عالمی ثقافت کی لغت

تالیف: کوامے انتھونی اپیاہ اور ہنری لوئی گیٹس جونیئر

ترجمہ: پروفیسر حنیف کھوکھر

الف

آترا ہاسس (رزمیہ)

میسوپوٹیمیا کی ایک قدیم رزمیہ نظم۔ قدیم بابلی عہد (1800-1600 ق م) میں لکھی جانے والی یہ داستان تورات میں مذکور سیل عظیم کی حکایت سے بہت مشابہ ہے۔ اس کے مطابق جب سات بڑے دیوتاؤں نے اقتدار پر قبضہ کیا تو بقیہ دیوتاؤں نے مجبور ہو کر ان کے لیے خوراک مہیا کرنا شروع کر دی۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد چھوٹے دیوتاؤں میں بے چینی پیدا ہوئی اور انھوں نے بغاوت کر دی۔ اس بغاوت کو رام کرنے کے لیے سب سے عقلمند دیوتا اینکی نے انسان تخلیق کرنے کا منصوبہ بنایا تا کہ دیوتاؤں کی جگہ وہ ان کے لیے کام کر سکیں۔ انسانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور وہ پورے کرۂ ارض پر پھیل گئے لیکن اس اثنا میں ان کا شور اس قدر زیادہ ہوا کہ دیوتا اسے برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے انسان کو بھوکوں مارنے اور زمین کو بنجر کرنے کے لیے قحط اور نمک جیسی آفات نازل کیں تا کہ انسانوں کی تعداد کم ہو جائے۔ لیکن اینکی کی مدد سے انسان بچ نکلے اور شور و غوغا کرتے چلے گئے۔ پھر دیوتاؤں نے ایک خوفناک سیلاب بھیجنے کی ٹھانی تا کہ اس دھرتی سے انسانوں کا صفایا ہو جائے۔ اینکی نے ایک شخص آترا ہاسس کو اپنے اور اپنے خاندان کے لیے ایک کشتی تیار کرنے کا حکم دیا لیکن جب خوراک جمع کرنے والے انسانوں کی کمی ہوئی تو دیوتاؤں کو بھوک اور پیاس نے آلیا۔ مرتے کیا نہ کرتے انھوں نے ایک جدید انسانی نسل پیدا کرنے کا فیصلہ کیا لیکن ایک شرط کے ساتھ۔ وہ یہ کہ جو عورتیں پیدا ہوں گی وہ بانجھ ہوں گی اور ان کے ساتھ ایک شیطان تخلیق کیا جائے گا جو مردہ بچے پیدا کرے گا اور پیدا ہونے والے بچوں کو مارنے کا سبب پیدا کرے گا۔

آرنلڈ میتھیو (1822-1888)

انگریز شاعر اور تنقید نگار میتھیو آرنلڈ ایک معروف مصلح تعلیم کے فرزند تھے اور انھوں نے خود بھی اپنی تحریروں میں سماجی اصلاح پر خامہ فرسائی کی۔ اگرچہ اس کی شاعری اس کے ہمعصروں ٹینی سن اور رابرٹ براؤننگ کے مقابلے میں کم معروف ہے، اس کا شمار وکٹورین دور کی عکاس بہترین تخلیقات میں کیا جا سکتا ہے۔ آرنلڈ نے اپنی مشہور نظم ''ساحل ڈوور'' (1867ء) میں اپنے دور

کے روحانی بحران کی تصویر کشی کے لیے سمندر کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ اپنی ایک اور مشہور نظم ''خانہ بدوش عالم'' (1853ء) میں آرنلڈ نے آکسفورڈ کے ایک غریب دانشور کے قصے کو شعروں میں بیان کیا ہے جو یونیورسٹی ترک کر کے خانہ بدوشوں کے ایک گروہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ اپنی نظم میں مذکور دانشور کے برعکس آرنلڈ 1844ء میں آکسفورڈ کے بلیول کالج سے فارغ ہونے کے بعد سکول انسپکٹر مقرر ہوا اور اپنی عمر کے آخری ایام تک اس عہدے پر کام کرتا رہا۔ اس نے اپنے ابتدائی ادوار میں زیادہ تر شاعری کو ہی ذریعہ اظہار بنایا اور اپنی منظومات کے متعدد مجموعے شائع کیے لیکن آکسفورڈ میں شاعری کا پروفیسر مقرر ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد اس نے شاعری ترک کر کے نثر لکھنا شروع کر دی۔

اس نے اپنی تنقیدی نگارشات میں ان موضوعات پر بالتفصیل لکھا جنھیں وہ پہلے اپنی منظومات میں متعارف کرا چکا تھا۔ ان نگارشات کے طفیل وہ انگریزی اور امریکی تنقید میں ایک نہایت ممتاز مقام پر فائز ہوا۔ آرنلڈ ادب کو ایک طاقتور ثقافتی طاقت اور جمہوری تعلیم کا محور خیال کرتا ہے۔ اس نے اپنے مشہور و معروف تنقیدی مضمون 'ثقافت اور نراجیت' (1869) میں ادبی اصولوں پر نظر ثانی کا مطالبہ کیا اور کہا کہ ادب میں شرکت پر کسی خاص طبقے کی اجارہ داری نہیں ہونا چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ امیر طبقہ بہت زیادہ مادیت پرستی کا شکار ہو چکا ہے اور متوسط طبقے کے لوگوں کو 'عبرانیت' جس نے ان کے ذوق میں پستی پیدا کی ہے، چھوڑ کر 'یونانیت' اختیار کرنی چاہیے۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے ثقافت کو دوبارہ زندگی بخشی جا سکتی ہے۔ اس کے بقیہ تنقیدی کام میں 'ترجمہ ہومر' (1861) اور 'تنقیدی مضامین' (1865) بھی بہت اہم خیال کیے جاتے ہیں۔

آریہ

سنسکرت زبان میں آریا کا مطلب اعلیٰ یا عالی نسب لوگ ہے۔ آریائی نیم خانہ بدوش چرواہوں پر مشتمل قبائل تھے جو دو ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ ایران اور ہندوستان کے شمال علاقوں میں آ کر آباد ہوئے۔ یہ باشندے قبائلی گروہوں اور دیہی بستیوں کی شکل میں رہتے تھے اور ان کا سردار راجہ کہلاتا تھا۔ ہند یورپی زبانیں انہی آریائی باشندوں کی بولی کی اولاد ہیں۔ انیسویں صدی میں آریائی ہند یوروپی اور ہند ایرانی زبانوں کے مترادف کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اگرچہ بنیادی طور پر یہ ایک لسانی اصطلاح ہے جو انیسویں صدی کے ماہر لسانیات میکس ملر کے توسط سے مقبول ہوئی۔ ہند آریائی کو عموماً ابتدائی ہند یوروپی زبان بولنے والے لوگوں کے لیے استعمال کیا

جاتا ہے جو وسطی ایشیا سے نقل مکانی کر کے برصغیر ہندوستان میں آ آباد ہوئے تھے۔1854ء میں شائع ہونے والی ایک کتاب میں ایک فرانسیسی مصنف جوزف آرتھر نے آریائی 'نسل' کے مفہوم میں توسیع کی۔اس کی مشہور ترین تحریر انسانی نسلوں کی عدم برابری(55-1853) میں آریہ 'نسل' کی تعریف ایسے سفید فام لوگوں کے طور پر کی گئی ہے جو ہند یوروپی زبانیں بولتے ہیں۔اس کا دعویٰ ہے کہ بنی نوع انسان نے آفرینش سے آج تک جتنی بھی ترقی کی ہے وہ آریائی لوگوں کے طفیل ہے اور اس نسل کے انسان اخلاقی اعتبار سے سامیوں، زرد فاموں اور سیاہ فاموں سے بہتر ہوتے ہیں۔ وہ ٹیوٹنز کو ان آریائی باشندوں کے خالص ترین جدید نمائندے قرار دیتا ہے۔ جرمن نواز انگریز سیاسی فلسفی ہوسٹن سٹیوارٹ چیمبرلین (1855ء۔1927ء) کی طرح گوبی بنو کے نسلی نظریے نے عوامی سطح پر مقبولیت حاصل کی۔ جرمنی میں خاص طور پر لوگوں کی اس سے بہت دل چسپی پیدا ہوئی اور اسے کئی دیگر زعما کے ساتھ اس وقت کے قد آور موسیقار رچرڈ ویگنر کی حمایت بھی حاصل ہوئی۔ بیسویں صدی میں خصوصاً چیمبرلین کی تصنیف 'انیسویں صدی کی بنیادیں' (1910) کے توسط سے گوبی مینو کے نظریات نازیوں کے انقلابی نظریے کے ایک جزو لاینفک کی حیثیت اختیار کر گئے۔ چیمبرلین کی اس کتاب نے گوبی مینو کے تصورات کے سیاسی مضمرات کو سماجی جبریت سے آگے بڑھا کر نسلیت کے ایک ایسے بیان کی بنیاد رکھی جس نے جرمن آمر ہٹلر (1945.1889) کی نازی تحریک کو متاثر کیا جو آریاؤں کو نارڈک نسل کے مساوی گردانتا تھا اور جس نے اس نظریے کو یہود کشی کے جواز کے طور پر استعمال کیا۔

ہندوستان میں ویدک دور (1500ق م۔650ق م) کی آمد اور ہندوؤں کے ذات پات کے نظام کے جڑ پکڑنے سے ایک آریائی 'نسل' کا تصور بہت حد تک ختم ہو گیا۔شروع میں ذات پات کے نظام کی بنیاد ورن (رنگ) اور سفید فام آریاؤں اور سیاہ فام داسوں کے درمیان امتیاز پر رکھی گئی۔ یہاں آریائی قبائل کو تین جدا جدا جاتیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ ذاتیں برہمنوں یعنی مذہبی علماء، کشتریوں یعنی عسکری طبقے اور ویشوں یعنی تاجروں اور کاروباری افراد پر مشتمل تھیں۔سب سے نچلی ذات داسوں کی تھی۔اس دوران غیر آریائی باشندوں کو آریا اور سنسکرت کے رنگ میں رنگ کر آریہ ثقافت میں جذب کرنے کا عمل شروع ہوا جس کی بنیاد یہ تصور تھا کہ غیر آریائی باشندے خود سے برتر قوم یعنی آریاؤں کی پیروی کرتے ہیں۔

آزاد، مولانا ابوالکلام (1887ء۔1958ء)

ہندوستان کی تحریک آزادی کے ایک ممتاز رہنما۔آپ کے والد پناہ گزین اور والدہ ایک

عرب خاتون تھیں۔ آپ مکہ میں پیدا ہوئے اور کلکتہ میں پلے پڑھے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے بارہ برس کی عمر میں اپنی صحافتی زندگی کا آغاز اخبار میں ایک مضمون لکھ کر کیا۔ آزاد نے متعدد اخبارات سے متعلق رہنے کے بعد 1912ء میں اپنا ہفتہ وار اردو جریدہ الہلال نکالنا شروع کر دیا۔ وہ ایک جراتمند مفکر تھے اور انھوں نے انگریزوں سے تعاون اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی علیحدگی کی کھل کر مخالفت کی۔ وہ ''الہلال'' کے مضمون کے توسط سے ہندی مسلمانوں کو تحریک آزادی میں شمولیت کی دعوت دیتے رہے۔ ان کے انقلابی نظریات کی وجہ سے انگریز حکام نے 1914ء میں ان کے پرچے پر پابندی عائد کر دی اور انھیں جیل میں بند کر دیا۔ آزاد نے قرآن پاک کا ترجمہ و تفسیر قید کے دوران ہی کیا۔

آزاد 1923ء میں انڈین نیشنل کانگرس کی صدارت کے لیے منتخب ہوئے۔ وہ اس عہدے پر فائز ہونے والے کم سن ترین سیاست دان تھے۔ 1940ء میں وہ ایک بار پھر اس منصب کے لیے منتخب ہوئے اور جون 1946ء تک اس پر متمکن رہے۔ انھوں نے اپنے دوسرے عہد صدارت میں ہندوستان کو آزادی دلوانے کے لیے انگریزوں سے مذاکرات کی راہ اختیار کی۔ 1947ء میں برطانوی راج کے خاتمے کے بعد انھوں نے بھارت کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا اور تعلیمی نظام کی اصلاح میں مصروف ہو گئے۔ ان کی کتاب ''آزادیٔ ہند'' آپ کے انتقال کے بعد 1959ء میں شائع ہوئی۔

آسٹریلیا کے مقامی باشندے

اس نسل کے لوگ آسٹریلیا اور تسمانیہ میں آباد ہیں۔ جب اٹھارہویں صدی کے اواخر میں گورا یہاں آیا اور اس نے آسٹریلیا کو برطانوی مجرمین کے قید خانے کے طور پر منتخب کیا تو اس وقت ان مقامی باشندوں کی تعداد تین سے دس لاکھ کے درمیان تھی اور وہ پانسو کے قریب لسانی گروہوں پر مشتمل تھے۔ جب یورپی آبادکار آسٹریلیا میں آباد ہوئے تو ان سے میل ملاپ سے ان لوگوں کے رہن سہن میں کئی تغیرات رونما ہوئے۔

آثار قدیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ آسٹریلیا میں انسان تقریباً 60000 سال سے بستے چلے آ رہے ہیں۔ ان باشندوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ زمانہ قدیم میں غالباً ایشیا سے نقل مکانی کر کے بذریعہ سمندر یہاں آئے تھے لیکن اس بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے کہ آیا وہ یکبارگی یہاں پہنچے یا تھوڑے تھوڑے کر کے۔

ان باشندوں نے خشک آب و ہوا اور پالنے کے لحاظ سے غیر موزوں جانوروں کی وجہ سے

شکار اور خوشہ چینی کا شغل اپنایا اور ان کی بڑی خواہش پانی کے ذخائر کو محفوظ کرنا ہوتی تھی۔ جوں جوں ان لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا وہ چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہوتے چلے گئے۔ جب یہ چھوٹے گروہ پانی کی تلاش میں نکلے تو وہ ایک دوسرے سے جدا ہوتے چلے گئے۔ تاہم ان مختلف گروہوں میں تعلق داریاں موجود رہیں۔ اس بڑھتے ہوئے قبیلے کے افراد کا مرکز نگاہ اب بھی پانی کا وہ ابتدائی ذخیرہ تھا جہاں ان کے آباؤ اجداد نے سکونت اختیار کی تھی۔ مادر گروہ اور اس سے نکلنے والی چھوٹی شاخوں کے درمیان تعلق کے تسلسل نے بعد ازاں ایک بڑے قبیلے کے ذیلی گروہوں کے درمیان قرابت داری کے ایک باقاعدہ نظام کی شکل اختیار کر لی۔

ان قدیم قبائلی باشندوں کا خیال تھا کہ پانی اور خوراک میں قلت ان کی زندگی کے اخلاقی و معاشرتی نظام میں کسی گڑبڑ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے لہٰذا تعویذ گنڈے اور ٹوٹکے ان کی رسوم کا حصہ بنے اور انھوں نے قدرتی انواع مثلاً حیوانات کو اپنے سماجی نظام میں شامل کرنا شروع کیا۔ قبیلے کے مردوں کو مختلف رہائش گاہوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا جن پر ایک یا ایک سے زائد پالتو انواع کے نام درج ہوتے تھے تاکہ آدمی، جانور اور آبائی ہیروؤں کے درمیان رسوماتی تعامل کی نگرانی کی جا سکے۔ تاہم Dreaming اور Dreamtine پر اختیار صرف عمر رسیدہ مردوں کا تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس سے مراد ایک اہم آفرینشی حکایت تھی جس کا سوانگ انسانی و حیوانی زندگی کے تسلسل کو یقینی بنانے کے لیے رسوماتی انداز میں بھرا جاتا تھا۔

ان باشندوں کو انیسویں صدی میں گوروں کے ہاتھوں بڑے ظلم و ستم برداشت کرنے پڑے۔ پھر خود کو شہری زندگی کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کا مشکل عمل بھی تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ غربت، بیماری اور ناداری بھی تھی۔ ان ساری چیزوں نے مل کر جدید دور میں ان بے چاروں کی خوب گت بنائی۔ 1986ء میں ان مقامی باشندوں کی تعداد 228000 تھی اور وہ آسٹریلیا کی کل آبادی کے دو فی صد حصے سے کم تھے۔ ان میں بیروزگاری کی شرح قومی اوسط سے چھ گنا زیادہ ہے جبکہ ان کی اوسط اجرت قومی شرح سے آدھی ہے۔

آسٹن، جین (1775ء۔1817)

انگریزی مصنفہ۔ ان کا شمار مغربی دنیا کے عظیم ترین ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے انگریزی متوسط طبقے کی زندگی کے تہہ دار مزاحیہ اور طنزیہ کردار تخلیق کیے۔

جین آسٹن دیہاتی علاقے کے ایک پادری کے آٹھ بچوں میں ساتویں نمبر پر پیدا ہوئیں۔ انھوں نے اپنی ابتدائی زندگی جیسا کہ اٹھارھویں صدی کے معزز گھرانوں کی خواتین میں رواج تھا،

زیادہ تر اپنے خاندانی حلقے میں گزاری۔ اس کے ناولوں کا زیادہ تر مواد سادہ دیہی ماحول کے چھوٹے زمیندار طبقے سے تعلق رکھنے والے قریبی عزیز واحباب سے ہی متعلق ہے۔ اگرچہ وہ اپنے قارئین کو محظوظ کرنے کی خواہاں نظر آتی ہیں لیکن ان کا مقصد صرف حظ ہی نہ تھا۔ ان کی نظر قریبی رشتوں ناطوں میں اقدار واطوار اور انسانی رویوں پر بھی تھی۔ ادبی نقادوں کے مطابق ان کے درجے کی نفیس مزاح نگاری کی نظیر ان کے بعد ابھی تک پیدا نہیں ہوسکی۔

اگرچہ شادی آسٹن کی نگارشات میں ایک مرکز اور محور کی حیثیت رکھتی ہے، مگر انھوں نے خود ساری عمر اس سے پرہیز کیا۔ ان کے معاشقوں کی کئی حکائتیں مشہور ہیں لیکن وہ سب کی سب غیر مصدقہ ہیں۔ (ان کے لواحقین نے ان کی موت کے بعد ان کے بہت سے خطوط ضائع کر دیے تھے) تاہم انھوں نے ایک بڑے خاندان میں زندگی گزاری اور انھیں درجنوں کی تعداد میں بھتیجے بھتیجیاں اور بھانجے بھانجیاں میسر تھیں جن سے وہ اپنے دل کی بات کرسکتی تھیں اور جنھیں وہ اپنے زیر تکمیل ناولوں کی کہانیاں سنا سکتی تھیں۔ ان کے چار ناول ان کی زندگی میں ہی ان کے نام کے بغیر شائع ہوگئے تھے جنھوں نے اس وقت کے ادبی حلقوں میں کافی گونج بھی پیدا کی۔

(1811) ''عقل واحساس'' جین آسٹن کا سب سے پہلے شائع ہونے والا ناول ہے گو یہ ان کا پہلا ناول نہ تھا۔ انھوں نے سب سے پہلے ''پہلا تاثر'' قلمبند کیا جو بعد میں ''غرور تعصب'' کے نام سے معروف ہوا۔ یہ ناول 1797ء میں تکمیل کو پہنچا مگر لندن کے ایک پبلشر ٹامس کیڈل نے اسے چھاپنے سے معذرت کرلی۔ یہ 1813ء میں آکر چھپا۔ ''خانقاہ نارتھینگر'' جو کہ 98-1797ء میں لکھا گیا، کے بارے آسٹن کہا کرتی تھیں کہ ''غرور تعصب'' کی شوخی ظرافت کا الٹارخ پیش کرتا ہے۔ یہ ناول مع ایک دوسرے ناول ''ترغیب'' کے 1818ء میں ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا اور تب جا کر لوگوں کو پتہ چلا کہ یہ خوبصورت ناول جین آسٹن تصنیف کرتی رہی ہیں اور یہ بات بھی ان پر ظاہر اس کے بھائی ہنری آسٹن کے تحریر کردہ ایک سوانحی نوٹ سے ہوئی۔ ان کے دیگر معروف ناولوں میں (1814) ''مینسفیلڈ پارک'' اور (1815) ''ایما'' شامل ہیں۔ جین آسٹن کا انتقال مرض ایڈیسن کی وجہ سے ہوا۔

آشوریہ

زمانہ قدیم میں مشرق قریب میں پروان چڑھنے والی ایک ثقافت۔ آشوری شمالی میسوپوٹیمیا کی ایک ریاست کے باشندے تھے۔ یہ علاقہ موجودہ عراق کے انتہائے شمال میں واقع ہے۔ آشوریوں نے قدیم مشرق قریب میں ایک نہایت عظیم اور عالی شان سلطنت کی بنیاد رکھی۔

آشوریوں نے چودھویں صدی قبل مسیح میں بابلیہ سے آزادی حاصل کرنے کے بعد میسوپوٹیمیا کے خطے کی ایک بڑی طاقت کے طور پر ابھرنا شروع کیا۔ اگرچہ بادشاہ تکلتی سرتا (اندازاً 1208ق م) کی وفات کے بعد آشوریوں کی طاقت کچھ عرصے کے لیے روبہ زوال ہوئی، لیکن نویں صدی قبل مسیح میں آکر آشوری حکمرانوں نے اپنی سلطنت کی سرحدوں میں توسیع کرنا شروع کردی اور تگلت پلیسر سوم (اندازاً 744-727ق م)، سارگون دوم (اندازاً 721-705ق م)، سنیقرب (اندازاً 704-681ق م) اور آسرحدون (اندازاً 681-669ق م) جیسے مضبوط بادشاہوں کی سرکردگی میں آٹھویں صدی قبل مسیح سے لے کر ساتویں صدی قبل مسیح کے اواخر تک کے عرصے میں مصر تا خلیج فارس مشرق وسطیٰ کے بیشتر علاقے کو فتح کر کے ایک آشوری پرچم کے نیچے جمع کردیا گیا۔

آشوری ادب بابلیہ سے اخذ کیا گیا یا پھر کم از کم یہ ہے کہ بابلی بولی میں لکھا جاتا رہا۔ صرف علمی اور انتظامی دستاویزات آشوری زبان میں لکھی جاتی تھیں۔ بادشاہ آشورناصرپال دوم (اندازاً 883-859ق م) کے دور میں علم وادب اور فن تعمیر کو بہت فروغ ملا۔ آشوریوں نے جنگ اور شکار کے مناظر (مع تشریحی فقرات کے) تراشنے کا فن انا طولیہ کے فن کاروں سے سیکھا۔ ایک طرف آشوری فنون میں نفاست کے عنصر نے جلا پائی تو دوسری طرف تعمیرات میں روغنی ٹائلوں کے استعمال کے رواج کا آغاز ہوا۔ ان عمارات میں سے شاہی محل کلخ سب سے زیادہ متاثر کن ہے جس نے بعد میں سلطنت کے ثقافتی مرکز کی حیثیت اختیار کرلی۔

اس محل کے درودیوار کو مذہبی رسوم اور جنگ وجدل کی تصویروں اور دیو مالائی مناظر اور بڑے بڑے تصویری طغروں سے سجایا گیا تھا۔ آخری عظیم آشوری بادشاہ آشوربنی پال 627ق م کے لگ بھگ فوت ہوا اور آشوریہ سلطنت مآل کار لگ بھگ 614 سے 609 قبل مسیح تک کے عرصے میں میڈیز اور چالڈین قبائل کے ہاتھوں مکمل طور پر تباہ ہوگئی۔

آئزن ہاور، ڈوائٹ [ڈیوڈ] (1890ء-1960ء)

امریکہ کا چونتیسواں صدر اور دوسری عالمی جنگ کے دوران مغربی یورپ میں اتحادی افواج کا سپریم کمانڈر۔ آئزن ہاور ٹیکساس کے ایک غریب بنیاد پرست عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا۔ اسے پڑھائی سے کوئی خاص دل چسپی نہ تھی لیکن اس نے کھیلوں میں خوب نام کمایا۔ کنساس میں ہائی سکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے ویسٹ پوائنٹ میں واقع امریکی فوجی اکیڈیمی میں داخلہ لے لیا۔ وہاں اس نے اپنے پسندیدہ کھیل فٹ بال میں حصہ لینا شروع کیا لیکن اپنے پہلے ہی

سال اسے گھٹنے کے زخم کے سبب میدان سے باہر ہونا پڑا۔ وہ 1915ء میں پاس ہوا اور 164 کی کلاس میں اس کا نمبر 61 واں تھا۔ اسے فوج میں سیکنڈ لیفٹننٹ کا عہدہ دے کر سان انتونیو ٹیکساس بھیج دیا گیا جہاں 1916ء میں اس کی ملاقات مامی جینو اداؤد سے ہوئی جس سے وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گیا۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران جب وہ ایک ٹینک ٹریننگ سنٹر کی کمان کر رہا تھا اسے ترقی دے کر کیپٹن بنا دیا گیا۔ اسے ٹریننگ کے شعبے میں اچھی کارکردگی کی بنا پر سروس میڈل بھی دیا گیا۔ 1920ء کے عشرے میں وہ نہر پانامہ کے علاقے میں خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ 1924ء میں امریکہ واپسی پر اس نے آرمی وار کالج اور کمانڈ اینڈ جنرل اسٹاف سکول سے کورس کیے۔ 1929ء سے 1933ء تک اس نے فرانس اور واشنگٹن میں نائب وزیر جنگ کے طور پر فرائض سرانجام دیے اور پھر اسے آرمی چیف آف سٹاف جنرل ڈوگلس میکارتھر کا معاون خاص بنا دیا گیا جس کے سیاسی و عسکری نظریات کی آئزن ہاور بعد میں بڑی شدومد سے مخالفت کرتا رہا۔ 1935ء سے 1939ء تک وہ جنرل میکارتھر سے مل کر فلپائن میں وہاں کی مسلح افواج کی تنظیم نو میں مصروف رہا۔ جرمنی کے پولینڈ پر حملے کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ امریکہ واپس آ گیا اور 1941ء میں اسے کرنل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔

جوں جوں دوسری عالمی جنگ میں امریکہ کی شمولیت میں اضافہ ہوا، آئزن ہاور نے بھی ملٹری کمانڈ رسٹرکچر میں تیزی کی طرح آگے بڑھنا شروع کر دیا اور جون 1942ء میں اسے یورپ کے محاذ پر امریکی کمانڈر نامزد کر دیا گیا۔ شمالی افریقہ، صقلیہ اور اٹلی میں اس کی کامیابیوں کے بعد دسمبر 1943ء میں اسے سپریم ہیڈ کوارٹرز آف الائیڈ ایکسپی ڈشنری فورس کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا۔ جون 6-1944ء کو نارمنڈی کا حملہ آئزن ہاور کی ہی زیر نگرانی عمل میں آیا۔ اس حملے نے ہٹلر کی فوجوں کے پاؤں اکھاڑ دیے اور انھیں 8 مئی 1945ء کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ اس پر اسے پنج تارا جنرل بنا دیا گیا اور جب اگلے ماہ امریکی افواج نے جرمنی پر قبضہ کیا تو اس کی قیادت بھی آئزن ہاور کر رہا تھا۔ اس سال نومبر میں وہ امریکی فوج کا چیف آف سٹاف بن گیا۔ اس نے کولمبیا یونیورسٹی کی صدارت کا عہدہ لینے کے لیے 1948ء میں فوج سے استعفیٰ دے دیا لیکن پھر اس نے دسمبر 1950ء میں یورپ میں اتحادی افواج کے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے نیٹو کی تنظیم میں مدد دینے کے لیے چھٹی لے لی۔ 1952ء میں اس نے فوج کو خیر باد کہہ کر ریپبلکن صدارتی امیدوار کی نامزدگی کے لیے مہم میں حصہ لیا۔ امریکیوں کا یہ محبوب جنگی ہیرو دسمبر 1943ء میں یہ نامزدگی اور بعد ازاں ہونے والے انتخابات بڑی آسانی جیت گیا۔ 1956ء کے صدارتی انتخاب میں اس

نے پہلے سے بھی زیادہ فرق سے کامیابی حاصل کی۔ اگرچہ آئزن ہاور مشرق وسطیٰ اور کیوبا میں اشتراکیوں سے فعال عسکری مقابلے کا بڑا زبردست حامی تھا، اس نے امریکیوں کو اس داخلی خطرات سے بھی متنبہ کرنا شروع کر دیا تھا جسے اس نے ''فوجی صنعتی کمپلیکس'' کا نام دیا۔ ایک عشرے بعد اس مسئلے نے نیولیفٹ کی تحاریر وتقاریر میں غیر معمولی اہمیت اختیار کر لی۔ اس کی تصانیف میں دوسری جنگ عظیم میں اتحادی فوجوں کی روداد ''یورپ کی جنگیں'' (1948ء) اس کی صدارتی یاداشتیں ''تبدیلی کا مینڈیٹ'' (1963ء) اور ''امن کی یلغار'' (1965ء) شامل ہیں۔

آئی سس

قدیم مصر کی ایک دیوی۔ وہ پاتال کے دیوتا اوسی رس کی بہن اور بیوی تھی۔ اس کی پرستش مشرق قریب کے بہت سے گروہوں کیلئے انتہائی اہمیت اختیار کر گئی اور انجام کار اسے سلطنت رومہ کے مذہب میں ضم کر لیا گیا۔ ''آئی سس'' ایک مصری لفظ ہے جس کا مفہوم ''تخت'' تھا، کی یونانی شکل ہے۔ تخت کو اکثر و بیشتر اس دیوی کی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ گائے کے سر یا اس کے سینگوں کو بھی اس مقصد کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔

آئی سس، اس کے خاوند بھائی اوسی رس اور اس کے بیٹے ہورس کی پرستش نے عیسائی مذہب کے سامنے بہت دم خم کا مظاہرہ کیا۔ مصری دیو مالا میں اس کا کردار اوسی رس کی ہلاکت اور اس کے نتائج وعواقب کے گرد گھومتا ہے۔ اس دیو مالائی حکایت کے مطابق وہ اپنے مقتول شوہر کے بکھرے اعضا چن کر اسے دوبارہ جوڑنے کا جتن کرتی ہے اور اپنے غم کی طاقت سے کام لے کر اوسی رس کو ایک دفعہ پھر زندہ کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس حکایت میں آگے چل کر اس کے اپنے فرزند ہورس سے تعلق کا ذکر آتا ہے۔ ہورس بڑا ہو کر اپنے باپ کے قاتل سیث سے جنگ کر کے انتقام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ ہورس، آئی سس کی نگہداشت اور حفاظت کے طفیل ہی اپنی زندگی کے ابتدائی برسوں میں محفوظ رہ پاتا ہے اور آئی سس اپنے اس کردار کی وجہ سے نگہداشت کی دیوی کے طور پر جانی جاتی ہے۔

آئی سس آخر کار ایک مہربان ماتا دیوی اور زرخیزی و بارآوری کی دیوی بن گئی۔ آئی سس کی پوجا زیریں مصر میں شروع ہوئی اور پھر سارے ملک میں پھیل گئی اور اس کے نام پر بہت سے معبد تعمیر کئے جانے لگے۔

1960ء کے عشرے میں جب امریکہ میں تہذیب وثقافت کے خلاف جذبات ابھرنا

شروع ہوئے تو اس سے لوگوں کی دلچسپی قدیم مذہب میں بہت بڑھ گئی جس سے آئی سس نے بھی بہت زیادہ مقبولیت حاصل کر لی۔ ہالی وڈ میں اس دیوی پر ایک سیریز بھی تیار کی گئی جو 1970ء کے عشرے میں عوام کیلئے ٹی وی پر پیش کی گئی تھی۔

ابسن، ہینرک (یوہان) (1828ء۔1906ء)

ناروے سے تعلق رکھنے والا ایک معروف ڈرامہ نگار۔ بعض نقاد ابسن کو جدید ڈرامے کا والد قرار دیتے ہیں اور اس میں واقعی کوئی شک والی بات نہیں کہ ان کی نگارشات نے تھیٹر کا چہرہ مہرہ یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اس نے ایک ایسی صنف میں سماجی مسائل متعارف کرانا شروع کئے جو اس وقت ایک بالکل غیر سیاسی صنف شمار ہوتی تھی۔ ابسن کی سماج اور اس کی بے چینیوں کے بارے میں تشویش اس کے کھیل (بھوت: 1881ء) میں پیش کی گئی جنسیت اور شادی کے ادارے پر اس کی تنقید کو (گڑیا گھر 1879ء) میں بڑے واضح طور پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اسے نفسیاتی تھیٹر کے بانیوں میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے روایتی انداز سے پلاٹ پر زور دیتے رہنے کی بجائے کردار اور جذباتی الجھن کے پیچیدہ مطالعات شروع کئے۔

ابسن سکی این کے ساحلی شہر میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوا۔ ابھی وہ لڑکپن میں ہی تھا کہ اس کا خاندانی کاروبار بیٹھ گیا اور اسے پندرہ برس کی عمر میں گرمسٹاد شہر کے ایک دوا فروش کے ہاں ملازمت کرنا پڑی۔ انہیں اس ملازمت میں آئے بمشکل کوئی دو برس ہی ہوئے تھے کہ اس کے استاد کی نوکرانی ابسن کے ناجائز بچے کی ماں بن گئی۔ اس نے نومولود بچے میں کوئی دلچسپی نہ لی لیکن ناجائز اولاد کا موضوع اکثر اس کے ڈراموں میں در آتا ہے۔

ابسن کو تئیس سال کی عمر میں برگن کی نیو نیشنل تھیٹر کا مینجر اور سرکاری ناٹک نویس مقرر کر دیا گیا لیکن اس نے جلد ہی یہ کام چھوڑ کر کرسٹینا (حال اوزسلو) کے نارویجی تھیٹر کے مینجر کا زیادہ سود مند عہدہ قبول کر لیا جس پر وہ 1857ء سے لیکر 1862ء تک کام کرتا رہا۔ 1864ء میں جب یہ تھیٹر دیوالیہ ہوا تو ابسن نے جلاوطنی اختیار کر کے روم، میونخ اور ڈریسڈن میں دن بتانے شروع کر دیئے۔ 1891ء میں آخر کار وہ کرسٹینا واپس لوٹ آیا اور زندگی کا بقیہ حصہ یہیں گزار دیا۔

ابسن نے بہت سے کھیل لکھے لیکن اس کے خیالات کو صحیح معنوں میں آواز ''گڑیا گھر'' میں ملی۔ یہ کھیل ایک خاتون نورا کے بارے میں ہے جو اپنے ریاکار شوہر کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ ابسن کے ڈرامے کو کوئی خوشگوار موڑ دے کر ختم کرنے سے انکار اور نورا کو ایک خود مختار عورت کے طور پر پیش کرنے کے فیصلے نے ناظرین کو چونکا کے رکھ دیا۔ ان کا اگلا کھیل ''بھوت'' جو مرض اور

اخلاقی آلودگی کی طاقت کے بارے میں تھا۔ ابسن کو اپنے ڈراموں میں غیر معمولی طور پر مضبوط خواتین کے کردار شامل کرنے کے حوالے سے خاص طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ نورا اور ''ہیڈا گیبلر'' کی ہیروئن کو اس ''نئی قسم کی عورت'' کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس نے یہ کردار غالباً اپنی بیگم سوزانہ تھورسن کو ذہن میں رکھ کر وضع کیے۔

اتاترک

ترک قوم کا عسکری و سیاسی رہنما۔ عوامی جمہوریہ ترکیہ کے بانی اور اولین صدر مصطفیٰ کمال کو اتاترک (ترکوں کا باپ) کا خطاب ترک پارلیمان نے 1935ء میں دیا۔ اتاترک سیلونیکا میں پیدا ہوئے جو اس وقت سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا۔ انھوں نے 1895ء میں ایک فوجی درسگاہ میں داخلہ لیا اور پھر استنبول چلے گئے جہاں انھوں نے 1905ء میں ایک جنگی اکیڈیمی سے اپنی گریجوایشن مکمل کی۔ وہ عثمانی سلطان عبدالحمید دوم (اقتدار 1876ء۔1909ء) سے مخالفت کی بنا پر کچھ عرصہ قید بھی رہے لیکن بعدازاں ایک فوجی مشن پر دمشق چلے گئے جہاں انھوں نے اپنے ہم خیال فوجی افسروں کو ساتھ ملا کر ایک انقلابی گروپ 'وطن اور آزادی' تیار کیا۔ اپنے انقلابی پس منظر کے باوجود اتاترک اس مجلس اتحاد میں زیادہ فعال کردار ادا کرتے نظر نہیں آتے جس نے انجام کار 1908ء میں عبدالمجید دوم کو معزول کیا تھا۔

جنگ عظیم اول کے دوران وہ بلغاریہ میں فوجی اتاشی کے طور پر مامور تھے۔ انھوں نے ایک سپاہی کے طور پر خصوصاً 1915ء میں گیلی پولی کے میدان میں لڑی جانے والی جنگ میں بڑا نام کمایا اور ایک قومی ہیرو کا درجہ اختیار کر گئے۔ گیلی پولی کی فتح ان چند ایک فتوحات میں شامل ہے جو عثمانی ترک اس جنگ میں حاصل کر پائے تھے۔ اکثر محاذوں پر انھیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

جب 1918ء میں جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کیے گئے تو اتاترک جو اس وقت تک جنرل بن چکے تھے اتحادیوں کی مسلط کردہ سخت شرائط دیکھ کر بہت مایوس ہوئے۔ انھوں نے اتحادیوں اور اپنے سلطان دونوں کی مخالفت مول لی اور مئی 1919ء میں اپنی انقلابی کاروائیاں شروع کرنے کے لیے اناطولیہ چلے آئے۔ ماہ جولائی تک وہ عمائدین اناطولیہ کی ایک کانفرنس بلا چکے تھے اور اپنے وطن کی آزادی کے لیے ایک نئی فوج تشکیل دے چکے تھے۔ اپریل 1920ء میں اتاترک نے ترکی کی گرینڈ نیشنل اسمبلی کا اجلاس منعقد کیا جس نے انھیں سپیکر منتخب کر لیا۔ اس جلا وطن پارلیمنٹ نے سلطان اور اتحادیوں کے مابین طے ہونے والے معاہدے کو ماننے سے انکار کر دیا اور اتحادیوں کو سرزمین ترکی سے نکال باہر کرنے کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ یہ

جدوجہد تین برس تک جاری رہی جس کے نتیجے میں اتاترک اپنی قوم کو اتحادیوں خصوصاً ان یونانیوں سے نجات دلانے میں کامیاب ہوگئے جنھوں نے ازمیر اور مغربی اناطولیہ کے علاقوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ انھوں نے 1923ء میں گرینڈ نیشنل اسمبلی کے سربراہ کے طور پر معاہدہ لوزان کے لیے ہونے والے مذاکرات میں حصہ لیا جس کی رو سے ترکی کی جدید ریاست کی سرحدوں کا تعین کیا گیا۔ اکتوبر 1923ء میں ترکی کو جمہوریہ قرار دے دیا گیا اور اتاترک نے اس کے پہلے صدر کا منصب سنبھال لیا۔

آزادی حاصل کرنے اور سربراہ مملکت کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد اتاترک نے ترکی کو ایک جدید ریاست میں تبدیل کرنے کے لیے ایک زبردست مہم کا آغاز کیا۔ انھوں نے 1924ء میں خلافت عثمانیہ کو ختم کر کے خلیفہ کو ملک سے بھگا دیا اور ترکی کو ایک سیکولر ریاست بنانے کا اعلان کر دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ترکی میں پارلیمانی نظام متعارف کرایا اور رسم الخط، تعلیمی نظام اور تجارتی و عدالتی قوانین میں اصلاحات کیں۔

اتاترک نے لباس کے سلسلے میں اصلاحات کیں۔ خواتین کو پردے اور مردوں کو فیض کیپ (ترکی ٹوپی) پہننے کی ممانعت کر دی گئی کیونکہ یہ دونوں چیزیں ماضی کی عثمانیہ ثقافت کی علامت تھیں۔

1934ء میں خواتین کو حق رائے دہی تفویض کیا گیا اور 1935ء کے انتخابات میں 17 عورتیں پارلیمنٹ کی رکن بن گئیں۔

اتاترک کی اپنے مقصد سے لگن اور یکسوئی سے ان کی حکومت میں آمرانہ رنگ بھی پیدا ہوا۔ وہ اپنے مخالفین کو خصوصی عدالتوں کے ذریعے کچل دیا کرتے تھے جیسا کہ 1926ء میں ان پر قاتلانہ حملے کی سازش میں ملوث افراد کے مقدمے میں کیا گیا۔ وہ 1938ء میں اپنی وفات تک اپنے ملک سے تمام اسلامی اور عثمانی نام و نشان مٹا کر اسے ایک سیکولر ریاست میں تبدیل کر چکے تھے۔

اجنتا کے غار

بھارت میں واقع مشہور بدھ مندروں کی ایک جگہ۔ ہندوستان کے صوبے مہاراشٹر کے شمالی جانب واقع ایک گاؤں اجنتا کے نواح میں واقع پتھروں سے تراشے گئے یہ مندر اور خانقاہیں اپنی دیواری تصویروں کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ یہ غار ایک ستر فٹ گہرے شگاف کی اندرونی جانب گرینائٹ کی چٹانوں میں واقع ہیں جہاں کبھی بدھ راہب رہا کرتے تھے۔ اس وادی میں

لگ بھگ انتیس غار ہیں جن میں سے بعض کو مندروں کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور بعض کو خانقاہوں کے طور پر۔ ان سب کی کھدائی اور آرائش دوسری صدی قبل مسیح اور ساتویں صدی قبل مسیح کے درمیان کسی وقت عمل میں آئی۔ اگرچہ ان مندروں کے فن تعمیر خصوصاً ان کے نقش ونگار سے مزین ستونوں کی زیادہ تعریف کی جاتی ہے، داخلی دیواروں چھتوں اور ستونوں پر بنی تصویریں بھی کچھ کم نہیں۔ ان تصاویر میں بہت شوخ رنگ استعمال کیے گئے ہیں اور ان میں ایک ایسی سطوت و تمکنت نظر آتی ہے جو ہندی آرٹ میں شاذ ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ تصاویر ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک مربوط سلسلے کی شکل اختیار کرتی چلی جاتی ہیں اور ایک عجیب وغریب تاثر پیدا کرتی ہیں۔ ان میں بدھ مذہب کے مختلف مشاہیر اور معبود دکھائے گئے ہیں۔ بعض تصاویر کو زمانے اور موسم کی دست برد سے نقصان پہنچا ہے مگر پھر بھی اجنتا کے یہ غار ہندوستانی آرٹ کی شان وشوکت کے ثبوت کے طور پر آج بھی موجود ہیں۔

اچیبے چنوا (1930 تا.....)

نائیجیریا کا مشہور ادیب اور ناول نگار۔ آچیبے کو انگریزی کو ذریعہ اظہار بنانے والا پہلا بڑا افریقی ناول نگار قرار دیا جاتا ہے۔ وہ مشرقی نائیجیریا میں پیدا ہوا اور اس نے ایک عیسائی اگبو گھرانے میں پرورش پائی۔ وہ اپنے ناولوں میں عموماً قبل نوآبادیاتی دور سے لے کر قومی آزادی تک کے درمیانی عرصے میں نائیجیریا کی ثقافت میں پیدا ہونے والے انقلاب سے بحث کرتا ہے۔ آچیبے کا پہلا ناول Things Fall Apart (اشاعت 1958ء) نوآبادیاتی دور میں اگبو قبیلوں کی روایتی معاشرت وثقافت میں پیدا ہونے والی توڑ پھوڑ سے متعلق ہے۔ اسے افریقہ کے انگریزی بولنے والے خطوں اور باقی دنیا میں ثانوی تعلیمی کورسوں میں بالالتزام پڑھایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ہم صرف فرانسیسی میں لکھنے والے کمارالے کا موازنہ ہی اس سے کر سکتے ہیں۔ متذکرہ بالا ناول کے علاوہ اچیبے نے 1960ء میں No Longer at Ease لکھا۔ اس میں اس نے نائیجیریا کے ایک ایسے تخیل پرست نوجوان کو مرکزی کردار بنایا ہے جو برطانیہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے وطن لاگوس لوٹتا ہے اور برے دن اسے آلیتے ہیں۔ 1964ء میں منظر عام پر آنے والے Arrow of God ''خدا کا تیر'' میں روایتی دیسی معاشرے اور نوآبادیاتی جدیدیت کے مابین تصادم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کی چوتھی تصنیف A Man of the people (1966ء) قارئین کو نئی آزاد شدہ افریقی ریاستوں میں آمریت کی متوقع فصل سے متنبہ کرتی ہے۔ اپنے ان ناولوں کے ساتھ ساتھ آچیبے نے ایسے

بہت سے مقالات ومضامین بھی بہت سے جرائدورسائل میں قلمبند کیے ہیں جن میں افریقیوں اور دیگر ادبا کی فکشن میں براعظم افریقہ اوراس کے باسیوں کی تصویر کشی کی بات کی گئی ہے۔اس کی بعض تحاریراس کے ان تجربات کا بھی حاصل ہیں جن میں سے وہ مختلف امریکی اور نائیجیرین درسگاہوں میں ادب کے استاد کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ نائیجیریا کی خانہ جنگی(70-1967ء)آچیبے کے لیے ایک بہت روح فرسا سانحہ تھا۔اس خانہ جنگی میں اس کا ایک دوست، رفیق کاراور نائیجیریا کا مشہور شاعر کرسٹوفراوکگبو بھی مارا گیا تھا۔اس صدمے سے دوچار ہونے کے بعد اس نے ناول لکھنا ترک کردیے اور اپنی توجہ مضامین، افسانے اور شاعری لکھنے پر مرکوز کرلی۔1987ء میں وہ ایک بار پھر ناول نگاری کی طرف آیا اوراس نے Anthills of the Savannah شائع کیا۔آجکل آچیبے امریکہ میں ہے اور وہاں لیکچرار کے طور پر کام کررہا ہے۔

اخناتون (انتقال 1354 قبل مسیح)

قدیم مصر کا ایک فرعون۔اخناتون کا تعلق قدیم مصری بادشاہوں کے اٹھارہویں سلسلے سے تھا۔اس نے1372 ق م سے لے کر1354 ق م تک حکومت کی اور ایک موحدانہ مذہب آتون کی بنیاد رکھی۔

اخناتون سے قبل مصری بہت سے خداؤں کی پرستش کرتے تھے جو زندگی کے مختلف امور کے نگران متصور ہوتے تھے۔جس طرح ان خداؤں کا ایک منظّم سلسلہ مراتب تھا، اس دور کی سیاسی حکومت بھی بہت منظّم تھی۔ بادشاہوں کے اٹھارھویں سلسلے نے1539 ق م سے1292 ق م تک دوسوسال تک حکومت کی۔ان کے عہد میں مصری سلطنت فنیقیا نوبیا اور فلسطین تک پھیلی ہوئی تھی۔فرعون کو خداؤں کا ترجمان خیال کیا جاتا تھا۔اس لیے اسے حکومت کے سربراہ کی حیثیت حاصل تھی اور اسے شاہی خطاب، مال ودولت اور عیش وعشرت کا حقدار سمجھا جاتا تھا۔

اخناتون نے1372 ق م کے لگ بھگ تخت پر بیٹھنے کے بعد اپنا خاندانی نام امنحتب برقرار رکھا اور قدیم خداؤں کی پوجا جاری رکھی۔اس کے کچھ عرصہ بعد اس نے ایک نئے واحد اور سچے، خدا ایتن کی پرستش شروع کردی جس کا نشان سورج تھا۔قدیم مذہب سے اس چھیڑ چھاڑ کے بعد اس نے سیاسی نظام میں بھی تبدیلیاں لانے کی کوشش کی۔ دارالحکومت تھیبس سے امرنا منتقل کردیا گیا جس کا نام اس نے بدل کر آخے تیتن یعنی 'ایتن کا افق' رکھ دیا۔اس نے الوہی بادشاہت کے تصور کو بھی دوبارہ متعارف کرایا۔

اس کے متعارف کردہ نئے مذہب میں کوئی ضابطۂ اخلاق یا نظام تادیب نہ تھا اور یہ بات بھی قدیم مذہب کے تادیبی نظام سے بہت ہٹ کر تھی۔ پجاریوں کو محض یہ حکم تھا کہ وہ زندگی کے لیے شکر کرتے رہا کریں۔

اخناتون کے دور میں مصر میں اور دیگر خارجی صوبوں میں بہت زیادہ بدعنوانی اور بغاوت دیکھنے میں آئی۔ اس کی موت کے بعد اس کے جانشینوں سمنخ کارع اور توتن خامن نے قدیم مذہبی اور سیاسی روایات کو نئے سرے سے جوں کا توں بحال کر دیا۔

ابن الہیثم (اندازاً 965ء۔1040ء)

عرب سائنس دان۔ ابن الہیثم جنوبی عراق میں پیدا ہوا لیکن بعد ازاں وہ قاہرہ چلا گیا جہاں خلیفہ نے اسے دریائے نیل کے سالانہ سیلاب پر قابو پانے کے ایک منصوبے پر کام کرنے کیلئے مدعو کیا تھا۔ جب اسے احساس ہوا کہ اس منصوبے سے کام نہیں بننے کا تو اس نے جان بوجھ کر پاگلوں ایسی سدھ بدھ بنالی تا کہ متلون مزاج خلیفہ کے عتاب سے بچا رہے۔ خلیفہ کی موت کے بعد اپنی موت تک ابن الہیثم نے خود کو بصریات، ریاضی اور فلکیات کے موضوعات پر تصنیف و تالیف کے کاموں کیلئے وقف کیے رکھا۔

ابن الہیثم نے اپنی اہم ترین تصنیف ''بصریات'' میں بینائی کے بارے میں ایک طبع زاد اور انتہائی مدلل نظریہ پیش کیا۔ اس نے ثابت کیا کہ روشنی آنکھ میں کسی بیرونی منبع سے نکل کر داخل ہوتی ہے۔ اس نے انعکاس وانغطاف کی بات کی اور عمقی ادراک کی وضاحت کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس کتاب کا بعد ازاں لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا جس سے یورپی سائنسدانوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ ایک مسئلہ جسے اس نے اپنی اس کتاب میں حل کرنے کی کوشش کی مغرب میں ہنوز ''الہیذن پرابلم'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ لاطینی والوں نے اس کے نام کو بگاڑ کر الہیذن کر دیا تھا۔

فلکیات پر اپنی تصنیف ''شکوک'' میں الہیثم نے کائنات کے بارے میں صدیوں سے چلے آتے بطلیموسی نظریے کو تنقید کا نشانہ بنایا اور دکھایا کہ یہ نظریہ تضادات سے پر ہے۔ ''بصریات'' کی طرح یہ تحریر نہ صرف اپنے انفرادی دلائل کی وجہ سے اہم ہے بلکہ سائنسی منہاج کی نمونہ کاری کے اعتبار سے بھی قابل قدر ہے۔ وہ اس کتاب کے تعارف میں لکھتا ہے کہ چونکہ ''خدا نے سائنسدانوں کو غلطی سے مبرا پیدا نہیں کیا، علماء کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے بعد آنیوالوں کے فائدے کیلئے اپنے پیش روؤں کے کام کی اصلاح کریں۔ لیکن سائنس میں سر کھپانے کا فائدہ کیا؟ ''حقیقت'' اس کا کہنا تھا'' کی جستجو ضروری ہے خواہ اس سے کوئی فائدہ نکلے یا نہ نکلے''۔

http://muftbooks.blogspot.com/

ابن بطوطہ (1304ء۔1368ء)

مشہور عرب سیاح اور ''رحلہ'' (سفر) کے نام کی معروف کتاب کا مصنف۔ ابن بطوطہ کے اپنے بیانات کے مطابق اس نے پچاس برس کے عرصہ میں کوئی 75 ہزار میل کا سفر طے کیا۔ اس نے تقریباً تمام مسلم ممالک نیز سماٹرا و جاوا اور شائد چین کی بھی سیر کی۔ اہل مغرب کو ابن بطوطہ کی تصنیف کا پتہ انیسویں صدی میں اس وقت چلا جب فرانس نے الجیریا پر قبضہ کر لیا۔

ابن بطوطہ طنجہ میں پیدا ہوا اور ان کا پورا نام ابوعبداللہ محمد ابن عبداللہ الواطی اللطنجی ابن بطوطہ تھا اور انہوں نے ادب اور قانون کے شعبوں میں بہت ساری تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ بعد ازاں یہ تعلیم ان کے بڑے کام آئی۔ وہ جس بادشاہ کے دربار میں بھی گئے ان کا بڑے عزت و احترام سے استقبال کیا گیا اور اس طرح انہیں اپنی سیاحتوں کے لئے کسی مالی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ وہ 1325ء میں حج کی نیت سے مکہ گئے جو مشرق قریب کے علماء سے حصول علم کی راہ میں ان کی پہلی منزل تھی۔ مکہ اور اس کے قرب و جوار میں کئی سالوں تک اکتساب علم کرنے کے بعد انہوں نے ایک بحری جہاز کے ذریعے افریقہ کے مشرقی ساحل کی سیاحت کی۔ وہ جنوب میں سفر کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچے جہاں آج کل ملک تنزانیہ آباد ہے۔ پھر انہوں نے خلیج فارس دیکھنے کیلئے شمال کا رخ کیا اور پھر 1332ء میں واپس مکہ چلے آئے۔ وہاں رہ کر انہوں نے دہلی کے سلطان محمد شاہ تغلق (1325ء۔1351ء) کے دربار میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا جو مسلم علماء پر اپنی سخاوت کیلئے مشہور تھا۔ اس سفر کے دوران انہون نے ترکی، روس، وسطی ایشیا اور پھر ہندوستان دیکھا۔

اس وقت تک ابن بطوطہ کو کچھ نہ کچھ شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ سلطان دہلی نے انہیں دہلی کے قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا جس پر وہ کئی برس تک فائز رہے۔ اس کے بعد وہ سلطان کے سفیر کی حیثیت سے چین کے دورے کو نکلے لیکن انہیں اپنے جہاز کی تباہی سمیت کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے وہ دو برس تک مالدیپ ہی میں رکے رہے۔ انجام کار وہ سیلون (سری لنکا) اور سماٹرا سے ہوتے ہوئے چین پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے بیجنگ تک سفر کیا لیکن بعض ماہرین کو ان کے اس دعوے سے اختلاف بھی ہے۔ وہ 1348ء میں مکہ اور شمالی افریقہ سے ہوتے ہوئے اپنے وطن طنجہ واپس آ گئے۔ ابن بطوطہ 1351ء میں مراکش لوٹے اور انہوں نے سلطان کی درخواست پر اپنی یادداشتیں شاہی کاتب کو لکھانا شروع کیں جس نے ان کی نثر کو گوٹہ لپہ لگایا اور شائد ان کی روداد کو بھی۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اس کے بعد مراکش کے ایک قصبے میں قاضی بن کر سکونت اختیار کر لی۔ ان کی سیاحتوں کے اسلوب اور

http://muftbooks.blogspot.com/

غیر معروف ثقافتوں اور معاشروں کے بارے میں ان کے گرانقدر مشاہدات کے پیش نظر ان کا موازنہ مشہور یورپی سیاح مارکوپولو سے کیا جاتا ہے۔

اگرچہ ان کے بعض بیانات پر شک وشبہے کا اظہار بھی کیا جاتا ہے، ان کی تصنیف ''رحلہ'' بحیثیت مجموعی ایک قابل اعتماد دستاویز تصور ہوتی ہے جو ہمیں اس زمانے کی اسلامی دنیا کے غیر معمولی باہمی اتصال کا بڑے قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع بہم پہنچاتی ہے۔

ابن خلدون (1332ء۔1406ء)

عرب دانشور اور مدبر۔ آپ تیونس کے ایک رئیس گھرانے میں پیدا ہوئے اور غرناطہ، فیض، تلیمکن، قاہرہ، مکہ اور مدینہ میں رہ کر کام کیا۔ ان کا زمانہ بہت بحرانی زمانہ تھا اور انھیں اپنے سیاسی عزائم کی وجہ سے کئی مرتبہ اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا پڑا۔ ابن خلدون کو تاریخ پر ان کی شاہکار کثیر جلدی تصنیف کی وجہ سے آج تک بڑے عزت واحترام سے یاد کیا جاتا ہے جس کا عنوان ''عربوں، غیر عربوں اور بربروں کے سیاسی واقعات کی ابتدائی اور موخر دور کی تاریخ کے اسباق و دستاویز کی کتاب ہے۔ ان کا شمار ان بہت سے مسلم مورخین میں ہوتا ہے جنہوں نے فارس، بازنطین اور مشرق قریب کی قدیم تہذیبوں کے علم اور داستان کو مجتمع کرتے ہوئے دنیا کی مفصل تواریخ قلمبند کیں۔

ابن خلدون دیگر مورخین کے ''روایت میں اندھے اعتماد'' پر جز بز اور اپنی بیان کردہ اشیاء کی وضاحت میں پیچاں وتاباں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریر میں شاہی خاندانوں پر خاص توجہ دی ہے جو ''جو افراد کی طرح ایک طبعی عرصہ حیات کے حامل ہوتے ہیں''۔ انہوں نے اس کی وجہ ''گروہی عصبیت'' بیان کی ہے جسے تین چہل سالہ نسلوں سے زائد وقت تک برقرار رکھنا مشکل ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ واقعات کی صحیح تفہیم انسانی معاشرے کے مختلف پہلوؤں کی سمجھ بوجھ کے بعد ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ انہوں نے معاشروں (مثلاً خانہ بدوش یا حضری) کی مختلف اقسام اور ان پر جغرافیے اور آب وہوا کے اثرات کی وضاحت کی کوشش کی۔ الغرض ان کی زیر بحث تصنیف انسانی تہذیب کے بارے میں کسی جامع نظریے کی تلاش میں سرگرداں نظر آتی ہے۔

اگر ابن خلدون کو ان کے پیش روؤں کے ساتھ رکھ کر ان کا تجزیے کی گہرائی کے اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو وہ ایک بہت ممتاز مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب کے مقدمے میں تاریخ ومعاشرت سے متعلق اپنے نظریات کا ایک مفصل خاکہ پیش کیا ہے، جسے مشہور انگریز

مورخ آرنلڈ جوزف ٹوائن بی (1889ء۔1975ء) نے ''انسانی معاملات کے بارے میں کہیں بھی کیے جانے والے تجزیوں میں سب سے جامع اور بصیرت افروز تجزیہ'' قرار دیا ہے۔ ابن خلدون نے تہذیب کے جن مختلف شعبوں کا معائنہ کیا آج کل ان کا مطالعہ تاریخ، عمرانیات، بشریات، لوک ثقافت، جغرافیئے، تاریخ سائنس، اطلاقی لسانیات، معاشیات اور سیاسیات جیسے علوم کے تحت کیا جاتا ہے۔

ابن رشد (1126ء۔1194ء)

مسلمان فلسفہ دان جو مغربی دنیا میں Averroes کے نام سے معروف ہیں۔ آپ 1126ء میں سپین کے شہر غرناطہ میں پیدا ہوئے اور آپ نے دین اسلام، یونانی حکمت اور طب کی تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے قاضی اور طبیب کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے مختلف شعبوں سے متعلق متعدد طبع زاد تصانیف اور تبصرے رقم کیے۔ انہوں نے بہت روشن خیال حکمرانوں کی سرپرستی میں کام کیا لیکن 1195ء میں انہیں جلا وطن کر دیا گیا کیونکہ اس وقت کے خلیفہ اور اس کے معتمدین کا خیال تھا کہ فلسفہ ایک خطرناک شے ہے۔ انہیں ان کی عزت و مرتبت کہیں موت سے تھوڑا عرصہ قبل جا کر واپس ملی۔

ابن رشد نے عقل اور مذہب کے دیرینہ مسئلے پر کام کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ حقیقت تین وسیلوں یعنی ثبوت، استدلال اور فصاحت سے دوسروں تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ ابن خلدون کے مطابق پہلا طریقہ سب سے زیادہ صحیح ہونے کی بنا پر بہترین ہے لیکن منطق اگر ایسے افراد کو سکھانے کی کوشش کی جائے جو اسے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو یہ خطرناک ہے کیونکہ یہ انسان کے ذہن میں تشکیک و الحاد پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔ لہٰذا عامۃ الناس کیلئے ویسے بیانات زیادہ مناسب ہیں جیسے کہ قرآن مجید میں شامل ہیں۔ لیکن اگر قرآن کے لغوی مفاہیم منطقی طریقوں سے حاصل شدہ نتائج سے متصادم ہوں تو فلسفیوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کلام اللہ کی مجازی تعبیر سے کام لے سکتے ہیں۔ مشہور مسلمان فقیہہ اور عالم دین الغزالی (1038ء۔1111ء) نے اپنی کتاب ''فلسفے کے تضادات'' میں فلسفے کے خلاف جو بے حد الزام تراشیاں کیں ہیں، ابن رشد نے ان کا جواب اپنی تصنیف ''تضادات کے تضادات'' (80-1079ء) میں دیا جس میں انہوں نے الغزالی کے دلائل کا تیا پانچا کر کے رکھ دیا۔

ابن رشد یونانی فلسفی ارسطو (384ق م۔322 ق م) کے بہت بڑے حامی تھے اور انہوں نے اس کی منطقی سائنسی، مابعد الطبعیاتی اور تنقیدی تحریروں پر بڑے بھرپور اور مفصل تبصرے

تحریر کئے ہیں۔ یورپی دانشوروں کو تیرہویں صدی میں انہی تبصروں کے لاطینی تراجم کے طفیل ہی ارسطو کو دوبارہ دریافت کرنے کا موقع ملا۔ سچی بات یہ ہے کہ سولہویں صدی تک مغرب میں ارسطو کی جو تحریریں سب سے زیادہ استعمال کی جاتی رہیں، وہ لاطینی میں براہ راست ترجموں سے حاصل ہونے والی تحریریں نہیں بلکہ عربی سے لاطینی میں کئے گئے تراجم تھے جن کے ساتھ ابن رشد کے تبصرے لف ہوتے تھے۔

ابن سینا (980ء۔1037ء)

ایک اہم مسلم فلسفی اور طبیب۔ ابن سینا کو مغربی دنیا میں ان کے لاطینی نام Avicenna سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ بخارا میں پیدا ہوئے جو اس وقت ایران کے ساتھ تھا۔ وہ بچپن سے بہت ذہین فطین تھے۔ وہ خود بتاتے ہیں کہ وہ چودہ سال کی عمر میں اپنے مدرسین کی تدریس کیا کرتے تھے۔ وہ سولہ کی عمر میں ایک جانے پہچانے طبیب اور بائیس سال کی عمر میں وزیر بن چکے تھے۔ وہ تمام معلوم شعبوں میں اپنے بے کنار علم کی وجہ سے مشہور تھے، کچھ لوگ ان کے غیر مقلدانہ عقائد کی بناء پر انھیں برا سمجھتے تھے اور نیم حکیم قسم کے دانشوران کی طنز سے خوفزدہ تھے۔

ایک فلسفی ہونے کے ناطے انہوں نے وحی اور یونانی فلسفے کی عقل پرستی کے مابین مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ عقلیت کے نظریے کے مطابق استدلال خود علم کا ایک ایسا منبع ہے جو حسی ادراک سے برتر بھی ہے اور خود مختار بھی، لہٰذا اسے مذہبی صداقت کے ثبوت کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔ ابن سینا نے پلوٹینس کے الوہی ظہور کے اصول سے استفادہ کر کے صداقت، بشمول وحی، کی شعوری تفہیم کیلئے نظام عالم کے ارسطا طالیسی نظریے میں جگہ ڈھونڈ لی تھی۔ ابن سینا کے مطابق ذات لازم یعنی خدا ایک روح پیدا کرتا ہے جو وجود میں آ کر ایک اور روح کو جنم دیتی ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح دسویں روح جسے عقل فعال کہتے ہیں اور جو زمین دنیا کو چلاتی ہے، تک چلتا رہتا ہے۔ روح انسان بشرطیکہ یہ منطق اور محنت دونوں سے متصف ہو تو یہ عقل فعال کے ساتھ واصل ہو کر علم حقیقی حاصل کر سکتی ہے۔ ابن سینا کے حقیقت کے براہ راست عارفانہ ادراک کے نظریے نے موخر اسلامی فکر پر بہت اثرات مرتب کیے۔ ان کے منطقی اور مابعد الطبعیاتی نظریات ان یورپی فلسفیوں کے لئے بہت پرکشش ثابت ہوئے جو مسلمان دانشوروں کی طرح مذہب اور منطق کو قریب لانے کی کوششوں میں مصرف تھے۔

خسرے اور چیچک کی تشخیص کرنے والے مسلم طبیب رازی (وفات 925ء) اور دوران خون کی وضاحت کرنے والے ابن النفیس (وفات 1288ء) کی طرح ابن سینا کا بھی طب کی

تاریخ میں بڑا نام ہے۔

ابن سینا نے طب کے موضوع پر بہت سی تحریریں قلمبند کیں جن میں طبی معلومات کا ایک مجموعہ شعری صورت میں بھی موجود ہے۔ان کی سب سے مشہور تصنیف ''القانون فی الطب'' ہے جو500 سال تک مشرق ومغرب کی دانشگاہوں میں پڑھائی جاتی رہی۔اس میں صحت وعلاج کے عام اصول، مختلف جڑی بوٹیوں کے طبی خواص، مختلف نظاموں کی مرضیات اور بیماریوں (بشمول عشق روگ) کی تشخیصی معلومات اور زخموں کے علاج کے بارے میں ہدایات شامل ہیں۔ القانون کا کلی یا جزوی طور پر ستاسی مرتبہ ترجمہ کیا گیا (اکثر لاطینی میں) اور اسے یونیورسٹیوں میں سترہویں صدی تک پڑھایا جاتا رہا ہے۔

ادب

بنیادی طور پر یہ ایک عربی لفظ ہے جس کے متعدد مفاہیم ہیں اور یہ مفاہیم زمانے کے ساتھ بدلتے بھی رہے ہیں۔کہیں اس کا مطلب تعظیم وشائستگی بنتا ہے تو کہیں شعروتصنیف۔دسویں صدی کے کسی عرب یا فارسی شخص کے لیے باادب ہونے سے مراد یہ تھی کہ کوئی شخص شاعری، ضرب الامثال اور بدوی عربوں کی تاریخ سے شناسا ہے، اسے عربی زبان پر عبور حاصل ہے اور وہ فارسی بادشاہوں اور یونانی حکماء کے اقوال سے متعارف ہے بلکہ یہ بھی کہ اسے پیراکی اور پولوکھیلنا آتی ہے۔اس مفہوم میں ادب کا مطلب تھا ''شائستگی''۔یہ ایک ایسا تصور تھا جس سے قرون وسطیٰ کی اسلامی دنیا میں مراد بعض پیشوں اور سماجی تعاملات کے لیے ضروری علم اور مہارت کا حاصل ہونا تھا۔مثال کے طور پر افسروں کے آداب پر کتب تحریر کی جاتی تھیں۔آداب سے شناسا افراد کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ ان کی پرورش اچھے ماحول میں ہوئی ہے۔افراد کے اطوار وفضائل ان کی صلاحیتوں میں اظہار پاتے تھے اور ان میں اہم ترین صلاحیت اس ادب کی سمجھی جاتی تھی جسے انگریزی زبان میں literature کہتے ہیں۔لہٰذا ادب میں 'علمیت' اور 'اچھی عادات' دونوں آجاتے تھے۔کلاسیکی عہد میں یہ اصطلاح ایک خاص ادبی صنف کے لیے بھی استعمال کی جانے لگی۔عرب دنیا میں کتابوں کو تفنن طبع اور دینوی تعلیم کے حصول کے لیے آٹھویں صدی میں استعمال کیا جانے لگا اور اسی روش سے ادب کا وہ مفہوم ماخوذ ہے جس سے literature مراد لی جاتی ہے۔اس میں کاتبین کا کردار اہم ہے۔ان کے سرکاری مناصب کا تقاضہ ہوتا تھا کہ وہ ایک صاف اور شستہ نثری اسلوب کے حامل ہوں اور ان کے فارسی پس منظر میں ان ادبی مخاذن سے واقفیت بھی شامل ہوتی تھی جن سے عرب لوگ آشنا نہیں ہوتے تھے۔معروف کاتب ابن المقفہ

http://muftbooks.blogspot.com/

نے کئی تصانیف فارسی سے عربی میں ترجمہ کیں جن میں حکایات کیشہرۂ آفاق کتاب 'کلیہ ودمنہ' بھی شامل ہے۔ ان حکایات کا ماخذ ہندی کتاب پنچ تنتر ہے جسے 'حکایات بدپائی' بھی کہا جاتا ہے۔ قرون وسطیٰ میں لکھنے لکھانے کے معاملوں میں ادب کا سب سے زبردست خالق الجاحز (وفات 869ء) تھا۔ اس کا دادا ایک حبشی غلام تھا اور اس نے اپنے کام کا آغاز بغداد کی عباسی حکومت کی حمایت اور منطقی فلسفے کے دفاع میں پمفلٹ نویسی سے کیا۔ بعدازاں اس نے جو تحاریر قلمبند کیں وہ علمیت وذہانت کا شاہکار ہیں۔ ان تحاریر میں وہ اپنے قارئین کی مختلف دل چسپیوں کو موضوع بناتا ہے اور وہ انسانی کردار اور مادی ثقافت کی طرف توجہ سے متصف ہیں۔ اپنی تصنیف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے الجاحز خود کہتا ہے کہ ''آپ کی توجہ حاصل کرنے کے لیے وہ واحد طریقہ جو میں اختیار کرسکتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں اپنی کتاب کو زیادہ سے زیادہ پرکشش انداز میں پیش کروں۔'' یہاں وہ اپنے قارئین سے مذہبی وفلسفیانہ تنازعات، ضرب الامثال اور شاعری شامل کرنے کا بھی وعدہ کرتا نظر آتا ہے۔ اس کی ''کتاب الوحوش'' میں جانوروں کے بارے میں گراں قدر معلومات درج ہیں جنھیں وہ عام طور پر مکالمات وحکایات کی صورت میں پیش کرتا ہے گو اس کا اصل مقصد انسانوں کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ یعنی ان جانوروں کا نفسیاتی تجزیہ جنھیں الجاحز سب سے زیادہ مسحورکن خیال کرتا ہے۔

دیگر ادباء کی تحاریر بھی قرون وسطیٰ کے ادب سے خاص اسی بے حد تجسس اور بوقلموں تخیل کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس صنف میں ایسے لوگوں کے متعلق حکایات کے مجموعے شامل ہیں جنھیں کسی قطعی غیر متوقع نوع کی خوش بختی کے طفیل انتہائی خوفناک صورت حال سے بچالیا جاتا ہے۔ یا پھر جنت اور دوزخ کے سفر کا بیان ہے جس میں کہانیوں کے کردار ماضی کے مشہور لوگوں سے بات چیت کرتے نظر آتے ہیں۔ اس ادب کے زمرے میں جہاں گرد کرداروں اور بے نشاں منزلوں کے متلاشی افراد کی مہم جوئیوں سے متعلق وہ داستانیں بھی آجاتی ہیں جنھیں بڑی مکفیٰ اور مسجع نثر میں تحریر کیا جاتا تھا اور نرالے اور انوکھے لفظوں سے سجایا جاتا تھا اور جن میں بڑھ چڑھ کے لفظی کمالات کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔

ادرائیت

ایک فلسفیانہ اور مذہبی تحریک جس میں علم خفی کی قوت ناجیہ پر بحث کی جاتی ہے۔ ادرائیت کو انگریزی میں Gnosticism لکھا جاتا ہے جو یونانی زبان کے لفظ Gnosis سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ''علم'' ہے اور اس سے مراد ایسا علم ہے جو سالک کو عام آدمی سے ممیّز کرتا ہے۔ تاہم

اس اصطلاح کا استعمال ہمیں جدید دور کے دانشوروں کے ہاں ہی ملتا ہے اور اس میں بہت سے مکاتب آ جاتے ہیں۔ تحریک ادرائیت دوسری صدی عیسوی میں یونانو رومن عہد میں اپنے عروج پر پہنچی اور ابتدائی دور کی عیسائیت کی حریف بنی جس کے علماء اس کے استرداد میں لکھتے رہے۔ اگر چہ ادرائیت سے منسوب گروہ کئی اور مختلف تصورات کے حامل ہیں، کچھ عناصر ایسے ہیں جو ان سب میں مشترک ہیں مثلاً اندھیرے اجالے کے ثنوی نظام، خیر کے عالم روحانی اور شر کی مادی دنیا اور ایک خدائے برتر اور دنیا تخلیق کرنے والی ایک کمتر طاقت (جو کہ بعض اوقات بدی کے روپ میں ہی سامنے آتی ہے) کا تصور آپ کو قریب قریب سب جماعتوں میں ملے گا۔

ادرائیت کی ایک خاص الخاص بات ایک تہہ دار تہہ اور پراسرار نظام کائنات کا عقیدہ ہے۔ ادرائیہ علماء کی فکر میں ''دانش'' کی دیوی سوفیہ کو بہت نمایاں حیثیت حاصل تھی جس نے اس دنیا میں آ کے بدی کے فرشتے پیدا کیے۔ ادرائیوں کے ہاں ایک ازلی انسان کا تصور بھی ملتا ہے جو یہ دنیا بننے سے پہلے بھی موجود تھا اور جو ظلمت سے جنگ کیلئے دنیا میں تشریف لایا۔ اس نظام فکر کے مطابق یہی ازلی انسان برائی کی ان طاقتوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد کہ جنہوں نے اسے شکست دی تھی ''سوتر'' یا ناجی'' کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ وہ اپنے لیے بھی نجات حاصل کرتا ہے اور ادرائی سالک کیلئے بھی۔ ادرائی علم حاصل کر کے اور دنیائے دلی سے چھٹکارا پا کر خود کو خدا کے قریب لانے اور اپنے اندر ذات باری کا عرفان حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کیش کی چھاپ ہمیں بہت سے موخر روایتی اور متصوفانہ مذاہب پر بھی نظر آتی ہے۔ قبالہ یہودیت کے توسط اس نے عیسائیت کی صورت گری میں بھی بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ بائبل کی تالیف، مختلف مسالک اور پوپیت سمیت کیتھولک چرچ کے بہت سے ادارے ادرائیت کے ردعمل کے نتیجے میں ہی معرض وجود میں آئے۔

ارانی، یانوش (1817-1882)

ہنگری نژاد رزمیہ شاعر۔ وہ ہنگری کے ایک مقام سالونٹا کے ایک غریب کسان گھرانے میں پیدا ہوئے جس کا تعلق عیسائی کیلونسٹ مسلک سے تھا۔ انھوں نے اپنی تعلیم کا آغاز ڈیبریٹسن سے کیا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد تعلیم ادھوری چھوڑ کر سفری اداکاروں کے ایک گروپ میں شامل ہو گئے۔

شاعر کی حیثیت سے ارانی کا پہلا اہم کام ٹولڈی (1847) تھا جسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس رزمیہ داستان میں چودھویں صدی کو دکھایا گیا ہے اور ایک انتہائی طاقتور نوجوان ٹولڈی

کی مہمات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ انھوں نے یہ کردار سولھویں صدی کے ایک شاعر پیٹر ابوسوائی سیلیمز سے لیا تھا۔ ارانی نے اس رزمیہ کے لیے سادہ اور عام فہم زبان اور اسلوب استعمال کیا جو شائع ہوتے ہی اہل ہنگری کے دلوں میں اتر گئی جو پہلے ہی اپنی قومی ادب کے منصۂ شہود پر آنے کے انتظار میں تھے۔ یہ رزمیہ ہنگری کے مشہور شاعر سانڈور بیٹوفی کو بھی بہت اچھی لگی۔ اس نے ارانی کی تعریف میں ایک نظم بھی لکھی اور دونوں شاعر بہت قریبی دوست بن گئے۔

ارانی نے 1848ء میں ہنگری کے انقلاب میں بھی حصہ لیا۔ وہ کسانوں کے ایک سرکاری اخبار کی ادارت کرتے رہے لیکن جب انقلاب ناکام ہوگیا تو وہ پیشۂ تدریس کے ساتھ منسلک ہوگئے۔ اسی دوران انھوں نے اپنی رزمیہ کا دوسرا حصہ ''ٹولڈی کا معاشقہ'' مکمل کیا۔ انھوں نے اس کا تیسرا جزو تولڈی کی شام، 1854ء میں مکمل کیا جس میں ٹولڈی اور بادشاہ کے درمیان معاندت کا حال بیان کیا گیا ہے جو بالآخر اس کی موت پر منتج ہوتی ہے۔ ارانی نے 1851ء سے لے کر 1860ء تک ناگی کروس میں کلاسکس اور لغت ہنگری کے استاد کی حیثیت سے کام کیا۔ 1858ء میں وہ ہنگیرین اکیڈیمی کے لیے منتخب ہوئے اور ایک ادبی جرید Szepirodalmi Figyelo (جو بعد میں Koszoru کے نام سے معروف ہوا) کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگے۔

اگرچہ ''ٹولڈی'' کو ارانی کی اہم ترین تخلیق مانا جاتا ہے، اس نے بعض دیگر اہم تحاریر بھی قلمبند کیں۔ 'بیوقوف سٹیفن' 1850ء میں شائع ہوئی۔ اس میں تلخ دروں بینی کے ساتھ مزاح کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ 'شاہ بودا کی قوت' 1864 میں شائع ہوئی اور اس میں ہنگری کے قبل از تاریخ دور کو موضوع بنایا گیا ہے۔ وہ 'ٹولڈی' کی طرح اس نظم کے بھی تین حصے لکھنا چاہتے تھے لیکن وہ اسے مکمل نہ کر سکے۔ وہ رزمیہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بعض دوسری اصناف سخن میں بھی طاق تھے اور اس کے علاوہ ایک بلند پایہ مترجم بھی تھے۔ انھوں نے شیکسپیئر، گوئٹے اور ارسٹوفینز جیسے مشاہیر کی تخلیقات پر کام کیا۔ ان کے کلام پر غم والم کا عنصر غالب ہے۔

ارتھ شاستر

قدیم دور میں لکھی جانے والی سیاسی امور پر مشہور ہندوستانی تصنیف۔ سنسکرت زبان میں ارتھ شاستر کا مفہوم ہے 'مادی فائدے کا علم' یہ 15 عنوانات میں منقسم ہے اور ہر عنوان آگے 150 ابواب پر مشتمل ہے۔ ارتھ شاستر میں مرکزی حکومت کے تحت چلائی جانے والی ایک چھوٹی ریاست کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یہ بادشاہ کے صحیح منصب و کردار کا تعین کرتی ہے، وزراء کے

انتخاب کے لیے معیارات پیش کرتی ہے، جنگ وجدل کے معاملے میں رہنمائی کرتی ہے اور نظم ونسق برقرار رکھنے کے لیے جاسوسی کے ایک فعال نظام کے استعمال کا مشورہ دیتی ہے۔

اکثر محققین کا خیال ہے کہ اس کتاب کا بنیادی مصنف کوٹلیہ ہے (جسے وشنوگپت یا چانکیہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے) جو راجہ چندرگپت کا وزیر تھا لیکن بعض افراد نے اس سلسلے میں تشکیک کا اظہار بھی کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ قرین قیاس محسوس نہیں ہوتا کہ سارے کے سارے ابواب اس نے خود اپنے ہاتھ سے تحریر کیے ہوں۔

خیر بات جو بھی ہو، ارتھ شاستر نے ہندوستان کے علم ملک بانی کی نشوونما پر بہت دوررس اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس کا موازنہ اکثر اوقات بعض مشہور مغربی تصانیف مثلاً افلاطون کی 'جمہوریہ' اور میکاولی کی 'راجہ' سے بھی کیا جاتا ہے۔

پانچویں صدی کے ڈرامہ نگار وساکادت نے اپنے کھیل مدراکشس میں کوٹلیہ اور اس کے بادشاہ کے مابین تعلق پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی۔ اس ڈرامے کے مطابق کوٹلیہ نے راجہ نند کی شکست اور ہلاکت میں کلیدی کردار ادا کیا تھا تاکہ موریہ سلسلے کے بانی چندرگپت (تخت نشینی 322ق م) کو تخت پر بٹھایا جاسکے۔

اردو

پاکستان کی قومی زبان۔ اردو ایک ہند آریائی زبان ہے جس کا آغاز دہلی کے قریب کی دریائی وادی میں ہوا۔ یہ پاک و ہند کے مسلمانوں کی سب سے بڑی زبان ہے۔ تاہم شاید یہ پاکستان کے مقابلے میں بھارت کے زیادہ گھرانوں میں بولی جاتی ہے۔ موجودہ دور میں اردو بولنے والے افراد کی تعداد پچاس ملین سے زائد ہوگی۔

اردو اور ہندی کا بول چال کا انداز اور ان کے صرف ونحو میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے لیکن ہندی کی بعض ادبی اصناف ایسی ہیں جنہیں اردو والے نہیں سمجھ سکتے اور اردو کی بعض اصناف کو سمجھنا ہندی والوں کیلئے مشکل ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ دونوں گروہوں نے مختلف قسم کے ثقافتی اثرات قبول کیے ہیں۔ ہندی پر سنسکرت کے اثرات غالب ہیں جبکہ اردو نے عربی و فارسی کا اثر زیادہ قبول کیا ہے۔ اردو عربی و فارسی طرز کے رسوم الخط یعنی نسخ و نستعلیق وغیرہ میں تحریر کی جاتی ہے۔

اردو ادب نے سولہویں اور سترہویں صدی کے دوران جنوبی ہند کی ریاستوں گولکنڈہ اور بیجاپور میں نمو پائی جہاں کے قلی قطب شاہ (1581ء۔1611ء) جیسے مسلم فرمانروا خود بھی شاعر

http://muftbooks.blogspot.com/

تھے اور وہ شاعروں کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ اس دور کی تحریریں ہندوستانی اور فارسی موضوعات کا مرکب تھیں جن میں پراکرت، دراوڑی، فارسی اور عربی الفاظ کا آزادانہ استعمال کیا جاتا تھا۔ اس دکنی دور میں زیادہ تر مثنویاں اور رزمیہ نظمیں لکھی گئیں۔ اردو کا کلاسیکی دور سولہویں صدی میں شروع ہوا اور 1857ء میں ہندوستان کی باگ ڈور مکمل طور پر انگریزوں کے ہاتھ میں جانے تک قائم رہا۔ اس دور میں غزل کو غلبہ حاصل رہا۔ سترہویں صدی کے آخر تک اردو شاعری کا مرکز مزید آگے شمال کی طرف یعنی اورنگ آباد منتقل ہو چکا تھا جہاں کے ممتاز شعراء میں ولی محمد دکنی (1667ء۔ اندازاً 1725ء) اور سراج الدین سراج (1715ء۔1763ء) کا نام آتا ہے جنہوں نے اپنا کلام فارسی اسلوب میں لکھا۔

1858ء میں مغلیہ سلطنت کے خاتمے اور برطانوی حکومت کے قیام کے بعد اردو ادب نسبتاً زیادہ مقامی رنگ اختیار کر گیا۔ آئندہ ستر برس تک اردو ادیب اور ادب کی توجہ زیادہ تر مذہبی و سیاسی اصلاح کی جانب رہی۔

حضرت علامہ اقبال (1877ء۔1938ء) کو اردو کا اہم ترین شاعر تصور کیا جاتا ہے۔ انہیں مفکر پاکستان اور مصور پاکستان کے القابات سے بھی یاد کیا جاتا ہے، اگرچہ انہیں ان کے خواب کے شرمندہ تعبیر ہونے سے پہلے ہی اجل نے آلیا۔ اقبال کے کلام کا موخر حصہ زیادہ تر اردو منظومات پر مشتمل ہے جس میں انہوں نے سیاسی جدوجہد، عشق و جذب، ملائیت، استعماریت اور مساوات جیسے موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔

1936ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ اس تحریک نے سماجی حقیقت نگاری اور ترقی کا نعرہ لگایا جس سے فیض احمد فیض (1911ء۔1984ء) جیسے عظیم شعرا اس کی طرف کھنچے چلے گئے۔ اس تحریک میں ضعف 1947ء میں ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے بعد دیکھنے میں آیا۔ اس کے ساتھ ہی جدیت منظر عام پر آنا شروع ہوگئی جس میں صوری تجربے، انفرادی نفسیات اور سماجی معاملات پر زور دیا گیا۔ اردو کے دور جدید کے شعرا میں ن م راشد (1910ء۔ 1975ء) اور میراجی (1912ء۔1949ء) کا نام نمایاں ہے۔

بیسویں صدی کے وسط میں افسانے کی صنف نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ سعادت حسن منٹو (1912ء۔1955ء) راجندر سنگھ بیدی (1915ء۔1984ء) اور عصمت چغتائی (پیدائش 1915ء) کا نام بہترین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔ جہاں تک اردو ناول کا سوال ہے تو اس میں شاید قرۃ العین حیدر (1928ء۔2007ء) کے مقابلے کا کوئی بھی لکھاری ابھی

http://muftbooks.blogspot.com/

پیدا نہیں ہوا۔ ان کا ناول ''آگ کا دریا'' نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی ہے۔

اسلام

یہودیت اور عیسائیت کی طرح ایک بڑا الہامی مذہب جس کی بنیاد عقیدہ توحید ہے۔ عربی میں ''اسلام'' کا مطلب ''اطاعت'' ہے۔ اسے ''اسلام'' کا نام اس لئے دیا گیا ہے کہ اس میں داخل ہونے کے بعد انسان کو رضائے خداوندی کے آگے مکمل اطاعت اختیار کرنا پڑتی ہے۔ دین اسلام قبول کرنے والے لوگ مسلمان یا مسلم کہلاتے ہیں جس کا مفہوم ''اطاعت کرنے والے'' ہے۔

اسلام دنیا میں رسول خداﷺ (571ء۔632ء) کی ذات با برکات کے توسط سے متعارف ہوا ان پر پہلی وحی 610ء میں خدا کے فرشتے جبرئیل کے ذریعے نازل کی گئی جس پر انہوں نے اپنی نبوت کا اعلان کیا۔ بعد ازاں ان وحیوں کو مجتمع کر کے قرآن پاک کی شکل دے دی گئی۔ یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ یہ تینوں مذاہب ایک ہی بنیادی دین کی مختلف شکلیں ہیں اور اسلام ان سب میں سے آخری، حتمی اور کامل ترین دین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ جیسے بہت سے انبیاء جو یہودیوں اور مسیحیوں کیلئے محترم ہیں، انہیں اسلام میں بھی بڑی عزت واحترام سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ پیغمبر مختلف وقتوں میں خدا کا پیغام لے کر دنیا میں آئے تاکہ انسانوں کو سیدھا راستہ دکھایا جا سکے۔

خاتم النبین حضرت محمدﷺ نے اپنے سے پہلے آنے والے انبیاء کرام کے پیغام کی تجدید کی اور دنیا کو ایک نیا مذہبی وسماجی نظام دیا جو آٹھویں صدی کے اوائل میں جزیرہ عرب سے نکل کر ایشیا، مشرق وسطیٰ اور افریقہ تک جا پہنچا اور اس کا یہ سفر آج تک جاری ہے۔ قرآن کریم میں یہودیوں اور عیسائیوں کو ''اہل کتاب'' کہا گیا ہے اور مسلمانوں کو ان کے ساتھ عزت وتکریم سے پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن میں بصراحت بیان کیا گیا ہے کہ ''دین میں کوئی جبر نہیں'' لہٰذا عموماً مسلمانوں نے کسی کو بھی زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش نہیں کی۔

اسلام کے پانچ بڑے ارکان ہیں جن کی ادائیگی ہر عاقل وبالغ مسلمان پر فرض ہے۔ ان میں سے پہلا کلمہ شہادت، دوسرا نماز، تیسرا روزہ، چوتھا حج اور پانچواں زکوٰۃ ہے۔ کلمہ شہادت اللہ رب العزت کی وحدانیت اور محمدﷺ کے آخری نبی ہونے پر ایمان کا اقرار ہے اور یہ کلمہ پڑھ کر انسان دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کے لئے دن میں پانچ مرتبہ باوضو ہو کر نماز ادا

http://muftbooks.blogspot.com/

کرنا بھی فرض ہے۔ پہلی نماز پو پھٹنے سے ذرا قبل، دوسری دوپہر کے وقت، تیسری سہ پہر کو، چوتھی شام کے آغاز پر اور پانچویں شام کا اندھیرا چھا جانے پر پڑھی جاتی ہے۔

روزے اسلامی سال کے نویں مہینے یعنی رمضان میں رکھے جاتے ہیں۔ روزہ بھی ایک بالغ اور صحت مند شخص پر فرض کیا گیا ہے جس کے دوران اسے پو پھٹنے سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے سے اجتناب کرنا ہوتا ہے۔ حج ایک صاحب حیثیت مسلمان پر زندگی میں ایک بار فرض ہے جس کیلئے اسے سعودی عرب کے شہر مکہ مکرمہ کا سفر اختیار کرنا ہوتا ہے اور وہاں پہنچ کر بعض مناسک ادا کرنا ہوتے ہیں۔ حج کے موقع پر طواف کعبہ سب سے بنیادی چیز ہے لیکن حضرت ابراہیمؑ، ان کی اہلیہ ہاجرہ اور ان کے فرزند حضرت اسماعیلؑ کی سنت کی پیروی میں بعض دیگر رسوم بھی ادا کی جاتی ہیں۔ زکوٰۃ کا مطلب اپنے جمع شدہ مال واسباب سے ایک مقررہ حصہ غریبوں اور حاجت مندوں میں تقسیم کرنا ہے۔ یہ انفرادی اور اجتماعی عبادتیں مسلمانوں کی زندگیوں کی صورت گری کرتی ہیں اور انہیں ایک امت کے رشتہ میں پرو دیتی ہیں۔

اسلام نے شروع دن سے بڑی تیزی سے پھیلنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے مختلف اسباب بیان کے جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس دین کے اصول بہت سادہ اور وعدے بہت واضح ہیں۔ اسلام افریقہ سے لے کر یورپ تک پوری دنیا پر چھا چکا ہے اور اس کے ماننے والے دنیا کے ہر گوشے میں پائے جاتے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ایک ارب ستاون کروڑ کے قریب ہے۔

اشوک اعظم (انتقال اندازاً 232 قبل مسیح)

موریہ سلسلے کا ہندوستانی شہنشاہ جس کا پایۂ تخت موجودہ پاکستانی شہر ٹیکسلا کے مقام پر واقع تھا۔ اشوک موریہ خاندان کا آخری بڑا بادشاہ تھا اور اس کے بارے میں بیشتر معلومات چٹانوں اور لاٹھوں پر کندہ تحریروں کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں۔ اس نے 260 تا 232 قبل مسیح تک حکومت کی۔ وہ بدھ مت کے عظیم پرچارک کے طور پر مشہور ہے۔ اس نے اس مذہب کی تعلیمات کو ہندوستان کے طول وعرض میں متعارف کرا دیا۔ کہتے ہیں کہ اس نے بدھ مت اپنی بادشاہت کے آٹھویں سال کالنگا کی تسخیر کے بعد احساس گناہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر اختیار کیا تھا۔

اس فتح کے بعد اشوک نے جنگ وجدل سے توبہ کر لی اور اپنی زندگی اور اپنی ریاست کا چلن دھرم (نیک زندگی کے اصول) کے مطابق ڈھال لیا اور بدھ مت کی تعلیمات کو انسانوں تک پہنچانے کا عہد کر لیا۔ اس نے تمام مذاہب کے احترام کی روش اختیار کی۔ وہ بدھ مت کی بات

صرف اپنے ہم عقیدہ لوگوں سے کرتا تھا۔ وہ عدم تشدد، دیانت داری اور فیاضی کے اصولوں پر یقین رکھتا تھا اور اس کی رعایا کے لوگ دوسروں کے مسلک کو برا بھلا کہنے سے اجتناب کرتے تھے اور اپنے عقیدے اور تصورات کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔

اشوک نے اپنی ریاست میں بدھ مت کے اصولوں کے عملی اطلاق کی سعی کی اور اپنی رعایا پر تحکم و رعونت کی بجائے صلح و اتفاق سے حکمرانی کی۔ اس کے مقرر کردہ حکام عوام کے صحیح خادم بن کر غریبوں محتاجوں اور بے سہارا افراد کی مدد اور دادرسی کی کوشش کرتے تھے۔ اشوک رعایا کا حال جاننے اور ان کی فلاح کے کاموں کا جائزہ لینے کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں بذات خود دورے کرتا تھا۔ اس کے نائبین اور وزیروں کو بھی یہ حکم تھا کہ وہ اسے عوامی بھلائی کے منصوبوں کے بارے میں باخبر رکھیں۔

راجہ اشوک نے انسانی بھلائی، عوامی خدمت اور بدھ مذہب کے پرچار کو مرتے دم تک حرز جاں بنائے رکھا۔ وہ مذہبی حدود میں رہ کر تنازعات کو رفع دفع کرنے کی کوشش کرتا تھا اور بدھ مت کے پیروکاروں تک اس دھرم کی تعلیمات پہچانے کا اہتمام کرتا تھا۔ اس نے بہت سے سٹوپا اور بدھ خانقاہیں تعمیر کرائیں اور خود اپنے بچوں کو مبلغین کے طور پر سری لنکا بھیجا۔ اس نے جا بجا مسافر خانے، پانی کے تالاب اور انسانوں اور جانوروں کے لیے ہسپتال بنوائے۔ اگرچہ اشوک کے انتقال کے بعد اس کی بیشتر پالیسیاں ترک کر دی گئیں، مگر اس کی فیاضی اور مہربانیوں کی یادیں آج بھی زندہ ہیں۔

آگسٹس

عیسائی فلسفی۔ انھیں انگریزی میں سینٹ آگسٹین اور لاطینی زبان میں آریلیئس آگسٹینس کہا اور لکھا جاتا ہے۔ وہ شمالی افریقہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ عیسائی اور والد کافر تھا۔ انھوں نے لاطینی ادب کی تعلیم حاصل کی اور پھر روم اور کارتھیج میں فن بلاغت اور میلان میں مانیچی فلسفہ پڑھاتے رہے۔ انھیں میلان کے بشپ سینٹ امبروز سے دوستی کے طفیل نوفلاطونیت میں دل چسپی پیدا ہوئی اور پھر وہ عیسائیت کی طرف مائل ہو گئے۔ سینٹ امبروز نے انھیں 387 کو ایسٹر کے موقع پر بپتسمہ دیا اور پھر وہ افریقہ واپس چلے آئے جہاں انھوں نے خلوت اختیار کر کے مذہبی کتب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ انھیں 391ء میں پادری اور اس کے چار برس بعد ہپو کا بشپ بنا دیا گیا اگرچہ وہ اپنے علاقے سے بہت کم باہر جاتے تھے لیکن ان کا اثر ان کے مکتوبات کی وجہ سے بہت جلد ساری عیسائی دنیا میں پھیل گیا۔ ان میں سے 250 خطوط اب بھی موجود ہیں۔ اپنے

وعظوں کی طرح ان مکتوبات میں بھی آگسٹس اپنے دور میں مروج مانوی، پلیجی اور دوناتی عقیدوں کے مقابلے میں عیسائیت کی حمائت کرتے نظر آتے ہیں۔ ان مکتوبات میں ہمیں ان کا نظریہ تقدیر اور رحمت ایزدی بھی نمو پاتا دکھائی دیتا ہے جو بعدازاں رومن کیتھولک مسلک اور جان کیلون، مارٹن لوتھر اور جینسن پسندوں کی تعلیمات میں بہت اہمیت اختیار کر گیا۔ اگسٹس اپنی خودنوشت سوانح عمری 'اعترافات' کے لیے بھی بہت جانے جاتے ہیں۔ اس تحریر میں انھوں نے اپنے عیسائیت قبول کرنے کا حال بیان کیا ہے اور اس سے پہلے کی زندگی پر تاسف وملال کا اظہار کیا ہے جس کے دوران وہ بعض حسیناؤں کے دام زلف میں بھی گرفتار رہے۔ ان کی سب سے مشہور تصنیف 'شہر یزداں' ہے جس میں وہ بتاتے ہیں کہ عیسائیت کس طرح ایک نئے سماجی نظام کا ماڈل فراہم کر سکتی ہے۔ بعد میں انھوں نے ایک کتاب 'تردیدات' بھی لکھی جس میں انھوں نے قبل کے اپنے بعض نظریات میں تبدیلی وترمیم کی۔ اگسٹس 430 میں ہپو پر لیٹروں کے حملے میں مارے گئے لیکن ان کا نام اور کام عیسائیت کی دینیاتی نشوونما میں آج بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔

افلاطون (اندازاً 427 ق م۔ 347 ق م)

قدیم یونانی فلسفی۔ افلاطون ایتھنز کے ایک اشرافیہ گھرانے میں پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک شاعر کے طور پر کیا لیکن بعدازاں وہ حکیم سقراط (اندازاً 469 ق م۔ 399 ق م) سے میل جول کی وجہ سے فلسفے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ افلاطون کو سقراط کے شاگرد خاص کی حیثیت حاصل تھی، چنانچہ ہمیں افلاطون کی بہت سی ابتدائی تحریروں میں سقراط کی شخصیت جھلکتی نظر آتی ہے۔ ان تحریروں میں اپالجی، کریٹو اور چار مائیڈز نمایاں ہیں جنہیں سقراط کے خطبات یا اس سے مکالمات کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

افلاطون کے دوسرے تصنیفی عہد میں بھی سقراط کو نمایاں حیثیت حاصل ہے لیکن ان تحریروں میں سقراط کی بجائے افلاطون کے اپنے افکار و دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ ''جارجیاس''، ''پروٹاگورس''، ''فیڈو'' اور ''جمہوریہ'' کا تعلق افلاطون کے وسطی تصنیفی عہد سے ہے۔ ''جمہوریہ'' میں انصاف، شاعری اور سیاسی ارتقاء جیسے موضوعات پر بات کی گئی اور فلسفی بادشاہ کا فلاطونی تصور پیش کیا گیا ہے جسے وہ ایک مثالی حکمران کے طور پر پیش کرتا ہے۔ افلاطون کے اختتامی عہد کی تحریروں مثلاً ''سوفسٹ''، ''پولیٹیکس'' اور ''قوانین'' میں سقراط کو بطور ایک کردار سے زیادہ استعمال نہیں کیا گیا لیکن ان میں بھی مکالمے کا اسلوب ہی اختیار کیا گیا ہے۔ ''قوانین'' افلاطون کی آخری کتاب تھی جس میں انہوں نے ''جمہوریہ'' کے بہت سے تصورات میں ترمیم کی۔

http://muftbooks.blogspot.com/

افلاطون کو فلسفیاتی عینیت کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق حقیقت بنیادی طور پر مجرد و مطلق کلیات پر مشتمل ہوتی ہے جنہیں وہ تصورات قرار دیتے ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ صرف جدلیاتی مشن یا فلسفیانہ تحقیق سے ہی حقیقی علم تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ان افکار کا خاکہ افلاطون کی بہت سی تصانیف میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ تصانیف اس قدر مہارت سے تحریر کی گئی ہیں کہ ان کی وجہ سے افلاطون کا شمار یونانی نثر کے عظیم ترین انشاء پردازوں میں ہوتا ہے۔ افلاطونی افکار نے یہودیت اور عیسائیت کے مذہبی عقائد، نیز قدیم روم کے فلاسفہ، یورپی نشاۃ ثانیہ اور سترہویں صدی کے انگلستان پر بہت زیادہ اثرات مرتب کئے۔

اقبال، سر محمد (1877ء۔1938ء)

شاعر اور فلسفی۔ انہیں ترجمان حقیقت، حکیم الامت اور مفکر پاکستان کے القابات سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ وہ پنجاب کے شہر سیالکوٹ کے ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نور محمد صاحب ٹوپیاں سی کر گزر اوقات چلاتے تھے۔ ان کے استاد مولوی میر حسین بڑے بلند پایہ عالم تھے۔ اقبال نے ایم اے تک کی تعلیم گورنمنٹ کالج لاہور سے حاصل کی اور پھر اعلیٰ تعلیم کیلئے 1905ء میں یورپ چلے گئے۔ وہ 1908ء تک وہاں رہے جس کے دوران انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفے کی ڈگری حاصل کی، لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند لی۔

اقبال وطن واپسی پر پہلے کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی ادب پڑھاتے رہے اور پھر انہوں نے وکالت شروع کر دی، اقبال نے بحیثیت شاعر زمانہ طالب علمی میں ہی شہرت حاصل کرنا شروع کر دی تھی۔ یورپ میں قیام کے دوران ان کے فکر و فن میں تبدیلیاں رونما ہوئیں اور جب وہ واپس آئے تو انہوں نے قومیت اور مغربی تہذیب پر تنقید شروع کر دی۔ اقبال کے دل میں غلامی میں جکڑی ہوئی اپنی قوم کی بے بسی کا بڑا درد تھا۔ انہوں نے مسلمانان ہند کو اسلام کے شاندار ماضی کی جھلک دکھا کر ان کے جسد مردہ میں جذبے کی ایک نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔

ان کی مشہور فارسی منظومات ''اسرار خودی'' اور ''رموز بیخودی'' بالترتیب 1915ء اور 1918ء میں شائع ہوئیں جن میں اقبال نے نفی ذات کے فلسفے پر کڑی تنقید کی۔ اس پر کئی لوگوں نے اقبال کے خلاف اعتراضات شروع کر دیئے۔ بعد ازاں انہوں نے اپنے فارسی کلام کے تین اور مجموعے شائع کئے۔ ''پیام مشرق'' 1923ء میں جرمن شاعر گوئٹے کے دیوان کے

http://muftbooks.blogspot.com/

جواب میں لکھا گیا۔1927ء میں غزلوں کا مجموعہ ''زبورعجم'' شائع ہوااور1932ء میں ان کی شاہکار تخلیق ''جاوید نامہ'' شائع ہوئی۔ جاوید نامہ جس میں اطالوی شاعر دانتے کی طویل نظم ''ڈیوائن کامیڈی'' کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے،ایک شاعر مولانا رومی کی رہنمائی میں فکر و تجربے کی تمام منزلوں میں سے گزرتا ہوا عالم بالا تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

اقبال کو اگر بیسویں صدی کا اردو کا عظیم ترین شاعر کہا جائے تو اس میں کوئی مبالغے والی بات نہیں ہوگی۔اقبال نے اپنے سیاسی وفلسفیانہ افکار کو صرف اپنی شاعری تک ہی محدود نہیں رکھا۔وہ اپنا پیغام اپنے خطبات کے ذریعے بھی لوگوں تک پہنچاتے رہے۔ان کی نثری کتاب ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' میں ان کے جدید اسلامی نقطہ نظر کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔اقبال بغداد پر منگول حملے کے وقت سے مسلم فکر پر طاری جمود کے خلاف بولتے نظر آتے ہیں۔اقبال نے لوگوں کے سامنے ایک ایسی ثقافتی دنیا کا خواب پیش کیا جو ملائیت اور ملوکیت دونوں سے پاک ہو۔ وہ تاریخ اور فطرت کے مطالعہ پر بھی بہت زیادہ زور دیتے محسوس ہوتے ہیں۔اقبال دین میں بھی جمود کے قائل نہ تھے۔وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اجتہاد سے کام لیتے ہوئے اپنے مذہب میں بھی اس طور کی تبدیلیاں پیدا کریں کہ جن سے ان کے افکار وعقائد جدید دنیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو جائیں۔اگر اشتراکیت کے تصور مساوات اور اس کے نسل پرستی اور ملوکیت کے استرداد کو سامنے رکھا جائے تو یہ نظام اسلام سے کافی قریب ہوتا محسوس ہوتا ہے۔اس لئے اقبال اشتراکیت کیلئے ایک نرم گوشہ رکھتے محسوس ہوتے ہیں۔تاہم وہ اشتراکیت میں مضمر مادیت اور اخلاقی و روحانی فقدان کے سبب اس سے متنفر بھی نظر آتے ہیں۔

اقبال کو1922ء میں سر کا خطاب ملا۔انہوں نے1930ء میں اپنا وہ مشہور خطبہ دیا جس میں انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کیلئے ایک الگ ریاست کا تصور پیش کیا تھا۔وہ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں اس ریاست کے حصول کی جدوجہد میں پیش پیش رہے اگرچہ وہ اپنے اس خواب کے شرمندہ تعبیر ہونے سے قبل ہی دنیا سے رخصت ہو گئے،ان کی قوم آج بھی انہیں مصور پاکستان کے نام سے یاد کرتی ہے۔ پاکستان میں ہر سال 28 جون کو یوم اقبال بڑے عزت و احترام سے منایا جاتا ہے۔

اہل کتاب

ایک قرآنی اصطلاح جو یہودیوں،عیسائیوں اور صابیوں یعنی رزتشت کے پیروکاروں کے لیے استعمال کی گئی ہے۔اسلامی عقیدے کے مطابق یہ تینوں مذاہب اپنے اپنے وقت کے اعتبار

سے سچے تھے اور ان سب کی اساس کتاب مقدس یعنی خدا کی وحی پر ہے۔ حضرت محمدؐ کی بعثت کے بعد جب اسلامی معاشرے کا قیام عمل میں آیا تو ان مذاہب کے ماننے والوں کو ذمی کا نام دیا گیا اور انھیں بعض ایسی رعائتیں دی گئیں جو کفار یا ذات خداوندی کے منکرین کو نہ مل سکیں۔ اسلامی معاشرے میں اہل الکتاب کو اپنے مذہب کے مطابق عبادت کی آزادی حاصل ہے اور انھیں کوئی گزند نہ پہنچانے کا حکم ہے۔ تاہم ذمیوں سے ایک خاص ٹیکس یعنی جزیہ لینے کا حکم ہے جس کے بدلے میں انھیں مسلم افواج میں عسکری خدمات کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیا جاتا ہے۔

حضرت محمدؐ نے اپنے عہد میں اسلامی ریاست میں بسنے والے غیر مسلم اہل کتاب کے عزت واحترام اور حق کا بہت خیال رکھا۔ آپؐ کی وفات کے بعد آنے والے خلفاء، ان کے جرنیلوں اور گورنروں کو بھی یہی تاکید کی گئی کہ وہ اسی پالیسی کو جاری رکھیں۔

مسلمان مردوں کو اہل الکتاب خواتین سے شادی کی اجازت ہے، اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو بھی، مگر اس طرح پیدا ہونے والے بچوں کی پرورش اسلامی طور طریقوں کے مطابق کرنے کا حکم ہے۔ ہاں اگر کوئی اہل الکتاب مرد کسی مسلمان عورت سے شادی کا خواہاں ہو تو اسے لازماً مسلمان ہونا ہوتا ہے۔

آج کے دور میں بیشتر اسلامی ملکوں کے قوانین میں اہل الکتاب کی الگ قانونی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔

البیرونی۔ابوریحان (اندازاً 973ء۔1048ء)

عرب عالم اور فلسفی۔ وہ بحرارال کے جنوب میں واقع خطے خوارزم میں پیدا ہوئے اور انھیں اپنے دور کے عظیم ترین دانشوروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ عربی میں لکھتے تھے لیکن انھیں ترکی، فارسی، سریانی، عبرانی اور سنسکرت پر بھی عبور حاصل تھا۔ انھوں نے ریاضی، طب، معدنیات، طبیعیات، تاریخ اور فلکیات جیسے موضوعات پر تصانیف قلمبند کی ہیں۔ تاریخ سے متعلق ان کی تحاریر میں قدیم اقوام کی تاریخ، اور 'تاریخ الہند' اور فلکیاتی تصانیف میں 'القانون' اور 'المسعودی' شامل ہیں۔ انھوں نے اپنے علم وفضل کے طفیل خوارزم، جرجان اور غزنی کے درباروں میں عزت پائی اور بحرارال سے لے کر ایران و ہندوستان تک مشہور ہوئے۔

البیرونی نے بہت زیادہ سیر وسیاحت کی اور قدیم ہند کے رہن سہن پر ایک انسائیکلوپیڈیا بھی لکھا۔ ان کی نامور مسلم فلسفی ابن سینا (980ء۔1037ء) کے ساتھ خط وکتابت بھی رہی۔ البیرونی کی تصانیف شاندار اسلامی علمی روایت اور پرشکوہ مسلم ثقافت کی آئینہ دار ہیں۔

http://muftbooks.blogspot.com/

الجبرا

ریاضی کی ایک شاخ جسے ازمنہ وسطیٰ کے مسلم دانشوروں نے فروغ دیا۔ آج کل یہ اصطلاح انگریزی میں عام استعمال ہوتی ہے لیکن بنیادی طور پر یہ عربی لفظ الجبر سے نکلی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لفظ پہلے پہل فارسی ریاضی دان الخوارزمی کی کتاب 'الجبر والمقابلہ' میں استعمال کیا گیا۔ جو لگ بھگ 825ق م میں لکھی گئی 'algorithim' بھی اسی ریاضی دان کے نام سے ماخوذ ہے۔ 'الجبر' کا مطلب کسی مساوات سے منفی اجزا کا اسقاط اور 'المقابلہ' کا مطلب مشابہ اجزا کا مجموعہ ہے۔ یہ دونوں تفاعلات الجبرے میں مرکزی حیثیت کے حامل ہیں۔

چونکہ اس وقت تک عربی اعداد کا استعمال شروع نہیں ہوا تھا۔ الخوارزمی کی مذکورہ بالا کتاب لفظی مسائل کا ایک بڑا مجموعہ نظر آتی ہے جس میں بہت سی اشکال بھی دیکھنے کو ملتی ہیں کیونکہ وہ بہت سی مساواتوں کو جیومیٹری کے طریقوں سے حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

الخوارزمی نے یہ کتاب مشہور عباسی خلیفہ مامون الرشید (وفات 833ء) کے زیر سرپرستی تحریر کی جو علوم وفنون کا بہت بڑا مربی تھا اور جس نے بغداد میں بیت الحکمہ قائم کیا تھا۔ اس ادارے میں ایک بڑی لائبریری تھی اور یہاں کتابوں کے ترجمے کا کام ہوتا تھا۔ اس دور میں جو بین التہذیبی تعاملات دیکھنے میں آئے، ان سے علم ریاضی کی تاریخ میں دو اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ پہلی تو یہ کہ عربوں نے ہندی اعداد اپنا لیے جن میں صفر بھی شامل تھا جس سے لمبی لمبی قیمتوں کو آسانی سے لکھنا ممکن ہو گیا۔ اصل میں وہ اعداد جنھیں دنیا میں عربی اعداد سمجھ کر استعمال کیا جاتا ہے وہ علامتیں ہیں جو عربوں نے اہل ہند سے سیکھیں اور جنھوں نے بعد ازاں شمالی افریقہ جا کر موجودہ شکل اختیار کر لی۔

دوسری اہم پیش رفت جو اس وقت کے بغداد میں دیکھنے کو آئی وہ ریاضی، جیومیٹری اور فلکیات کی یونانی کتب کا عربی زبان میں ترجمہ تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مسلم ریاضی دانوں نے بعد ازاں ارشمیدس، اقلیدس اور اپالونیئس کی تحاریر سے فائدہ اٹھا کر غیر اقلیدسی جیومیٹری دریافت کر لی۔

جس طرح اس وقت کے مسلم سائنسدانوں نے یونانی علمی رویے سے فائدہ اٹھایا اور اسے وسعت دی، اسی طرح بعد میں آنے والے یورپی دانشوروں نے عرب وفارس کے ان مسلم ماہرین کے کام سے اکتساب کیا۔ الخوارمی کی کتاب کے متعدد اجزا کا لاطینی زبان میں ترجمہ پہلے رابرٹ آف چیٹر نے 1145ء میں کیا اور پھر جیرارڈ آف کریسمونا نے جس کا انتقال 1187ء

http://muftbooks.blogspot.com/

میں ہوا۔ الجبرے کی عملی افادیت کو پیش نظر رکھا جائے تو تہذیب انسان کے سائنسی سفر میں قدیم مسلم دانشوروں کے کردار کی عظمت اور بھی نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔

الف لیلہ ولیلہ

قرون وسطیٰ کی ایک عربی داستان۔ یہ داستان جس میں شہرزاد ہر رات بادشاہ شہریار کو ایک نئی حکایت سنا کر اپنی زندگی بچاتی رہتی ہے اصلاً عربی نہیں ہے۔ اسے ایک فارسی مجموعۂ حکایات سے عربی میں ترجمہ کیا گیا جس کا مآخذ شاید ہندی تھا۔ لکھاریوں نے بعدازاں قرون وسطیٰ میں اس مترجمہ مجموعے میں عربی لوک کہانیاں لف کیں۔ اٹھارھویں صدی کے اوائل میں اس عربی مسودے کے یورپی زبانوں میں ترجمے کا عمل شروع ہوا۔ اس عمل کے دوران مغربی مترجمین نے اس داستان میں بہت سی ترامیم اور اضافے بھی کیے۔

اس میں شامل الہ دین کا چراغ اور علی بابا چالیس چور جیسی بہت سی کہانیاں جو دوسرے ملکوں میں مشہور ہوئیں اصل مسودے میں نہیں تھیں بلکہ اس وقت شامل کی گئیں جب ایک شامی عیسائی نے اٹھارہویں صدی کے اوائل میں پیرس میں اپنے قیام کے دوران فرانسیسیوں کو سنائیں۔ انٹوائن گال لینڈ جسے الف لیلہ کا پہلا یورپی مترجم مانا جاتا ہے، نے یہ کہانیاں اپنی ڈائری میں نوٹ کیں اور کافی عرصہ بعد ان میں کافی ساری ترامیم کر کے انھیں سلسلہ وار شائع کرنا شروع کیا۔ یہ بات 1704ء سے لے کر 1717ء تک کی ہے۔ اس سے قبل یہ حکایات نہ تو مشرق وسطیٰ میں زیادہ معروف تھیں اور نہ ہی ادبی ذوق رکھنے والے عرب حضرات انھیں کوئی بڑا ادب تسلیم کرتے تھے۔ مزے کی بات ہے کہ الف لیلہ نے یورپ میں اس قدر مقبولیت حاصل کی کہ بعد میں لف شدہ مغربی مواد کے حامل مطبوعہ ایڈیشنوں کو مشرق وسطیٰ لا کر ان کا مقامی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ جب سر رچرڈ برٹن نے غیر عرب حکایات کے اپنے 'ترجمے' پر کام کرنا شروع کیا تو اس نے گال لینڈ کی فرانسیسی کتاب کے ترجمے سے اکتساب کیا تا کہ اس کی مشرقی باس کو برقرار رکھا جا سکے۔

اگرچہ مغربی محققین اچھی طرح جانتے تھے کہ آدھی سے زیادہ حکایات بعد میں لف کی گئی ہیں، وہ اس ذخیرے کو 'مشرق شناسی' کے لیے بہترین گائڈ بک قرار دیتے رہے، حالانکہ یورپ میں طبع شدہ الف لیلہ میں شامل بہت سی کہانیوں کا ناک نقشہ عربی لوک کہانیوں جیسا ہے۔ گذشتہ تین صد برسوں میں الف لیلہ کے چھپنے والے ہزاروں ایڈیشن مشرق وسطیٰ کے متعلق مغربی تجسس و تخیل کے لیے ایک یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ہم انھیں مشرق وسطیٰ کے لوگ ادب کی حقیقی

http://muftbooks.blogspot.com/

مثال قرار نہیں دے سکتے۔

الوہی بادشاہت

حاکمیت کا قدیمی اصول۔ الوہی بادشاہت کا تصور یعنی بادشاہ کی الوہیت کا عقیدہ پورے براعظم افریقہ میں بکھری کئی ثقافتی روایتوں میں ملتا ہے۔ اس عقیدے کے مآخذ کا پتہ نہیں لیکن قدیم مصر کے معروف فرعون دیوتا اس طرز کے بادشاہی نظام کی کچھ قدیم ترین دستیاب مثالیں پیش کرتے ہیں۔

الوہی بادشاہت کا عقیدہ یوگنڈا کے بگانڈا، گھانا کے اشانتی، مشرقی افریقہ کے نائی اور واور نیام ویزی، جنوبی افریقہ کے لُنڈا اور شونا اور بہت سے دیگر قبیلوں میں موجود پایا جاتا ہے۔ جن معاشروں میں الوہی بادشاہت کا یہ ادارہ پایا جاتا ہے وہاں بعض دیگر منفرد اور امتیازی عقائد وخواص بھی ملتے ہیں۔ الوہی بادشاہوں کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ قویٰ فطرت ان کے قبضہ قدرت میں ہوتے ہیں اور ایک الوہی بادشاہ کا بنیادی کام اپنی رعایا کی فصلوں کے لیے بارشیں مہیا کرنا ہوتا ہے تاکہ انھیں اناج دانہ اچھی مقدار میں مل سکے۔ الوہی بادشاہ دیوتا یا کسی فوت شدہ بزرگ کی روح کا حامل متصور ہوتا ہے۔ ریاست میں اس کا مرتبہ سب سے بلند ہوتا ہے اور وہ اپنے عوام سے مناسب فاصلہ برقرار رکھتا ہے۔ وہ سدا پردے کے پیچھے رہتا ہے اور کسی کو اسے غور سے دیکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ رسوماتی شاہ کُشی (الوہی بادشاہ کا اس کے عہد اقتدار کے خاتمے پر قتل) قدیم مصری الوہی بادشاہی نظام کا ایک حصہ اور بہت سی دیگر افریقی ثقافتوں میں بھی عام تھی۔ ان الوہی بادشاہوں کی تدفین پر بھی بہت سی انسانی قربانیاں نذر کی جاتی تھیں۔

بہت سے معاشروں میں ایک مقدس الاؤ کو بادشاہ کی زندگی کی علامت کے طور پر لیا جاتا ہے جو اس کی پوری زندگی کے دوران جلتا رہتا ہے اور جسے اس کی موت پر بجھا دیا جاتا ہے۔ قدیم مصریوں میں الوہی بادشاہ اکثر اپنی بہنوں سے بیاہ رچاتے تھے اور بہت سے معاشروں میں چاند دیوتا اور موت کے بعد انھیں بڑا معبود تصور کیا جانے لگتا تھا جن کے حضور نذریں اور قربانیاں پیش کی جاتی تھیں۔

امام

شیعہ مسلمانوں کا روحانی پیشوا۔ شیعہ مسلم امام کی نسبت حضرت علیؓ (600ء۔661ء) کے توسط سے براہ راست رسول اللہ ﷺ (570ء۔632ء) سے ملاتے ہیں اور صرف امام کو ہی

کسی خاص زمانے میں مذہبی احکامات اور کلام خداوندی کی تعبیر کا واحد ذمہ دار تصور کرتے ہیں۔ امام معصوم اور نور الٰہیہ کا حامل متصور ہوتا ہے جس کی وجہ سے لوگ خود ہی اس کی طرف راغب ہوتے ہیں اور اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ شیعہ اعتقاد کے مطابق ہر زمانے کا ایک امام ہوتا ہے لیکن بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسانی شر سے نقصان پہنچنے کے خدشے کے پیش نظر اسے اللہ کی رضا سے لوگوں کی نظر سے اوجھل کر دیا جاتا ہے۔ شیعہ مسلک یہ بھی کہتا ہے کہ امام غائب مہدی کے طور پر دنیا میں دوبارہ ظاہر ہو کر احکام خداوندی کا بول بالا کریں گے اور انسانی معاشرے میں حق و انصاف قائم کریں گے۔ شیعہ مسلک کی سب سے بڑی جماعت ''اثنا عشری'' کے مطابق بارہویں امام نائب مہدی کی حیثیت سے دنیا میں دوبارہ ظاہر ہوں گے اور ایک مثالی اسلامی معاشرہ قائم کریں گے۔

شیعہ اور سنی مسلمان مسجد میں نماز پڑھانے والے شخص کو بھی ''امام'' کہتے ہیں۔ سنی مسلمان اسلامی تاریخ کے بڑے فقہا کیلئے بھی یہ لقب استعمال کرتے ہیں جن کے شرعی معاملات کے بارے میں دیئے گئے فیصلوں کی پیروی کی جاتی ہے۔ شیعہ حضرات عصر حاضر میں یہ لقب اس موخر مفہوم میں اپنے آج کل کے فقہا کیلئے بھی استعمال کرتے ہیں۔

امبید کر، بھیم راؤ رام جی (1893ء۔1956ء)

ہریجنوں یعنی ہندوستانی اچھوت جاتیوں کے سیاسی رہنما۔ وہ مغربی ہندوستان کے ایک اچھوت گھرانے میں چودھویں نمبر پر پیدا ہوئے۔ انھیں اپنے بچپن میں یقیناً اونچی ذات والے ہندوؤں کی حقارت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ بڑا ہونے پر امبید کر کو وظیفہ ملا اور انھوں نے لندن سے قانون کی تعلیم اور بعدازاں نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی اور لندن سکول آف اکنامکس سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ وہ جب ہندوستان واپس آئے تو انھیں نچلی ذات سے تعلق رکھنے کی بنا پر بہت برا سلوک برداشت کرنا پڑا۔ اس پر انھوں نے ہریجنوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے جدوجہد کرنے کا بیڑہ اٹھالیا۔ انھوں نے متعدد ہریجن رسالے نکالے۔ 1924ء میں اچھوتوں کی اخلاقی و مادی تحقیق و ترقی کے لیے ایک ادارہ قائم کیا۔ امبید کر اور ان کے ساتھیوں نے کئی پرامن مظاہروں کا اہتمام کیا۔ اس کے علاوہ امبید کر نے ہندوستان کی آئین ساز کمیٹی کی مشاورت کے فرائض بھی سرانجام دیے۔ ان کی قیادت میں تیس لاکھ اچھوتوں نے بدھ مذہب قبول کیا۔ امبید کر نے اپنی قوم کے لیے ایک الگ سیاسی وحدت قائم کرنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ اس میں ناکام رہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

امبید کر نے آزاد مزدور پارٹی قائم کی جس نے 1936ء میں ہونے والے عام انتخابات میں ہریجنوں کے لیے مختص تمام نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ 1942ء میں انھوں نے کل ہند اچھوت فیڈریشن کو ایک سیاسی پارٹی کی شکل میں منظّم کیا۔ 1947ء میں امبید کر کی وزیر قانون کے طور پر تقرری سے ہریجن بہت خوش ہوئے اور ہم سب جانتے ہیں کہ اس برس ہندوستان نے برطانیہ سے آزادی حاصل کر لی۔ بٹوارے کے بعد امبید کر آئینی معاملات میں اپنی مہارت کے طفیل ہندوستان کی دستور سازی اور ہندو کوڈ کی تشکیل میں بہت فعال کردار ادا کرتے رہے۔ اس کوڈ کے تحت اچھوتوں کے خلاف امتیازی برتاؤ کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور تب سے انھیں مانو کہا جانے لگا۔

اگر چہ امبید کر ہندو کوڈ اسمبلی میں منظور کرانے میں کامیاب ہو گئے لیکن آنے والے برسوں میں انھیں یہ باور ہو گیا کہ ان کی ذات نئی حکومت میں ان کے اثر ورسوخ کی راہ میں دیوار بن رہی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر انھوں نے 1951ء میں وزارت قانون سے استعفیٰ دے دیا۔ ڈاکٹر امبید کر کی اچھوتوں کے بارے میں گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہندو رویے سے مایوسی کا اظہار ان کی زندگی کے آخری برس میں ہوا جب وہ اپنے تیس لاکھ پیروکاروں کی معیت میں ہندومت چھوڑ کر بدھ مذہب میں شامل ہو گئے۔

امریکن انڈین موومنٹ (AIM)

عسکریت پسند امریکی انڈین لوگوں کی شہری حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والی ایک جماعت۔ یہ جماعت 1968 میں امریکی ریاست منی سوٹا کے شہر میناپولس میں ڈیسن بینکس، کلائیڈ بیلی کورٹ، جارج ملر اور چند دیگر افراد نے مل کر تشکیل دی اور یہ میناپولس اور سینٹ پال میں امریکی انڈین افراد کے خلاف امتیازی برتاؤ اور ان کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کے نتیجے میں وجود میں آئی اور جلد ہی پورے شمالی امریکہ میں ان امریکی انڈین افراد کے دفاع کی علامت بن گئی جنھیں وفاقی حکومت نے نہایت گندے حالات اور ناگفتہ بہ شہری علاقوں میں رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اپنے قیام کے بعد اس جماعت نے اپنا دائرہ کار وسیع کر لیا اور اس میں امریکی انڈین باشندوں کے معاشی، قانونی، ثقافتی اور علاقائی مفادات کو بھی شامل کر لیا۔ اس کے قائدین نے امریکی بیورو آف انڈین افیئرز کی تنظیم نو اور امریکی حکومت اور امریکی انڈین باشندوں کے مابین طے پانے والے ماضی کے سمجھوتوں پر عمل درآمد کا مطالبہ بھی کیا۔ امریکی انڈین باشندوں کے متعلق حکومتی پالیسیوں کے خلاف احتجاج کے لیے ایک انوکھا طریقہ اختیار کرتے ہوئے متذکرہ

http://muftbooks.blogspot.com/

گروہ کے500ارکان نے نومبر1972ء میں امریکی دارالحکومت واشنگٹن میں واقع BIA کی عمارت پر ایک ہفتے تک قبضہ کیے رکھا۔ انھوں نے پوری دنیا کی توجہ اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کی طرف ایک دفعہ پھر مبذول کرانے میں کامیابی اس وقت حاصل کی جب انھوں نے جنوبی ڈکوٹا ریاست کے مقام پائن رِج کے ایک تاریخی گاؤں وونڈڈنی پر دس ہفتے تک قبضہ کیے رکھا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں1890ء میں قتل عام ہوا تھا۔اس کے ارکان جزیرہ الکاٹراز کے قصبے (1967-71) کے قضیے میں بھی ملوث تھے۔

1978ء تکAIM کی بیشتر قیادت قید میں جا چکی تھی اور مقامی تنظیمیں ابھی تک مصروف پیکار تھیں لیکن یہ جماعت ان برے حالات میں بھی سینہ سپر رہی اور اس کے اراکین نے اپنے سیاسی وسماجی مشن کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ایک روحانی تحریک کی شکل اختیار کر لی اور قدیمی مذہب کی حمایت شروع کر دی۔AIM کی رکنیت کے لیے ضروری ہے کہ امیدوار پائن رج میں منعقد ہونے والی آفتابی رقص کی رسم میں شریک ہو۔1980ء کے عشرے کے اواخر میںAIM کے ارکان کی تعداد لگ بھگ5000 تھی۔

امریکی انقلاب(1775-83)

اسے امریکی جنگ آزادی بھی کہا جاتا ہے۔شروع میں اس جنگ کا دائرہ بہت محدود تھا جس میں برطانیہ کی تیرہ امریکی نوآبادیاں اپنی آزادی کے جتن میں مصروف تھیں لیکن کچھ ہی عرصے بعد یہ لہر پھیل کر ایک بین الاقوامی مسئلے کی شکل اختیار کر گئی۔ جرمن کرائے کی فوج نے برطانوی افواج کی مدد کی جبکہ فرانس،سپین اور ہالینڈ امریکیوں کی امداد کرتے رہے۔

برطانوی حکومت نے فرانس کو1763ء کی جنگ میں شکست دے دی اور آئندہ بارہ برس نت نئے ٹیکسوں اورStamp Act اور(1767) TownShend Act جیسے تجارتی قوانین کے ذریعے امریکیوں سے زیادہ سے زیادہ مال بٹورنے کی جدوجہد میں مصروف رہی۔ آبادکاروں کے جذبات اس وقت اور بھی زیادہ برانگیختہ ہو گئے جب برطانیہ نے یہ نئے قوانین تیار کرتے وقت برطانوی پارلیمنٹ میں امریکی نمائندگی کی بھی کوئی پرواہ نہ کی۔ آبادکاروں کی شکایات کی طرف برطانوی عدم توجہی نے بے چینی میں اضافہ کیا اور اس سے جابجا احتجاجات کا سلسلہ پھوٹ نکلا۔1770ء میں بوسٹن میں اس وقت قتل عام کی صورت دیکھنے میں آئی جب 50 آبادکاروں اور برطانوی سپاہیوں کے درمیان بوسٹن کے بازاروں میں تصادم ہوا۔1773ء کی بوسٹن ٹی پارٹی تو بہت مشہور ہے۔اس موقع پر باغی آبادکاروں نے نئے ٹیکسوں کے خلاف

http://muftbooks.blogspot.com/

احتجاج کے لیے برطانوی مال اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا تھا۔ اس ساری بے چینی اور خلفشار نے آخر بڑھ کر ایک جنگ آزادی کی شکل اختیار کر لی۔

1775ء میں برطانوی جنرل ٹامس گیج اور امریکیوں کے مابین میسا چوسٹس ریاست کے شہروں لیکسنگٹن اور کنکارڈ میں کھلی جنگ کا آغاز ہوا۔ امریکی حرت پسندوں نے بوسٹن پر قبضہ کر لیا۔ اتنے میں امریکی جنرل ہنری ناکس بھی آن پہنچا اور اس نے جنرل ولیم ہاؤ کی قیادت میں لڑنے والے برطانوی فوجیوں کو وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد خزاں میں امریکیوں نے مانٹریال کو بھی محاصرے میں لے لیا لیکن برطانوی افواج نے آئندہ بہار میں انھیں دھکیل کر فورٹ ٹکونڈروگا کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اسی دوران امریکیوں نے کیوبک پر بھی چڑھائی کی لیکن وہ ناکام رہے اور امریکی جنرل رچرڈ منٹگمری مارا گیا۔

1776ء میں آبادکاروں نے خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ برطانیہ نے معاہدے کی پیشکش کی اور اعلان کیا کہ اگر آبادکار ہتھیار ڈال دیں تو انھیں معاف کر دیا جائے گا۔ امریکیوں نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا اور اس نے لانگ آئی لینڈ پر لنگر انداز ہو کر کمانڈر انچیف جارج واشنگٹن کی سرکردگی میں لڑنے والی امریکی فوج کو شکست سے دوچار کر دیا۔ واشنگٹن کو شکست کھا کر پہلے مین ہٹن کی طرف پسپائی اختیار کرنا پڑی لیکن پھر اسے وائٹ پلینز کا رخ کرنا پڑا جہاں اس کی فوج کو 25 اکتوبر کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ واشنگٹن کے مین ہٹن اور فورٹ لی دونوں جگہ متعین دستے تباہ و برباد ہو گئے لیکن اس نے بڑنیٹن میں برطانوی رہنما لارڈ چارلز کارنوالس کے دستوں پر دھاوہ بول دیا۔ واشنگٹن کرسمس کی رات دریائے ڈیلویئر عبور کر کے ٹرینٹن پہنچ گیا اور اس نے 1000 برطانوی فوجیوں کو حراست میں لے لیا۔ اس کے بعد اس نے پرنسٹن میں بھی فتح حاصل کر لی جس سے پورے امریکہ میں آبادکاروں کے حوصلے بلند ہو گئے۔

اگرچہ ابھی تک طاقت کے توازن میں کوئی خاص تبدیلی دیکھنے میں نہیں آئی تھی لیکن 1777ء میں دونوں طرف بہت سی فتوحات اور شکستیں وقوع پذیر ہوئیں۔ امریکی افواج نے موسم گرما اور خزاں میں برطانوی جنرل برگوئن کے البانی نیویارک کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کو روکے رکھا۔ تاہم جنرل ہاؤ کو اس وقت بڑی کامیابی حاصل ہوئی جب اس نے 11 ستمبر کو واشنگٹن کو برینڈوائن کریک کے مقام پر شکست دے کر 25 ستمبر کو فلاڈیلفیا پر قبضہ کر لیا جو کہ اس وقت امریکہ کا دارالحکومت تھا۔

1778ء میں فیصلہ کن امریکی فتوحات کا آغاز ہوا۔ اس کی بڑی وجہ جون میں فرانس کا

برطانیہ کے خلاف مکمل جنگ کا اعلان تھا، اگر چہ وہ در پردہ 1776ء سے ہی باغیوں کی امداد کرتا چلا آیا تھا۔ فرانسیسی فوج نے جنوب میں خاص طور پر بہت اہم کردار ادا کیا جہاں وہ سوانا اور یارک ٹاؤن کے محاصروں میں امریکیوں کے شانہ بشانہ لڑی۔ واشنگٹن کی فوجوں نے بیرن فریڈرک ولہیلم سٹوبن کے تحت ویلی فورج میں تربیت حاصل کی۔ اس سے بھی جنگ کی صورتحال میں بہت تبدیلی پیدا ہوئی اور امریکیوں نے مان ماؤتھ کے مقام پر برطانوی فوج کے خلاف فتح حاصل کرلی۔ کارنوالس کو جنوب میں بہت نقصان اٹھانا پڑا اور 19 اکتوبر 1781ء کو اس کے 7000 جوانوں نے ہمت ہار کر یارک ٹاؤن کے مقام پر امریکیوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ 3 ستمبر 1783ء کو پیرس میں امریکیوں اور برطانوی حکومت کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کے نتیجے میں جنگ بند ہوگئی اور برطانیہ عظمیٰ نے امریکہ کی خودمختاری کو تسلیم کرلیا۔

ام کلثوم (1910ء۔1974ء)

عالمی شہرت حاصل کرنے والی مصری گلوکارہ۔ ام کلثوم کو بیسویں صدی میں عرب دنیا کی معروف ترین گلوکارہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے جدید عرب موسیقی کی نشوونما کو کئی حوالوں سے متاثر کیا۔ ام کلثوم نے اپنی گائیکی کا آغاز دریائے نیل کے میدانوں میں واقع ایک چھوٹے سے گاؤں سے کیا۔ انہوں نے اس دور میں مذہبی گیت گانے شروع کیے جب مصر میں گانے والوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ ام کلثوم نے اپنی ذاتی محنت، صبر اور استقامت سے سماج میں خواتین گلوکاروں کیلئے جگہ پیدا کی۔ ان کی گائیکی عمومی طور پر موسیقی کے ایک نئے معاشرتی کردار کی تعریف کرنے میں بھی مدد ثابت ہوئی۔

اپنی گلوکاری کے عروج کے دنوں میں ام کلثوم بڑی باقاعدگی سے نامور ترین جدید عرب شعرا سے نغمات لکھوایا کرتی اور پھر بہترین موسیقاروں سے ان کی دھنیں تیار کرواتی تھیں۔ ایک طرف جہاں وہ کلاسیکی ادب سے لئے گئے اقتباسات (جن میں فارسی شاعر عمر خیام کی رباعیوں کے عربی تراجم بھی شامل ہیں) محافل میں پڑھ کر سنایا کرتی تھیں تو دوسری طرف وہ مصر کی بازاری عربی زبان میں لکھے ہوئے گیتوں سے بھی لوگوں کے دلوں کو برمالیتی تھیں۔ موسم سرما کے دوران وہ ہر ماہ کی پہلی جمعرات کو اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتی تھیں۔ ان کے یہ پروگرام قاہرہ ریڈیو سے براہ راست نشر کئے جاتے تھے جنہیں سارا مصر ہمہ تن گوش ہوکر سنا کرتا تھا۔ ان کے گانوں کے بول پروگرام سے کئی روز قبل ہی لوگوں تک پہنچ جاتے تھے اور ام کلثوم کے گانے سے قبل ہی اکثر لوگوں کو یہ ازبر ہوجایا کرتے تھے۔ ام کلثوم کئی کئی گھنٹوں کے سولو کنسرٹ کیا کرتی تھیں اور اگر ان کے دم خم کو

دیکھا جائے تو ان کا مقابلہ کسی بھی مغربی اوپرا سنگر سے کیا جا سکتا ہے۔ام کلثوم کی وفات پر قاہرہ کے بازاروں میں لاکھوں افراد جمع ہوئے ۔عرب ثقافت مختلف قسم کی موسیقارانہ روایات (درباری، لوک، عارفانہ، جدید پاپ وغیرہ) سے ہمیشہ مالا مال رہی ہے تاہم گلوکاری اور صوت انسانی کو ایک خصوصی مقام دیا جاتا رہا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ جدید عرب دنیا میں ایک خاتون گلوکارہ یعنی ام کلثوم کو کسی بھی دوسری ثقافتی شخصیت کے مقابلے میں زیادہ شہرت وعزت ملی۔

انجیلی موسیقی

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسوی صدی کا ایک امریکی شہری مذہبی گیت ، یہ موسیقی دو روائیتوں یعنی سفید انجیل اور سیاہ انجیل میں پروان چڑھی۔

سفید موسیقی انجیلی مناجات پر مشتمل ہے اور اس کا موضوع بائبل کے چیدہ چیدہ احکامات وتصورات ہیں۔ یہ گیت صیغہ واحد متکلم میں گائے جاتے ہیں اور ان میں شامل مقدس پیام پر زور دینے کیلئے اسے بار بار دہرایا جاتا ہے اور ہر بند کے بعد کورس کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ یہ موسیقی امریکی پاپ سونگ سے مشابہ ہے۔انیسویں صدی میں سفید انجیل کو مقبولیت دینے والوں میں گلوکار آئرا سانکی (1840ء۔1908ء) اور مبلغ ڈوائیٹ مودی (1837ء۔1899ء) جیسے لوگوں کا نام شامل ہے۔

سیاہ موسیقی 1930ء کے عشرے میں کساد بازاری کے دنوں میں پروان چڑھی اگرچہ اس میں تبلیغ اور گائیکی کی ان بہت پرانی افریقی۔ امریکی تقریری روایات کی جھلک ملتی ہے جو زمانہ غلامی میں رائج تھیں۔ اگرچہ سننے میں لگتا ہے کہ یہ موسیقی روایتی مناجات کی بنیاد پر استوار ہے، ادائیگی اور نغمگی کے اسلوب کے اعتبار سے اس کا تعلق روحانی اور بلوز انگ سے ہے۔گائیک ان گیتوں کو تنہا بھی گاتے ہیں اور کورس میں بھی۔ وہ یہ گیت گاتے وقت متنوع صوتی اثرات استعمال کرتے ہیں اور انہیں مختلف تانوں اور سروں سے سجانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلائنڈ ولی جانسن اور مہالیہ جیکسن کا نام انجیل موسیقی کے بڑے فنکاروں میں شمار ہوتا ہے اور ٹامس ڈورسی کو اس ضمن میں غالباً سب سے بڑا فنکار قرار دیا جا سکتا ہے۔

اَندرچ، ایوو (1902-1975)

بوسنیا کا ایک ادیب، آیوو آندرچ نے ایک ناول نگار اور کہانی کار کے طور پر شہرت پائی۔ وہ بوسنیا کے مقام ڈولاچ میں 10 اکتوبر 1892ء کو پیدا ہوا۔اس نے زاغرب، کراکو، ویانا اور گراز

میں تعلیم حاصل کی۔ اسے جنگ عظیم اول کے دنوں میں استعماریت مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے آسٹریا اور ہنگری کے حکام کے ہاتھوں صعوبتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ وہ قید رہا اور اسے نظر بند بھی کیا گیا۔ انہی دنوں اس نے اپنا پہلا بڑا تخلیقی کام Exponto (1918) تحریر کیا جو ایک نثری نظم کی شکل میں ہے۔ اس سے اس کی بطور ادیب شناخت مستحکم ہوگئی اور اسے 1920ء کے بعد اپنے افسانوی مجموعے شائع کرنے کا موقع ملا۔ جنگ عظیم اول کے خاتمے کے بعد اس نے یوگوسلاویہ کی نئی ریاست کے لیے سفارتی خدمات سرانجام دینا شروع کر دیں اور اس سلسلے میں بخارسٹ، میڈرڈ، روم، برلن اور جینوا میں تعینات رہا لیکن وہ جہاں بھی رہا، اس کی تحاریر کے موضوعات کا تعلق ہمیں بوسنیا کی دھرتی اور ثقافت سے ہی جڑا نظر آتا ہے جن میں وہ ہمیں اپنے ہموطنوں کی نفسیات و کردار کی تصویر کشی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس نے جنگ عظیم دوم کے دوران تین ناول لکھے۔ ان میں دو یعنی بوسینا کی کہانی (1945) اور دریائے ڈرینا کا پل (1945) بوسنیا کی تاریخ سے متعلق ہیں۔ آنڈرچ کو 1961ء میں ادب کے نوبل پرائز سے نوازا گیا۔ اس کا انتقال 13 مارچ 1975ء کو بلغراد، یوگوسلاویہ میں ہوا۔

اندلس

سپین کا وہ علاقہ جہاں مسلمانوں نے سلطنت قائم کی۔ اس سرزمین پر مسلمان پہلے پہل 711ء میں نوجوان بربر جرنیل طارق ابن زیاد کی سرکردگی میں لنگر انداز ہوئے۔ جبل الطارق اسی بہادر جرنیل کے نام سے موسوم ہے۔ اسلامی لشکر انتہائی تیزی سے پورے جزیرہ نما پر قابض ہوگیا اور 732ء میں فرانس کی دہلیز تک جا پہنچا۔ اگر اس وقت کا فرانسیسی فرمانروا چارلز مارٹل (719-741) جو کہ شارلمین کا دادا تھا، ان کی موثر مزاحمت نہ کرتا تو فرانس بھی ان کے قبضے میں آچکا ہوتا۔

اسلامی حکومت کے عہد میں یہ علاقہ پورے یورپ کے علمی و ثقافتی مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا۔ عرب دانشور ابن راشد، ابن باجہ اور موسیٰ ابن میمون جیسے نامور فلسفی اسی ثقافت میں پروان چڑھے اور اپنی تصانیف کے لاطینی ترجموں کی بدولت پورے یورپ میں معروف ہوئے۔ یہ تراجم تولیدو میں کیے گئے جہاں عیسائی علماء عربی زبان اور عربی زبان میں تحریر کردہ فلسفے اور سائنس کی کتب کی تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ یہاں عرب اور ہسپانوی ثقافتوں کی آمیزش سے ایک نرالا آرٹ اور فن تعمیر نمو پایا جو قرطبہ کی پرشکوہ مسجد اور الحمرا کے نام سے موسوم غرناطہ کے عالیشان محل میں آج بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ اس زمانے کے اندلس میں نشوونما پانے والی شاعری کا ہی وسیلہ

ہے جس سے روایتی عرب شاعری کے مضامین یورپی ادب میں پہنچے۔ اندلس کی اس امتزاجی شہری ثقافت کو اسلامی اور مسیحی ثقافتوں کا نقطہ اتصال سمجھا جاتا ہے۔ اس تہذیب نے یورپی قرون وسطیٰ کے آرٹ اور تمدن کی تشکیل میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

اندلس پر مسلمانوں کی حکومت کے عہد کے دوران کئی بار خلفشار اور بدامنی کے وقت دیکھنے کو ملے۔ ایک طرف داخلی سیاسی ریشہ دوانیاں اور محلاتی سازشیں تھیں اور دوسری طرف عیسائی۔ یورپ کے ساتھ ملتی طویل سرحدیں۔ عیسائی دنیا نے گیارھویں اور تیرھویں صدی کے درمیانی عرصے میں اندلس پر دوبارہ قبضے کے لیے ایک بھرپور تحریک شروع کیے رکھی جس کے روح رواں اس وقت کے پوپ گریگوری ہفتم (1073ء۔1085ء) تھے۔ اس تحریک کو داخلی سیاسی خلفشار سے یقیناً بہت فائدہ پہنچا ہوگا۔ عیسائیوں نے 1085ء میں تولیدو پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ قرطبہ اور اشبیلیہ بھی بالترتیب 1236ء اور 1248ء میں ان کے قبضے میں چلے گئے۔ 1492ء میں آراگون اور کاسٹائل کی متحدہ مملکت نے غرناطہ کے مسلم حکمرانوں کو شکست سے دوچار کیا۔ 1609ء میں فلپ سوم نے مسلمانوں کو سپین سے مکمل طور پر نکال دیا پناہ گزینوں نے شمالی افریقہ کے مختلف مقامات پر سکونت اختیار کرلی۔ ان کی ثقافت کے بچے کھچے آثار وہاں آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

انڈین

یوں تو ''انڈین'' کا لفظ انڈیا (ہندوستان) سے ہے، مگر امریکہ میں یہ اصطلاح وہاں کے مقامی باشندوں کیلئے استعمال کی جاتی ہے۔ اس اصطلاح کے استعمال کی ابتدا اطالوی مہم جو کرسٹوفر کولمبس (1451ء۔1506ء) سے ہوئی۔ جب کولمبس سمندر میں سفر کرتا ہوا 1492ء میں اس امریکی جزیرے پر پہنچا جہاں آج کل ڈومنکن ریپبلک اور ہیٹی آباد ہیں تو وہ سمجھا کہ شاید وہ ہندوستان پہنچ گیا ہے۔ اسی رعایت سے وہاں پر پہلے سے آباد مقامی باشندوں کو انڈین کہا جانے لگا۔ اس اصطلاح نے براعظم شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ میں بسنے والے کئی مختلف ثقافتی و نسلی گروہوں پر ایک ہی لیبل چسپاں کردیا ہے اور اب بہت سے مقامی باشندوں نے بھی اس بنیادی طور پر غلط اصطلاح کو ایک مشترکہ شناخت کی علامت کے طور پر اپنا لیا ہے۔ تاہم کچھ لوگ بعض خاص سیاسی و بین الثقافتی مقاصد کے پیش نظر اپنے لئے ''انڈین'' کی بجائے "Indigenous" یا "native" کی اصطلاحیں استعمال کرنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو نیٹو امریکن کی اصطلاح بھی کوئی ایسی درست محسوس نہیں ہوتی کیونکہ یہ بھی سب مقامی

لوگوں کو ایک ہی ٹوکرے میں ڈالنے کے مترادف ہے اور اس سے مختلف گروہوں کی الگ الگ شناختوں کا اظہار نہیں ہوتا۔

ان انڈینز کے آباؤ اجداد ہزاروں برس کے عرصے میں مختلف جغرافیائی خطوں سے ہجرت کر کے امریکہ پہنچے اور ان کے مختلف جغرافیائی خطوں اور تاریخی تجربوں نے مختلف النوع معاشروں کو جنم دیا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی وفاقی حکومت کے پاس تین ہزار قبائل کا ریکارڈ ہے اور جنوبی امریکہ، وسطی امریکہ اور کینیڈا میں سینکڑوں مزید قبائل کے لوگ موجود ہیں۔ مثال کے طور پر گوئٹے مالا میں مختلف زبانوں کے حامل بیس سے زائد قبائل ہیں۔

اپنے تمام ترنسلی و ثقافتی امتیازات کے باوجود انڈینز کے بہت سے مفادات مشترکہ ہیں۔ کیونکہ ان کے روایتی ادارے ان کے زمین سے تعلق سے جڑے ہوئے تھے۔ طویل دور استعماریت کے دوران سامراجیوں نے انہیں ختم کرنے یا پھر انہیں اپنی ثقافت میں جذب کرنے کی پالیسی اپنائے رکھی جن سے ان کا ثقافتی تانا بانا منتشر ہو کر رہ گیا۔ اگرچہ یورپی استعمار نے انڈینز پر مختلف طرح کے اثرات مرتب کئے، ان کی بحیثیت الگ اقوام کے بقا کا مشاہدہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد اس سرزمین میں کہ جس نے بعد میں یو ایس اے کی شکل اختیار کی جو تقریباً تین ہزار زبانیں استعمال کرتے تھے، ان میں سے تقریباً نصف اب بھی استعمال کی جا رہی ہیں۔

انگکور عہد

کھمیر سلطنت کا عہد زریں۔ یہ سلطنت نویں سے پندرھویں صدی عیسوی کے درمیانی عرصے میں اس خطے میں پروان چڑھی جسے آج ہم کمبوڈیا کہتے ہیں۔ یہ سلطنت نویں صدی میں جے ورمن دوم (802-850) نے قائم کی۔ اس دور میں وہاں مروج ہندو عقیدے کے مطابق دیوتا بادشاہ دنیوی اور مذہبی دونوں قسم کی طاقتوں کا حامل ہوتا تھا اور اسے دیوراج کہا جاتا تھا۔ تمام کھمیر تہذیب اینگکر میں بیٹھے اسی بادشاہ کے گرد گھومتی تھی۔ اس سے حکومتی استحکام اور وسائل جمع کرنے کا ایک نیا دور ممکن ہو گیا تھا۔ ایک مستحکم اور متحد سلطنت ہونے کی وجہ سے یکے بعد دیگرے آنے والے بادشاہوں کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ عالی شان مندروں اور آبپاشی کے نظاموں جیسے بڑے منصوبوں پر خاطر خواہ توجہ دے سکیں۔ تالابوں، راجباہوں اور نہروں کے نظام نے جس کی بنیاد شاہ اندر ورمن اول (877-889) نے رکھی تھی انگکور سلطنت کی ترقی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس سے قبل ملک میں چاول کی صرف ایک فصل ہوتی تھی جس سے عوام کی غذائی ضرورت

http://muftbooks.blogspot.com/

بمشکل ہی پوری ہوتی تھی مگر آبپاشی کے نظام کی اصلاح سے سال میں دو بلکہ تین فصلیں ہونے لگیں اور چاول بہ افراط پیدا ہونے لگا۔ اس افراط کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہری مراکز کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا۔ دیوتا اور بادشاہ کی خدمت پر مامور یہی شہری آبادی تھی جس نے انگکور تہذیب کو پروان چڑھایا جو فن کی لطافت اور وژن کی وسعت کے طفیل آج تک معروف ہے۔ انگکور تہذیب نے ہندوستانی ثقافت سے بہت زیادہ اثرات قبول کیے۔ یہی وجہ ہے کہ سنسکرت کے جتنے کتبے اور یادگاریں ہمیں اس تہذیب کے آثار میں ملتی ہیں وہ شاید آج کل کے ہندوستان میں بھی نہیں ملتیں۔ تقریباً ہر انگکور بادشاہ پہلے ایک مندر اپنے والدین کے اعزاز میں تعمیر کراتا تھا اور پھر اس سے بڑا ایک مندر پہاڑ اپنے مقبرے کے لیے تیار کرواتا تھا جس کا مقصد ہندی دیومالا کے خدائی جبل میرو کا سوانگ بھرنا تھا۔ ان دیوہیکل تعمیری منصوبوں پر ہزاروں لوگ کام کرتے تھے اور انھیں بے شمار شاہراہوں، نہروں، راجباہوں، تالابوں، دیواروں اور قلعوں کے مرکز میں ایستادہ کیا جاتا تھا۔ یہ سب یادگاریں تیزی سے نمو پذیر حرفت و کاریگری کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان کے در و دیوار پر نقش و نگار اور شبیہیں جس خوبصورتی سے تراشی گئی ہیں اور ان میں تناسب کا جس درجے کا خیال رکھا گیا ہے وہ انھیں کلاسک کے درجہ پر پہنچانے کے لیے کافی ہے۔ ہم آج انگکور ثقافت کے بارے میں جو کچھ بھی جانتے ہیں وہ ان عمارات کے کھنڈروں سے حاصل ہونے والی معلومات و شواہد پر مبنی ہے یا پھر یہ ان سنسکرت کی کتبہ عبارتوں کے طفیل ہے جو سارے کمبوڈیا میں بکھری پڑی ہیں۔

انگکور تہذیب اپنے عروج کے بعد بارہویں صدی میں زوال پذیر ہونا شروع ہوئی اور انجام کار 1444ء میں تھائی لینڈ کی اتویاہا بادشاہت کے حملے کے وقت ڈھیر ہوگئی۔ اس وسیع سلطنت کو چھوٹی کھمیر ریاستوں میں بانٹ دیا گیا اور ان کی یادگاروں کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ انھیں انیسویں صدی میں فرانسیسی ماہرین آثارِ قدیمہ نے دریافت کر کے بحال کیا۔

انوما الیش

بابل کی آفرینشی حکایت ہفت لوحی انوما الیش جو 1876ء میں پہلی بار منظر عام پر آئی، کو میسوپوٹیمیا کی قدیم ترین ادبی تحاریر میں شمار کیا جاتا ہے۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ اسے بخت نصر اول (اندازاً 1124ء۔1103 ق م) کے عہد جو کہ سخت بابلی قوم پرستی کا دور تھا، میں تحریر کیا گیا۔

یہ حکایت اس زمانے سے ابتدا کرتی ہے جب دنیا میں پانی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ شیریں پانی کا ایک گڑھا (اپسو) تھا یا پھر نمکین پانی کے سمندر (تیامات) تھے۔ ان دونوں پانیوں کے

http://muftbooks.blogspot.com/

ملاپ سے وہ ارتقائی عمل شروع ہوا جس نے دیوتا انو (''پیدا کیا گیا'') اور اس کے بعد اس کے بیٹے ای دیوتا کو جنم دیا۔ انو اور اس کے بیٹوں کی سرگرمیوں سے پریشان ہو کر اپسو نے دیوتاؤں کو ہلاک کرنے اور اس سکون کی زندگی کو لوٹنے کی کوشش کی جو ازلی پانیوں کے ملاپ سے قبل تھی۔ اس کے بعد ہونے والی لڑائی میں ای نے اپسو کو مار ڈالا اور خود کو ''اپسو کا سردار'' مقرر کر دیا اور پھر ننھے دیوتائے اعظم مردوخ کو پیدا کیا جو آگے جا کر اس رزمیہ کے ہیرو کی شکل اختیار کرتا ہے۔

بعد میں جب انو نے ہوا پیدا کی اور اس سے پانیوں میں مزید ہلچل پیدا ہوئی تو سمندری دیوتاؤں نے تیامات سے التجا کی کہ وہ اپسو کے قتل کا بدلہ لے۔ قیامت نے گیارہ عفریتیں پیدا کیں اور دیوتاؤں سے لڑنے کے لیے ایک فوج تیار کی۔ ننھے مردوخ نے دیوتاؤں کی طرف سے لڑنے کی حامی بھری لیکن اس شرط پر کہ وہ اسے اپنا بادشاہ بنائیں گے اور اس کے منہ سے نکلی بات کو تقدیر کا درجہ حاصل ہوگا۔ مردوخ نے طوفان کا روپ لے کر ایک ہی لڑائی میں تیامات میں آندھیاں بھیجیں اور پھر اس کے پھولے پیٹ کو پھاڑ کر اسے ایک ہی لڑائی میں چت کر ڈالا۔ پھر اس نے تیامات کے جسم کو آسمان کی مدد سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور پھر پہاڑ، اجرام فلکی اور چشمے پیدا کیے۔

اس معرکے سے واپسی پر مردوخ نے دیوتاؤں کے اجتماع کے لیے بابل کی تعمیر کی تجویز دی اور ای سے کہا کہ وہ مزدوری کے لیے انسان تخلیق کرے۔ اس نے دیوتاؤں میں بھی مختلف کام تقسیم کر دیے۔

انوما الیش آفرینشی حکایت کے طور پر تو اہم ہے ہی لیکن اس کی کائنات کی بطور ایک سیاسی تنظیم تصویر کشی بابلیہ ریاست کی دیومالائی بنیادیں فراہم کرتی ہے۔ مردوخ تیامات سے دیوتاؤں کی طرف سے لڑا تھا۔ تسخیر تیامات کے بعد اس کے مشن کا اختتام بھی ہو سکتا تھا لیکن اس کے بابلیہ کی تعمیر اور جسمانی محنت کے لیے انسان کی تخلیق کے منصوبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی قیادت جنگ کے علاوہ زمانہ امن میں بھی سودمند ثابت ہوتی تھی۔

انوئیٹ

امریکہ، گرین لینڈ، کینیڈا اور سابق سوویت یونین کے آرکٹک اور سب آرکٹک خطوں میں بسنے والے مقامی باشندے۔ انوئیٹ زبان میں ''انوئیٹ'' کا مطلب ہے ''اصل باشندے'' اور شائد وہ ''اسکیمو'' کے نام سے زیادہ معروف ہیں جس کا مفہوم ہے ''کچا گوشت کھانے والے'' یہ اصطلاح مشرقی کینیڈا کے انڈینز نے اپنے ان پڑوسی انوئیٹ باشندوں کیلئے اختراع کی جو شکار

http://muftbooks.blogspot.com/

میں بہت ماہر تھے۔ یہ لوگ جونویں صدی میں گرین لینڈ پہنچے باوجود دو براعظموں میں بکھرے ہونے کے یکساں زبان وثقافت کے حامل ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ اصلاً ایشیائی ہیں۔ کسی وقت محققین کا کہنا تھا کہ انڈینز ہجرت کر کے شمال کی طرف آئے تھے اگرچہ شمالی اور جنوبی امریکی انڈینز کے جسمانی اختلافات اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔

انوئیٹ شمالی امریکن مقامی لوگوں کا وہ پہلا گروہ تھا جس کا یورپیوں سے براہ راست تعلق استوار ہوا۔ ناروے والوں کی انوئیٹ باشندوں سے ملاقات گرین لینڈ میں دسویں صدی میں ہی ہو چکی تھی، اگرچہ وہ اٹھارہویں صدی میں یورپی مبلغین کی گرین لینڈ میں آمد تک زیادہ تر الگ تھلگ زندگی بسر کرتے رہے۔

روایتی انوئیٹ ثقافت پر آرکٹک خطے کی بہیمیت کا بہت اثر ہے۔ جب موسم گرما آتا ہے اور سمندر کی برف پگھل جاتی ہے تو انوئیٹ باشندے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں شکار اور ماہی گیری کیلئے اپنے پسندیدہ علاقوں کا رخ اختیار کرتے ہیں۔ جب سردی آتی ہے تو یہ ٹولیاں واپس اپنے اصل مقام پر لوٹ آتی ہیں اور وہ اپنی قوم کے ساتھ اجتماعی زندگی میں شریک ہو جاتی ہیں اور بحر منجمد میں شکار کا مشکل کام شروع ہو جاتا ہے۔ ''اگلو'' انوئیٹ زبان کا لفظ ہے جس کا لغوی مفہوم ''گھر'' ہے۔ جب ہم اسکیمو یا انوئیٹ باشندوں کے بارے میں بات کرتے ہیں تو اگلو یعنی برف کے گھروں کا تصور بھی معاً ہمارے ذہن میں فوری آ جاتا ہے لیکن اس طرح کے گھروں کا رواج انوئیٹ باشندوں میں اتنا عام نہیں جتنا کہ باہر کی دنیا میں سمجھا جاتا ہے۔

سیل کے شکاری بعض اوقات سمندر کی منجمد سطح پر سیلوں کے بنائے ہوئے ہوا کے سوراخ ڈھونڈ کے وہاں اگلو بستیاں بنا لیتے تھے اور پھر وہاں بیٹھ کر سیلوں کی واپسی کا انتظار کرتے تھے۔

انوئیٹ جن جانوروں کا شمار کرتے تھے ان کا ذکر ہم ان کے مذہب اور آرٹ میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ باشندے مظاہر فطرت کی پرستش کرتے تھے۔ ان کا مذہب بہتر شکار پر مبنی اوامر ونواہی اور رسوم وروایات کے ایک پیچیدہ نظام پر مشتمل تھا۔ شامان اس نظام میں مرکزی کردار ادا کرتا تھا جو خرابی صحت اور ناکام شکار کی وجوہات کی توجیہہ کرتا تھا اور وہ لوگوں پر خوراک وشکار کی ممانعات اور رسوم کی اہمیت واضح کرتا تھا۔ ایسی ہی رسوم میں سے ایک رسم مرے ہوئے سیل کے گھر آنے پر بطور مہمان نوازی پانی کا گلاس پیش کرنا تھا۔ اگر ہم ان کے زیر استعمال اشیاء (مثلاً وال رس کے دانت یا وھیل کی ہڈی) یا ان کی بنائی ہوئی تصاویر کا جائزہ لیں تو ہمیں انوئیٹ آرٹ میں بھی ایک شکاری کی زندگی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اگرچہ انوئیٹ باشندوں کی روایات میں تبدیلیاں بھی

http://muftbooks.blogspot.com/

دیکھنے میں آ رہی ہیں لیکن یہ تبدیلیاں اتنی بڑی نہیں کہ جس سے ہم یہ سمجھنا شروع کر دیں کہ انہوں نے اپنی ثقافت چھوڑ کر کوئی دوسری ثقافت اپنالی ہے۔

انھوں نے دوسری عالمی جنگ کے بعد اپنا روایتی خانہ بدوش رہن سہن ترک کر کے چھوٹی چھوٹی بستیاں بنا کر رہنا شروع کر دیا تھا۔ بہت سے انوئیٹ باشندے صنعتی شہری علاقوں (خصوصاً الاسکا اور اس کے نواح) میں بھی آباد ہو چکے ہیں۔ شہروں کی طرف اس نقل مکانی کے باوجود الاسکا ''کینیڈا'' گرین لینڈ اور یوریشیا تک کے باشندوں پر محیط انوئیٹ تحاریک دیکھنے کو مل رہی ہیں جو ایک اہم سیاسی وثقافتی آواز کی شکل بھی اختیار کر سکتی ہیں۔ 1982ء میں کینیڈا کے شمال مغربی علاقہ جات کے باشندے پہلے ہی ان علاقہ جات کی تقسیم کے ایک منصوبے پر رضا مندی کا اظہار کر چکے ہیں جس میں انوئیٹ باشندوں کو ان کے علاقوں پر زیادہ سیاسی کنٹرول فراہم کرنے پر اتفاق کیا گیا ہے۔

اوتار

ہندو دیوی یا دیوتاؤں کی انسانی یا حیوانی تجسیم۔ ہندوؤں کی مقدس رزمیہ نظم بھگوت گیتا (اندازاً 200 ق م) کے مطابق اوتار کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب دنیا گمراہ ہو کر بدی کے راستے پر چل نکلتی ہے۔ سنسکرت زبان کے اس لفظ کا لغوی مفہوم 'نزول' ہے اور اس سے مراد دیوتا کا زمین پر اترنا اور اس کے مرتبے میں گراوٹ ہے جو خدائی پیکر سے انسانی یا حیوانی پیکر میں آنے سے واقع ہوتی ہے۔

ہندو مذہب کی الوہی تثلیث میں وشنو دیوتا کو ربوبیت، برہمن کو تخلیق اور شیو کو فنا کا نگران وذمہ دار تصور کیا جاتا ہے۔ وشنو کے بارے میں وہ بتاتے ہیں کہ وہ اس دنیا کے نظام کو بحال کرنے کے لیے نو مختلف شکلوں میں اس دنیا میں ظاہر ہو چکا ہے اور وہ مستقبل میں کسی وقت دسویں شکل میں بھی ظاہر ہوگا۔ وشنو کے ہر نزول کے ساتھ ایک حکایت منسوب ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ وشنو پہلی بار نوع انسانی کے بانی منو ویواستو کو غرقابی سے بچانے کے لیے ایک مچھلی کے روپ میں ظاہر ہوا تھا اور اس کا آخری اوتار، کالکی سفید گھوڑے پر سوار ایک انسان کے روپ میں ہوگا جس کی آمد پر یہ دنیا ختم ہو جائے گی۔ وہ بدکاروں کو سزا دے گا اور نیک لوگوں کو نعم واکرام سے نوازے گا۔

وشنو کے اوتاروں کی تعداد واحوال میں مختلف علاقوں کے اعتبار سے تنوع پایا جاتا ہے جن میں درج ذیل شامل ہیں: مائیا (مچھلی)، کُرما (کچھوا)، واراہا (خنزیر)، نرسمہا (آدھا انسان، آدھا شیر)، وامن (بونا)، پرسودام (رام گنڈاسہ بردار)، رام (مقدس رزمیہ رامائن کا ہیرو)،

http://muftbooks.blogspot.com/

کرشن (دیومالائی گوالا)، بدھ، اور کالکی (جو مستقبل میں آئے گا)۔

لفظ 'اوتار' کے خاص الخاص مذہبی مفہوم کے ساتھ اس کا ایک دوسرا مفہوم بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اب اس کا مطلب تجریدی تصورات یا ناقابل محسوس خواص کی تجسیم بھی لیا جانے لگا ہے۔

اورول، جارج (1903ء۔1950ء)

جدید دور کے ایک مایہ ناز انگریز ناول نگار، ان کا اصلی نام ایرک آرتھر بلیئر تھا اور وہ بنگال میں پیدا ہوئے لیکن جب ان کی عمر صرف چار برس تھی تو ان کے گھر والے انہیں لیکر واپس لندن آ گئے۔ انہیں پہلے تو سیسکس کے ایک چھوٹے سے نجی سکول میں داخل کرایا گیا اور اس کے بعد وہ ایٹون میں پڑھنے لگے۔ وہ 1922ء تا 1927ء ہندوستان کی شاہی پولیس سے منسلک ہو کر برما میں تعینات رہے لیکن جب وہ چھٹی پر انگلستان میں تھے تو انہوں نے پولیس کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور لکھنے لکھانے میں مشغول ہو گئے۔ پہلے تو انہوں نے غربا کی زندگی کی باس چکھنے کیلئے لندن کے علاقے ایسٹ اینڈ میں رہائش اختیار کی اور پھر وہ پیرس چلے گئے۔ وہاں انہوں نے کمیوں کمیروں کی طرح کام کیا لیکن پھر انہیں نمونیہ ہو گیا اور وہ 1929ء میں انگلستان واپس چلے آئے۔ ان کی اولین کتاب ''لندن اور پیرس کے برے حال اور بانکے دیہاڑے'' 1933ء میں شائع ہوئی جس میں انہوں نے گندی میلی بستیوں کی زندگی اور کم آمدنی کے حامل معلموں کے احوال کی تصور کشی کی ہے۔ اورول خود مدرس رہے، کتابوں کی دکان پر ملازمت کرتے رہے اور کتابوں پر تبصرے تحریر کرتے رہے اور ساتھ میں ایام برما (1934ء) ایک پادری کی بیٹی (1935ء) اور کیپ دی ایسپی ڈسٹر افلائنگ (1936ء) جیسی کتب تصنیف کرتے رہے۔

1936ء میں اورول نے ایک خاتون ایلین شوئیسی سے شادی کر لی جس کے بعد لیفٹ بک کلب والوں نے انہیں غریبوں اور بیروزگاروں کے بارے میں لکھنے کیلئے رکھ لیا۔ ان کی اس دور کی تحریروں نے ان کا بطور ایک سیاسی ادیب نام مستحکم کر دیا۔ وہ 1936ء میں خانہ جنگی دیکھنے اور اس میں حصہ لینے کیلئے سپین بھی گئے جہاں وہ 1937ء میں زخمی بھی ہوئے۔ انگلینڈ واپسی پر انہوں نے مرحبا کیٹلونیا (1938ء) لکھی جس میں انہوں نے قدامت پسند بائیں بازو کو تنقید کا نشانہ بنایا گو وہ خود کو ایک انقلابی اور اشتراکیت پسند تصور کرتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ان کی انگریز فوج میں شامل ہونے کی خواہش بوجہ خرابی صحت پوری نہ ہو سکی لیکن وہ بہت سے داخلی محاذوں پر کام کرتے رہے جس میں ان کے بی بی سی کے ساتھ گزارے دو سال (1941ء۔ 1943ء) بھی شامل ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے وہ دو ناول تخلیق کئے جن کی وجہ سے ان کا

نام آج تک زندہ ہے۔ یہ اینمل فارم (1944ء) اور 1984ء (1949ء) کے عنوانات سے شائع ہوئے اور ان میں معاشرے میں اتھارٹی کے کردار اور حکمرانوں کی طاقت کو بہت بری طرح رگیدا گیا تھا۔ اورول مسلسل تپ دق کا نشانہ بنے رہنے کے بعد بالآخر لندن میں انتقال کر گئے۔

اووڈ (43ق م۔17ء)

ایک اہم رومن شاعر۔ انہیں عہد آگسٹس کی اہم ترین ادبی شخصیات میں تصور کیا جاتا ہے۔ حسیت اور شستگی فصاحت ان کے کلام کے نمایاں محاسن ہیں۔ ان کے تخلیقی شاہکار تغیرات (Metamorphoses) کو کلاسیکی دیومالائی کہانیوں کے ایک اہم ذریعے کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اووڈ کا اثر ان کے بعد کے ادوار میں لکھنے والے رومن شعرا پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ شعرا ان کے اثرات ازمنہ وسطی خصوصاً بارہویں صدی میں ایک بار پھر قبول کرتے اور ان کے اسلوب اور مضامین دونوں سے استفادہ کرتے نظر آئے۔ انہیں یورپی نشاۃ ثانیہ (رینی ساں) کا سب سے اثر آفریں لاطینی شاعر تصور کیا جاتا ہے اور تو اور ملٹن اور شیکسپیئر جیسے نشاۃ ثانیہ کے بعد بعض بڑے شاعر بھی اس سے فیض حاصل کرتے نظر آتے ہیں۔

اووڈ کا پورا نام پبلیس اووڈیئس ناسو تھا اور وہ روم سے نوے میل مشرق میں واقع ایک قصبے سلمو (حال سلمونہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک سردار (نائٹ) تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا بھی بڑا ہو کر خاندانی عزت و مرتبے کے شایان شان کسی عزت دار پیشے سے منسلک ہو۔ ان کی خاص طور پر خواہش یہ تھی کہ اووڈ وکیل بنے اور اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے اووڈ کیلئے فصاحت و بلاغت اور فن خطابت کی اچھی سے اچھی تعلیم کا بھی اہتمام کیا۔ اس تربیت نے اووڈ کے اسلوب پر بھی گہرے اثرات مرتب کئے اور اسے شستگی و پرکاری اور ناصحانہ پن کے اوصاف سے متصف کیا۔ اووڈ نے عدلیہ میں کئی چھوٹے چھوٹے منصوبوں پر کام کیا اور پھر خود کو مکمل طور پر شاعری کیلئے وقف کر دیا۔

اووڈ کی تقریباً سب کی سب ابتدائی نظمیں مرض دل یعنی عشق کے بارے میں ہیں۔ انہوں نے بعد میں اپنی ابتدائی بہت سی تخلیقات کو ضائع کر دیا اور جو بچ گئیں وہ ''معاشقے'' کے عنوان سے پانچ مجموعوں کی شکل میں بیس برس کے عرصے میں شائع ہوئیں اور اس عمل کا آغاز 20 ق م میں ہوا۔ ان میں سے بیشتر منظومات اووڈ کے کورنا نامی ایک کافر ادا حسینہ سے عشق کے بارے میں ہیں جس کے بارے میں بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ محض ایک خیالی محبوبہ تھی۔ اسی عہد کے دوران اووڈ نے ''ہیروئینیں'' کے نام سے بھی ایک مجموعہ لکھا جس میں محبت کی لطافتوں پر مزید خامہ

http://muftbooks.blogspot.com/

فرسائی کی گئی ہے۔اس دور کے دوران لگتا ہے کہ اووڈ کی اپنی رومانوی زندگی بھی خوب نمو پائی۔ انہوں نے تین شادیاں کیں۔ان کی تیسری بیگم ان کے مربی پولس فیبئیس میکسیمس کی قرابت دار تھیں۔

اووڈ نے 1 ق م کے لگ بھگ اپنی تین جلدی تصنیف ''فن عشق'' مکمل کی۔اس کی پہلی دو جلدوں میں مردوں کو لڑکیاں پھنسانے کے طریقے بتائے گئے ہیں جبکہ تیسری جلد میں خواتین کو مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ اس قدر مقبول ہوا کہ اس سے شہنشاہ آگسٹس کی اخلاقی اصلاح کی کوششوں پر پانی پھر گیا۔اس تصنیف میں بعض مقامات پر رمز وایمائیت کے انداز میں آگسٹس پر پھبتیاں بھی کسی گئی ہیں۔

اووڈ نے میڈیا کا اپنا ایک ورژن بھی تحریر کیا جواب ناپید ہو چکا ہے۔انہوں نے ''فاستی'' (تقویم) بھی لکھنا شروع کی۔ان کا خیال تھا کہ وہ سال کے مختلف مہینوں سے متعلق نظموں کا ایک دور تصنیف کریں گے، تاہم وہ اپنی وفات تک صرف چھ دور ہی قلمبند کر پائے۔''تغیرات'' جو 8 ق م تک مکمل ہو چکی تھی، ایسے کرداروں کے متعلق مختلف کہانیوں پر مشتمل ایک رزمیہ ہے جو اپنی شکل تبدیل کرتے رہے ہیں۔ یہ نظم زمانی ترتیب کے مطابق آگے بڑھتی ہے اور تخلیق عالم سے لے کر جولیئس سیزر کے دور تک کا سفر طے کرتی ہے۔اووڈ نے اس تخلیق کے توسط سے بڑی مہارت اور چابکدستی سے یونانی ورومن دیومالا کی پرانی کہانیوں میں ایک نئی جان پیدا کر دی۔اووڈ کی کہانیاں طبیعی تغیرات سے متعلق کم اور انسانی جذبے سے متعلق زیادہ ہیں: تغیرات خالصتاً طبیعی ہیں جبکہ کرداروں کے اہم ذاتی اوصاف غیر متغیر رہتے ہیں۔

''تغیرات'' کی تکمیل کے کچھ ہی عرصہ بعد اگسٹس نے اووڈ کو ملک بدر کر دیا اور اس کی کتابوں کو سرکاری کتب خانوں سے نکال دیا گیا۔اس کی جلاوطنی کی مکمل وجوہات ابھی تک نامعلوم ہیں تاہم اووڈ کہتا ہے کہ اس کا سبب ایک تو ''فن عشق'' تھا اور دوسرا ایک اور ''غلطی'' تھی۔اب اللہ جانتا ہے کہ یہ ''غلطی'' کیا تھی۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس غلطی سے مراد اووڈ کو شہنشاہ کی بیٹی جولیا کی موج مستیوں کا علم ہونا اور اسے بادشاہ کے علم میں نہ لانا تھا۔اووڈ نے اپنی سزا کے خلاف احتجاج کے طور پر ''تغیرات'' کے اصلی مسودے کو جلا ڈالا (اگرچہ اس کے دوستوں کے پاس اس کے نسخے موجود تھے) لیکن اس کے باوجود اسے 8ء کے آخر میں بحر اسود میں ٹومس (رومانیہ میں) جلاوطن کر دیا گیا۔اگرچہ اس سرحدی قصبے پر آئے دن تند خو شمالی قبائل حملے کرتے رہتے تھے اور یہاں کی سردیاں بھی بہت غضبناک تھیں، اووڈ کو یہاں بہت عزت ملی اور اسے ٹیکسوں سے بھی

http://muftbooks.blogspot.com/

مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ اس کے باوجود اووڈ کی اس دور کی تخلیقات شکوک اور واپسی کی ناکام التجاؤں سے لبریز ہیں (''بحر اسود کے نالے اور نامے'')

ایزٹیک

میسو امیریکن انڈین باشندے۔ ہمیں ایک فرانسسکن پادری برنارڈینو ڈی سہاگن کی بدولت ان باشندوں کی قدیم تاریخ وثقافت کے بارے میں بہت سی باتوں کا علم ہوا ہے جو 1520ء میں میکسیکو آیا اور اس نے یہاں کی مقامی زبان منہوا ایتل سیکھی اور پھر اپنے مشاہدات کو تحریری شکل دی۔ سہاگن نے 1547ء اور 1577ء کے درمیانی تیس برس کے عرصے میں ایزٹیک عمائدین اور پروہتوں سے لاتعداد کہانیاں اور قصے سنے جن سے ان باشندوں کی مذہبی، سائنسی، سیاسی، خانگی اور معاشی زندگی کے بارے میں بہت سی باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ سہاگن نے ان کہانیوں کو بعد ازاں قدیم میکسیکو کی تاریخ (77-1547) کے عنوان سے ہسپانوی اور منہوا تل زبانوں میں کتابی شکل میں مرتب کیا۔

ایزٹیک باشندوں کا اصل وطن ایزتلان (سفید سرزمین) تھا۔ بعد میں انھوں نے وسطی میکسیکو میں ٹولٹک تہذیب کو تسخیر کیا اور چچمک قبائل کے اپنے خانہ بدوش آباؤ اجداد کے رہن سہن کو ترک کر کے کسان بن گئے۔ انھوں نے زراعت وآبپاشی کے شعبے میں نئے نئے تجربے کیے اور بچے کھچے ٹولٹک شہروں کو بڑے شہری مراکز میں بدل دیا۔ اپنے نقطہ عروج پر ایزٹیک سلطنت کی سرحدیں وسطی میکسیکو سے لے کر یوکاٹان تک پھیلی ہوئی تھیں اور اس کا مقابلہ پیرو میں آباد انکاز سے تھا۔

ایزٹیک معاشرت طبقات میں منقسم تھی اور اس کے باشندے تین بڑی ذاتوں پر مشتمل تھے:

پیلٹن (اشرافیہ)

میسہال (عام لوگوں کا طبقہ)

میکس (غلام، مزارعے اور کمیرے)

مزارعے نجی یا سرکاری املاک سے منسلک تھے جبکہ کمیرے خود کو یا اپنے کنبے کے ارکان کو ایک خاص مدت کے لیے بیچ دیتے تھے۔ غلاموں کو کارکنوں اور مزدوروں کے طور پر ملازم رکھا جاتا تھا مگر عموماً انھیں قابل صرف دولت کی طرح استعمال کیا جاتا تھا اور مذہبی مواقع پر قربان کیا جاتا تھا۔ اشرافیہ سے متعلق بزرگ کم سن افراد کی تعلیم وتربیت کے ذمہ دار تھے اور پروہت انسان اور

دیوتاؤں کے درمیان وکیلوں کا کردار ادا کرتے تھے اور رسومات اور قربانیاں سرانجام دیتے تھے۔ ایزٹیک معاشرے میں تتبع وتقلید کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ اور مروجہ اقدار سے روگردانی کرنے والے افراد کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ زنا، چوری، قتل اور جنگ میں نافرمانی کی سزا موت تھی۔ عورتوں اور مردوں کے اپنے اپنے منصب تھے۔ مرد کھیتوں میں محنت کرتے تھے جبکہ خواتین گھر اور کنبے کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ خواتین کو اپنی جائیداد بنانے، مقدمات دائر کرنے اور کاروباری معاہدوں میں شامل ہونے کی اجازت تھی مگر مردوں کے مقابلے میں ان کے حقوق بہت کم تھے۔ ایزٹیک اپنی ذات برادریوں میں شادیاں کرتے تھے اور بڑے لوگوں میں ایک سے زیادہ شادیوں کا رواج عام تھا۔ جب ہسپانوی فاتح پرنان کورٹیس (1485ء۔1547) نے 1521ء میں ایزٹیک دارالحکومت ناچ ٹٹلان پر قبضہ کر کے اس تہذیب کا خاتمہ کیا تو صدیوں کے پسے وہ مقامی لوگ بھی اس کی مدد کو نکل آئے جو ایزٹیک معاشرے کے جابرانہ قوانین سے تنگ آ چکے تھے۔

ایزٹیک باشندے خود کو جنگ کے دیوتا ہوٹزی لوپوچٹلی کے خاص بندے تصور کرتے تھے اور خود کو 'بندگان شمس' کہلاتے تھے۔ ان کی آفرینشی حکایت کے مطابق پہلے چار سورج ہوا کرتے تھے۔ پھر پانچویں سورج کی یہ موجودہ دنیا وجود میں آئی جو آخر میں قیامت کے دن تباہ ہو جائے گی۔ ایزٹیک باشندے اس سورج کو خوش رکھنے کے لیے کہ کہیں وہ بھی غائب نہ ہو جائے انسانی قربانیاں دیتے تھے اور خون اور دل خوراک کے طور پر مہیا کرتے تھے۔ غلاموں، خصوصاً انھیں جو جنگوں میں پکڑے جاتے تھے، دیوہیکل ایزٹیک معابد میں ذبح کیا جاتا تھا۔ مذہبی رسومات میں آدم خوری کا بھی رواج تھا۔ مایا تقویم سے ماخوذ رملی سنگ تقویم، ٹونال پوہولی کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ یہ ایزٹیک تقدیر پر حاوی ہے اور مقدر کے سب فیصلے اسی کے مطابق ہوتے ہیں۔ شمسی سال 18 مہینوں پر مشتمل تھا۔ ہر مہینے کے 20 دن اور پانچ اضافی 'منحوس' ایام تھے۔ وقت کو باون سالہ ادوار میں بھی تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہ ادوار کائنات کی دوری پیدائش اور تباہی کے ایزٹیک اور مایا عقیدے کے مطابق تھے۔ ہر دور کے خاتمے پر گھریلو برتن اور مورتیاں تبدیل کر دی جاتی تھیں اور بڑی بڑی قربانیں سورج کی نذر کی جاتی تھیں۔ متذکرہ سنگ تقویم قیامت کی پیش گوئی کا کام بھی کرتا تھا۔ قیامت کے بارے میں ایزٹک لوگوں کا عقیدہ تھا کہ ایک بہت بڑا زلزلہ آئے گا جو پانچویں سورج کی اس دنیا کو ملیامیٹ کر دے گا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی، برٹش

ایک تجارتی کمپنی۔ آغاز میں یہ ایک خالصتاً کاروباری ادارہ تھا جس کے قیام کی اجازت

تاج برطانیہ نے1600 میں ایسٹ انڈیز کے مصالحے کی تجارت میں برطانیہ کی شمولیت کو یقینی بنانے کی خاطر دی تھی۔ یہ کمپنی ایک گورنر اور چوبیس اراکین پر مشتمل ایک کمیٹی کے ذریعے نظام چلاتی تھی اور یہ اٹھارھویں صدی کے شروع سے لے کر انیسویں صدی کے وسط تک علاقے میں برطانوی سامراجی سرگرمیوں کے عروج کے دور (1708ء۔1873ء) میں ہندوستان کے سیاسی منظر پر چھائی رہی۔ یہ کمپنی صدیوں کے عمل سے ہندوستانی اقتدار تک پہنچی جو اہل ہند اور متصادم استعماری طاقتوں کے ساتھ ایک طویل جدوجہد کا نتیجہ تھا۔ برطانوی انڈونیشیا میں ولندیزیوں کے ہاتھوں ایک خوفناک شکست کھانے کے بعد مصالحے کی اس انتہائی فائدہ مند تجارت سے پیچھے ہٹ گئے، انھوں نے اپنی توجہ ہندوستان سے کپڑا برآمد کرنے پر مرکوز کر لی۔ اور پورے ہندوستان میں اپنی بستیاں اور اڈے قائم کر لیے۔1640ء میں کمپنی نے مدراس شہر کے لیے جگہ خریدی؛1668ء میں چارلز دوم نے ممبئی کے گردوپیش کا علاقہ کرائے پر دے دیا اور 1690ء میں کمپنی نے بنگال میں کلکتہ شہر کی بنیادیں قائم کرنا شروع کر دیں جہاں وہ چاندی اور تانبے کے بدلے کپڑے اور ریشم کی تجارت کرتے تھے۔

ان تینوں بندرگاہوں یعنی مدراس، کلکتہ اور ممبئی پر برطانوی قلعے تعمیر کیے گئے اور انھوں نے کمپنی کے شاندار تجارتی بیڑے کے قیام میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ چارلز دوم کے عہد اقتدار (85-1660ء) میں کمپنی نے سکے بنانے کے حق، قوانین بنانے اور تبدیل کرنے کے اختیار اور جنگ شروع یا بند کرنے کے اختیار کے بشمول وہ حقوق و اختیارات بھی حاصل کر لیے جو عام طور پر آزاد ریاستوں کے پاس ہوتے ہیں۔

1761ء میں برطانیہ نے اپنے حریف فرانس کو وانڈواش کی لڑائی میں تسخیر کر لیا۔ کمپنی نے ہندوستانی ریاستوں کے نیم خودمختار سلطانوں کے ساتھ ''اتحاد'' تشکیل دے کر خطے کی داخلی بے چینی سے بھی فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ برطانوی افواج ان سلطانوں کو ان کی وفاداری اور ٹیکسوں میں براہ راست چھوٹ کے عوض ''تحفظ'' فراہم کرتی تھی۔ برطانوی پارلیمان جو کہ کمپنی کی بڑھتی ہوئی طاقت سے تشویش میں مبتلا تھی، نے اسے برطانوی کابینہ کے ماتحت کر کے لارڈ ہیسٹنگز کو ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل مقرر کر دیا تا کہ کمپنی اور ریاست کے درمیان تعلقات کو استحکام دیا جا سکے۔ پٹ کے1784ء میں منظور کیے جانے والے انڈیا ایکٹ کی رو سے برطانوی حکومت کی نمائندگی کے لیے ایک بورڈ آف کمشنرز تشکیل دے دیا گیا تا کہ یہ ہندوستان کے برطانوی علاقوں پر سیاسی، عسکری اور مالی نگرانی رکھ سکے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

جیسے جیسے کمپنی کی سیاسی طاقت میں اضافہ ہوتا گیا، اس کا تجارتی کردار ماند پڑتا گیا۔ 1813ء اور 1833ء کے چارٹر ایکٹوں کے وقت تک اس کی ہندوستان اور مشرق بعید کی تجارت پر اجارہ داری ختم ہو چکی تھی اور یہ خود کو محض ایک انتظامی ادارہ خیال کرنے لگی تھی۔ کمپنی اپنی فوجی و مالی ضروریات اراضی پر ناروا ٹیکس عائد کر کے پوری کرتی تھی۔ اس پالیسی نے بہت سے کسانوں اور چھوٹے زمینداروں کی کمر دہری کر دی اور انھیں زمینداری ترک کر کے پہلے سے کھچا کھچ بھرے شہروں کا رخ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے توسط سے نافذ کی گئی برطانوی سامراجی حکومت نے ثقافتوں کا پیچیدہ اور تہہ دار ملغوبہ تیار کر دیا تھا۔ جہاں کمپنی کے افسر اہندوستانی زبانیں اور رسم و رواج سیکھنے میں لگے ہوئے تھے، ہندوستانی باشندے انگریزی زبان سمیت برطانوی سلطنت کے مختلف لوازمات سے نبرد آزمائی کرتے تھے۔ 1830ء میں اردو کے ساتھ انگریزی کو بھی سرکاری زبان کا درجہ مل گیا۔ تعلیمی میدان میں غیر ملکی حکمرانوں نے فنڈ کچھ اس طور سے استعمال کیے کہ مدارس میں کلاسیکی ہندی علوم و فنون کی بجائے یورپی زبان و ادب کا رواج ترقی پا گیا اور انگریزی بولنا عزت و رتبے کی نشانی سمجھا جانے لگا۔ ثقافتی اقدار میں بھی تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور بعض اوقات اس کے لیے جبری طریقے بھی استعمال کیے گئے۔ لارڈ ولیم بینٹنک کے دور (36-1826)ء میں کمپنی نے صدیوں سے چلی آتی ستی کی رسم پر سرکاری طور پر پابندی نافذ کر دی۔

کمپنی کے ہندوستان میں تین سو سالہ تسلط کے دوران ہندوستان کے مقامی لوگ اس کے اثر و رسوخ کا مقابلہ کرتے رہے۔ 1818ء سے 1857ء تک کا زمانہ جہاں کمپنی کی طاقت کے عروج کا زمانہ تھا وہاں ہندوستان میں بہت سی قبائلی لڑائیاں اور کسان بغاوتیں بھی دیکھنے میں آئیں۔ 1851ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن، دکن ایسوسی ایشن، مدراس نیٹو ایسوسی ایشن اور بمبے ایسوایشن جیسی مقامی لوگوں کی قائم کردہ تنظیموں نے مل کر یہ سوچ بچار کی کہ کمپنی کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے اور اگر ختم نہیں تو اس کی اصلاح کیسے عمل میں لائی جا سکتی ہے۔ 1857ء کی جنگ آزادی نے کمپنی کی طاقت پر برطانوی اعتماد کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس جنگ آزادی کا محور مغلیہ سلطنت کے آخری فرمانروا بہادر شاہ ظفر تھے جسے کمپنی کی فوجوں سے شکست کھائے بمشکل دس سال ہی ہوئے تھے۔ جنگ میں مقامی لوگوں کو شکست ہوئی اور بہادر شاہ کو ملک بدر کر کے رنگون بھیج دیا گیا اور تاج برطانیہ نے کمپنی کے اختیارات ختم کر کے ہندوستان کو براہ راست اپنی عملداری میں لے لیا۔

ایسٹر

http://muftbooks.blogspot.com/

عیسائیوں کا مذہبی تہوار جو حضرت عیسیٰؑ کے دوبارہ جی اٹھنے کی یاد میں ہر سال منایا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے حواری ایسٹر نہیں مناتے تھے بلکہ وہ کوئی دن بھی نہیں مناتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یسوعؑ کے دوبارہ زندہ ہونے کے بعد ہر یوم ہی مبارک ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے عیسائیت قبول کرنے والی قوموں نے اپنے بہار کے تہواروں کو عیسوی رنگ دیا یہ تہوار مسیحیین کے لیے اہمیت اختیار کرتا گیا۔ اس مبارک تہوار کو ''متحرک میلہ'' بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی تاریخ ہر سال بدلتی رہتی ہے۔ عموماً اسے اکیس مارچ (جب سورج میکھ کے پہلے خط میں پہنچتا ہے) کے بعد پہلے پورے چاند کے بعد آنے والے پہلے اتوار کو منایا جاتا ہے۔ تاہم عیسیٰؑ کی وفات کے بعد کی اولین صدیوں میں اس تہوار کی صحیح تاریخ پر عیسائیوں کے آپس میں بہت سخت جھگڑے ہوئے۔ عیسیٰؑ کے یہودی النسل پیروکار ایسٹر کا ہفتہ اپنے روایتی یہودی تہوار عید فسح کے دنوں میں مناتے تھے لیکن غیر یہودی مسیحیوں نے اس تہوار کو ایسے منانا شروع کر دیا جیسے یہ مغرب میں اب منایا جاتا ہے۔

رومن شہنشاہ نے 325ء میں جو مشہور اجلاس بلایا تھا اس کا ایک مقصد اس مسئلے کو بھی حل کرنا تھا۔ اس اجلاس میں یہ فتوی صادر کیا گیا کہ ایسٹر کی تاریخ کے سلسلے میں اب ''یہودیوں کے اندھے پن'' کی مزید پیروی نہیں کی جائے گی۔ تاہم ایسٹر کی مغربی اور مشرقی تاریخوں کے مابین کچھ اختلاف اب بھی باقی ہے۔

ایسٹر کے ساتھ وابستہ رسومات میں یہودی اثرات کے ساتھ عیسائیت سے پہلے کی بہت سی دیگر روایات بھی شامل ہو چکی ہیں۔ اس تہوار کا نام ہوسکتا ہے بہار کی ٹیوٹونک دیوی اشتر سے نکلا ہو۔ ایسٹر کا تعلق یہودی عید فسح اور یونانی دیوی پرسیفونی کی ہر سال بہار میں پاتال سے واپسی کی دیومالائی حکایت سے بھی جڑا لگتا ہے۔ انڈوں کو شوخ رنگوں میں رنگنے سے لے کر اس تہوار کی نشانی کے طور پر خرگوش کے انتخاب تک تجدید و بار آوری کی کئی علامتیں اب بھی ایسٹر سے متعلقہ روایات میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

اگرچہ ایسٹر اور اس سے پہلے کے مقدس ہفتے کی رسموں میں علاقے علاقے کے رواج کے مطابق بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے، مگر مقدس ہفتے کی سنجیدگی اور ایسٹر کے غل غپاڑے کا امتیاز ایک مشترکہ تھیم دکھائی پڑتی ہے۔ یورپ اور لاطینی امریکہ کے رومن کیتھولک چرچوں میں مقدس ہفتے کے دوران اولیاء کے مجسموں کو ڈھانپ دیا جاتا ہے اور چرچ سے آرائش و زیبائش کی بیشتر چیزوں کو ہٹا دیا جاتا ہے اور سیاہ لباس میں ملبوس پادری اور عام لوگ گزرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسٹرن

http://muftbooks.blogspot.com/

آرتھوڈوکس روایت میں اس تہوار کا محور مبارک ہفتے کے روز نصف شب کا اجتماع ہے جس میں پادری لوگوں کے سامنے پکارتا ہے۔

''یسوع زندہ ہوگیا'' لوگ اس کے جواب میں کہتے ہیں ''ہاں واقعی وہ زندہ ہوگیا'' اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے اپنے ہاتھ میں پکڑی شمعیں جلا لیتے ہیں جس سے تاریک چرچ روشنیوں سے بھر جاتا ہے۔

انڈے رنگنے کی رسم کو بھی خصوصاً ایسٹرن آرتھوڈوکس روایت میں بڑی اہم علامت کی حیثیت حاصل ہے۔ سلووینیا میں خوراک کی ایک ٹوکری عیسیٰؑ مصلوب کی علامت کے طور پر چرچ میں تبریک کے لیے لائی جاتی ہے۔ اس موقع پر دکھائی دینے والا آگ پر بھنا خنزیر کا گوشت عیسیٰؑ کے جسم اور گوشت سے بھری آنتیں ان رسوں کی نمائندگی کرتی ہیں جن سے ان کو باندھا گیا تھا اور پانچ سرخ انڈے ان پانچ زخموں کی علامت کے طور پر شامل کیے جاتے ہیں جن سے جناب مسیحؑ کی موت واقع ہوئی تھی۔ یونان کے بعض علاقوں میں عیسیٰؑ کی تدفین کی نقل میں مقدس ہفتے کے دوران ایک انڈہ ایک جھاڑی کے نیچے رکھ دیا جاتا ہے اور جب ایسٹر کا اتوار آتا ہے تو یہ ''جی اٹھتا ہے''۔ یعنی اسے اٹھا کر انگیٹھی پر رکھ دیا جاتا ہے۔

ایسٹر رائزنگ

آئرلینڈ میں رونما ہونے والی ایک بغاوت۔ یہ آئرلینڈ کے لوگوں کی ایک طویل انقلابی جدوجہد کا نقطۂ عروج تھا جو 1916ء میں ظہور پذیر ہوا۔ 1914ء میں پہلی عالمی جنگ چھڑنے کا فائدہ اٹھا کر تین مقامی تنظیموں نے مل کر برطانوی حکومت کے خلاف ڈبلن بغاوت بپا کی تھی۔ ان تنظیموں میں سے ایک آئرش ریپبلکن برادر ہڈ تھی جس کے سربراہ ٹام کلارک تھا دوسری اس کی ماں آئرش رضا کار تھی جس کے قائد میکنیل اور پیٹرک پیئرس تھے۔ اور تیسری تنظیم سٹیزن آرمی تھی جسے جیمز کونولی نے تشکیل دیا تھا اور جس پر 1913ء کی برطانیہ مخالف ناکام ہڑتال کے کارکنوں کا غلبہ تھا۔ شن فین نامی سیاسی پارٹی بھی اس میں کسی حد تک ملوث تھی۔ اس شورش کے کرشماتی شخصیت کے حامل رہنما پیئرس کو توقع تھی کہ بغاوت بپا ہونے کے بعد عالمی رائے عامہ آئرلینڈ کے لوگوں کی طرف جھک جائے گی۔ تاہم یہ امید حقیقت نہ بن سکی کیونکہ رسد اور سپاہیوں کی تعداد اتنی نہ تھی کہ لڑائی کو چھ دن سے زیادہ جاری رکھا جا سکتا۔ اس شورش کے بارے میں خیال تھا کہ یہ برطانوی حکومت کے خلاف ملک گیر مظاہرے کی شکل اختیار کر لے گی لیکن جب مخبر نے بغاوت کی اطلاع برطانویوں کو بھیجی تو انھوں نے فوراً آئرش قوم پرست رہنما سر راجر کیسمنٹ کو اسلحہ فراہم کرنے کے

جرم میں گرفتار کرلیا۔ میکنیل نے بغاوت منسوخ کرنے کی کوشش کی لیکن کلارک اور پیئرس سٹیزن آرمی کے 200 اور آئرش رضا کاروں کے 1500 سے زائد ارکان کو حرکت میں لے آئے۔ ایسٹر سوموار کے روز جو کہ ایک دن کے التوا سے 24 اپریل 1916ء کو پڑا، ڈبلن شہر میں اہم مقامات خصوصاً ڈاکخانے پر قبضے سے شورش کا آغاز ہوگیا۔ پیئرس نے آئرش جمہوریہ اور اس کی عبوری حکومت کے قیام کا اعلان کردیا جس کا صدر اور کمانڈر انچیف وہ خود تھا۔ برطانیہ والوں نے ردعمل میں ڈبلن کے باغیوں کے ٹھکانوں پر حملے شروع کردیے۔

برطانوی فوجیوں اور آئرش حریت پسندوں کے درمیان ڈبلن کے گلی کوچوں میں تقریباً ایک ہفتے تک دوبدو لڑائی ہوتی رہی۔ ہر طرح کے کیل کانٹے سے لیس برطانوی فوج شہر پر مسلسل گولے برسا رہی تھی لہٰذا پیئرس اور چودہ دیگر حریت پسند رہنماؤں کو ہتھیار پھینکنے پر مجبور ہونا پڑا۔ باغی رہنماؤں پر مقدمہ چلا اور انھیں سزائے موت دے دی گئی۔ آئرلینڈ کے عوام اور باغیوں نے اس اقدام کو ظلم سے تعبیر کیا۔ بہت غم وغصہ اور اشتعال دیکھنے میں آیا اور سزا پانے والے حریت پسندوں نے شہدا کا درجہ حاصل کرلیا۔ 1918ء میں ہونے والے آئندہ انتخابات میں جمہوری شین فین پارٹی نے واضح برتری حاصل کرلی۔ سارا ڈبلن جوش وخروش اور تشدد وخونریزی کے سیلاب کی لپیٹ میں آگیا جس میں برطانوی پشت پناہی سے چلنے والی آئرش حکومت تنکے کی طرح بہہ گئی۔ برطانیہ والوں نے اپنی حکومت قائم رکھنے کی کئی ناکام کوششیں کیں لیکن بالآخر انھیں 6 دسمبر 1921ء کو آئرلینڈ کی آزاد ریاست کے قیام کو قبول کرنا پڑا۔

ایسٹرن آرتھوڈوکس چرچ

آرتھوڈوکس کیتھولک چرچوں کو ہی عام زبان میں ایسٹرن آرتھوڈوکس کہا جاتا ہے۔ یہ دین عیسوی کے تین بڑے مسالک میں سے ایک ہے۔ بقیہ دو رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مسلک ہیں۔ بعض اوقات اس کے لیے یونانی آرتھوڈوکس چرچ کا نام بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

ابتدائی صدیوں کے دوران عیسائی چرچ پانچ بڑے خطوں (Patriarchates) میں منقسم تھا جن کے مراکز روم، سکندریہ قسطنطینہ، انطاکیہ اور یروشلم تھے۔ ہر خطے میں ایک بڑا بشپ مقرر تھا جو اس کا نظام خودمختارانہ طور پر چلاتا تھا۔ پانچویں صدی میں آکے سینٹ پال کے جانشین ہونے کی وجہ سے روم کے بشپ کی دینی معاملات میں بالادستی کو تسلیم کیا جانے لگا لیکن اس صدی کے اواخر میں مذہبی تفرقے اور سیاسی قوت کی نقل مکانی سے ایسٹرن چرچوں کی فرماں برداری میں ضعف پیدا ہوگیا اور ظاہر ہے ساتویں صدی میں اسلام کی اشاعت سے بھی بہت فرق پڑا۔

http://muftbooks.blogspot.com/

قسطنطینہ جو کہ بازنطینی سلطنت کا پایہ تخت تھا، کا بشپ مشرق میں، خصوصاً دسویں صدی میں روس میں عیسائیت کے پھیلاؤ کے بعد بہت زیادہ اثر ورسوخ حاصل کر گیا۔ ''تقسیم عظمیٰ'' کے لیے عموماً سن 1054ء کا حوالہ دیا جاتا ہے یہ وہ سال ہے جب پوپ لیونہم اور قسطنطنیہ کے بشپ نے ایک دوسرے سے قطع تعلقی کا اعلان کیا تھا۔ تاہم مشرقی اور مغربی چرچوں کے درمیان کوئی واضح اور سرکاری طور پر قطع تعلقی دیکھنے میں نہ آئی بلکہ تیرھویں اور سولھویں صدی کے درمیان مصالحت کی بہت سی رسمی کوششیں بھی کی گئیں۔ دو واضح طور پر مختلف وممیّز عقیدوں کی نمووارتقاء میں سینکڑوں برس کا عرصہ لگا۔

آج کے دور میں ایسٹرن آرتھوڈوکس چرچ کئی خودمختار چرچوں پر مشتمل ہے جن کا اپنا ایک الگ الگ بشپ ہے۔ اس ملک میں کسی مرکزی حکومت یا پوپ کا وجود نہیں تاہم قسطنطینہ کے بشپ کو بروئے روایت احترام دیا جاتا ہے۔ آرتھوڈوکس چرچ کی اجتماعی طور پر نمائندگی بشپوں کی ایک مجلس کرتی ہے۔

اس ملک کے مختلف چرچوں میں عقیدے اور طریقہ عبادت کے اعتبار سے فرق پایا جاتا ہے لیکن وہ سب عیسیٰؑ کے حواریوں کی روایت فتاویٰ نائسین، سات ایکومینیکل کونسلوں، سات رسموں اور بازنطینی طریقہ عبادت کی پیروی پر متفق ہیں۔ وہ ازلی گناہ، پوپ کی معصومیت، برزخ، پادریوں کی شادی maintainence of religious orders اور doctrine of indulgences کے متعلق رومن کتھولک چرچ کے موقف سے اختلاف پر بھی متفق ہیں۔ عددی اعتبار سے روسی آرتھوڈوکس چرچوں کو برتری حاصل ہے جبکہ اس کی رسومات اکثر اوقات سلاو اور رومانی زبان میں ادا کی جاتی ہیں۔ 1986ء میں اس کے کل اراکین کی تعداد کا تخمینہ 90 ملین تھا (بعض ذرائع کے مطابق یہ تعداد 200 ملین ہے) ان میں سے نصف افراد اس وقت کے سوویت یونین میں آباد تھے جو اب ٹوٹ کر کئی ریاستوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔

ایسکائی لس (525 تا 456 قبل مسیح)

یونانی ڈرامہ نگار۔ ایسکائی لس ایلسیس میں پیدا ہوا اور اس نے ڈرامہ نگار کے طور پر اپنے کام کا آغاز 490 قبل مسیح میں کیا۔ وہ اپنے عہد کا مشہور ترین المیہ نویس تھا اور اس نے جشن ایتھنز کے موقع پر منعقد ہونے والے مقابلوں میں تیرہ مرتبہ فتح حاصل کی تھی۔ اس دور کے رواج کے مطابق ایسکائی لس نے اپنے کئی ڈراموں میں مرکزی کردار خود ہی ادا کیا۔ ڈرامے کے فن میں اس کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے کورس کے کردار میں تخفیف کر کے اور سٹیج پر ایک ہی وقت میں ایک سے

زیادہ کرداروں کو متعارف کرا کے صنف المیہ کی ڈرامائی صلاحیتوں کو توسیع دی۔

اگرچہ کہا جاتا ہے کہ اس نے نوے ڈرامے تصنیف کیے لیکن اس وقت اس کے نام سے صرف سات ڈرامے ہیں جو باقی بچے ہیں اور ان کا شمار یونانی ڈرامے کی قدیم ترین تخلیقات میں ہوتا ہے۔ چھ ڈرامے ایسے ہیں جن کہ بارے میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اسی کے ہیں:

1 The Persians (472BC)
2. Seven against Thebes (467)
3. The Suppliant women (466-459)
4. Agamemnon
5. The Libation-Bearers
6. Eumenides

Prometheus Bound بھی ایسکائی لس سے منسوب کیا جاتا تھا لیکن اب ماہرین کے ہاں یہ خیال زور پکڑ چکا ہے کہ اس کا تعلق بعد کے کسی دور سے ہے۔

ایسکائی لس اپنی تخلیقات میں انسانی تاریخ کی عکاسی، جرم و انتقام، عزت و آن اور وغرور وتکبر کے ایک سلسلے کے طور پر کرتا ہے۔ وہ دیوتاؤں کے عجیب وغریب مطالبوں اور سزاؤں کی ستائی اور لافانی خداؤں کے پرغیض جذبات کے ہاتھوں جرم و یاس کے نرغے میں اترتی نوع انسانی کی نازک صورت حال کو تماشائیوں کے سامنے ایک ڈرامائی رنگ میں پیش کرتا ہے۔ تاہم بعض ناقدین کا خیال ہے کہ ایسکائی لس کو اس بات کا یقین تھا کہ اخلاقی زوال اور بگاڑ کے منحوس سلسلے کو توڑا جا سکتا ہے اور ایتھنز کی جمہورت کا مستقبل المیے سے نجات کا راستہ دکھا سکتا ہے۔

ایل خان

وہ منگول خاندان (1256ء۔1353ء) جس نے تیرہویں اور چودھویں صدی میں ایران پر حکومت کی۔ چنگیز خان کے مفتوحہ علاقے کی تقسیم کے بعد ایران، میسوپوٹیمیا، شام اور شاید مصر کی تسخیر کا کام اس کے پوتے ہلاکو خان کے حصے میں آیا۔ ہلاکو تیرہویں صدی کے ربع ثانی میں ایران پر حملہ آور ہوا جس کے بعد منگول لشکر نے میسوپوٹیمیا کی طرف پیش قدمی جاری رکھی اور 1258ء میں مشرق وسطیٰ کے اہم ترین شہر اور اسلامی دنیا کے دارالخلافہ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس کے بعد منگول فوجیں شام کی طرف بڑھتی چلی گئیں تاوقتیکہ ترکوں نے ان کے قدم روک دیئے۔ تاہم منگول ایران پر اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گئے جہاں انہوں نے 1359ء تک حکومت کی۔ یہاں حکومت کرنے والے منگول بادشاہ ایل خانی کہلاتے تھے۔ ایل کا

مطلب کمتر یا نائب تھا اور وہ خود کو ایل خانی چین میں برسر اقتدار اور ترک تاتار اور منگول قبیلوں پر راج کرنے والے خان اعظم کی تکریم میں کہتے تھے۔ ایل خانی عہد کا پہلا نصف چین سے قریبی انتظامی اور ثقافتی مراسم، نسطوری عیسائیوں، شامانیوں اور بدھ متوں سے ترجیحی سلوک اور ایران کی مسلم آبادی سے دوہرے طرز عمل کی وجہ سے معروف ہے۔ 1295ء میں محمود غزنوی کی تخت نشینی کے بعد چین اور ایل خانیوں کے تعلقات میں کمی رونما ہونے لگی اور انہوں نے خود کو مقامی ترک و فارسی ثقافت میں کھپا دیا۔ تاہم بہت سے منگول اثرات بھی اس دور کے فن تعمیر اور فنون لطیفہ میں اپنا آپ جتاتے ہیں۔ ایرانی آرٹ میں نیوندر اڈالنے کے علاوہ ایل خانی دور علوم کی مختلف شاخوں خصوصاً تاریخ نگاری، نجوم شناسی، اور طب کے فروغ کے اعتبار سے بھی بہت اہم تھا۔

ایلیٹ، ٹی ایس (1888ء۔1965ء)

امریکی شاعر۔ ایلیٹ سینٹ لوئی میں پیدا ہوا اور اس نے ہارورڈ یونیورسٹی سے فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔ وہ 1914ء میں امریکہ سے ہجرت کر کے لندن میں آبسا جس کے بعد اس کی امریکہ واپسی 1932ء میں ہوئی۔ اس وقت تک وہ کلیسائے انگلستان کا رکن اور ایک برطانوی شہری بن چکا تھا۔ اگر ایلیٹ کی تعلیم کو دیکھا جائے تو اسے فلسفے کا پروفیسر ہونا چاہیے تھا لیکن جہاں تک اس کے اپنے ذہن کی بات ہے اس نے کبھی پیشہ تدریس سے وابستہ ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی بجائے اس نے اپنی ساری توانائیاں شاعری، تنقید اور ڈرامہ نگاری کے لیے وقف کیے رکھیں۔ ایلیٹ کی پہلی مشہور نظم ''الفریڈ جے پرفراک کا نغمہ محبت'' (1915ء) تھی جس میں وہ ایک انتہائی لطیف انداز سے جذبات کے بنجر پن اور جنسی انجماد کو شہری معاشرے کے زوال و تنزل کے ساتھ رکھ کر قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔

ایلیٹ جب چھوٹا تھا تو وہ ایک دوسرے امریکی تارک وطن ایذرا پاؤنڈ سے فن شاعری سیکھتا رہا۔ ایلیٹ کی شاعری دیکھیں تو اس پر پاؤنڈ کے بڑے واضح اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ اس نے ایلیٹ کی نظم "He do the police in different voices" کی بڑی بے دردی سے کانٹ چھانٹ کی۔ یہ وہی نظم ہے جو بعد میں ''ویرانہ'' کے نام سے 1922ء میں چھپی اور اپنے خالق کے لیے لازوال شہرت کا باعث بنی۔ یہ نظم ایلیٹ کی سب سے مشہور تخلیق ہے جس میں اس نے سماجی و روحانی تنہائی پر تحقیق کی ہے۔ کسی تنقید نگار نے اسے ''گورے کی جنسی ناکامی کا گیت'' بھی قرار دیا ہے۔ ویسٹ لینڈ نے نئی ادبی جدیدیت کی فتح کے طور پر جلد ہی عوامی و تنقیدی حلقوں میں مقبولیت حاصل کر لی۔

1920ء کے عشرے کے اواخر تک ایلیٹ چرچ آف انگلینڈ سے منسلک ہو چکا تھا۔ 1930ء کے عشرے میں اس نے کلیسا کے لیے بہت سے کھیل لکھے جس میں سینٹ ٹامس اے بیکٹ کی زندگی پر مبنی ڈرامہ ''گرجے میں قتل'' (1935ء) اور ''خاندان کا ملاپ'' (1939ء) شامل ہیں۔ ایلیٹ 1960 کی دھائی تک شاعری، ڈرامے اور تنقید لکھتا رہا۔ اسے 1948ء میں نوبل پرائز اور آرڈر آف میرٹ سے نوازا گیا۔

ایموریم

تالمود کے مصنفین۔ یہ لفظ عبرانی اور آرامی زبانوں سے ماخوذ ہے اور اس کا مطلب 'ترجمان' ہے۔ اس سے مراد یہودی مذہبی علماء کی وہ جماعت ہے جنھوں نے تالمود کو مکمل کیا۔ اسے آپ یہودیوں کا سب سے بڑا ضابطۂ قانون قرار دے سکتے ہیں جو روزمرہ زندگی کے تقریباً تمام معاملات پر محیط ہے۔ تیسری سے چھٹی صدی عیسوی تک ان علماء نے مختلف یہودی دانشگاہوں میں مشنیٰ (غیر تحریری یہودی شریعت) پر ایسے ہی تحقیق کی جیسے کہ مثنائی علماء جنھیں کہ تنا ایم کہا جاتا تھا، نے بائیبل پر کام کیا تھا: اصل متن کی صحیح صحیح تفسیر کر کے۔ فلسطین اور بابلیہ میں سکونت پذیر یہودیوں میں دو مختلف طرح کی تالمود پروان چڑھی اور دونوں اپنے اپنے غیر یہودی پڑوسیوں کے قوانین میں اختلافات کی عکاسی کرتی ہیں۔ چونکہ بابلی تالمود فلسطینی تالمود کے مقابلے میں زیادہ طویل اور مکمل تھی، اسے حتمی مسودہ جانا جانے لگا اور اس کی یہ حیثیت ابھی تک برقرار ہے۔

اینڈرسن، ہانز کرسچین (1805-1875)

ڈنمارک نثر ادادیب۔ اگرچہ اینڈرسن نے ڈرامہ، ناول اور سفرنامے کے بشمول کئی اصناف کو ذریعہ اظہار بنایا، وہ اپنی کہانیوں کی بدولت زیادہ جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے 1835ء سے لے کر 1872ء تک کے عرصے میں کل 168 کہانیاں تحریر کیں۔ ان مختلف نوع کی کہانیوں کے مآخذ بھی مختلف ہیں۔ بعض تو ڈنمارک کی لوک حکایات ہیں اور بعض دوسرے ملکوں کی لوک داستانوں سے ماخوذ ہیں لیکن اس کی بیشتر کہانیاں اس کے اپنے ذہن کی پیداوار ہیں۔ شہزادی اور مٹر کا دانہ، شہنشاہ کے کپڑے اور بدصورت بطخ جیسی کہانیاں پورے کرۂ ارض پر معروف ہیں اور ان کا سینکڑوں زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

اینڈرسن کا بچپن کسمپرسی کے عالم میں گزرا۔ اس کے والدین کوئی زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے

http://muftbooks.blogspot.com/

اور وہ ایک گندے سے علاقے میں پلا بڑھا۔ چودہ برس کی عمر میں اس نے کوپن ہیگن کا سفر اس امید پر اختیار کیا کہ شاید وہ وہاں رہ کر کوئی مشہور اداکار یا گلوکار بن جائے۔ اس میں تو وہ کامیاب نہ ہو سکا تاہم اسے ایک مربی مل گیا جو کوپن ہیگن کے تھیٹر کا ڈائرکٹر تھا۔ اس نے اینڈرسن کی مدد کی تاکہ وہ سکول اور یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کر سکے جس کے بعد اینڈرسن نے بطور ادیب اپنی زندگی کا آغاز کیا اور 1829ء میں اپنی پہلی اہم تحریر شائع کی جو جرمن رومانوی ادیب ہامین کے انداز میں لکھا ایک تخیلاتی افسانہ تھا۔ بعد ازاں اس نے ڈرامے پر بھی ہاتھ آزمایا لیکن وہ اس میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اسے اصل شہرت اپنی کہانیوں کے اس مجموعے سے ملی جو اس نے بچوں اور بالغوں دونوں کے ذوق کو پیش نظر رکھ کر لکھی تھیں۔ اینڈرسن کا اسلوب اپنے زمانے کی ادبی روایت کے لحاظ سے نیا اور مختلف تھا کیونکہ جو محاورے اور فقرے وہ استعمال کرتا تھا وہ بول چال کی زبان سے زیادہ قریب تھے۔ اس نے افریقہ، ایشیائے کوچک اور یورپ میں بہت سے سفر بھی کیے اور اپنے تجربات کو لوگوں کے سامنے کتابی شکل میں پیش کیا۔

ب

بادلیئر، مشارل پیئر (1821ء۔1867ء)

فرانسیسی شاعر۔ اگرچہ بادلیئر نے ایک ہی شعری مجموعہ (برائی کے پھول: 1857ء) شائع کیا لیکن اس کے شعری اسلوب اور علامتی رنگ نے جدید عہد کی مغربی شاعری کی نشوونما پر بہت زیادہ اثرات مرتب کیے ہیں۔ بادلیئر ایک باغی نوجوان تھا اور بغاوت کا یہ عنصر اس کی زندگی اور فن دونوں میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کے والدین بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے اور وہ اپنے سوتیلے باپ کے پاس پلا بڑھا۔ اٹھارہ کے سن کو پہنچنے تک وہ سکول سے خارج ہوا اور اسے وہ جنسی بیماری لگ چکی تھی جو انجام کار اس کی موت کا باعث بنی۔ اس وقت تک وہ ایک بے مہار اور بے راہرو طرز زندگی کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کے سوتیلے باپ نے اسے راہ راست پر لانے کے لیے سمندری سفر پر بھیجا لیکن واپسی پر باپ کا ترکہ اس کے ہاتھ لگا اور وہ پیرس کی ادبی زندگی میں کھو گیا۔ آرٹ کے نقاد کی حیثیت سے اس کا کام بہت اہمیت کا حامل ہے لیکن یہ اس کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کافی نہ تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ اس کے خاندان والوں نے اسے ملنے والے ترکے کو ایک ٹرسٹ کے سپرد کر دیا تھا۔ اس نے 1845ء میں مالی مشکلات، اپنے رشتہ داروں

سے ناچاقی اور اپنی ادبی ناکامیوں سے دل برداشتہ ہوکر خودکشی کی بھی کوشش کی۔ جلد ہی اسے امریکی شاعر اور افسانہ نگار ایڈگر ایلن پو کی تحاریر کے تراجم سے ایک بڑی ادبی کامیابی ملی۔ یہ تراجم بہت مقبول ہوئے اور فرانس میں کلاسک کی حیثیت اختیار کر گئے۔ بادلیئر نے مآل کار 1857ء میں 'برائی کے پھول' شائع کی جو اس کی سالہا سال کی کاوشوں کا ثمر تھا۔ ان نظموں میں علامتوں کا پنا تلا استعمال رومانوی ادیبوں کی بے محابا نثر سے بہت مختلف تھا۔ اسلوب کے اعتبار سے اس کی نظمیں کلاسیکی ہیں لیکن ان کے مضامین ..... حسن فرسودگی اور پیچیدہ جذباتی کیفیات ..... جدید شاعری کے موضوعات کی پیش وائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم اس دور میں ان نگارشات کے بارے میں ماہرین کی رائے یہ نہ تھی۔ اس کی شاعری اس عہد کے مشروع جمالیاتی ذوق کے لیے صدمے کا باعث بنی جس کے باعث اسے تھانے کچہری کے چکر بھی لگانا پڑے۔ اس کی کتاب کو فحش قرار دے دیا گیا۔ اگرچہ اس سے بادلیئر کے جذبات کو بہت ٹھیس پہنچی، اس نے شعر کہنے اور نثر لکھنے کا کام جاری رکھا۔ اس نے 1861ء میں 'برائی کے پھول' کا نیا ایڈیشن مزید اضافوں کے ساتھ شائع کیا لیکن اب اس کی صحت بہت گر چکی تھی۔ بالآخر وہ 1867ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

باکسر بغاوت

چین میں بپا ہونے والی ایک سیاسی شورش۔ یہ بغاوت شمالی چین میں انیسویں صدی میں وقوع پذیر ہوئی۔ اس کا نام ایسا اسے شروع کرنے والے گروہ کی وجہ سے پڑا۔ اس گروہ کے چینی نام یی ہیچوان کا ٹھیک ترجمہ ''نیک اور ہم آہنگ مٹھے'' بنتا ہے۔ بیرونی دنیا میں اس گروہ کے ارکان باکسر کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ گولیوں سے بچنے کے لیے شیڈو باکسنگ سے ملتے جلتے مارشل آرٹس کی مشق کرتے تھے۔ ابتداء میں ان کی تحریک خاندانی اور غیر ملکی حکومت کے خلاف تھی مگر جب جنگ خاندان (1644ء۔1911ء) نے غیر ملکیوں کو چین سے نکالنے کے لیے ان کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تو انھوں نے اپنا نعرہ اور اپنا لائحہ عمل تبدیل کر لیا۔

یہ بغاوت دو بڑے مسئلوں کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ پہلی وجہ تو غیر ملکیوں کے لیے خلاف علاقائی رعائیتوں کے سبب پیدا ہونے والے جذبات تھے۔ 1842ء میں ہونے والے ناتکنگ (اب نانجنگ) معاہدے کے مطابق جاپان نے تائیوان کو قبضے میں لے لیا۔ دوسرا مسئلہ شمالی چین میں پے در پے وارد ہونے والی قدرتی آفات کا سلسلہ تھا۔ مذکورہ بالا علاقوں کے ہاتھ سے نکلنے سے چینیوں کو اس خوف نے آلیا کہ ان کے ملک کو تو غیر ملکی طاقتیں مکمل طور پر آپس میں تقسیم کر لیں

گی۔ دوسری طرف خشک سالی اور سیلاب انھیں یوں لگے جیسے یہ فطری نظام میں کسی خلفشار کے آثار ہیں اور قوم کے لیے کسی بڑی مصیبت یا تبدیلی کی علامات ہیں۔ باکسروں نے داخلی تجارت میں کمی اور بیروزگاری میں اضافے کے لیے غیر ملکی تجارتی تسلط کو موردِ الزام ٹھہرایا اور مشتعل ہو کر 1898ء میں غیر ملکیوں کے خلاف بغاوت بپا کر دی۔ انھیں مبلغین اور چینی عیسائیوں کے خلاف خاص طور پر بہت غصہ تھا۔ 1900ء میں چین میں مغربی مفادات کے تحفظ کے لیے مسلح فوج بھیجی گئی۔ 200 سپاہیوں پر مشتمل یہ فوج پیکنگ (اب بیجنگ) کی طرف روانہ ہوئی لیکن باکسروں نے اسے پیچھے دھکیل دیا اور پیکنگ میں داخل ہو کر بہت سے عیسائیوں کو ذبح کر ڈالا۔ اس کے علاوہ انھوں نے متعدد غیر ملکی سفارت خانوں جہاں غیر ملکیوں اور چینی عیسائیوں نے باکسروں سے بھاگ کر پناہ لے رکھی تھی، کو بھی محاصرے میں لے لیا۔ اگرچہ ڈاؤاِیجر ملکہ غیر ملکی طاقتوں کے خلاف اعلان جنگ کر چکی تھی، چین کے بہت سے علاقائی گورنر جنرلوں نے اس حکم کی طرف توجہ نہ دی جس سے بغاوت کا دائرہ کار سمٹ کر رہ گیا۔ اسی اثناء میں 20000 افراد پر مشتمل ایک بڑی فوج پیکنگ میں داخل ہو چکی تھی جس نے سفارت خانوں کا محاصرہ توڑ ڈالا اور ڈلوَاِیجر ملکہ کو شیان کی طرف فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ آئندہ برس یعنی 1901ء میں چین کو باکسر پروٹوکول پر دستخط ثبت کرنے پر مجبور ہونا پڑا جس کے مطابق چین کو غیر ملکی طاقتوں کو پیسے کی ادائیگی کا کہا گیا تھا اور ان چینی سرکاری ملازمین کے لیے سزا تجویز کی گئی تھی جنھوں نے باکسروں کا ساتھ دیا تھا۔

بالزاک، ہانردی (1799ء۔1850ء)

فرانسیسی ادیب۔ بالزاک کا شمار ادبی حقیقت نگاری کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ فلابئیر اور ستاں دال کی طرح ان کی تحریروں میں بھی روحانیت اور حقیقت نگاری کا ایک انتہائی خوبصورت اور متوازن امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔

بالزاک کو بچپن سے ہی ادب سے پیار تھا۔ یہ اس کے لیے لڑاکا ہم جماعتوں اور چڑچڑے معلمین سے فرار کی ایک اچھی پناہ گاہ تھی۔ اس نے بہت زیادہ مطالعہ کیا اور یونیورسٹی آف پیرس میں کچھ عرصہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ادیب بننے کا فیصلہ کر لیا۔ بالزاک کے سر پر شہرت و امارت اور عشق کے خواب سوار تھے لیکن اس کے بڑے اس کی سرگرمیوں سے نالاں تھے۔ چنانچہ بالزاک نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ دو سال تک لکھے گا اور اگر ادیب کے طور پر کامیابی حاصل نہ کر سکا تو پھر وہ جو پیشہ کہیں گے اختیار کر لے گا۔ اس مدت کے اختتام تک بالزک صرف ایک ڈرامہ کرامویل (1819) لکھ پایا تھا اور وہ بھی کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ برے حال اور

http://muftbooks.blogspot.com/

بانکے دیہاڑے، بالزیک نے پریشان ہوکر ایک فرضی نام سے سنسنی خیز ناول لکھنے کی ٹھانی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے روزمرہ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے طباعت اشاعت اور ٹائپ فونڈری جیسے کاروباوں میں بھی طبع آزمائی کی مگر اسے کسی چیز میں بھی کامیابی نہ ملی۔

اس کی تجارتی کامیابی کی ابتدا 1829ء میں ''انقلاب دشمن'' اور 'شادی کی جسمیات' اور 1830ء میں 'نجی زندگی کے مناظر' کی اشاعت سے ہوئی۔ اگلے ہی برس بالزاک نے بڑے لوگوں کی طرح اپنے نام میں 'دی' لگانا شروع کر دیا اور پیرس میں ایک بڑا گھر خرید لیا۔ وہ اندھا دھند لکھنے کا عادی تھا اور کافی کی چسکیاں لے لے کر اکثر چودہ چودہ پندرہ پندرہ گھنٹے مسلسل میز پر بیٹھا لکھتا رہتا تھا۔ اس دوران وہ کئی کئی کپ کافی پی جاتا تھا۔ 1832ء میں اس کی ملاقات پولینڈ کی ایک مالدار خاتون ایوالن ہنکا سے ہوئی جو اس وقت یوکرائن کے ایک بوڑھے زمیندار سے بیاہی تھی۔ کچھ عرصہ میں دونوں میں پیار کی پینگیں بڑھنا شروع ہوگئیں اور انھوں نے یوکرائن والے صاحب کے انتقال کے بعد آپس میں شادی کر لی۔ ان عشقیہ ایام کے احوال بالزک نے ''ایک بدیسی حسینہ کے نام خطوط'' (1832ء۔1844ء) میں بالتفصیل بیان کیے ہیں۔ اگرچہ ان کا یہ معاشقہ مزید اٹھارہ برس جاری وساری رہا مگر بالزاک نے اپنے لکھنے کی رفتار برقرار رکھی تاکہ وہ شادی سے قبل اپنے قرضے اتار سکے۔ 1832ء سے 1835ء تک کے تین سالوں میں اس نے بیس سے زائد تصنیفات قلمبند کیں جن میں 'گاؤں کا ڈاکٹر' (1833) اور 'بوڑھا گوریو' (1835ء) جیسے شاہکار بھی شامل تھے۔ اس نے سولہ جلدی 'انسانی طربیہ' 46-1842 کے عرصے میں لکھی۔ اس عنوان کے تحت اس نے بیس سال سے زائد عرصے کے دوران لکھے ہوئے اپنے بہترین ناول اور افسانے اجتماعی شکل میں شائع کیے۔ اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو لگتا ہے اس میں وہ فرانس کی سماجی تاریخ کی عکاسی کا خواہاں تھا۔ اگرچہ یہ کتاب اسلوب کے اعتبار سے کچھ خاص متاثر نہیں کرتی، اس سے ہمیں اس کے مشاہدے کی گہرائی کا ضرور پتہ چلتا ہے۔ اس نے فرانسیسی معاشرے کی تصویر کشی جس کامل انداز سے کی وہ بھی قابل توصیف ہے۔ بالزاک کا انتقال 1850ء میں اس کی ہنکا سے شادی کے چند ماہ بعد ہوا۔ اس کی ادبی میراث نے جہاں بالزاک کو ایک کلاسیکی ناول نگار کی حیثیت سے شہرت دوام بخشی وہاں اس نے فکشن میں حقیقت نگاری کے فروغ میں بھی بہت اہم کردار ادا کیا۔

بائبل

یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتاب۔ بہت سے لوگ اسے الہامی کلام قرار دیتے ہیں۔

http://muftbooks.blogspot.com/

یہ دنیا کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔اس میں شامل تصورات اور اخلاقی احکامات انتہائی اثر انگیز ہیں اور ان کے اثرات نہ صرف مغربی فلسفہ وفکر پر بآسانی ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں بلکہ دنیا کے بعض دیگر خطوں کی فکر پر ان کا رنگ غالب ہے۔

بائبل کو دو حصوں یعنی عبرانی صحائف اور عہد نامہ جدید میں تقسیم کیا جاتا ہے۔عبرانی صحائف اہل یہود کے لیے بہت مقدس مقام کے حامل ہیں۔اس کی پہلی پانچ کتب (آفرینش، خروج، سفر الاولین، اعداد اور کتاب استثنا) کو صحائف خمسہ یا مجموعی طور پر تورات کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ان تحاریر میں وہ تمام احکامات وقوانین شامل ہیں جو خدائے تعالیٰ نے قوم یہود کے لیے حضرت موسیٰؑ پر اتارے۔یہ صحائف خمسہ اور کتاب یوشع، اس عالم اور نوع انسانی کی تخلیق اور خدا کی محبوب قوم کے طور پر نبی اسرائیل کے تاریخی سفر کے احوال بیان کرتی ہے۔ان میں یوشعؑ، اسماعیلؑ، یسعیاہؑ، ارمیاؑ، عزقائیلؑ جیسے انبیاء اور بارہ دیگر چھوٹے پیغمبر بنی اسرائیل کی تاریخ اور ان کے سماجی نظام اور ادارۂ بادشاہت کی نشوونما کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔عبرانی کی دیگر کتب کو اسفار الکتابات کہا جاتا ہے اور یہ زیادہ فلسفیانہ (کتاب ایوبؑ اور سفر الجامعہ) یا شاعرانہ (مزامیر، نغمات سلیمانؑ) ہیں۔

ہم ان کتب کے مصنفین کا نام نہیں جانتے لیکن محققین نے مختلف تحاریر کو ان کے اسالیب اور ان میں خدا کے لیے استعمال کیے جانے والے ناموں کے اعتبار سے مختلف گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔مثلاً بعض کتب میں خدا کو یہواہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے لیکن بعض دیگر کتب اس کی بجائے 'ایلوہم' کا لفظ استعمال کرتی ہیں۔ان تمام تحقیقات کے باوجود ہم ان کتب کے مصنفین کی تعداد یا ان کے زمانہ تصنیف کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔عبرانی صحائف کو بنیادی طور پر عبرانی زبان میں قلمبند کیا گیا اگرچہ ان میں چند ایک چیزیں ایسی بھی ہیں جن کے بارے میں محققین کا خیال ہے کہ پہلے آرامی میں تحریر کی گئی تھیں۔جب اہل فارس بحیرہ روم سے متصل علاقوں پر قابض ہوئے تو یہودیوں نے اصل عبرانی کو رابطے کی نئی زبان میں منتقل کرنا شروع کر دیا اور جب تیسری صدی قبل مسیح میں یونانی زبان نے اپنا سکہ جمایا تو عبرانی صحائف کا ترجمہ یونانی میں کر دیا گیا جو Septuagint یا السبعونیہ کے نام سے مشہور ہوا۔جب عیسائیوں نے عبرانی صحائف اور عہد نامہ جدید کو باہم جمع کیا اور بہت سی اقوام نے عیسائیت قبول کی تو تراجم کی بھرمار ہوگئی۔عبرانی صحائف اور عہد نامہ جدید میں چودہ کتب ایسی ہیں جن کے الہامی ہونے کے بارے میں اکثر پروٹسٹنٹ عیسائی تشکیک کا اظہار کرتے ہیں لیکن رومن کیتھولک مسلک کے پیروان میں

سے گیارہ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ یہ کتب اجتماعی طور پر اپوکریفا کہلاتی ہیں۔ اپوکریفا کو عام طور پر رومن کیتھولک بائبلوں میں شامل عبرانی صحائف کے آخر میں رکھا جاتا ہے اور ان میں توبیاس، جوڈتھ، کتاب دانائی، بارک اور میقابیس کو بھی شامل کیا جاتا ہے اپوکریفا کو اکثر الگ سے بھی شائع کیا جاتا ہے۔ یہ تحاریر بنی اسرائیل کی تاریخ کو استمرار دے کر اسے دوسری صدی قبل مسیح تک لے آتی ہیں۔

عہد نامہ جدید عبرانی صحائف کی نسبت بہت مختصر ہے اور حضرت عیسیٰؑ (جسے فرزند خدا کے طور پر پیش کیا گیا ہے) اور ان کی وفات سے تقریباً سو سال بعد یعنی اس زمانے تک کی حکایت سناتا ہے جب عیسائی چرچ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اس کی پہلی چار کتب اناجیل کہلاتی ہیں اور ان میں جناب مسیحؑ کی ولادت، حیات، وصال اور ان کے دوبارہ جی اٹھنے کی بات کی گئی ہے۔ کتاب اعمال (حواریوں کے اعمال) سینٹ پال کے انتقال تک عیسائیت کے پھیلاؤ کے متعلق ہے اور 'مکتوبات' میں چرچ کے ابتدائی دور کے زعماء خصوصاً سینٹ پال کی خط و کتابت شامل ہے۔ ''مکاشفہ یوحنا'' وہ واحد کتاب ہے جس میں قیامت کا ذکر ہے اور سینٹ جان کو دکھائی جانے والی اس رویا کا ذکر ہے جس میں انھیں دنیا کے انجام اور حضرت عیسیٰؑ کی اپنے پیروکاروں کی رہنمائی کے لیے اس دنیا میں دوبارہ تشریف آوری کے متعلق بتایا گیا تھا۔

عہد نامۂ جدید میں کی گئی عیسیٰؑ کی تصویر کشی اور عبرانی صحائف کی پیشین گوئیوں کے درمیان اس قدر زیادہ مشابہت کو محض حسن اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ عیسیٰؑ کی زندگی اور ان کی تعلیمات ان پیشین گوئیوں کے مطابق ہوگی۔ درحقیقت عہد نامہ جدید زیادہ دلآویز اکثر اس وقت لگتا ہے جب ہم اس کا موازنہ عبرانی صحائف سے کرتے ہیں خصوصاً عیسائیت کے اس قدر زیادہ پھیلاؤ کے تناظر میں۔ عبرانی صحائف جہاں حسد و انتقام کے ایک ایسے ہیبتناک معبود کی تصویر پیش کرتا ہے جو یہودیوں کو نافرمانی کی سزا کے طور پر مسلسل غلامی میں مبتلا کرتا رہتا ہے، عہد نامہ جدید میں ایک ایسا معبود سامنے آتا ہے جس کے پاس عفو اور نجات کا پیغام ہے۔ سلطنت رومہ کے زوال کے دنوں میں آبادی کا ایک بڑا حصہ بدعنوان حکومتوں اور قدیمی مذاہب کی وجہ سے بہت تنگ تھا۔ عیسائیت کی اس کشش نے اس کی کامیابی میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ابتدائی دور کے عیسائیوں میں یہ بحث چل نکلی تھی کہ آیا عیسیٰؑ کے پیغام کا اطلاق تمام انسانوں پر ہوتا ہے یا صرف یہودیوں پر۔ یہ بحث ہمیں مکتوبات میں شروع سے لے کر اخیر تک جھلکتی نظر آتی ہے۔

313ء میں شہنشاہ قسطنطین اول نے فرمان میلان میں دین عیسوی سے رواداری برتنے کا

عندیہ دے دیا تھا۔ اس وقت تک قدیم اور جدید دونوں عہد ناموں کا ترجمہ قبطی، حبشی، گوتھک، لاطینی اور دیگر زبانوں میں ہو چکا تھا۔405ء میں سینٹ جیروم نے تمام ذرائع کو لاطینی زبان میں مجتمع کر دیا جیسے بعد میں ولگیٹ ترجمے کے نام سے موسوم کیا گیا اور یہ ترجمہ ایک ہزار سال سے زائد عرصے تک سرکاری بائبل کے طور پر پڑھا جاتا رہا۔ اگرچہ اس ایڈیشن کی اشاعت کے دوران کئی مباحث اور تنازعات نے جنم لیا ولگیٹ کو ایک مقدس کتاب کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ ولگیٹ کے انگریزی اور جرمن ترجموں نے پروٹسٹنٹ مسلک کی نمو میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ پرنٹنگ پریس کی ایجاد اور بائبلوں کی مقامی زبانوں میں اشاعت نے انگریزی اور جرمن جیسی زبانوں کو سٹینڈرڈائز اور کوڈیفائی کرنے میں بھی مدد دی جن کی پہلے بہت سی اور بعض اوقات متصادم بولیاں اور رنگتیں تھیں۔ عیسائی مبلغین کی پوری دنیا میں کدوکاوش کے طفیل اب بائبل کا ترجمہ دنیا کی تقریباً ہر زبان میں ہو چکا ہے۔

بائرن، جارج گورڈن [نوئل] (1788ء۔1824ء)

انگریز رومانوی شاعر جو لارڈ بائرن کے نام سے معروف ہے۔ اپنے غم وفکر میں غلطاں ڈپریشن کے شکار ''بائرونک ہیرو'' میں جسے بائیرن نے اپنی بہت سی تحاریر میں تخلیق کیا ہے، ہمیں اس شاعر کی خود اپنی شخصیت جھلکتی نظر آتی ہے۔ اگرچہ رُشٹ پُشٹ، پست قد کا حامل اور لنگ کا شکار بائیرن جسمانی طور پر تو اس ہیرو جیسا نظر نہیں آتا لیکن اگر اس کی عیاشیوں اور بے راہرویوں کی کہانیاں سنیں تو وہ یقیناً اپنے کرداروں کا سا دکھائی دیتا ہے۔

بائیرن کے والد کا اس کی کم سنی میں ہی انتقال ہوگیا تھا اور اس کی پرورش اس کی تندمزاج والدہ نے سکاٹ لینڈ میں کی۔ جب وہ دس برس کی عمر کو پہنچا تو اسے خاندانی خطاب اور میراث دے دی گئی جس پر وہ اپنی ماں کے ساتھ نیوسٹیڈ ایبی منتقل ہوگیا۔ اس نے مشور برطانوی سکول ہیرو اور ٹرنٹی کالج کیمبرج سے تعلیم حاصل کی اور 1808ء میں ایم اے کی ڈگری حاصل کر لی۔ وہ 1809ء میں برطانوی دارالامرا میں اپنی خاندانی نشست پر متمکن ہوا۔ اس کی پہلی شائع ہونے والی تحریر ''بے کار لمحے'' (1807ء) تھی۔ اس پر بڑی لے دے ہوئی جس کے جواب میں اس نے اپنی طنزیہ تخلیق ''انگریز شاعر اور سکاٹ ناقدین'' (1809ء) بغیر اپنا نام ظاہر کیے شائع کی۔ کچھ عرصہ بعد وہ بحیرۂ روم کے علاقوں کی سیاحت کو روانہ ہوگیا جہاں کے ماحول اور آب وہوا نے اس کی رومانوی طبیعت پر مہمیز کا کام کیا اور اس کی منظومات کے لیے بہ افراط مواد مہیا کیا۔ اس نے انگلستان واپسی پر اپنی نظموں کی دوسری کتاب ''چائلڈ ہیرالڈ کی یاترا'' (1812ء) شائع کی جس

نے اسے ایک مشہور شخصیت میں تبدیل کر دیا۔ بائیرن اپنے معاشقوں کی وجہ سے بہت مشہور ہوا اور اس کے ساتھ بہت سے مردوں اور عورتوں دونوں کے نام آئے بلکہ یہ افواہ بھی پھیلی کہ اس نے اپنی سوتیلی بہن آگسٹا لے کے ساتھ بھی دو نمبر تعلقات استوار کر رکھے ہیں۔ وہ 1814ء میں این آئزابیلا ملبینک کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوا جس سے اس کے ہاں ایک بیٹی آگسٹا ایڈا پیدا ہوئی۔ بائیرن کی آوارہ مزاجیوں کی وجہ سے اس کے اور لیڈی بائیرن کے درمیان بالآخر علیحدگی ہوگئی جس سے بائیرن نے دلبرداشتہ ہوکر انگلستان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنے کا فیصلہ کرلیا۔ پہلے تو وہ ایک اور معروف انگریز رومانوی شاعر پی بی شیلے اور اس کی بیگم کے ساتھ جھیل جنیوا پر ٹھہرا رہا، بعدازاں اس نے اٹلی کا سفر اختیار کیا اور پھر انیس سالہ متزوج رئیسہ ٹیریزا گلیکو لی کے ساتھ رہنے لگا۔ اس خاتون کے ساتھ بائیرن کا تعلق نسبتاً زیادہ پائیدار بتایا جاتا ہے۔ بائیرن نے اپنی شاہکار نظم ''ڈان جوآن'' (1819ء۔1824ء) پر کام اسی دور میں شروع کیا۔ بائیرن کی شہرت آج کے دور تک اس کی اسی تخلیق کی بدولت چلی آتی ہے۔ ٹیریزا کے باپ اور بھائی سے تعلق کی وجہ سے بائیرن نے بھی یونان کی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس نے ایک بحری جہاز پر یونان کی طرف سفر اختیار کیا لیکن راستے میں اسے ایک مہلک بیماری نے آن لیا اور وہ کچھ ہی عرصہ بعد انتقال کر گیا۔ یونان کے لوگوں نے اس کا سوگ اپنے ایک ہیرو کے طور پر منایا۔ اس کی میت کو لندن کے مشہور قبرستان ویسٹ منسٹر ایبی میں تدفین کی اجازت نہ ملی لہٰذا اسے نیوسٹیڈ میں اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ تاہم اس کی موت کے کوئی ایک سو پینتالیس برس بعد اس کی یاد میں ویسٹ منسٹر ایبی کے فرش پر اس کے نام کی ایک تختی نصب کر دی گئی۔

بائیرن کی طنزیہ منظومات Beppo (1818ء) اور The Vision of Judgement (1822ء) اور ڈان جوآن کو اس کی بہترین تخلیقات میں شمار کیا جاتا ہے۔ موخرالذکر نظم اس نے 1819ء میں لکھنا شروع کی لیکن وہ اسے مکمل نہ کر سکا۔

بخت نصر ثانی (اندازاً 604۔556 ق م)

شہنشاہ بابل، بخت نصر بابلیہ سلطنت کے مشہور ترین بادشاہوں میں سے تھا۔ وہ اپنے باپ کے بعد 604 ق م میں تخت نشین ہوئے اور اکادی فوج کے سپہ سالار بنا اور اس نے 605 ق م میں بچے کھچے اشوریوں کو شکست سے دوچار کیا تھا۔ بخت نصر نے زمام اقتدار سنبھالتے ہی پورے کے پورے شام اور فلسطینی ساحل پر آباد قصبوں پر قبضہ کرلیا تھا۔ 597ء میں اس نے یروشلم پر بھی قبضہ کرلیا اور یہودیہ کے بادشاہ زدیقیاہ کو اپنا باجگزار بنا لیا۔ لیکن جب اس تک خبریں پہنچیں کہ

http://muftbooks.blogspot.com/

زدیقاہ چالاکیا دکھانے سے باز نہیں آتا اور اس کے لوگ مسلسل سازشوں میں مصروف ہیں تو بخت نصر نے پروشلم پر لشکر کشی کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ہیکل کو بھسم کر دیا اور یہودیوں کی ایک بڑی تعداد کو یرغمال بنا کر بابل لے آیا (586 ق م)۔ جب 556 ق م میں بخت نصر نے آنکھیں بند کیں تو اس وقت تک بابلیہ کے علاوہ پورے کا پورا شام، فلسطین، اور اشوریہ کا جنوبی خطہ اکادی سلطنت میں شامل ہو چکا تھا۔

بخت نصر کے دور میں بابلیہ نے عسکری میدان کے علاوہ دوسرے شعبوں میں بھی بہت ترقی کی۔ شہر پناہ کے عرض میں اس قدر اضافہ کیا گیا کہ اس پر دو چار گھوڑا بگھیاں آسانی سے گزر سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ بخت نصر نے بابل کے وہ مشہور عالم معلق باغات بنوائے جنہیں دنیا کے سات عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔

بدھ

بدھ مت کا بانی۔ بدھ کا سنسکرت لفظ سدھارتھ گوتم (563۔483 ق م) کے لیے بطور لقب استعمال کیا جاتا ہے جس کا لغوی مطلب ''روشنی یافتہ'' ہے۔ روایت کے مطابق گوتم ایک شاہی گھرانے میں پیدا ہوا۔ وہ کپل وستو کے شاکیہ قبیلے کے راجہ کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ یہ علاقہ آج کل نیپال کا حصہ ہے۔ اس کی پیدائش کے وقت جوتشیوں نے اس کی ماں کے خواب کی تعبیر نکال کر یہ پیشین گوئی کی تھی کہ وہ بڑا ہو کر ایک عظیم گرو اور رہنما بنے گا۔ اس کے باپ راجہ سدودھن نے اسے بڑے ناز و نعم میں پالا لیکن جب وہ انتیس کے سن کو پہنچا تو ایک شدید داخلی بحران کا شکار ہو گیا۔ بڑھاپے بیماری اور موت جیسی ابتلاؤں کو دیکھ کر اپنی جائیداد گھر بار اور بیوی، بچوں کو چھوڑا اور ایک جوگی کی بود و باش اختیار کر جنگل کی راہ لے لی اور کئی سال تپسیا اور زہد و مجاہدے میں بتا دیے۔ ایک مرتبہ جب وہ بودھ گیا میں ایک بودھی پیڑ کے نیچے بیٹھا گیان دھیان میں مصروف تھا تو اسے ایک اپنے اندر ایک روحانی روشنی اترتی محسوس ہوئی جس سے اسے ان ابدی سچائیوں کا فہم آپ ہی آپ حاصل ہو گیا جن کی تلاش میں وہ ایک عرصے سے سرگرداں تھا۔ لیکن اسے یہ منزل یوں ہی حاصل نہیں ہو گئی تھی۔ اس نے برسوں جتن کیے تھے اور شیطان مارا کی تحریصات کا مقابلہ انتہائی استقامت سے کیا تھا۔ اب وہ ایک بدھ یعنی حقیقت کو بیدار کرنے والا شخص بن چکا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی چار درویشوں سے بات کرتے ہوئے اپنے پہلے وعظ میں چار اعلیٰ سچائیوں اور آٹھ طبقی نیکی کے راستے کا درس دیا جنھوں نے بعد میں بدھ مت کے

http://muftbooks.blogspot.com/

بنیادی ارکان کی شکل اختیار کر لی۔ اپنی زندگی کے بقیہ پینتالیس برسوں میں بدھ وسطی ہندوستان کے نگر نگر گھوم کر اپنی تعلیمات پھیلاتا رہا۔ اس نے راہبوں یا بدھ بھکشوؤں کا ایک سنگھ تشکیل دیا جس میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے اور وہ بدھ کے ارشادات لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ بدھ اسی برس کی عمر میں کوسی نگر کے مقام پر فوت ہوا۔ اس کی میت کو جلایا گیا تھا۔

بدھ مت

گوتم بدھ کی تعلیمات پر مبنی ایک عالمی مذہب۔ بدھ کی تعلیمات کو اس کے ترک تشخص سے زیادہ احسن طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے جب اس نے گھر بار چھوڑ کر درویشی اختیار کر لی تھی۔ اس نے عیش و عشرت میں ایک انفرادی زندگی گزارنے کی بجائے عالمگیر انسانی دکھ کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کا نروان اس کے مذہب یا دھرم کی بنیاد بنا جسے وہ چار اعلیٰ سچائیوں کے طور پر بیان کرتا ہے۔

۱۔ زندگی دکھ سے عبارت ہے۔
۲۔ دکھ خواہش اور لوبھ کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔
۳۔ خواہش پر قابو پا کر دکھ سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے: اور
۴۔ خواہش کا خاتمہ آٹھ طبقی نیکی کے راستے پر چلنے سے ممکن ہے۔

نیکی کے اس راستے کے آٹھوں مرحلوں کا لب لباب یہ ہے:
صحیح سوچ، صحیح کلام، صحیح برتاؤ، صحیح اخلاق، صحیح کوشش، صحیح فکر اور صحیح علم کی جستجو۔

بہت سے حضرات بدھ مت کے عروج کو چھٹی صدی قبل مسیح میں گنگا طاس اور مشرقی ہندوستان میں نمو پذیر ہونے والی دیگر اہم تبدیلیوں کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ اس زمانے میں شہر آبادی و ثقافت کے مراکز تھے اور یہ مراکز مل کر چھوٹی ریاستوں کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ اس تبدیلی کے ساتھ ادلے بدلے کے نظام پر مبنی بادشاہتوں کی متحدہ حکومتوں اور زرعی معیشتوں میں منتقلی کا عمل بھی دیکھنے میں آیا۔ اس نئی صورت حال میں یہ ضروری ہو گیا تھا کہ ذات پات کے اس نظام کو خیر باد کہا جائے جس پر کہ اب تک ہندی معاشرہ استوار چلا آتا تھا۔ بدھ مت نے جہاں عورت اور مرد دونوں کو خیر مقدم کیا، اس نے ذات پات کے امتیازات کو ختم کر دیا خصوصاً چونکہ خود بدھ کا تعلق بھی سب سے اونچے طبقے یعنی برہمن جاتی سے نہ تھا۔

معاشرتی نظام میں ان تغیرات نے روح و جسم، زندگی و قوت اور انتہا و لا انتہا جیسے بہت سے فلسفیانہ مباحث کو جنم دیا۔ بدھ مت نے ان ثنویتوں میں درمیانی راستے کی تلقین کی اور یہ موقف

http://muftbooks.blogspot.com/

اپنایا کہ دنیا میں آتما (روح) نام کی کوئی چیز نہیں اور معروضی وموضوعی دنیا میں کوئی فرق نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ بدھ مت میں کسی قادر مطلق خدایا ''اصول اولین'' کا تصور موجود نہیں۔ اس کی بجائے یہ ہر شئے کی وحدت کی بات کرتا ہے اور روشنی کے حصول کے راستے کے وجود کا اثبات کرتا ہے جس سے کہ ہندو عقیدے کے آواگون نظریے کی تردید ہوجاتی ہے۔ بدھ خانقاہیں صرف غور وفکر کے لیے ہی استعمال نہیں ہوتی تھیں بلکہ یہ مدرسوں، سراؤں، شفاخانوں بزرگ خانوں، کتب خانوں اور عجائب گھروں کا کام بھی دیتی تھیں۔ یہی ہمہ گیریت وہ وجہ ہے جس کا رن بدھ مت پورے ایشیا میں پھیلتا چلا گیا۔ بدھ مت ساتویں سے نویں صدی کے درمیانی عرصے میں ایشیا کے بیشتر علاقوں تک پہنچ چکا تھا لیکن اس کا مبداء یعنی خود ہندوستان بارھویں صدی میں مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا اور چودھویں صدی تک یہ وہاں سے تقریباً کلی طور پر ختم ہوگیا۔

موجودہ بدھ مت تین بڑے مکاتیب فکر پر مشتمل ہے:

۱۔ تھیراوادا (بزرگوں کا عقیدہ) جو سری لنکا، میانمار اور جنوب مشرقی ایشیا میں پایا جاتا ہے۔

۲۔ مہایان (عظیم گاڑی) چین، جاپان اور کوریا میں عروج پر ہے: اور

۳۔ وجرایان (الماسی گاڑی) اس کے پیروتبت اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں ملتے ہیں۔

بدھ مت چین میں پہلی صدی عیسوی میں آیا اور تاؤمت (متصفوانہ چینی فلسفہ) میں مدغم ہوگیا۔ بدھ کی تعلیمات جو کہ شروع میں سنسکرت میں تھیں، کا ترجمہ آہستہ آہستہ چینی زبان میں ہوا اور جوں جوں بدھ مبلغین چین میں پھیلتے گئے، ان تعلیمات کے تراجم بھی تمام بولیوں میں ہوتے گئے اور دانشور طبقہ اس مذہب کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ جانشینی کے لیے لڑی جانے والی پے در پے جنگوں سے مجروح ملک میں لوگوں کو بدھ خانقاہوں کا پرامن ماحول بہت اچھا لگا ہوگا۔ بدھ مت بتدریج چینی اقدار میں مدغم ہوتا چلا گیا اور اس نے اپنی توجہ افراد اور ان کے خاندانوں کے درمیان دینوی تعلقات پر مرکوز کرلی۔

بدھ مت چین سے چوتھی صدی میں کوریا اور چھٹی صدی میں جاپان پہنچا۔ بعض حکمرانوں نے تو اسے بڑی پذیرائی بخشی لیکن بعض نے اسے مقامی خداؤں کی توہین خیال کیا۔ بدھ مت کی مخالفت کرنے والوں کو جنگ میں شکست ہوئی اور یہ پورے جاپانی معاشرے میں سرایت کرگیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ مختلف رسوم اور عقائد کے حامل بہت سے مکاتیب اور مسالک میں تقسیم ہوتا چلا گیا۔ جاپانی بدھ مت اپنی خاصیت کے اعتبار سے غیر منطقی، زیادہ وجدانی اور جذباتی

http://muftbooks.blogspot.com/

طور پر زیادہ پرکشش خیال کیا جاتا ہے۔ یہ واضح طور پر بدھ مت کے مقامی جاپانی مذہب شنتو سے کامیاب انضمام کا نتیجہ ہے۔ موجودہ دور میں چھ بٹہ سات جاپانی آبادی بدھ مت کے پیروکاروں پر مشتمل ہے۔

وہ بدھ مت جسے مبلغین تیسری صدی قبل مسیح میں جنوبی ایشیا لے کر آئے 'جنوبی بدھ مت' یا بزرگوں کا عقیدہ کہلاتا ہے۔ یہ بدھ مت کی دیگر گونوں کی نسبت پالی زبان کی قدیم بدھ تعلیمات سے زیادہ میل رکھتا ہے۔ اس لیے اسے ابتدائی بدھ مت کی بہترین عصری نمائندگی خیال کیا جاتا ہے۔

بدھ مت تبت میں آٹھویں صدی میں متعارف ہوا اور وہاں کے لوگوں کے عقائد سے اس کے اختلاط سے بدھ مت کی ایک نئی شکل نے جنم لیا جس میں لامہ کی پرستش بھی شامل ہوگئی۔ لامہ کا مفہوم ''اعلیٰ وارفع'' ہے اور ہر لامہ کو اپنے پیش رو کا اوتار تصور کیا جاتا ہے اور سب سے بڑا لامہ، دلائی لامہ کہلاتا ہے۔ اس رنگ کے بدھ مت نے زیادہ تر منگولیا اور شمال مشرقی چین میں اپنے قدم جمائے۔

دیگر مذاہب کے آنے کے باوجود ایشیا میں بدھ مت کو آج بھی ایک غالب حیثیت حاصل ہے۔

بدایونی، عبدالقادر (1540ء-1615ء)

فارسی مؤرخ۔ آپ ایک راسخ العقیدہ سُنی مسلمان تھے جنھیں 1574ء میں مغل شہنشاہ اکبر کے دربار میں ایک مذہبی عہدے پر فائز کیا گیا۔ انھوں نے اکبر کے زیر سرپرستی بہت سی کتب تحریر کیں جن میں کتاب الحدیث، 'تاریخ الفی کا ایک جز اور معروف تاریخ دان رشید الدین کی 'جمیعت التواریخ' کا ترجمہ شامل ہے۔ تاہم بدایونی زیادہ مشہور اپنی شہرہ آفاق تصنیف 'منتخب التواریخ' کی بدولت ہوئے جس میں انھوں نے مغلیہ سلطنت اور مغل حکمرانوں اور شہزادوں کے احوال رقم کیے۔ اسے ''تاریخ بدایونی'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں اکبر اور اس کی رافضانہ مذہبی پالیسیوں کو نشانۂ تنقید بنایا گیا ہے اور جس طریقے سے بنایا گیا ہے وہ مصنف کی دلیری و جراتمندی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس میں ہندوؤں کی مقدس کتب رامائن اور مہابھارت کے سنسکرت سے فارسی ان ترجموں کا تذکرہ بھی شامل ہے جو اکبر نے ان سے کروائے۔ اکبر کے بارے میں اس کے درباری مؤرخ ابوالفضل نے بھی 'اکبر نامہ' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس مغل بادشاہ کی شخصیت اور کارناموں کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا تھا۔ بدایونی کی متذکرہ تاریخی تصنیف عموماً

http://muftbooks.blogspot.com/

اکبر کے زمانے کے اصل احوال جاننے کے لیے پڑھی جاتی ہے۔

بربر

شمالی افریقہ کے مقامی غیر عرب باشندے۔ وہ جو زبان بولتے ہیں، اسے بھی بربر کہا جاتا ہے۔ بربر کی اصطلاح یونانی لفظ 'باربا روس' یا 'باربیرینز' سے ماخوذ ہے اور اسے سب سے پہلے شمالی افریقہ کے رومن فاتحین نے استعمال کیا۔ آج کل اس سے مراد شمالی افریقہ کے ان باشندوں سے آنے والی نسل لی جاتی ہے جنھیں بارھویں صدی عیسوی میں عربوں نے فتح کیا تھا۔ سب بربر نسلی یا مذہبی اعتبار سے ایک نہیں ہیں۔ گو ان کی زبانیں ہامی لسانی گروہ کی رکن زبانوں کے بہت قریب ہیں۔ ان کی نسلی و مذہبی نسبتوں میں فرق ہے۔ کچھ قبیلے تو یہودی تھے اور کچھ عیسائی لیکن ان کے بیشتر قبائل نے اسلام قبول کر لیا۔ اگرچہ زیادہ تر بربر شمالی افریقہ میں بسنے والے عربوں میں آمیزش اختیار کر گئے، بعض گروہوں نے اپنی الگ لسانی و ثقافتی شناخت برقرار رکھی۔ یہ لوگ اب زیادہ تر الجیریا اور مراکش کے پہاڑی اور صحرائی علاقوں میں رہتے ہیں۔ کچھ تھوڑے بہت بربر تیونس 'موریطانیہ' مالی، سینیگال، نائجر، لیبیا اور مغربی مصر میں بھی آباد ہیں۔

اگرچہ دوسری ثقافتوں کے لوگ اب ان کے لیے 'بربر' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، وہ خود اپنے آپ کو اپنی علاقائی، لسانی اور قبائلی نسبتوں سے موسوم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر شلوح، شلیح زبان بولتے ہیں اور اطلس کے پہاڑوں میں آباد ہیں جبکہ رِفی قبائل رفیہ بولتے ہیں اور ارف پہاڑوں میں رہتے ہیں۔ بربر ثقافت نے فن تعمیر، رقص و موسیقی، پارچہ بافی اور مصوری کی اپنی علاقائی اصناف کے توسط سے شمالی افریقہ کے خطے میں بہت اثرات مرتب کیے ہیں۔ بربر زبانیں عموماً عربی یا لاطینی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں گو بربروں کے اپنے الگ حروف بھی موجود ہیں جنھیں تفی ناگ (انگریزی میں تفی نار) کہا جاتا ہے۔ اگرچہ شمالی افریقہ کے مدارس میں اس زبان کی تعلیم نہیں دی جاتی، مگر گذشتہ چند عشروں کے دوران یہاں کے تخلیق کاروں کی بہت سی شعری و نثری نگارشات منظر عام پر آئی ہیں۔

بربروں کے المواوی (گیارھویں اور بارھویں صدی) اور الموحد (1130-1269) خاندانوں نے شمالی افریقہ کی اسلامی تاریخ میں مرکزی کردار ادا کیا۔ مثال کے طور پر سپین فتح کرنے والا اسلامی جرنیل طارق بن زیاد ایک بربر تھا۔ جبل الطارق، انگریز جسے جبرالٹر کہتے ہیں، بھی اس کے نام سے موسوم ہے۔

شمالی افریقہ میں فرانسیسی نوآبادیاتی دور حکومت کے دوران استعماری طاقتوں نے فرانسیسی

http://muftbooks.blogspot.com/

قبضے کے خلاف تحریک مزاحمت کو کمزور کرنے کے لیے بربروں اور عربوں میں اختلافات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مراکش اور الجیریا میں بربروں کو اس امید پر خصوصی مراعات سے نوازا گیا کہ وہ اپنے ہموطنوں کی بجائے بدیسی طاقت کا ساتھ دیں گے تاہم فرانس کی الجیریا کو ساتھ ملانے کی کوشش ناکام ہوگئی اور 1954ء سے 1962ء تک چلنے والی خونیں جنگ میں الجیریا کے لوگ متحد ہوکر لڑے اور انھوں نے 'انقلاب عشرہ ملین شہدا' میں فرانس سے آزادی حاصل کر لی۔ آج کل بعض لوگ الجیریا میں روز افزوں اسلامی اثر کے مناظر میں بربر ثقافت کو اجاگر کرنے کے لیے آوازیں اٹھا رہے ہیں۔ بعض گروہ بربر قومیت کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ انھیں معاشرے میں زیادہ بارسوخ مقام دلایا جاسکے لیکن دوسری طرف آپ کو ایسے لوگ بھی ملیں گے جو ثقافتی رنگارنگی اور پرامن بقائے باہمی کی بات کرتے ہیں۔

برٹن، سر رچرڈ [فرانسس] (1821ء۔1890ء)

انگریز دانشور اور مہم جو۔ وہ افریقہ میں واقع تانگانیکا جھیل اور مکہ کے بشمول غیر مسلموں کے لیے ممنوعہ کئی اسلامی مقامات مقدسہ تک پہنچنے والا پہلا یورپی باشندہ تھا۔ برٹن نے اپنی مہمات سے متعلق 43 کتابیں اور تیس کتب تراجم کی شائع کروائیں جن میں ''الف لیلہ ولیلہ'' کا شہرہ آفاق ترجمہ (1885ء۔1888ء) بھی شامل ہے۔ اس کے ان مختلف معاشروں پر انتہائی حساس اور مفصل تبصرہ کہ جن کا اس نے مشاہدہ کیا کلاسیکی نسلی مطالعات کا درجہ رکھتے ہیں۔

برٹن کو زبانیں سیکھنے پر غیر معمولی ملکہ حاصل تھا۔ اسے 25 زبانوں پر عبور حاصل تھا اور یہ تعداد چالیس تک پہنچ جاتی ہے۔ برٹن نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ہندوستان میں برطانوی فوج کے ایک اینٹلی جنس آفیسر کے طور پر کیا۔ وہاں رہ کر اس نے مقامی لوگوں کا بھیس بدل کر ان میں گھل مل جانے کا فن سیکھا۔ اس صلاحیت کے طفیل وہ معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک مسلم سوداگر کے روپ میں بازار پہنچ جایا کرتا تھا۔ اس نے اپنی فوجی ملازمت کے دوران ایک افغان مسلمان کا روپ دھار کر قاہرہ، سویز، مدینۃ المنورہ، اور آخر میں مکہ شریف کی سیاحت بھی کی اور وہاں حرم شریف کی پیمائش کی اور اس کا خاکہ بھی تیار کیا۔

1855ء میں برٹن دریائے نیل کے ماخذ کی تلاش میں نکلا جو شاید اس کی مشہور ترین مہم تھی۔ اس سفر کے دوران اس کے ہمرہ انڈیا میں متعین ایک برطانوی افسر جان، ہینگ سپیک بھی تھا۔ اگرچہ اسے اپنی یہ مہم مقامی قبیلوں کے حملے کی وجہ سے روکنا پڑی، اس نے 1857ء میں اسے پھر شروع کر دیا۔ اس دوسری کوشش کے دوران بھی اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جن میں

ملیریا کی موذی بیماری بھی تھی۔ جب برٹن نے نئی مہم کی تیاری کے لیے انگلستان لوٹنے کی نیت ظاہر کی تو سپیک نے جھیل وکٹوریہ کی طرف سفر جاری رکھنے پر اصرار کیا جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ یہی دریائے نیل کا منبع ہے۔ برٹن نے بلا تحقیق یہ دعویٰ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس طرح ان دونوں مہم جوؤں کے درمیان اس چپقلش کا آغاز ہو گیا جو 1864ء میں سپیک کی ایک شکاری مہم کے دوران ہونے والی ہلاکت تک چلتی رہی۔ اس موت کے بارے میں برٹن کا دعویٰ تھا کہ سپیک نے خودکشی کی ہے۔

برٹن نے 1861ء میں برطانوی وزارت خارجہ کی ملازمت اختیار کر لی اور اگلے کئی سال تک مغربی افریقہ، برازیل، شام اور ٹریسٹ میں خدمات سرانجام دیتا رہا۔ اسے زیر مشاہدہ معاشروں کے بارے میں اپنے جائزوں کی وجہ سے لندن میں بیٹھے اپنے اعلیٰ افسروں کی سرزنش کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔ برٹن کی 1886ء میں موت سے چار سال قبل آخر کار اس کی صلاحیتوں اور کارگزاریوں کا لوہا اس وقت تسلیم کیا گیا جب ملکہ وکٹوریہ نے اسے نائٹ کمانڈر آف سینٹ مائیکل اینڈ سینٹ جارج کا اعزاز عطا کیا۔ برٹن ایک انتہائی زیرک اور روایت شکن ذہن کا مالک تھا۔ اسے جنسی ادب سے بھی بہت دل چسپی تھی۔ اس کی بیگم نے برٹن کی موت پر اس کے بہت سے اہم کاغذات ضائع کر دیے جن میں کچھ مشرقی جنسی تحاریر کے تراجم بھی شامل تھے۔

برلن، دیوار

کنکریٹ کی وہ دیوار جس نے 1961 تا 1990 مشرقی اور مغربی برلن کو جدا کیے رکھا۔ جنگ عظیم دوم کے خاتمے پر 1945ء کی پوٹس ڈیم کانفرنس کے موقع پر برلن کو امریکہ، برطانیہ، فرانس اور سوویت یونین کے درمیان تقسیم کر دیا گیا تھا۔ دیوار برلن سوویت یونین کے صدر خروشیف اور مشرقی جرمنی کی حکومت نے مشرق سے مغرب کی طرف ہونے والی دھڑا دھڑ نقل مکانی کو روکنے کے لیے اگست 1961ء میں راتوں رات تعمیر کروائی تھی۔ آنے والے دور میں یہ دیوار کمیونسٹ بلاک اور سرمایہ دار طاقتوں جن کی قیادت امریکہ اور NATO کر رہا تھا، کے درمیان سرد جنگ کی علامت کی حیثیت اختیار کر گئی۔ ابتدا میں تو برلن کے دونوں حصوں کو الگ کرنے کے لیے خاردار تار لگائے گئے لیکن بعد میں یہاں دس فٹ بلند کنکریٹ کی پکی دیوار تعمیر کر دی گئی جس کے گرداگرد پھاٹکوں، برقی باڑوں، مسلح چوکیوں، اور نگران برجوں کا جال بچھا دیا گیا۔ اس کی لمبائی برلن شہر کے درمیان 28 میل اور مغربی برلن کے گرد 75 میل تھی۔ اگرچہ ٹھیک تعداد بتانا مشکل ہے، کم و بیش 191 افراد دوسری طرف فرار ہونے کی کوشش میں سرحدی

محافظوں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔لوگ پہلے ہی اس اقدام سے ناخوش تھے، جب سوویت یونین میں میخائل گورباچوف صدر بنے اور انھوں نے پریسٹرائیکا پالیسی کا نفاذ کیا تو لوگوں کے جذبات نے مزید شدت پکڑ لی، وسیع پیمانے پر جلسے جلوس اور مظاہرے دیکھنے میں آئے جس کے نتیجے میں اس دیوار کو بالآخر 1989ء میں گرا دیا گیا۔ دیوار کا انہدام 1990ء میں عمل میں آیا جس کے بعد مشرقی جرمنی سے ہجرت کرنے والے افراد کا سیلاب امڈ آیا۔اس دیوار کے انہدام میں پڑوسی ملک ہنگری کی ایمیگریشن پالیسیوں میں نرمی نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا جس سے مشرقی جرمنی کی شمال مشرقی سرحد پر جرمن پناہ گزینوں کو آزادی سے نکلنے کا موقع مل گیا۔اس واقعے کے بعد 1990ء کے عشرے میں ایک مختصر مدت کے لیے منہدم دیوار کی ٹھیکریوں کا کاروبار بھی خوب چمکا۔ دیوار مسمار ہونے سے برلن ایک ہوا تو 1990ء کے اواخر میں مشرقی اور مغربی جرمنی کے دوبارہ متحد ہونے کا خواب بھی شرمندہ تعبیر ہو گیا۔

برونٹے بہنیں

این برونٹے (1820ء۔1849ء)

شارلٹ برونٹے (1816ء۔1855ء)

ایمیلی برونٹے (1818ء۔1848ء)

یہ تینوں بہنیں جنھوں نے ناول نگاری کی وجہ سے شہرت حاصل کی انگلینڈ کے ایک قصبے تھارنٹن میں ایک پادری کے گھر پیدا ہوئیں لیکن ان کی والدہ کی وفات کے فوری بعد انھیں ایک اقامتی مدرسے میں بھیج دیا گیا۔ بدقسمتی سے اس مدرسے کے حالات اچھے نہ تھے۔ اچھے کیا بہت ڈراؤنے تھے۔اس کی انتظامیہ کا عقیدہ یہ تھا کہ جسمانی تکلیفوں سے روحانی بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔(شارلٹ برونٹی کے ناول 'جین آئیر'' میں مذکور لوووڈ سکول میں اس خوفناک مدرسے کی جھلک ملاحظہ کی جاسکتی ہے)۔نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ان میں سے بڑی دو بہنیں ماریہ اور ایلزبتھ تو تپ دق کے ہاتھوں دم توڑ گئیں اور باقی لڑکیاں والد کے پاس واپس چلی گئیں۔گھر آنے کے بعد ان کا شغل یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے بھائی برینویل کے ساتھ مل کر سارا سارا دن یارک شائر کے جنگلوں اور بیلوں میں گھومتی اور پہروں بیٹھی خیالی مملکتیں تشکیل دیتی رہتی تھیں۔شارلٹ اور برینویل نے ایک افریقی سلطنت، اینگریہ اختراع کی اور اس کے باشندوں کی مہمات کا ریکارڈ جمع کرنا شروع کیا جبکہ ایمیلی اور این نے ایک ریاست گونڈل تخلیق کی اور اس کے معاملات کی ایک بہی تیار کرنا نیز نظمیں لکھنا شروع کر دیں۔ یہ نظمیں بعد میں شارلٹ کی کچھ تخلیقات کے ساتھ ایک مجموعے ''کرر،

http://muftbooks.blogspot.com/

ایلس اور ایکٹن بیل کی نظمیں' کی صورت میں 1846ء میں چھپیں۔ یہ کتاب جس کی اشاعت ترکے سے آنے والی ایک معمولی سی رقم سے ممکن ہوئی تجارتی اعتبار سے مکمل طور پر ناکام رہی۔ شارلٹ کے ایک بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے صرف دو نسخے بک پائے تھے۔ اس پر تینوں بہنوں نے ناول نگاری پر طبع آزمائی کا فیصلہ کیا۔ شارلٹ کے ناول ''پروفیسر'' نے بہت سے پبلشروں کے دفاتر کے چکر لگائے لیکن کسی نے بھی اسے گھاس نہ ڈالی تاہم ایمیلی کا 'ودرنگ ہائٹس'' (1847ء) اور این کا ''ایگنس گرے'' (1847ء) کئی ماہ ٹھکرائے جانے کے بعد قبول کرلیا گیا۔ شارلٹ کی دوسری کاوش ''جین آئیر'' (1847ء) اشاعت کے فوری بعد کامیابی کی منزل حاصل کرگئی۔ برونٹے بہنیں تاحال بیل کے ایک خیالی نام سے اپنی کتب شائع کروا رہی تھیں لیکن ان کے پبلشروں نے ''جین آئیر'' کی مقبولیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہ بات عام کرنا شروع کردی کہ بیل کے نام سے لکھی جانے والی تمام کتب ایک ہی مصنف کی ہیں۔ اس اثنا میں برینویل خاندان کے معاملات سے کچھ ایسا لاتعلق ہوا کہ اسے پتہ ہی نہ چل سکا کہ اس کی بہنیں کیا کر رہی ہیں۔ تپ دق کے ساتھ کثرت شراب نوشی اور افیون کے بے جا استعمال نے اس کی صحت اس قدر بگاڑ دی تھی کہ 1848ء میں وہ زندگی سے ہی ہاتھ دھو بیٹھا۔ چند ماہ بعد ایمیلی بھی اس مرض کا شکار ہو کر چل بسی۔ این کا انتقال 1849ء میں ہوا۔ بہنوں کے گزرنے کے بعد شارلٹ اپنے باپ کے پاس ہاورتھ واپس چلی آئی جہاں اس نے لکھنے لکھانے کا شغل جاری رکھا اور دو ناول 'شرلی' (1849ء) اور ''ولٹ'' (1853ء) شائع کیے۔ اس نے 1854ء میں اپنے باپ کے ایک جونیئر پادری سے شادی کی لیکن شادی کے نو ماہ بعد اسے بھی موت نے نگل لیا۔

تینوں بہنوں میں سے ایمیلی زیادہ بڑی تخلیق کار تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کی نظمیں اور اس کا تحریر کردہ ناول بہت گہرے متصوفانہ رجحانات اور انتہا درجے کے شعری تخیل کا پتہ دیتے ہیں۔ ''ودرنگ ہائٹس'' کو اس دور میں تو کوئی خاص کامیابی نہ مل سکی تھی لیکن آجکل اس کا شمار عظیم ترین انگریزی ناولوں میں ہوتا ہے۔ ایمیلی کے انتقال کے بعد یہ بات مشہور ہوئی کہ اس ناول کا اصل مصنف برینویل تھا یا اس کا کچھ حصہ اس نے لکھا تھا اور یہ کہ ایک عورت ہونے کے ناطے ایمیلی اس درجہ درندگی اور بہیمیت کا حامل ناول تصنیف نہ کرسکتی تھی تاہم اس الزام کو تاحال ثابت نہیں کیا جاسکا۔ اگرچہ شارلٹ کے ناول کاروباری اعتبار سے کامیاب رہے، ان میں بعض خامیاں صاف جھلکتی نظر آتی ہیں۔ ایک نقص اس کا یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ ہر وقت اپنی آپ بیتی اپنی تحریروں میں گھسیڑتی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ''پروفیسر'' میں آپ بیتی کا رنگ صاف نظر آتا ہے جس

http://muftbooks.blogspot.com/

میں اس نے اپنے ایک سابق معلم مسٹر ہیگر کے ساتھ اپنے معاشقے پر تھوڑا وارنش پھیر کر قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ این کے ناولوں کو قابل توجہ نہیں گردانا جا سکتا۔ اس کی اگر کوئی مشہوری ہے تو صرف اس کی بہنوں کی وجہ سے ہے۔ اگر اس کا ان سے تعلق نہ ہوتا تو شاید اس کی نگارشات کو اب تک دنیا بالکل ہی بھول چکی ہوتی۔

برہما

ہندوؤں کا ایک دیوتا۔ ''برہما'' کا لفظ برہمن سے نکلا ہے۔ برہما ہندوستان کے مؤخر ویدک دور کا ایک بڑا دیوتا ہے۔ وہ کلاسیکی ہندو تثلیث میں خالق کے درجے کا حامل ہے۔ اسے ایک اعلیٰ وارفع مقام حاصل ہے مگر تعجب کی بات ہے کہ تثلیث کے بقیہ دو دیوتاؤں یعنی وشنو (رب) اور شیو (فنا کرنے والا) کی طرح اس سے زیادہ فرقے منسوب ہیں۔ ہندو دیومالا میں برہما زمین اور اس کی تمام مخلوقات کا خالق ہے اور اسے پرجاپتی (ویدی خالق دیوتا) سے منسوب کیا جاتا ہے اور بالآخر وہ اپنی شناخت کھو دیتا ہے۔ ابتدائی ہندو دیومالا کے مطابق برہما ایک طلائی انڈے سے جنما تھا لیکن موخر دور کی حکایات بتاتی ہیں کہ وہ وشنو کی ناف سے اگنے والے ایک کنول سے نکلا تھا۔ برہما کو برہمن سے گڈمڈ نہیں کیا جانا چاہیے۔ برہما ایک دیوتا ہے جبکہ برہمن ایک ایسی قوت ہے جو اس کائنات کی تمام طاقت پر مشتمل ہے۔

تریمورتی عقیدہ ان مختلف روایات کے مابین تصادم کو رفع کر کے برہما، شیو اور وشنو کو ایک ہی ذات اعلیٰ کے مختلف بہروپ قرار دیتے ہوئے انھیں آپس میں جوڑ دیتا ہے۔ تاہم ساتویں صدی میں مروج سمرتا پوجا برہما کو نظر انداز کر دیتی ہے اور اگرچہ شیو اور وشنو کے لیے وقف تمام مندروں میں برہما کی مورتی پڑی ملتی ہے برہما سے منسوب کسی خاص فرقے یا مسلک کا وجود کھائی نہیں دیتا۔ ہندو مندروں میں مرکزی جگہ اب بھی برہما کو دی جاتی ہے جو علامتاً کائنات سے تطابق کا حامل ہے۔ اس کی مورتی میں عموماً چار چہرے اور بانہیں دکھائی جاتی ہیں۔ یہ چار ہندو طبقوں ورنوں)، چار ادوار (یگوں) اور چار ابتدائی مقدس ہندی صحائف (ویدوں) کا علامتی اظہار ہے۔ برہما اکثر اپنی محبوباؤں ساوتری اور سرسوتی کے جلو میں سفید لباس میں ملبوس ایک راج ہنس یا کنول پر براجمان دکھایا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب، قربانی کے اوزار اور ایک مالا ہوتی ہے۔

برہمنیں

ہندو مذہبی تفاسیر۔ یہ تفاسیر ہندو مذہب کی قدیم ترین مقدس کتب ویدوں کے ساتھ ملحق ملتی

ہیں۔ برہمنوں کا تعلق 900 سے 700 قبل مسیح تک کے اس زمانے سے ہے جب مقدس شعری بھجنوں کے مجموعے عام ہوئے۔ وہ برہمن رسوم و تعلیمات اور بھجنوں کے پوشیدہ معانی کی تشریح کے لیے داستان و دیومالا کو استعمال میں لاتی ہیں۔ برہمنیں بنیادی طور پر قربانی کی رسومات سے متعلق ہیں جنھیں وہ عموماً کہانیوں کے رنگ میں بیان کرتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مقبول brahmana میں Shunahshepa کی اور ایتاریہ برہمن میں شناشیپا کی اور شتاپا تھا برہمن میں راجہ پوردراوس اور چڑیل اروشی کی کہانی ہے۔ اگرچہ برہمنوں کو ''ادب میں شمار نہیں کیا جاتا، انھوں نے بعد کے ادوار کے نثری اسلوب پر بہت زیادہ اثرات مرتب کیے ہیں۔

ان میں سے آرنا گیں ..... برہمنوں سے ملحق ابواب ..... زیادہ فلسفیانہ رنگ کی حامل ہیں۔ انھیں ''جنگلی عبارات'' کہا جاتا ہے کیونکہ ان میں درج مواد کی تعلیم نگر سے دور صرف جنگل میں ہی دی جاتی تھی۔ یہ آرنا گیں برہمنوں اور بعد میں منظر عام پر آنے والی نسبتاً زیادہ متصوفانہ تحاریر، اپنشدوں کی درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس سے قبل ہندوؤں کا زیادہ زور قربانی پر تھا لیکن بعد میں قربانی کی بجائے متصوفانہ اور باطنی علم [خصوصاً آتما (روح) اور برہمن (الوہیت) کے درمیانی تعلق کے علم پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ اپنشدیں اس تبدیلی کے بعد قلمبند کی گئی تھیں۔

بعل

سرزمین کنعان میں پوجا جانے والا موسم اور زرخیزی کا دیوتا۔ 'بعل' ایک قدیم سامی لفظ ہے جس کا مطلب 'آقا' یا 'مالک' ہے۔ کنعان کے اس دیوتا بعل کی شبیہ عموماً ایک طلائی بچھڑے کی صورت میں بنائی جاتی تھی جس کی پرستش سے اسرائیلی قوم کو توریت شریف میں سختی سے منع فرمایا گیا تھا۔ موسیٰؑ اور الیاسؑ بعل کی پرستش کے سخت خلاف تھے اور وہ اپنی قوم کو اس 'جھوٹے خدا' کی عبادت سے منع کرتے رہے۔ غالباً بچھڑوں کو لائق پرستش تصور نہیں کیا جاتا تھا بلکہ انھیں ایک ایسا مقدس جانور خیال کیا جاتا تھا جس پر بعل اور دوسرے دیوتا کھڑے ہوتے تھے۔

حال ہی میں شام کے علاقے میں کھدائیوں کے دوران بعل پر لکھی جانے والی ایک نظم ملی ہے جو غالباً چودھویں صدی قبل مسیح سے قبل کی ہے۔ اس نظم میں بعل کی دوسرے دیوتاؤں (خدائے بحر ہیم اور خدائے فنا، موت) کے ساتھ جنگ، انھیں پچھاڑنے اور انھیں پچھاڑ کر دیوتاؤں کا بادشاہ بننے کے احوال بیان کیے گئے ہیں۔ یم کو شکست دینے کے بعد بعل کھیتی باڑی اور موسموں کا بلاشرکت غیرے خدا بن گیا اور اس نے زمین پر ایک محیرالعقول محل بنایا جس کی بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں۔ جب بعل انھیں کھولتا تھا تو آسمان سے بارش برسنے لگتی تھی اور زمین سیراب

http://muftbooks.blogspot.com/

ہوجاتی تھی۔ اپنی بادشاہت قائم کر کے بعل نے موت کو ایک پیغام بھیجا جس میں اس نے اس کا لے خدا کو خراج دینے سے انکار کیا۔ اس پر عیار موت نے بعل کو پاتال میں ایک ضیافت پر مدعو کیا۔ بعل نے حامی بھر لی لیکن حفظ ماتقدم کے طور پر حفاظتی رسوم بھی ادا کرنا شروع کر دیں۔ پہلے اس نے خود کو بلاؤں کے اثر سے بچانے کے لیے اپنے جسم کو سرخ چاک مٹی سے لتھیڑا اور پھر طاقت کے لیے ایک مینڈھے سے اٹھاسی مرتبہ اختلاط کیا۔ لیکن ان سب تدابیر کے باوجود بعل اور اس کے حواری موت کے پیٹ میں جا پہنچے اور زمین پر خشک سالی کے خطرات منڈلانے لگے۔ بعل کی بہن اور محبوبہ انات نے جوابی حملہ کر کے موت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور ان ٹکڑوں کو کھیتوں میں بو دیا۔ بعل جب آزاد ہوا تو بارشوں کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا اور زمین سیراب ہونے لگی۔ بعل اور موت کے درمیان اس کشمکش کو موسموں کے الٹ پھیر اور کثرت و احتیاج کے دوروں کی اسطوری توجیہہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس نظم سے توریت کی بعض مبہم عبارات کی تشریح بھی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جوئیل اور زیفانیہ کے اجزا اسی کنعانی حکایت اور رسم کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں اور یسعیاہ میں بحری عفریت کی ہلاکت کا کارنامہ یہواہ (عبرانی زبان میں خدا) سے منسوب کیا جاتا ہے جو بعل کے کارنامے سے بہت مشابہ ہے۔ یونانی دیومالا سے بھی بہت چیزیں ملتی ہیں۔ ہوا، پانی اور زمین کی الوہی تثلیث بعل، یم اور موت کی جھلک ہمیں زیوس، پوسائڈن اور ہیڈیز میں بھی نظر آتی ہے۔

بلوچ

پاکستان کے جنوب اور ایران کے سرحدی علاقوں میں آباد ایک نسلی گروہ۔ بلوچیوں کی کل تعداد 40 لاکھ کے لگ بھگ ہے اور ان میں سے بیشتر پاکستان کے صوبہ بلوچستان میں آباد ہیں جو بلحاظ رقبہ پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے۔ پاکستان و ایران کے علاوہ کچھ بلوچی افغانستان، بحرین اور بھارت میں بھی آباد ہیں۔ بلوچی بنیادی طور پر خانہ بدوش لوگ تھے لیکن اب ان کی اکثریت زرعی رہن سہن اختیار کر چکی ہے۔

بلوچی چودھویں صدی عیسوی تک اس خطے میں وارد نہیں ہوئے تھے جسے ہم بلوچستان کہتے ہیں۔ اس کے بعد اس علاقے میں حملوں اور یلغاروں کا ایک طوفانی دور شروع ہوا۔ 1595ء میں بادشاہ جلال الدین اکبر (اقتدار 1556ء۔1605ء) نے اسے فتح کر کے مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں یہ افغانستان کے ساتھ بھی رہا اور 1843ء میں برطانوی راج کے زیر نگیں آ گیا۔ اس کے صدر مقام کوئٹہ کو باقاعدہ طور پر 1847ء میں انگریز

http://muftbooks.blogspot.com/

سلطنت میں شامل کیا گیا۔ انیسویں صدی میں اہل فارس نے اس کے غربی حصے پر قبضہ کرلیا جس کی حدود کا تعین 1872ء میں کیا گیا۔

1947ء کے بٹوارے کے بعد پاکستان کا حصہ بننے کے وقت سے لے کر آج تک بلوچستان میں کئی دفعہ خلفشار اور بدامنی دیکھنے میں آئی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو جو 1971ء سے 1977ء تک برسراقتدار رہے، کے دور میں، 1979ء کے ایرانی انقلاب کے بعد اور پھر صدر پرویز مشرف کے دور میں بلوچیوں میں خاص طور پر بہت بے چینی مشاہدے میں آئی۔ پاکستان کی مرکزی حکومت اس کی معاشی حالت بہتر بنانے کے لیے کوششیں کرتی رہتی ہے لیکن بیشتر بلوچستان اب بھی کم آباد، دیہی اور پسماندہ علاقوں پر مشتمل ہے۔ 1980ء کے عشرے میں افغانستان میں روسی مداخلت کے بعد بہت سے افغان پناہ گزین بھی بلوچستان میں آئے اور انھوں نے یہاں کچی آبادیاں بنا کر رہنا شروع کر دیا۔

بورابدور

جاوا میں موجود ایک بدھ یادگار۔ اسے 778ء۔824ء میں سیلندرا راجوں نے تعمیر کروایا تھا جنھوں نے جاوا پر آٹھویں اور نویں صدی میں حکومت کی۔ بورابدور غالباً سیلندر بادشاہ اندر (782ء۔812ء) کے مقبرے کے لیے بنوایا گیا تھا۔ اس کی تعمیر کا بیشتر کام اس کی زندگی میں ہی مکمل ہو گیا تھا لیکن شاید اس کی باقیات کبھی بھی اس مقبرے میں دفن نہیں کی گئیں۔ یہ عمارت ہندی اور جاوی طرز تعمیر کا خوبصورت امتزاج ہے۔ اس کا اسلوب گپتا دور کے ہندوستان سے درآمد کیا گیا تھا لیکن اسے تعمیر مقامی کاریگروں نے کیا جنھوں نے اس کی آرائش وزیبائش میں جاوی رنگ بھی شامل کر دیا۔ یہ عمارت دور سے ایک دیوہیکل سٹوپا کی مانند دکھائی دیتی ہے لیکن درحقیقت اسے ایک ہی پہاڑی سے نو چبوترے کاٹ کر بنایا گیا ہے۔

یہ نو چبوترے سدھارتھ گوتم (563۔483 ق م) کے بدھ بننے سے قبل کی نو زندگیوں کی علامت ہیں۔ مندر بھی اس طرح بنایا گیا ہے کہ زائر بدھ کے نروان کے روحانی سفر کی یاد تازہ کرنے کے لیے نو ''پیدائشوں'' میں سے گزرتا ہے۔ سٹوپا کائنات کے دیومالائی ماڈل، منڈل کی شکل میں بنایا گیا ہے جس میں دائرے (فلک، مربعے (زمین) اور بدھ کی علامتیں جمع ہو کر ایک دوسری سے مل جاتی ہیں۔ زائر اوپر جانے سے قبل سٹوپا کے گرد نو دفعہ طواف کرتا ہے اور بدھوں کے تصور کے مطابق ہر طواف کے انجام پر اکال اسے نگل جاتا ہے اور وہ ایک دفعہ پھر پیدا ہو کر اگلے مرحلے میں پہنچ جاتا ہے۔ ابتدائی چبوتروں کو ابھری شبیہوں اور بدھ کی مورتیوں وغیرہ سے انتہائی

دلآویز انداز سے سجایا گیا ہے لیکن اس کے بعض حصے سادہ ہیں جو زائر کے مادی دنیا کی وابستگی سے گزر کر سنسار سے رہائی اور نروان کی روحانی آزادی تک پہنچنے کی علامت ہے۔ بورابدور میں 2000 تصویری طغرے اور مہاتما بدھ کے 400 مجسمے نصب ہیں اور اسے بدھ مت کے نالندہ مسلک کی ایک مکمل نصابی کتاب قرار دیا جا سکتا ہے۔

بومرینگ

آسٹریلیا کے قدیم مقامی باشندوں کا ایک ہتھیار جس سے وہ شکار کرتے تھے۔ یہ لکڑی کے ایک خمدار ٹکڑے کی شکل کا ہوتا ہے اور ابتدا میں اسے آسٹریلیا میں دریائے جارجز کے قریب نیوساؤتھ ویلز میں آباد ایک قبیلے نے استعمال کیا۔ ایسے ہتھیاروں کے دیگر کئی قدیم معاشروں میں استعمال کا بھی پتہ چلا ہے۔ تاہم بومرینگ کے بارے میں ماہرین کا خیال ہے کہ یہ صرف اور صرف آسٹریلوی ایجاد ہے۔ شکار کے لیے استعمال کیے جانے والے بومرینگ پلٹکر پھینکنے والے کے پاس نہیں آتے۔ یہ بومرینگ پلٹنے والے بومرینگوں کی نسبت تھوڑے لمبے اور وزنی ہوتے ہیں۔ انھیں ایک طرز کی لاٹھی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور انھیں شکار کی طرف پھینکا جاتا ہے۔ ابتدا میں اس آلے کو کھدائی اور مقامی تقریبات میں آلۂ موسیقی کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

آجکل بومرینگ اپنی انوکھی ساخت کی وجہ سے جانے جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ پھینکنے پر ہوا میں گھومنے لگتے ہیں اور چند لمحوں بعد واپس پلٹ کر پھینکنے والے کے پاس آ گرتے ہیں۔ دراصل اس قسم کے پلٹنے والے بومرینگ آلۂ شکار کی بجائے کھلونوں کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ کنفیڈریشن آف آسٹریلین سپورٹس 1978ء میں ایک بومرینگ ایسوسی ایشن آف آسٹریلیا بھی قائم کر چکی ہے۔ یہ تنظیم بومرینگ مقابلوں اور سالانہ چیمپئن شپ کا انعقاد کرتی ہے۔

بووا، سیمون دی

خواتین کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے والی فرانسیسی فلاسفر اور ادیبہ۔ وہ وجودی مکتبہ فکر سے اپنی وابستگی اور عظیم فرانسیسی دانشور اور ناول نگار ژاں پال سارتر سے اپنے طویل تعلق کی وجہ سے بھی بہت مشہور ہے جس سے اس کی آشنائی کا آغاز 1929ء میں ہوا۔ دی بووا پیرس کی ساربان یونیورسٹی سے فلسفے کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کچھ عرصہ تدریس کے پیشے سے وابستہ رہی اور پھر اس نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا۔ سارتر کے ساتھ ذاتی تعلق کے ساتھ وہ

http://muftbooks.blogspot.com/

1945ء میں اس کے ساتھ اس وقت پیشہ ورانہ تعلق میں بھی منسلک ہوگئی جب دونوں نے مل کر ماہانہ جریدے عہد نو کی ادارت کے فرائض سنبھالے۔

ڈی بووا نے وجودی فلسفے کو بنیاد بنا کر متعدد ناول لکھے جن میں 1954ء میں شائع ہونے والا ''دی مینیڈرنیز'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس نے خود اپنی زندگی پر بھی بہت سی تحاریر قلمبند کیں جس میں اس نے خود اپنی اور اس دور کے فرانسیسی دانشوروں کی بڑی جذباتی اور فکر انگیز تصویر کشی کی ہے۔ دی بووا کو سب سے زیادہ شہرت اپنی کتاب ''جنس دگر'' (1949) سے ملی جس میں اس نے خواتین سے روا رکھے جانے والے جبر کا تاریخی تجزیہ پیش کیا ہے۔ بہت سے تجزیہ کاروں کی رائے ہے کہ جدید دور کے مغرب میں بپا ہونے والی حقوق نسواں کی تحریک کی بنا اسی تحریر سے پڑی۔ اس نے بوڑھوں اور بڑھاپے پر اپنی کم معروف تصانیف ''انتہائی آسان موت'' جو اس نے اپنی والدہ کی وفات کے بعد لکھی اور ''بلوغت'' (1970) میں ایسے موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے جسے بائیں بازو کے دیگر مفکرین نظر انداز کرتے چلے آئے تھے۔ اپنی زندگی کی آخری تصنیف 'الوداع سارتر' (1981) میں دی بووا نے اپنے ساتھی سارتر کے آخری برسوں کو موضوع تحریر بنایا ہے۔

بوہرہ

برصغیر پاک و ہند میں آباد ایک مذہبی فرقہ۔ بوہرہ ایک گجراتی لفظ کا بگاڑ ہے جس کا مطلب ہے ''تجارت کرنا''۔ شروع میں بوہرہ مسلک کے مقلدین متوسط اور تاجر طبقے کے وہ افراد تھے جنھوں نے ہندومت ترک کر کے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کا جھکاؤ زیادہ تر شیعہ عقیدے کی طرف ہے۔ موجودہ دور میں شیعہ بوہرہ افراد کی تعداد دو لاکھ سے زائد ہے اگرچہ اس فرقے میں سنی مسلمان بھی ایک قلیل مقدار میں موجود ہیں۔

بوہرہ عقیدے کے ماننے والے افراد کا تعلق شیعہ عقیدے کے ذیلی مسلک مُستعلی سے ہے۔ اس مسلک کی بنیاد مصر میں رکھی گئی، بعد میں اس کا مرکز یمن میں بنا اور پھر مبلغین کے توسط سے یہ گیارھویں صدی میں برصغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں پھیل گیا۔ 1539ء کے بعد بوہرہ مسلک کے گجرات اور ہندوستان کے دیگر علاقوں میں جڑ پکڑنے کی وجہ سے اس کا مرکز یمن سے ہندوستان کے ایک مقام سدھ پور منتقل کر دیا گیا۔ اس فرقے کا پیشوا داعی کہلاتا ہے۔ ضہیب ابن موسیٰ اس کے پہلے جبکہ داؤد شاہ چھبیسویں داعی تھے۔ 1590ء کے لگ بھگ داؤد شاہ کے انتقال کے بعد بوہریہ فرقہ دو مخالف دھڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک کی قیادت ہندوستان کے داؤد

http://muftbooks.blogspot.com/

ابن قطب شاہ اور دوسرے کی باگ ڈور یمن کے سلیمان نے سنبھال لی۔ یہ دونوں گروہ اب بھی موجود ہیں اور ان کے مراکز بھارتی شہر ممبئی میں واقع ہیں۔ بوہرہ فرقے میں ایک اور تفرقہ بیسیوں صدی میں دیکھنے میں آیا جب داؤدی قدامت پسند اور ترقی پسند دو الگ الگ جماعتوں میں تقسیم ہو گئے۔ ان میں سے قدامت پسند جماعت روایتی رسوم و عبادات کی قائل ہے اور ملا جی کو اپنا امام تسلیم کرتی ہے جبکہ ترقی پسند بوہری ملا جی کے خلاف ہیں، اور وہ مذہبی عقائد و عبادات کو تعلیم اور معیار زندگی کے جدید تصورات سے ہم آہنگ کر کے چلنا چاہتے ہیں۔ ترقی پسند بوہرہ جماعت کو لوگوں میں زیادہ پذیرائی ملی ہے۔

بیکٹ، سیموئیل (بارکلے) (1906ء۔1989ء)

آئرش ناول نگار، شاعر اور ڈرامہ نویس۔ بیکٹ کو 1969ء میں ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔ بیکٹ نے تحریری زبان اور سٹیج کے مناظر کے سلسلے میں بہت سی اختراعات اور تجربات کیے۔ ان کی تخلیقات نے جدید ادباء کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا اور ادب میں نت نئے رجحانات متعارف کرائے۔ بیکٹ کے یاسیت سے پر مناظر، نحیف و نزار اور الجھے کردار اور قنوطی زاویہ نظر، جنگ عظیم دوم کے مغربی معاشرے کی رنج و یاس سے پر بے مقصدیت کی بڑی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔

بیکٹ نے ڈبلن کے ایک خوشحال پروٹسٹنٹ گھرانے میں آنکھ کھولی اور ڈبلن کے ٹرنٹی کالج سے السنہ جدید میں بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں پاس کیں۔ وہ 1928ء میں پیرس منتقل ہوئے اور بقیہ تمام عمر وہیں گزار دی۔ پیرس میں ان کی ملاقات ایک دوسرے ممتاز آئرش ادیب جیمز جوائس سے ہوئی جس نے ان کے اسلوب تحریر کو بہت متاثر کیا۔ یہ بات مشہور ہے کہ بیکٹ نے جیمز جوائیس کے تنخواہ دار سیکرٹری کے طور پر کام کیا لیکن تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اس دعوے میں کوئی حقیقت نہیں۔ بیکٹ نے ایک دوست کی حیثیت سے ایک بہت عمدہ اور دل چسپ رفاقت دی اور اس کی خاطر بہت سے ادبی کام سرانجام دیے۔ بیکٹ نے جلد ہی تصنیف و تالیف کو سنجیدگی سے لینا شروع کر دیا۔ انھوں نے اپنا پہلا مضمون 1929ء میں جوائیس کی تخلیقات کے حوالے سے شائع ہونے والی ایک کتاب کے لیے تحریر کیا۔ 1930ء میں ان کا شعری مجموعہ ''ہور وسکوپ'' شائع ہوا۔ تنقید پر ایک مختصر تصنیف ''پروست'' 1931ء میں منظر عام پر آئی اس کے بعد 1934ء میں ان کا افسانوی مجموعہ More Pricks than kicks چھپا۔ ان کے پہلے ناول ''مرفی'' کو چالیس سے زائد پبلشروں نے مسترد کیا اور وہ 1938ء میں امریکہ میں شائع ہوا لیکن اس دور

http://muftbooks.blogspot.com/

میں بہت کم لوگوں نے اسے قابل اعتنا سمجھا۔ ان مشکل اوقات میں بیکٹ کو بہت سی امراض نے بھی آگھیرا جن میں سے بعض کی وجوہ سراسر نفسیاتی تھیں اور وہ جب کبھی کبھار کسی عائلی مسئلے کی وجہ سے آئرلینڈ جاتا تو ان میں شدت پیدا ہو جاتی تھی۔ 1939ء کے بعد بیکٹ نے اپنی بیشتر تخلیقات پہلے فرانسیسی زبان میں قلمبند کیں اور پھر ان کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔

جنگ عظیم دوم میں بیکٹ نے فرانس کے محکمہ جاسوسی کے لیے کام کیا جس کے صلے میں اسے جنگ کے بعد گرانقدر اعزازت سے بھی نوازا گیا۔ 1947ء سے لے کر 1957ء تک اس نے وہ نگارشات قلمبند کیں جن کے لیے وہ زیادہ معروف ہے۔ ان میں تین ناولوں یعنی مولوی، ملون کی موت اور بے نام اور در انتظار گودو (1949ء) اور آخر بازی (1956ء) جیسے شاہکار کھیل شامل ہیں۔ در انتظار گودو پہلی بار 1953ء میں پیرس میں دکھایا گیا۔ اس نے مغرب کی سماجی اور علمی زندگی کو ایک نیا موڑ دیا اور بیکٹ کو راتوں رات شہرت کے بام عروج پر پہنچا دیا۔ اس کھیل میں بہت سی ڈرامائی اور ادبی روایات سے انحراف کیا گیا تھا۔ اس کے عجیب و غریب سٹیج اور لائحل ابہام نے اس چیز کی بنیاد رکھی جسے بعد میں یا وہ ''تھیٹر 'Theatre of the Absurd' کا نام دیا گیا۔ اس ڈرامے کی کامیابی سے حوصلہ پا کر بیکٹ نے بعد کی تخلیقات میں اور بھی زیادہ شدومد سے نئے تجربات کرنے شروع کر دیے۔ ان مختصر اور سادہ کھیلوں میں بیکٹ اداکاروں کے جسم پر زور کم کرتا چلا گیا اور آخر میں اس نے اسے بالکل ہی حذف کر دیا۔ اس کے کھیلوں میں آوازیں سنائی دیتی تھیں جسم نظر نہ آتے تھے بلکہ 1971ء میں پیش کیے جانے والے ایک ڈرامے 'سانس' میں تو آواز بھی غائب ہو گئی اور صرف منظر ہی منظر سامنے رہ گیا۔ تیس سیکنڈ کے اس کھیل میں ناظرین کو فقط ایک ہلکی سی آہ کا اتار چڑھاؤ سنائی دیتا ہے۔ اس کے کھیل 'کھیل' کے دوسرے نصف میں پہلے نصف کو حرف بہ حرف دہرایا جاتا ہے اور 'ڈرامچے' آیئے اور جایئے' میں دس منٹ تک ایک ہی ایکشن بار بار دہرایا جاتا ہے۔

بیکٹ نے 1969ء میں نوبل پرائز حاصل کیا اور اگلے برس اس کی نگارشات کے مجموعے کی سولہ جلدیں شائع ہوئیں۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری چند برس سفر و سیاحت اور اپنے کھیلوں کی پروڈکشن کی نگرانی پر صرف کیے۔ ان کا انتقال 83 سال کی عمر میں سانس بند ہونے کی وجہ سے ہوا۔

پ

پال، سینٹ

حضرت عیسیٰ کے حواری اور دین عیسائیت کے عظیم مبلغ۔ ان کے خطوط کو عہد نامہ جدید میں اہم مقام حاصل ہے۔ ان کا اصل نام سال الطرطوسی تھا وہ ایک کٹر یہودی اور عیسائیوں کے پکے دشمن تھے۔ ایک روایت کے مطابق جب وہ عیسائیت کو کچلنے کے عزم سے دمشق کی طرف سفر کر رہے تھے تو ان کی آنکھیں روشنی سے اندھی ہو گئیں اور انہیں حضرت مسیحؑ کی آواز سنائی دی جو کہہ رہے تھے کہ ''تم مجھے کیوں مارتے ہو؟'' جب انہیں دوبارہ بینائی حاصل ہوئی تو انہوں نے اپنا نام سال سے تبدیل کر کے پال رکھ لیا اور اپنی عمر کے اگلے تیرہ برس عیسائیت کی تعلیم و تبلیغ میں صرف کر دیے۔ سینٹ پال نے سینٹ برناباس اور سینٹ مارک کی معیت میں تین تبلیغی سفر طے کئے اور عیسائیت کا پیغام یہودیوں، قبرصیوں، ایشیائے کوچک، یونان اور روم تک پہنچایا۔ اس وقت کے رومن حکمرانوں نے ان کے مشن کو اپنی سلطنت کیلئے خطرہ خیال کرتے ہوئے انہیں اس وقت گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا جبکہ وہ یروشلم کے دورے پر تھے۔ انجام کار انہیں 60ء کو روم بھیج دیا گیا۔ انہیں یہاں بھی قید میں رکھا گیا لیکن انہیں اپنی کوٹھڑی سے تبلیغ کرنے کی اجازت تھی۔ ان کا انتقال کب اور کن حالات میں ہوا، اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ پانچ یا چھ سال بعد ان کا سر قلم کر دیا گیا تھا۔ اس وقت تک وہ رومن شہنشاہ نیرو (54ء۔ 68ء) کی ایک داشتہ کو عیسائی بنا چکے تھے۔ سینٹ پال کی حیات و تعلیمات نے عیسائیت کی اشاعت میں بہت اہم کردار ادا کیا یہ ان کی بپا کی ہوئی تبلیغی تحریک کا ہی ثمر تھا کہ عیسائیت نے تین سو سال سے بھی کم عرصے میں رومن سلطنت کے سرکاری مذہب کا مقام حاصل کر لیا اور اس کے بعد یہ دنیا کے ایک بڑے مذہب کے طور پر مانا جانے لگا۔

پرستش اجداد

آباؤ اجداد کی تکریم کی رسومات۔ انھیں افریقہ و ایشیا سے لے کر بحرالکاہل تک کے بشمول دنیا کے کئی مختلف علاقوں میں مذہبی اظہار کی ایک شکل کے طور پر مختلف طریقوں سے ادا کیا جاتا ہے۔ ایسی رسومات کے ماننے والوں اور ان میں شرکت کرنے والے افراد کے نزدیک مرنے

http://muftbooks.blogspot.com/

والے اس دنیا کے معاملات میں اتنا (اگر اس سے زیادہ نہیں) ہی عمل دخل اور اثر رکھتے ہیں جتنا کہ وہ مرنے سے پہلے رکھتے تھے۔ بعض لوگوں کا عقیدہ تو یہاں تک بھی ہے کہ مرنے والے بزرگوں کے پاس پس از مرگ ایسی خاص قوتیں آجاتی ہیں جنھیں وہ اس ارضی دنیا میں بسنے والے اپنے لوگوں کا کچھ سنوارنے یا بگاڑنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ مرنے والے کے عزیز و اقارب مختلف وجوہ کی بنا پر ان کی پوجا شروع کر دیتے ہیں۔ ان وجوہ میں صدمے یا جرم کے احساس میں تخفیف بھی ہوسکتی ہے، مرنے والے سے کسی فائدے کی توقع بھی ہوسکتی ہے یا پھر خاص طاقتوں کی حامل اس روح کے عتاب کا خوف بھی ہوسکتا ہے۔

اگرچہ مختلف معاشروں میں مروج رسومات اور ان کے پیچھے کارفرما اسباب وعلل میں فرق پایا جاتا ہیمگر ان کا بنیادی عنصر ایک جیسا ہی ہے اور وہ ہے جانے والی کی عزت و تعظیم۔ افریقہ اور بحرالکاہل کے بہت سے استوائی مقامات میں تصور کیا جاتا ہے کہ پرستش اجداد اس دنیا اور اُس دنیا کے درمیان رابطہ واتصال کے ذریعے کا کام کرتی ہے۔ ایسی پرستش کے دوران لوگ رقص وسرود کے توسط سے ماضی کی ارواح کو بلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاہم بعض افریقی سلسلے 'پرستش' اجداد کی اصطلاح کو ناپسند کرتے ہیں اور اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ اسے 'تکریم' اجداد کہا جائے۔ ان کا مؤقف یہ ہے کہ وہ بزرگوں کی خدا کی طرح پوجا نہیں کرتے بلکہ صرف ان کی یاد مناتے ہیں اور ان سے اظہار عقیدت کرتے ہیں۔ اسی طرح ایشیا خصوصاً چین میں بھی خاندانی اتحاد اور بزرگوں کی تعظیم پر زور دیا جاتا ہے۔

پرستش اجداد کی رسمیں زمانہ قبل تاریخ سے چلی آتی ہیں۔ بعد میں یہ باقاعدہ طور پر کنفیوشس مت کے ایک جزو کی شکل اختیار کر گئیں جسے آپ چین کا سب سے بڑا مذہب قرار دے سکتے ہیں۔

کنفیوشس مت کے پیرو پرستش اجداد کی تقاریب میں دعائیں مانگتے ہیں، نذریں اتارتے ہیں، خوشبو سلگاتے ہیں اور ایسی چوبی میزوں پر نیاز پیش کرتے ہیں جن پر آنجہانی بزرگوں کے نام کندہ ہوتے ہیں۔ چینی ثقافت میں خاندانی وفاداری کو اعلیٰ ترین اقدار میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں یہ رسومات آج بھی جاری وساری ہیں۔

پرستش اجداد کا جہاں ایک مذہبی پہلو ہے وہاں شاید اس کا ایک سماجی پہلو بھی ہے اور وہ ہے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا اور انھیں باہم دگر جوڑنا۔ ان رسومات کے شرکاء ایک دھاگے میں پروئے جاتے ہیں اور وہ سب خود کو ایک 'جماعت' کا حصہ سمجھنے لگتے ہیں جس سے نہ صرف خاندانی قدروں کو تقویت ملتی ہے بلکہ سماجی قدروں کو بھی۔

http://muftbooks.blogspot.com/

پشاور

یہ تاریخی شہر شمال مغربی سرحدی صوبے کا صدر مقام ہے۔ دوسری صدی قبل مسیح میں ایک یونانی النسل بادشاہ یوکراٹائیڈز نے اس زرخیز وادی پر قبضہ کر کے اپنی بادشاہت میں شامل کر لیا تھا۔ اگر تھوڑا آگے آئیں تو پہلی صدی عیسوی یعنی گندھارا تہذیب کے زمانے میں یہ شہر راجہ لکش (اندازاً 120ء) کے تحت کشن سلطنت کا پایہ تخت بنا۔ اس دور میں اسے پرس پورا اور پرسوارا (بمعنی ''قصبہ'' یا پرس کی ''رہائش'') دونوں ناموں سے پکارا جاتا تھا۔

منطقہ پشاور کے حوالہ جات سنسکرت کی ابتدائی کتابوں نیز قدیم یونانی جغرافیہ دان سٹریبو (64/63 ق م۔23ء) اور سکندریہ نژاد مشہور ماہر فلکیات بطلیموس (دوسری صدی عیسوی) کی تحریروں میں بھی ملتے ہیں۔ پشاور کو بدھ مت سے ایک خاص تاریخی نسبت ہے جس کی تصدیق برصغیر کے سب سے بڑے اس سٹوپا (بدھ خانقاہ) کے کھنڈرات سے ہوتی ہے جسے شاہ جی کی ڈھیری کہا جاتا ہے۔ بدھ مت کو اس خطے سے 988ء میں مسلم قبضے میں آنے تک ایک بہت طاقتور قوت کی حیثیت حاصل رہی۔ اگرچہ سولہویں صدی میں افغانوں نے پشاور کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا، یہ شہر انیسویں صدی میں مغلیہ سلطنت کے خاتمے تک کم از کم کسی حد تک مغل حکومت کے زیر نگیں رہا۔

پشاور بیگرام کے نام سے بھی معروف رہا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس شہر کو اس کا موجودہ نام مغل فرمانروا اکبر اعظم (اقتدار 1556ء۔1605ء) نے دیا تھا۔ پشاور 1834ء میں سکھ ریاست کا حصہ بن گیا یا لیکن پندرہ برس بعد اسے برطانوی راج کے زیر نگین آنا پڑا۔ پشاور پر تاج برطانیہ کی عمل داری 1947ء میں ہندوستان کے بٹوارے تک قائم رہی اور پھر یہ شمال مغربی سرحدی صوبے کے صدر مقام کی حیثیت سے پاکستان میں آ گیا۔ پشاور میں 1971ء سے لے کر 1981ء تک شہری آبادی کی شرح میں 103 فیصد کے حساب سے اضافہ دیکھنے میں آیا۔ پشاور یونیورسٹی کی بنیاد 1950ء میں رکھی گئی اور اس کے پانچ اپنے اور اٹھارہ الحاقی کالج ہیں۔

پشاور افغانستان اور وسطی ایشیا کے ساتھ قافلوں کی تجارت کا مرکز ہونے کے حوالے سے بہت طویل تاریخ کا حامل ہے۔ غیر ملکی سوداگر آج بھی پشاور کے قدیم قصہ خوانی بازار میں جمع ہو کر خشک میوہ جات، اونی مصنوعات، غالیچوں، قالینوں، پوستین، قراقلی ٹوپیوں اور چترالی چوغوں کی خرید و فروخت کیلئے بھاؤ تاؤ کرتے نظر آتے ہیں۔

http://muftbooks.blogspot.com/

پشتون

افغانستان اور پاکستان میں آباد ایک خاص نسلی گروہ کے افراد۔ وہ زیادہ تر ان دونوں ملکوں کے سنگم کے علاقوں میں آباد ہیں۔ انہیں پختون اور پٹھان بھی کہا جاتا ہے اور انہیں وسطی اور مشرقی افغانستان اور پاکستان کے شمال مغربی سرحد صوبے میں غالب اکثریت حاصل ہے۔ ابتداء میں پشتونوں کو افغان کہا جاتا تھا لیکن بعد میں یہ اصطلاح علاقے کے تمام باشندوں کیلئے استعمال کی جانے لگی۔ ان افغانوں کے بارے میں پہلا ذکر ہندوستان کے ماہر فلکیات وراہا مہیرا کی چھٹی صدی کی تحریروں میں ملتا ہے۔

پشتون تاریخ کے مطابق وہ سب ایک ہی افغان جد کی اولاد ہیں۔ اب اللہ جانتا ہے کہ افغانستان ہی ان کا اصل وطن ہو لیکن اس وقت پاکستان میں رہنے والے پشتونوں کی تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے جو کہ افغانستان میں مقیم ہیں۔ پاکستانی پشتون ان علاقوں میں تیرہویں تا سولہویں صدی کے عرصے میں آئے۔ بیشتر پشتونوں کی معاشرت اب بھی قبائلی ہے اور ان کے قبیلوں کی کل تعداد ساٹھ سے بھی زیادہ ہے جو آگے مزید چھوٹے چھوٹے گروہوں، برادریوں اور خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ پشتون اپنا حسب ونسب اپنے باپ دادا کی طرف سے متعین کرتے ہیں اور وراثت وجانشینی کے فیصلے اسی بنیاد پر کئے جاتے ہیں۔ پشتونوں میں عزت، غیرت اور جائیداد کے مسائل پر خاندانی اور قبائلی تنازعات بہت عام ہیں۔

درانیوں (جنہیں ابدالی بھی کہا جاتا ہے) کا قبیلہ پشتونوں کا سب سے طاقتور قبیلہ مانا جاتا ہے۔ احمد شاہ ابدالی کے دور (اٹھارہویں صدی) میں افغانستان پہلی بار ایک متحد سیاسی قوت بن کر ابھرا۔ درانی ایک مشترک طرز رہن سہن کی بنا پر متحد ہیں اور ان کی زبان پشتو کہلاتی ہے۔ ان میں پڑھے لکھے لوگ فارسی اور اردو بھی بول لیتے ہیں۔ بیشتر پشتون زراعت پیشہ ہیں جبکہ بعض بھیڑ بکریاں پالتے ہیں یا پھر تجارت کرتے ہیں۔ انہیں ایک جنگجو قوم تصور کیا جاتا ہے۔ انہوں نے شمالی ہندوستان میں بادشاہتیں بھی قائم کیں۔ پشتون ثقافت نے کئی صوفی شاعر اور جرنیل پیدا کیے ہیں۔

پشتون ثقافت پشتونوں کے اپنے منفرد سماجی تشخص اور فارسی کلچر کی آئینہ دار ہے۔ خٹک قبیلے کے سردار خوشحال خان (1613ء۔1689ء) کی لوک شاعری فارسی و پشتون دھاروں کا سنگم محسوس ہوتی ہے وہ غزل اور رباعی کی روایتی فارسی اصناف میں تھوڑی کانٹ چھانٹ کر کے اپنے بہادرانہ اور عاشقانہ جذبات کے اظہار کا کام لیتے نظر آتے ہیں۔ پشتونوں کی ادبی تاریخ میں اور

http://muftbooks.blogspot.com/

بھی کئی بڑے شاعر موجود ہیں۔ افغان جرنیل احمد شاہ درانی (وفات 1772ء) کا دیوان مشہور ہے۔ پاکستان کے صوفی شاعر رحمان بابا (وفات 1706ء) کو کون نہیں جانتا۔ آج کے دور کو دیکھیں تو راحت زخیلی (وفات 1963ء) کا نام ممتاز نظر آتا ہے۔ احمد فراز جیسے کئی پشتون شاعر اردو کو بھی وسیلہ اظہار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

پشکن، الیکساندر (سرگی وچ) (1799ء۔1837ء)

روسی شاعر۔ پشکن نے ماسکو کے ایک رئیس خانوادے میں آنکھ کھولی۔ ماں کی طرف سے ان کا نسب حبشہ کے ایک شاہی سلسلے سے جا ملتا ہے جس کے افراد ابراہم گنی بال کا لقب استعمال کرتے تھے اور پطرس اعظم کے تحت خدمات سرانجام دیتے تھے۔ پشکن 1817ء میں اپنی تعلیم مکمل کرنے سے قبل ہی بطور شاعر مشہور ہو گئے تھے۔ بعد ازاں انہوں نے سینٹ پیٹرز برگ میں سرکاری وظیفہ خوار کی حیثیت سے اپنی مشہور نظم رسلان اور لڈ ملا (20-1817ء) لکھی۔ اس نظم نے، جس کیلئے انہوں نے روس کی لوک کہانیوں کے مختلف عقائد سے استفادہ کیا تھا، ان کا نام روس کے ادبی منظر نامے میں اور بھی اجاگر کر دیا۔ تاہم 1820ء میں چند ناپسندیدہ سیاسی چٹکلے لکھنے اور تقسیم کرنے کے سبب ان کا ''تبادلہ'' روس کے جنوبی علاقے میں کر دیا گیا۔

جلاوطنی کے اس زمانے میں پشکن نے بحر اسود کے ساحل کے ساتھ ساتھ اور کاکیشیا میں بہت زیادہ سیر و سیاحت کی جس کے دوران وہ اپنا تصنیفی کام بھی سرانجام دیتے رہے۔ سرکار کے ساتھ ان کا تنازعہ بھی چلتا رہا اور 1824ء میں انہیں کفر اور حکومت مخالف جذبات پھیلانے کی پاداش میں ان کی خاندانی جاگیر میں جلاوطن کر دیا گیا۔ انہیں جلاوطن کرنے میں اوڈیسا کا گورنر جنرل کاونٹ وورنت سوف، جس کی بیوی کے ساتھ پشکن کا کافی طویل عرصہ معاشقہ چلتا رہا تھا اور جس سے اس کا ایک ناجائز بچہ بھی تھا، بہت کارآمد ثابت ہوا۔ پشکن نے میخائلوسکو میں اپنی آبائی جاگیر میں سکونت کے دوران اپنے اس شاہکار ناول ''یوجین اونیگن'' پر کام جاری رکھا جس کا آغاز اس نے اوڈیسا میں کیا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہاں اپنا ڈرامہ ''بورس گاڈونوف'' بھی پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

پشکن پر سے 1826ء میں پابندی اٹھالی گئی اور وہ ایک بار پھر سینٹ پیٹرز برگ واپس آ کر اپنی ادبی و سماجی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ 1830ء کی خزاں میں انہیں ہیضے کی وبا پھوٹنے کی وجہ سے غیر متوقع طور پر جنوبی روس میں واقع بولڈینو کی اپنی آبائی جاگیر میں مقید ہونا پڑا۔ اس دوران انہیں ایک بے پناہ تخلیقی کا تجربہ ہوا جس کے دوران انہوں نے ''یوجین اونیگن''

http://muftbooks.blogspot.com/

اور اپنی بعض بہترین نظمیں مکمل کیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنا ایک افسانوی مجموعہ ''بیلکن کی کہانیاں'' (1831ء) اور مختصر شعری ڈراموں کا مجموعہ 'چھوٹے چھوٹے المیے' (1830-36ء) بھی اسی دور میں مکمل کیا۔ پشکن نے 1831ء میں ایک اٹھارہ سالہ دوشیزہ نتالیہ گونچاروا سے شادی کر لی لیکن یہ زیادہ خوشگوار ثابت نہ ہو سکی۔ گونچاروا کی مصروف سماجی زندگی اور ایک بڑھتے ہوئے کنبے کی مالی ضروریات کی وجہ سے پشکن کو اپنی تخلیقی سرگرمیوں کیلئے بہت کم فرصت مل پاتی تھی۔ پھر ہوا یوں کہ پشکن کی نواجون بیوی کی ایک گارڈز آفیسر بیرن جارج سے آنکھ لڑ گئی جس پر پشکن سیخ پا ہو گئے اور انہوں نے بیرن کو لڑنے کا چیلنج دے ڈالا لیکن اس سوئمبر کے نتیجے میں پشکن کو جو زخم آئے وہ ان سے جانبر نہ ہو سکے۔

پشکن نے ایک شاعر کی حیثیت سے ادبی روایت پر بہت دیرپا نقوش مرتب کیے ہیں۔ ان کی شروع کی تحریروں میں فرانسیسی اور برطانوی رومانویت کا رنگ نمایاں ہے لیکن بعد میں انہوں نے اس روش کو ترک کر کے زبان و بیان کیلئے نئے نئے تجربے کیے اور ایک سادہ اور نپا تلا شعری اسلوب اختراع کیا جو کہ ان کی طویل نظموں ''پولٹاوا'' (1828-29ء) اور ''کانسی کا گھڑ سوار'' (1833ء) میں بخوبی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ 1830ء کے عشرے میں پشکن نے ''حکم کی ملکہ'' (1834ء) نامی ایک ناولچے کے بشمول بہت سی نثری نگارشات قلمبند کیں۔ پشکن نے اپنی تصانیف میں سیاسی موضوعات پر خامہ فرسائی بھی جاری رکھی۔ مثلاً انھوں نے اپنے تاریخی ناول ''کیپٹن کی بیٹی'' (1836ء) میں 74-1773ء کی کسان اور کوسک بغاوتوں کو موضوع بحث بنایا۔

پکاسو، پیبلو (1681ء۔1973ء)

دنیا کے ایک عظیم اور نامور مصور جن کا تعلق سپین سے تھا۔ ان کا پورا نام پیبلو روئز پکاسو تھا اور وہ سپین کے علاقے ملاگا میں پیدا ہوئے لیکن صدی بدلتے ہی وہ ادب و ثقافت کے عالمی مرکز پیرس میں منتقل ہو گئے۔ 1903ء میں انہوں نے لیفٹ بینک کے علاقے میں رہائش اختیار کر لی اور غرباء و مساکین کی عام روزمرہ زندگی پر تصویریں تخلیق کرنے لگے۔ جلد ہی ان کی تخلیقی عظمت کا لوہا مان لیا گیا اور ہر طرف ان کا طوطی بولنے لگا۔ ان تصویروں کو عموماً پکاسو کے دور نیلگوں (1901-04ء) کی تخلیقات کہا جاتا ہے۔ نیلگوں کے بعد گلابی دور (1905-08ء) شروع ہوتا ہے جس میں پکاسو نے سرکسی زندگی (جس کے ساتھ لگتا ہے انہیں بہت لگاؤ تھا) کی تصویر کشی کی ہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

پکاسو نے پیرس میں رہتے ہوئے فرانس کے مشہور تاثریتی مصور پال سیزین (1839ء۔1906ء) سے بہت اثر قبول کیا اور اس اثر کے تحت وہ اپنی مصوری میں ہندسی اشکال کا تجربہ کرنے لگے۔ 1907ء میں پکاسو کا ہندسی اشکال کا تجربہ ان کی تصویر ''دوشیزگان اوینیوں'' کی صورت میں ظاہر ہوا جسے ہم اس مکعبی تحریک کے نقطہ آغاز سے تعبیر کر سکتے ہیں جس کیلئے پکاسو اور ان کے دوست مصور جارجز براک (1882ء۔1963ء) غالباً سب سے زیادہ معروف ہیں۔ پکاسو کے شاہکار تین سازندے (1921ء) کو ہم مکعبی انداز کا عروج اور اس کی انتہا کہہ سکتے ہیں۔ پکاسو کیلئے اپنی قوت متخیلہ اور جولانی طبع کو کسی ایک نظام میں قید کرنا ممکن نہ تھا لہٰذا ہم انہیں ایسے فن پارے بھی تخلیق کرتے دیکھتے ہیں جن پر نیو کلاسیکی اور سرریئلسٹ رنگ غالب ہے۔ مرقع کی صنف کے فروغ و ترویج کا سہرا بھی پکاسو اور براک کے سر جاتا ہے۔

دوسری عالمگیر جنگ کے دوران جب پیرس پر نازیوں کا قبضہ ہوا تو پکاسو نے نازیوں کی جدید آرٹ سے کدورت کو دیکھتے ہوئے اپنے فن پارے بینک آف فرانس کے ایک صندوق میں چھپا دیئے تھے۔ 1940ء کے عشرے میں پکاسو نے کمیونزم کا نظریہ اپنا لیا اور والارس اور پھر کینس رہنے لگے۔ یہاں انہوں نے مصوری کے علاوہ مجسمہ تراشی، طباعت، سرامکس اور مرقع کا کام بھی کیا۔ 1958ء میں انہوں نے پیرس میں اقوام متحدہ کی عمارت کیلئے ایک بڑا تصویری طغریٰ تیار کیا۔

پنجاب

برصغیر میں واقع ایک جغرافیائی خطہ جواب پاکستان اور بھارت کے درمیان منقسم ہے۔ ''پنجاب'' کا لفظ دو فارسی لفظوں ''پنج'' اور ''آب'' سے مل کر بنا ہے اور اس علاقے کو اس نام سے اس لئے پکارا جاتا ہے کیونکہ شروع میں اس میں سے پانچ دریا گزرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ 10-1709ء میں ایک سکھ درویش اور سپہ سالار بندہ سوم جی بجادر نے اس خطے کو مغلوں کی عملداری سے چھڑا کے پنجاب کی بنیاد رکھی۔ سکھوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ (1790ء۔ 1839ء) کے دور میں پنجاب میں ایک طاقتور حکومت قائم کی لیکن 1849ء میں یہ علاقہ انگریزوں کے زیر نگین آ گیا۔

1947ء کے بٹوارے کے بعد پنجاب کے دو حصے ہو گئے۔ مغربی پنجاب پاکستان جبکہ مشرقی پنجاب بھارت کے ساتھ چلا گیا۔ پاکستان کی دو تہائی اور بھارتی ریاستوں پنجاب اور ہریانہ کی اکثریتی آبادی پنجابی زبان استعمال کرتی ہے۔ پاکستانی پنجاب کی تقریباً تمام کی تمام

http://muftbooks.blogspot.com/

آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ لاہور اس کا صدر مقام ہے اور بلحاظ رقبہ ملک کا دوسرا اور بہ اعتبار آبادی سب سے بڑا صوبہ ہے۔ 1955ء میں مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں جن میں پنجاب بھی آتا ہے، کو ملا کر ون یونٹ تشکیل دے دیا گیا تھا۔ دوسری طرف 1966ء میں بھارتی پنجاب میں یہ ہوا کہ اسے لسانی بنیاد پر تین مزید چھوٹی وحدتوں یعنی ایک بڑے پنجابی صوبے، ہندی زبان کی ریاست ہریانہ اور ہماچل پردیش میں تقسیم کر دیا گیا۔

ان لسانی تنظیم نو کا مقصد ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان کشیدگی فرو کرنا تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا اور 84-1980ء میں پنجاب کا مسئلہ ابھر کھڑا ہوا۔ اس کی ایک وجہ پنجاب کی تنظیم نو مکمل کرنے میں بھارتی حکومت کی ناکامی بھی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1980ء میں انتہا پسند سکھوں کی بہت سی جماعتیں زور پکڑنے لگیں اور انہوں نے امرتسر میں واقع اپنے مقدس گوردوارے گولڈن ٹیمپل کو اپنی کارروائیوں کا مرکز بنا لیا۔ 1984ء میں اس وقت کی بھارتی وزیر اعظم نے فوج کو حکم دیا کہ وہ گولڈن ٹیمپل پر حملہ کر کے اسے باغیوں سے صاف کر دے۔ اس کارروائی میں بہت سی جانیں ضائع ہوئیں اور سکھ مزید بھڑک اٹھے۔ ان کے غصے کا سب سے بڑا اظہار اس وقت دیکھنے میں آیا جب نومبر 1984ء میں وزیر اعظم اندرا گاندھی کو ان کے اپنے ہی دو سکھ محافظوں نے گولیوں سے بھون ڈالا۔ اس قتل کے بعد قتل عام ہوا جس میں بھارت کے مختلف علاقوں میں بسنے والے بہت سے معصوم سکھ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور پنجاب بے چینی و بدامنی کی لپیٹ میں آ گیا۔ تاہم آج کل اس ریاست میں امن و امان کی صورتحال کافی بہتر ہے۔

پو، ایڈگر ایلن (1809ء۔1849ء)

امریکی شاعر، ادیب اور تنقید نگار۔ پو کے والدین ملازمتی اداکار تھے۔ پو کے والد کا انتقال ان کی پیدائش کے ایک سال بعد ہوا اور اس سے ایک برس بعد ان کی والدہ بھی چل بسیں۔ پو کی پرورش رچمنڈ کے ایک سوداگر جان ایلن کے گھر ہوئی جو 1815ء میں ہجرت کر کے انگلستان چلے آئے۔ وہاں انہوں نے پو کو پرائیوٹ مدارس سے تعلیم دلوائی۔ اگرچہ کاغذات میں ایلن خاندان نے پو کو کبھی بھی نہیں اپنایا، وہ ایلن کا خاندانی نام تمام عمر اپنے نام کے ساتھ لکھتے رہے۔ پو نے 1826ء میں یونیورسٹی آف ورجینیا سے تعلیم مکمل کی لیکن اس اثناء میں ان کے اپنے سوتیلے باپ سے تعلقات بگڑ گئے جس کی وجہ سے انہیں مالی پریشانی کے دن دیکھنا پڑے۔ پو نے 1827ء میں بوسٹن جا کر، ''تیمور'' اور دیگر نظمیں شائع کیں لیکن انہیں پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔ بعد ازاں انہوں نے امریکی فوج میں شمولیت اختیار کر لی اور انہیں جنوبی کیرولائنا کے جزیرے

http://muftbooks.blogspot.com/

سیلوان بھیج دیا گیا۔

جان ایلن کی اہلیہ کے انتقال کے بعد پو اور اس کے سوتیلے باپ کے درمیان مفاہمت کے آثار پیدا ہوئے اور انہیں ویسٹ پوائنٹ میں ملٹری اکیڈیمی میں ملازمت مل گئی جس سے ان کی گزر اوقات بہتر طور پر ہونے لگی۔ انہوں نے 1829ء میں بالٹی مور میں اپنی پھوپھی ماریہ کلیم کے ہاں قیام کے دوران ''الاعراف'' شائع کی۔ وہ 1830ء میں ویسٹ پوائنٹ پہنچے لیکن انہیں فرائض میں غفلت کی بنا پر برطرف کر دیا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ انہیں اپنے سوتیلے والد کی زندگی اور وصیت سے بھی خارج کر دیا گیا۔ انہوں نے ''ایڈگر اے پو کی نظمیں'' 1831ء میں نیویارک سے شائع کیں لیکن وہ 1835ء تک بدستور کلیم کے ساتھ بالٹی مور میں ہی رہتے رہے اور ''جنوبی ادبی پیامبر'' کے مدیر کے طور پر کام کرتے رہے۔

پو نے 1835ء میں اپنی کزن ورجینیا سے شادی کر لی جس کی عمر اس وقت تیرہ سال تھی۔ وہ اپنی نو بیاہتا دلہن اور کلیم کے ساتھ رچمنڈ منتقل ہو گئے جہاں وہ مسلسل ''پیامبر'' کیلئے کام کرتے رہے لیکن 1837 میں انہیں کثرت شراب نوشی کی وجہ سے ملازمت سے نکال دیا گیا۔ اس ملازمت کے دوران انہوں نے 83 تبصرے، چار مضامین اور تین افسانے لکھے جس سے اس جریدے کی مانگ میں بہت اضافہ ہوا پو کو شراب کی لت اور دیگر بری عادات کی وجہ سے کسی بھی جگہ جم کر ملازمت کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ انہوں نے جینٹلمینز میگزین (40-1839ء)، گراہمز میگزین (42-1841ء)، دی نیویارک مرر (1844ء) اور براڈوے جرنل (1846ء) کے ساتھ کام کیا۔ ان میں سے آخری دو رسالوں میں انہوں نے نامور امریکی شاعر ہنری ورڈزورتھ لونگ فیلو (1807ء۔1882ء) کو خوب رگیدا۔

پو کی توجہ شعری وحدت، جذبے اور موڈ کے مکمل پن پر بہت زیادہ رہی اور انہوں نے ادب کی گوتھک روایت سے متاثر ہو کر بہت خوفناک اور سنسنی خیز افسانے تخلیق کئے۔ پو کی تحریروں میں آرتھر گورڈن پم آف نانٹکٹ کی کہانی (1838ء) بے ڈھنگوں اور چیتن کاریوں کی حکایات (1840ء)، ایڈگر ایلن پو کے نثری رومانس، ردو مورگ کے قتل اور تھکا ہارا آدمی کے بشمول نمبروں (1843ء)، ایڈگر ایلن پو کی کہانیاں (1845ء)، پہاری کوا اور دیگر نظمیں (1845ء) اور یوریکا: ایڈگر ایلن پو کی ایک نثری نظم (1848ء) شامل ہیں۔

1847ء میں ان کی اہلیہ ورجینیا کی وفات کے بعد پو کی ذہنی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ ان پر ڈپریشن کے شدید دورے پڑنے لگے جن کے دوران ایک مرتبہ انہوں نے خود

http://muftbooks.blogspot.com/

کشی کرنے کی کوشش بھی کی۔ پوکی خواہش تھی کہ وہ دوبارہ شادی کریں۔ چنانچہ انہوں نے شراب نوشی میں کمی کرنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن جب انہوں نے اپنی شادی کیلئے رچمنڈ کے سفر کے دوران بالٹی مور میں توقف کیا تو وہ پانچ روز بعد شراب کے نشے میں غٹ پائے گئے۔ چونکہ وہ ایک پولنگ کے قریب سے پائے گئے تھے، بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ وہ ان سیاسی ٹولوں کا نشانہ بنے جو نشہ بازوں سے بار بار ووٹ ڈلوا رہے تھے۔ بعض حضرات کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ ہلکاؤ کی بیماری سے فوت ہوئے۔ بہرکیف اس واقعے کے چار روز بعد وہ انتقال کر گئے اور انہیں بالٹی مور میں ان کی اہلیہ ورجینیا کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

پوپ، الیگزینڈر (1688ء۔1744ء)

انگریز شاعر۔ پوپ کو اپنے زمانے کے شعراء میں نمایاں ترین مقام حاصل تھا اور انہیں نو کلاسیکی انگریزی ادب کی بہترین مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ انہوں نے ایک ایسے دور میں رومن کیتھولک عیسائی کے طور پر پرورش پائی جب پورے انگلستان میں کیتھولک مسلک کے خلاف غم و غصے کی فضا حاوی تھی۔ پوپ کو بچپن میں شدید بیماری کا سامنا کرنا پڑا جس سے ان کی ریڑھ کی ہڈی میں بہت زیادہ خم پیدا ہو گیا تھا جس سے ان کا قد ٹھیک طور پر نہ بڑھ پایا اور وہ چار فٹ چھ انچ سے اوپر نہ جا سکے۔

پوپ چھوٹی عمر میں ہی پختہ سوچ کے مالک بن گئے تھے۔ انہوں نے اپنے شبانیے (1709ء) صرف سولہ برس کی عمر میں شائع کیے۔ اس کے بعد ان کی نظم ''تنقید کے بارے میں ایک مقالہ'' (1711ء) شائع ہوئی جسے ادبی کلاسیکیت کی نمائندہ تخلیق تصور کیا جاتا ہے۔ اس نظم نے پوپ کو 23 برس کی عمر میں ایک نامی گرامی شخصیت میں بدل دیا۔ ''زلف کی عصمت دری'' (1712ء) نے ان کا نام اور بھی مستحکم کر دیا۔ پوپ اپنی تکنیکی مہارت اور شعر میں طنز اور پند و نصائح کے ماہرانہ استعمال کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کے دیگر ادبی کارناموں میں ایک بد نصیب خاتون کی یاد میں ایک نوحہ (1717ء)، ایلوایزا ٹو ایبلارڈ (1717ء) ڈنسی ایڈ (1728-43ء) جو انہوں نے اپنے دوست اور ادبی معاون جوناتھن سوفٹ (1667ء۔ 1745ء) سے متاثر ہو کر لکھا، انسان کے بارے میں ایک مقالہ (1733-43ء) اور ان کے ہو مر کی ایلیاڈ (1715-20ء) اور اوڈیسی (1725-26ء) کے خوبصورت تراجم شامل ہیں۔

پوپ کو ان کی طنزیہ شاعری کے طفیل بہت سے مخالفین کا بھی سامنا کرنا پڑا اور بعض تو انہیں ''ٹوکنم کا خبیث بھڑ'' کا نام دینے تک بھی گئے لیکن ایک بات شک و شبے سے بالاتر ہے کہ پوپ

http://muftbooks.blogspot.com/

نے انگریزی ادب کو بہت کچھ دیا۔ ان کا شمار دنیا کے بہترین طنزیہ شعرا میں ہوتا ہے۔

پروست، مارسیل (1871ء۔1922ء)

نامور فرانسیسی ناول نگار۔ پروست نے متوسط طبقے کے ایک صاحب ثروت گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد پیرس کے ایک معروف ڈاکٹر اور یونیورسٹی آف پیرس کی فیکلٹی آف میڈیسن کے رکن تھے اور ان کی ماں، جن سے کہ انہیں بہت قربت تھی، کا تعلق ایک معزز یہودی خاندان سے تھا۔ پروست کو پیرس کے بڑے لوگوں سے پہلا تعارف ''لیسے کانداسے'' (1882-89ء) میں تعلیم کے دوران اپنے ہم جماعتوں کے خاندانوں کے توسط سے حاصل ہوا۔ فوج میں کچھ عرصہ (1889-90ء) گزارنے کے بعد پروست نے دانشگاہ سائنس وسیاسیات میں داخلہ لے کر قانون اور ادب کے مضامین پڑھنا شروع کر دیئے۔

پروست نے سب سے پہلے ایک افسانوی مجموعہ ''خوشیاں اور غم'' 1896ء میں شائع کیا گو اس میں شامل کہانیاں 1892ء اور 1893ء میں پہلے ہی مختلف رسالوں میں چھپ چکی تھیں۔ ان ابتدائی تحریروں سے ہی پروست کے شائستہ وشستہ نثری اسلوب اور ان کی ڈرائنگ روم سوسائٹی میں دلچسپی کا پتہ چل جاتا ہے۔ انہوں نے اپنا پہلا ناول (1895-99ء) Jeam Santeuil جس میں ان کی اپنی زندگی اور معاشرے کی جھلک بہت نمایاں ہے، قضیۂ ڈریفس (1895ء۔1906ء) کے یہود مخالف پہلوؤں کے ردعمل کے طور پر لکھا۔

پروست کو نو برس کی عمر میں دمے کے پہلے شدید حملے کا سامنا کرنا پڑا اور وہ بقیہ تمام عمر اس مرض کی مشکلات برداشت کرتے رہے۔ ان کے والدین اس بیماری کے پیش نظر انہیں گاہے گاہے دیہات میں مقیم اپنے مختلف رشتہ داروں کے ہاں بھیج دیا کرتے تھے۔ ان دیہات کے فطری مناظر نے ان کے ذہن پر بہت دیرپا اور گہرے اثرات مرتب کئے جن کا اظہار ہمیں ان کے بارہ جلدی شاہکار ''بیتے لمحوں کی یاد'' (1927ء) میں جا بجا ملتا ہے۔ یہ تصنیف ان کی حافظے میں فلسفیانہ دلچسپی کے طفیل پروان چڑھی۔

اس تصنیف میں پروست نے مختلف کرداروں کے توسط سے یہودیت اور ہم جنس پرستی دونوں پر بہت تفصیلاً بات کی ہے۔ بہت سے ادیبوں اور دانشوروں کا خیال ہے کہ پروست خود بھی ہم جنس پرست تھا، اگرچہ اس مسئلے پر بہت مختلف قسم کی آراء پائی جاتی ہیں اور ہم مصدقہ طور پر کوئی بات نہیں کر سکتے۔ پروست نے 1897ء میں ایک صحافی ژاں لورین سے ایک بہت طویل لڑائی لڑی جس کا پراوست کے مطابق قصور یہ تھا کہ اس نے اپنے کسی کالم میں بڑے نرم سے انداز سے

پروست کی ہم جنس پرستی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

پروست 1907ء میں ایک ایسے مکان میں مقیم ہو گئے جس کے بیڈ روم کا فرش کارک سے بنایا گیا تھا تا کہ پروست کی طبع نازک کو کسی شور وغل سے تکلیف نہ پہنچے۔ انہوں نے اپنی شاہکار تصنیف یہیں رہتے ہوئے مکمل کی۔ پروست کے ''بیتے لمحوں کی یاد'' اور آئرش ناول نگار جیمز جوائس کے یولیسیس کو جدیدیت کی معراج تصور کیا جاتا ہے۔ ''بیتے لمحوں کی یاد'' میں جہاں اور بہت سے محاسن موجود ہیں وہاں یہ اپنے پورے پورے صفحے پر محیط خوبصورت جملوں کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ یہ ناول پہلی عالمی جنگ کے سبب تاخیر سے شائع ہوا۔ اس طرح پروست کو جو اضافی مہلت میسر آئی اس میں انھوں نے اس کے مسودے پر بار بار نظر ثانی کی اور اس کی موٹائی کو بڑھاتے بڑھاتے دوچند کر دیا۔

پولو، مارکو (اندازاً 1254ء۔1354ء)

وینس نژاد اطالوی مہم جو۔ وہ ایک سوداگر گھرانے میں پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنا چین کا سفر سترہ برس کی عمر میں شروع کیا۔ اس سفر میں انہیں اپنے والد اور چچا کی رہنمائی حاصل تھی جو اس سے قبل بھی چین کی سیاحت کر چکے تھے۔ اس سفر میں انہیں تین برس تک سمندر اور خشکی پر صبر آزما مسافت سے گزرنا پڑا۔ اس مہم کے اختتام پر جب وہ انجام کار چین پہنچے تو ان کا منگول شہنشاہ قبلائی خان (اندازاً 1215ء۔1294ء) کے دربار میں بہت پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ قبلائی خان نے مارکو پولو کے والد اور چچا کو اپنے ہمراہ ایک سو یورپی مبلغ لانے کو کہا تھا تا کہ وہ اور اس کے لوگ ان سے عیسائیت کی تعلیم حاصل کر سکیں۔ یہ ایک سو مبلغین تو چین نہ پہنچ سکے تاہم شہنشاہ نے ان تینوں اطالویوں کو اپنی ملازمت میں رکھ لیا۔ وہ مارکو پولو کی منگول زبان پر قدرت اور اس کی سیاحانہ صلاحیتوں سے خاص طور پر بہت متاثر ہوا جس کے طفیل مارکو سترہ برس کے طویل عرصہ تک قبلائی خان کی ملازمت کرتا رہا۔ اس دوران مارکو نے قبلائی کی سلطنت کا حال جاننے کیلئے چین کے طول وعرض میں دورے کئے۔ وہ شہنشاہ کے کہنے پر برما، تبت اور جنوبی ہندوستان بھی پہنچے۔ مارکو پولو کو چین سے رخصتی کی اجازت بڑی مشکل سے ملی اور وہ جب 1295ء میں واپس اپنے وطن وینس پہنچے تو ان کے قریبی عزیزوں تک نے انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا۔ بعد ازاں انہیں ایک جنگ میں گرفتار کر لیا گیا۔ دوران قید انہوں نے اپنی سفری یادداشتوں پر مشتمل ایک کتاب ''مارکو پولو کے سفر'' (اندازاً 1295ء) تحریر کی جس سے آنے والے ادوار میں اہل یورپ کو چین کی سیاحت کی بہت ترغیب ملی۔ اس سفر نامے کو ایک اہم تاریخی دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔

تاج محل

مغلیہ دور کی ایک یادگار عمارت ۔ یہ مقبرہ مغل بادشاہ شاہجہان (اقتدار 58-1629ء) نے سترھویں صدی میں تعمیر کروایا۔ یہ مقبرہ بھارت کے شہر آگرہ میں دریائے جمنا کے کنارے بنایا گیا ہے اور ہم اسے مغلیہ فن تعمیر کی معراج قرار دے سکتے ہیں۔ ''تاج محل'' کا لفظ ''ممتاز محل'' کی بدلی ہوئی شکل ہے جو کہ شاہجہان کی محبوب ملکہ ارجمند بانو بیگم کی عرفیت تھی۔ ممتاز محل کا 1631ء میں دوران زچگی انتقال ہو گیا تھا جس پر شاہجہان نے پوری اسلامی دنیا سے ماہرین فن مدعو کر کے اور ان سے مشاورت کر کے اس حسین و جمیل عمارت کی تعمیر شروع کرنے کا حکم دیا۔ اس منصوبے کا آغاز 1632ء میں ہوا۔ مقبرے کا مرکزی حصہ 1643ء میں بیس ہزار سے زائد کاریگروں اور معماروں کی شبانہ روز محنت سے تکمیل کو پہنچا۔ مقبرے کے اردگرد کی بقیہ مساجد، باغات اور دیواریں 1649ء میں جا کر مکمل ہوئیں۔ پورا تاج محل 1654ء میں مکمل ہوا اور اس پر چالیس ملین روپے لاگت آئی۔

مقبرے کی عمارت خالص دودھیا سنگ مرمر سے بنی ہے جو سرخ پتھر کی مسجد سے مل کر ایک نہایت دلآویز منظر پیدا کرتی ہے۔ مقبرے کے اندرونی حصے میں ملکہ ممتاز اور شاہجہان (وفات 1658ء) دونوں خوابیدہ ہیں۔

تاؤمت

ایک چینی مذہب اور فلسفہ۔ فلسفیانہ تاؤمت کی بنیادی تصنیف ''تاؤ جنگ'' کو مانا جاتا ہے جس میں تاؤ کے تصور کی بڑے مفصل انداز سے وضاحت کی گئی ہے۔ یہ ایک ایسی ناقابل محسوس قوت کا نام ہے جو تمام موجودات کی تخلیق اور ان کے فنا کی علامت ہے۔ تے کا تصور بھی بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور اسے تاؤ سے بڑی قریبی نسبت ہے۔ تے کو آپ ایسے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ تاؤ کی تجسیم ہے اور یہ فطرت اور اس کے عوامل کی ایکتائی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ تاؤمت کا فلسفہ سادہ زندگی اور تاؤ اور تے کی مطابقت میں علم کی نفی پر زور دیتا ہے۔

تاؤ مذہب کا مقصد ابدی زندگی کا حصول ہے اور یہ بات فلسفیانہ تاؤ سے قدرے بے میل محسوس ہوتی ہے۔ شیان یا لافانی ہستیاں ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کی زندگیوں کو دوسروں کیلئے مثال کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ ابدی زندگی کے ہدف کے حصول کیلئے ضبط تنفس کے بہت سے طریقے، خصوصی غذائیں، اور جادوٹونے وجود میں آئے۔ ہان عہد میں آ کر مذہبی اور فلسفی تاؤمت

http://muftbooks.blogspot.com/

کے دونوں مسلک فنا ہو گئے۔ اس کے بعد تاؤمت کے دیگر دو فرقے یعنی شانگ چنگ ماؤشان اور لنگ باؤ منظر پر ابھرے۔ تاؤمت کے یہ چاروں مسالک چینی معاشرے میں آج بھی بہت اثر کے حامل ہیں۔

ج

جاز

امریکی موسیقی کی ایک صنف۔ جاز ریگ ٹائم اور بلوز وغیرہ کی ایک ارتقاء یافتہ شکل ہے اور اس کی جڑیں لوزیانہ اور نیو اورلینز کی ریاستوں سے آتی محسوس ہوتی ہیں۔ پرانے زمانے میں افریقہ سے لائے جانے والے غلام اپنے ساتھ ایسے سر، راگ، تانیں اور گیت لے کر آئے جنہوں نے یورپی موسیقی سے امتزاج کر کے ریگ ٹائم، بلوز اور انجام کار جاز جیسی اصناف کی شکل اختیار کر لی۔

جاز کے پرکھوں میں سے ریگ ٹائم کا غالباً پہلا نمبر ہے جس میں یورپ کی انیسویں صدی کے پیانو اور افریقی موسیقی کی آمیزش محسوس ہوتی ہے۔ ریگ ٹائم کو امریکہ میں 1895ء سے 1910ء کے عرصے میں سکاٹ جوپلن جیسے موسیقاروں نے مقبول بنایا۔ جوپلن کو اس عہد کا سب سے کامیاب موسیقار سمجھا جاتا ہے جس نے بہت سے نئے راگ متعارف کرائے جس کا مظاہرہ گویے چل پھر کر شراب خانوں اور سراؤں میں کرتے تھے۔ جوپلن نے 1899ء میں ''پیپل کا پتہ'' نام کا جو راگ اختراع کیا تھا اسے غالباً سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

جاز نے 1890ء کے عشرے میں جنم لیا جب چارلز ''بڈی'' بولڈن جیسے موسیقاروں نے تحریری دھنیں ترک کر کے عوامی راگوں سے تجربات کرنے شروع کیے اور اختراع سے کام لیتے ہوئے موسیقی کے قطعات میں برجستگی اور تحرک کے عناصر شامل کرنا شروع کیے۔ اختراع افریقی رنگ کی موسیقی کا مرکزی پہلو ہے اور یہ عنصر جلد ہی جاز اسلوب کی بنیاد بن گیا۔ اکثر و بیشتر جاز کا ذکر امریکہ کی ایک دیسی آرٹ فارم کے طور پر کیا جاتا ہے اور یہ دیکھتے ہی دیکھتے نیو اورلینز سے نکل کر شکاگو، نیویارک اور لاس اینجلز جیسے بڑے شہروں تک پہنچ گیا۔ جوزف ''کنگ'' اولیور اور لوئی آرمسٹرانگ جیسے فنکار اختراع کے عنصر کو 1920ء کے عشرے میں نئی بلندیوں تک لے گئے جبکہ ایڈورڈ ''ڈیوک'' ایلنگٹن ہارلم کے مشہور جاز تھیٹروں میں فن کی نوک پلک سنوارنے میں لگا رہا۔

1930ء کے عشرے میں ولیم ''کاؤنٹ'' بیسی اور بنی گڈ مین جیسے بینڈ لیڈروں نے ''سونگ'' کی بک بینڈ ساؤنڈ متعارف کرائی اور 1940ء کی دھائی میں ''بیبوپ'' کے نام سے جانا جانے والا پیچیدہ اور دھماکہ خیز جاز سٹائل منظر عام پر آیا۔

جپسی

اصلاً شمالی ہندوستان سے تعلق رکھنے والے ایک گروہ کے لوگ جو آج کل پوری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ لفظ ''جپسی'' کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ شاید یہ انگریزی لفظ "Egyptian" سے بنا ہے جسے ہم اردو میں مصری کہتے ہیں۔ ازمنہ وسطیٰ کے یورپی باشندوں کا خیال تھا کہ وہ مصر سے آئے ہیں۔ یہ لفظ انگریزی زبان میں پہلے پہل 1537ء میں استعمال ہوا۔ بہت سے جپسی خود کو ''رومانی'' یا ''روم'' (مرد) یا ''خاوند'') کہتے ہیں اور وہ دوسروں کو ''گاجے'' کہہ کر بلاتے ہیں۔ وہ رومانی زبان بولتے ہیں جس کا تعلق ہندوستانی زبانوں سے ہے لیکن اب اس میں بہت سے دیگر جغرافیائی وثقافتی گروہوں کی بولیوں کے الفاظ بھی شامل ہو گئے ہیں۔ بعض لوگ ان کی تعداد بیس لاکھ بھی بتاتے ہیں لیکن پوری دنیا میں منتشر جپسیوں کی کل تعداد ستر لاکھ تک ہوسکتی ہے جس کی اکثریت مشرقی یورپ میں آباد ہے۔

بعض ماہرین جپسیوں کو تین بڑے گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ولاکس رومانی بولنے والے گروہ (جنہیں کالدرایش بھی کہا جاتا ہے) کے زیادہ افراد مشرقی یورپ میں آباد ہیں لیکن یہ دنیا کے چپے چپے میں پائے جاتے ہیں۔ کیل (جنھیں گٹانو بھی کہا جاتا ہے زیادہ تر فرانس، سپین اور شمالی افریقہ میں ملتے ہیں اور مانش مغربی یورپ میں آباد ہیں۔ جپسیوں نے مشرقی یورپ اور دیگر خطوں میں اپنی سیاسی جماعتیں بھی بنا رکھی ہیں اور انہیں اقوام متحدہ میں نمائندگی بھی حاصل ہے لیکن ان کے بڑے معاشرتی ڈھانچے اکثر صورتوں میں بڑے بڑے خاندانوں کے اثر ورسوخ پر مبنی ہوتے ہیں۔ بعض ولاکس روایتی قوانین واقدار کے ایک ضابطے کے پیرو ہیں جسے کرس کہا جاتا ہے۔ جپسی جغرافیائی اور لسانی بکھراؤ (رومانی تحریری زبان نہیں ہے) کے سبب ثقافتی نمائندگی میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور سیاسی طاقت میں کمی کے باعث وہ مختلف حکومتوں کی زد میں بھی آئے رہتے ہیں۔ سپین میں پندرہویں صدی کی Inquisition کے دوران رومانی بولتے پکڑے جانے والے جپسیوں کی زبان کاٹ دی جاتی تھی۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران تقریباً پانچ لاکھ جپسی نازی کیمپوں میں ہلاک ہوئے۔ نازی جپسیوں کی نسل کو اس قدر پست خیال کرتے تھے کہ انہوں نے ان ہلاکتوں کا ریکارڈ رکھنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

جپسیوں کے بارے میں عام بہت سے تصورات غلط فہمی اور ناقص معلومات کا نتیجہ ہیں۔ ادب اور آرٹ نے بالخصوص مغربی یورپ اور روس میں، جپسیوں کے تشخص کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انہیں عموماً جادوٹونے کرنے والے خانہ بدوشوں کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں ایک حکایت یہ بھی مشہور ہے کہ جپسی خانہ بدوش اس لئے ہیں کہ ان کے پرکھوں نے کنواری مریمؑ اور ان کے بیٹے کو مصر ہجرت کرتے وقت پناہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں ایک اور کہانی بھی بتائی جاتی ہے جس کے مطابق خدا جپسیوں پر مہربان ہو کر مسکراتا ہے کیونکہ ایک جپسی نے ان میں سے ایک میخ چرالی تھی جو رومن عیسیٰؑ کے جسم میں پیوست کر رہے تھے اور اس طرح وہ مسیحؑ کی اذیت میں کمی کا موجب بنا۔ جو بھی ہو جپسیوں میں خانہ بدوش اور نگر نگر گھومنے کی عادت حکومت کی طرف سے انہیں دیئے گئے دیس نکالوں اور جلا وطنیوں کا نتیجہ ہو سکتا ہے خصوصاً ان کی پندرہویں صدی میں مغربی یورپ آمد کے بعد، جپسیوں کے بکھراؤ کو لوگ اکثر و بیشتر یہودی جلا وطنی سے بھی تشبیہ دیتے ہیں۔

جمال عبدالناصر (1918ء تا 1970ء)

معروف مصری سیاسی رہنما۔ صدر ناصر کو فرعونوں کے بعد پہلا نسلاً مصری قائد تسلیم کیا جاتا ہے۔ ناصر نے 1952ء میں اپنے ساتھیوں کی مدد سے کامیاب فوجی بغاوت کے ذریعے اس وقت کے مصری بادشاہ کا تختہ الٹ دیا تھا۔ ناصر نے شاہ فاروق کو حکومت سے الگ کرنے کے فوری بعد بڑی بڑی زرعی اراضیوں کو قومیانے، عوام کو مفت تعلیم فراہم کرنے اور سب بے روزگار افراد کو روزگار دینے کا اعلان کر دیا تھا گو اس نے باقاعدہ طور پر صدارت کا عہدہ 1956ء میں سنبھالا۔ صدر ناصر کے نہر سویز کمپنی کو قومیانے کے فیصلے نے ایک بڑا بین الاقوامی تنازعہ کھڑا کر دیا تھا۔ اس کمپنی کے بڑے حصہ دار برطانیہ اور فرانس تھے اور نہر سویز کا سارا انتظام و انصرام ان کے ہاتھ میں تھا۔ ناصر کے اس اقدام سے برطانیہ مشتعل ہو گیا اور اس نے سیاسی چالیں چل کر مصر پر اسرائیلی حملہ کرا دیا تا کہ برطانیہ و فرانس کے لیے مداخلت کی راہ ہموار ہو سکے۔ لیکن جب اقوام متحدہ نے مصری اقدام کی حمایت کا اعلان کیا تو صدر ناصر کو اس کے اپنے ملک بلکہ پوری تیسری دنیا میں بھی ایک ہیرو کے طور پر دیکھا جانے لگا۔

تیسری دنیا کے دیگر رہنماؤں سے مل کر غیر جانبدار تحریک کی بنیاد بھی ناصر نے ہی رکھی تھی تا کہ ان غریب اقوام کو مغربی اور کمیونسٹ دونوں بلاکوں کے اثر سے محفوظ رکھا جا سکے۔

ناصر نے اس دور میں مشرق وسطیٰ کے ممالک میں عرب قومیت کو اجاگر کرنے میں بھی بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس نے بہت سے ملکوں میں آزادی کے لیے چلائی جانے والی تحریکوں کی حمایت کی اور پوری عرب دنیا میں مصری اساتذہ اور ہنرمند افراد بھیجے۔ اس نے عرب اتحاد کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے 1958ء میں مصر اور شام دونوں کو ملا کر ایک ریاست بنانے کا اعلان کیا لیکن یہ متحدہ عرب جمہوریہ صرف تین سال چل سکی۔

مصر کی تعمیر نو کے سفر کے دوران ناصر کو اندرون خانہ اشتراکیوں اور اخوان المسلمین کی زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جسے اس نے جابرانہ ہتھکنڈوں سے دبانے کی کوشش کی۔ اس نے پورے ملک میں خفیہ پولیس کے اہلکاروں کا جال بچھا دیا اور ہزاروں مخالفین کو جیلوں میں بند کر دیا جس سے بہت سے مصری علماء اور دانشور ناصر سے بدظن اور اس کی جاری کردہ جدید پالیسیوں سے بیزار ہوتے چلے گئے۔

1967ء کی عرب اسرائیل جنگ نے ناصر کے سیاسی عزائم کو توڑ کر رکھ دیا۔ مصری فوج چھ دن بھی اسرائیلی یلغار کے آگے نہ ٹھہر سکی اور مصر و شام دونوں کی ناکہ بندی کر دی گئی۔ شکست کے بعد جب ناصر نے صدارت سے استعفیٰ دینے کا اعلان کیا تو مصر میں بڑے بڑے جلوس نکالے گئے تاکہ وہ یہ اقدام نہ کرے لیکن اس وقت تک مصر کی کمر ٹوٹ چکی تھی اور ناصر کے عروج کا سورج گہنا چکا تھا۔ بایں ہمہ جب 1970ء میں ناصر کا انتقال ہوا تو پوری عرب دنیا میں صف ماتم بچھ گئی اور عرب اپنے اس عظیم ہیرو کی رخصت پر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

جناح، محمد علی (1876ء۔1948ء)

پاکستان کے بانی اور پہلے گورنر جنرل۔ انہیں قائداعظم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کراچی میں پیدا ہوئے۔ آپ سات بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ انہوں نے انگلستان سے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ اور انیس سال کی عمر میں ڈگری حاصل کی۔ وہ دادا بھائی نوروجی کی انتخابی مہم میں بھی سرگرم رہے جو برطانوی دارالعوم کے رکن بننے والے پہلے ہندوستانی شخص تھے۔ جناح نے 1896ء میں وطن واپس آنے پر بمبئی میں وکالت کرنا شروع کر دی۔ دس سال تک وکالت کرنے کے بعد انہوں نے 1906ء میں سیاست میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اسی برس انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے کلکتہ میں ہونے والے اجلاس میں شرکت کی۔ اس سے چار سال بعد وہ شاہی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے جس سے ان کے پارلیمانی سیاست کے طویل کیریئر کا آغاز ہو گیا۔ جناح مرہٹہ رہنما گوپال کرشن گوکھلے سے متاثر تھے اور

انہوں نے اس رہنما سے مل کر ہندو مسلم اتحاد کے لئے بھی کام کیا۔اس دور تک وہ صرف برطانوی راج کے خلاف لڑتے رہے۔ان کا خیال تھا کہ ہندی قومیت کے فروغ سے مسلمانان ہند کے مفادات کا تحفظ کیا جا سکتا ہے۔لہٰذا اس دور میں وہ 1906ء میں قائم ہونے والی آل انڈیا مسلم لیگ سے الگ رہے۔

جناح انڈین ہوم رول لیگ کی بمبئی شاخ کے چیف آرگنائزر اور پہلے صدر بنے لیکن انہوں نے اس لیگ کو جلد ہی خیر باد کہہ دیا کیونکہ اس کا تعلق موہن داس گاندھی (1869ء۔ 1948ء) کی سیاست سے بڑھتا چلا جا رہا تھا اور جناح ان کی تحریک عدم تعاون کے مخالف تھے۔اس مرحلے پر وہ مسلم لیگ میں چلے آئے لیکن ان کا موقف اب بھی یہی رہا کہ مسلمانوں کے لئے بہترین راستہ ہندو مسلم اتحاد اور آئینی اصلاحات ہیں۔گاندھی کی تحریک عدم تعاون کے نتیجے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مخالفت پیدا ہونے پر مسلم لیگ کی مقبولیت میں اضافہ ہو گیا اور جناح قومی مفاد کے پیش نظر ہندوستان کی مختلف تنظیموں کے درمیان تعاون کی فضا پیدا کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔یہ ان کیلئے ایک دشوار مرحلہ تھا۔ایک الگ ریاست کا مطالبہ کرنے والے مسلمان انہیں ہندو نواز اور قوم پرست کہنے لگے جبکہ ہندو انہیں ایک چالاک مسلم عسکریت پسند سمجھتے تھے۔

وہ 1930ء میں ہندوستانی سیاست چھوڑ کر لندن چلے گئے لیکن 1935ء میں انہیں مسلم لیگ کے کہنے پر دوبارہ واپس آنا پڑا۔آخر کار جناح مسلم لیگ کے صدر بن گئے اور انہوں نے اپنی زندگی کو مسلمانوں کیلئے ایک خود مختار ملک کے حصول کے نصب العین کیلئے وقف کر دیا۔انہوں نے 1940ء میں منظور ہونے والی قرارداد لاہور میں ایک الگ مسلمان ملک کا مطالبہ کر دیا۔ 1944ء میں گاندھی جناح مذاکرات میں پیدا ہونے والے تعطل نے تقسیم کیلئے راستہ مزید ہموار کر دیا۔جناح اور ان کے ساتھیوں کی جدوجہد کے طفیل گاندھی، نہرو اور برطانیہ جیسے مخالفین کی مخالفت کے باوجود پاکستان 1947ء میں ایک حقیقت بن کر وجود میں آ گیا۔جدوجہد کے اس تمام دور میں جناح مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔

جناح ایک عرصے سے تپ دق کے عارضے میں مبتلا تھے لیکن وہ قیام پاکستان کے لئے ہونے والے مذاکرات کے سارے عرصے کے دوران یہ بات لوگوں سے چھپاتے رہے۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے اس کے پہلے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا لیکن وہ اقتدار میں آنے کے تھوڑا عرصہ بعد ہی دنیا سے چل بسے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

جیفرسن، ٹامس (1743ء-1826ء)

تیسرے امریکی صدر۔ جیفرشیڈویل ورجینیا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک کامیاب باغبان اور سرویئر اور والدہ کا تعلق ورجینیا کے ایک ممتاز گھرانے سے تھا۔ جب جیفرسن کے والد کا انتقال ہوا تو ان کی عمر صرف چودہ برس تھی اور انہیں ترکے میں ایک بڑا کھیت اور بہت سے غلام ملے۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے نجی سکولوں اور پھر کالج آف ولیم اینڈ میری سے تعلیم حاصل کی لیکن دو سال کے بعد وہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے یہاں سے چلے گئے۔ وہ 1774ء میں امریکی انقلاب کی وجہ سے عدالتیں بند ہونے تک بحیثیت وکیل پریکٹس کرتے رہے۔

1772ء میں ان کی شادی ایک متمول خاتون مارتھا ویلز سیکلٹن سے ہوئی اور انہوں نے اپنا مشہور بنگلہ مانٹی سیلو بنانا شروع کیا۔ وہ نوآبادیاتی ہاؤس آف برجیس کے رکن بھی رہے۔ انہوں نے 1779ء میں ورجینیا کے پہلے کنونشن کیلئے اپنا پمفلٹ ''برطانوی امریکہ کے حقوق کا ایک مختصر جائزہ'' کے عنوان سے شائع کیا جس میں انہوں نے فلسفیانہ انداز اختیار کرتے ہوئے تاج برطانیہ کی امریکی رعایا کے فطری حقوق کیلئے دلائیل پیش کئے، امریکہ پر برطانوی پارلیمان کی حاکمیت کو مسترد کیا اور شاہ برطانیہ کی اطاعت کی حمایت کی۔ جیفرسن کو 1775ء میں ہونے والی دوسری برِ اعظمی کانگریس کیلئے مندوب مقرر کیا گیا۔ اگلے برس انہیں اعلان آزادی تیار کرنے کیلئے منتخب کرلیا گیا۔ ادبی اسلوب کے اعتبار سے ایک کلاسک اور ایک سیاسی دستاویز کی حیثیت اختیار کرنے والے اس اعلان آزادی میں ایک انقلابی جمہوری فلسفہ پیش کیا گیا تھا اور امریکی شہریوں پر شاہ برطانیہ کی حکومت کی مذمت کی گئی تھی۔ اسے 4 جولائی 1776ء کو معمولی ترامیم کے بعد منظور کرلیا گیا۔ اس برس جیفرسن ورجینیا کی مجلس قانون ساز میں شامل ہوگئے جہاں انہوں نے وقف اور ورثے کے قوانین کو ختم کرنے میں مدد دی اور اپنے ''آئین مذہبی آزادی'' کے ذریعے ریاست اور مذہب کو جدا کرنے کیلئے کام کیا۔ 1782ء میں ان کی اہلیہ وفات پا گئیں جس پر انہوں نے ایک مختصر عرصے کیلئے عوامی زندگی سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اس دور میں انہوں نے اپنے ''شذرات بر ریاست ورجینیا'' (1785ء) قلمبند کئے۔ انہوں نے اس ریاست اور شمالی امریکہ کے بیشتر علاقے کی ''طبعی تاریخ'' بھی لکھی جس سے انہیں ایک سائنسدان کے طور پر بھی جانا جانے لگا۔ 1783ء میں انہوں نے برِ اعظمی کانگریس کے رکن کی حیثیت سے سکوں کے اعشاری نظام کی حمایت کیلئے کام کیا اور شمال مغربی علاقے کے الحاق کیلئے سفارشات مرتب کیں۔

1784ء سے 1789ء تک جیفرسن نے فرانس میں خدمات سرانجام دیں۔ پہلے تجارتی

معاہدوں کیلئے ہونے والے مذاکرات کے وفد میں اور پھر بینجمن فرینکلن کے جانشین کے طور پر امریکی منسٹر کی حیثیت سے۔انہوں نے فرانسیسی انقلاب کی شروعات کا مشاہدہ بھی کیا جس میں ان کی ہمدردیاں جمہوریت پسندوں کے ساتھ تھیں لیکن جب یورپی جنگوں کا آغاز ہوا تو انہوں نے جارج واشنگٹن کے تحت پہلے وزیر خارجہ کے طور پر کام کرتے ہوئے غیر جانبدرانہ پالیسی اختیار کرنے کی حمایت کی۔انہوں نے1796ء میں وفاق پسند جان ایڈمز کے مقابلے میں صدارتی انتخابات میں حصہ لیا اور دوسرے نمبر پر رہے لہٰذا انہیں اس دور کے قانون کے مطابق نائب صدر بنا دیا گیا۔انہوں نے وفاق پسند حکومت کی طرف سے آزادی اظہار اور حزب اختلاف کو غداری کے مقدمات کے ذریعے دبانے کی کوشش کی کھلی مخالفت کی اور1800ء میں ایڈمز کے خلاف دوبارہ الیکشن لڑنے اور اسے شکست دینے میں کامیاب ہو گئے لیکن مروجہ انتخابی نظام کی رو سے ان کی اپنے حریف ایرون بر کے ساتھ غیر ارادی طور پر ٹائی پڑ گئی۔جیفرسن یہ انتخاب جیت گئے لیکن انہیں ایوان نمائندگان میں زبردست جدوجہد کرنا پڑی کیونکہ وفاق پسند سیاست دان بر کو جتانے کی سرتوڑ کوششوں میں مصروف تھے۔

1800ء کے اس انقلاب کے بعد ان کے بطور صدر پہلے دور کو کامیاب قرار دیا گیا جس کے دوران ملک میں امن و امان کی صورتحال پہلے کے مقابلے میں بہتر رہی تاہم انہیں ایڈمز کی طرف سے کی گئی عدالتی تقرریوں کو ختم کرنے کی ناکام کوشش پر عدالت عظمیٰ کی طرف سے سرزنش کا سامنا کرنا پڑا۔1800ء میں ریاست لوزیانہ کی خرید جن سے امریکہ کا رقبہ تقریباً دگنا ہو گیا، کا شمار جیفرسن کے بہترین کارناموں میں ہوتا ہے۔انہوں نے لیوس اور کلارک کی مہم کو بھی منظم کیا۔

1804ء میں انہیں ایک بار پھر صدر چن لیا گیا۔اپنے دوسرے صدارتی دور میں جسے کہ پہلے دور جتنا کامیاب تصور نہیں کیا جاتا، انہوں نے ایرون بر پر غداری کا مقدمہ چلانے کی کوشش کی لیکن وہ اس مقدمے میں بری قرار دے دیا گیا۔اس مرحلے پر جیفرسن کو سیاسی جبر کے الزامات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ بین الاقوامی طور پر دیکھا جائے تو برطانوی اور فرانسیسی جارحیتوں سے بچنے کیلئے جیفرسن کا ان دونوں ملکوں کو برآمدات روکنے کا فیصلہ امریکہ کیلئے معاشی طور پر بہت بھیانک ثابت ہوا۔یہ اقدام ان چپقلشوں کو نہ روک سکا جنہوں نے1812ء میں جنگ کی شکل اختیار کی۔

جیفرسن کے بعد ان کا حواری جیمز میڈسن (صدارت1809ء۔1813ء) صدر بنا اور انہوں نے مانٹی سیلو میں سکونت اختیار کر کے اپنے زراعت، کلاسیکی ادب، سائنس اور میکانی ایجادات جیسے مشاغل میں وقت گزارنا شروع کر دیا۔ان کی کتابیں جو انہوں نے1812ء کی

http://muftbooks.blogspot.com/

جنگ میں واشنگٹن کی آتشزدگی کے بعد حکومت کو فروخت کیں لائبریری آف کانگریس کی بنیاد بنیں۔انہوں نے1819ء میں یونیورسٹی آف ورجینیا کی بنیاد رکھی اور اس کے پہلے ریکٹر بنے۔ وہ اپنے آخری برسوں میں دیوالیہ ہوتے ہوتے بچے اور ان کی مدد کیلئے ایک پبلک لاٹری کا اہتمام کرنا پڑا۔ان کا انتقال 4 جولائی1826ء کو اعلان آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر ہوا۔ انہوں نے کل ملا کر کوئی ساٹھ کے قریب تصانیف قلمبند کیں۔

جین مت

ایک ہندوستانی مذہبی اور فلسفیانہ روایت۔جین مت کی بنیاد چھٹی صدی قبل مسیح میں وردھن نے رکھی جنہیں جین (فاتحین) مہاویر بھی کہتے ہیں۔ یہ مت غالباً ہندومت کی قربانی کی رسموں کے ردعمل کے طور پر وجود میں آیا۔جین مت کسی خارجی خالق خدا پر اعتقاد نہیں رکھتا اور اس میں اہنسا یعنی کسی بھی زندہ مخلوق پر ظلم سے اجتناب کا درس دیا جاتا ہے۔اس مذہب کے پیروکار کی حتمی منزل فطرت انسانی کی تکمیل ہے اور اس منزل کے حصول کیلئے درویشی اور فقیری کی راہیں اختیار کی جاتی ہیں۔

جین مذہبی نظام کے مطابق کائنات کو کئی اجزاء میں تقسیم کیا گیا ہے۔''جیو'' میں روح اور تمام زندہ اشیاء شامل ہیں اور ''اجیو'' میں تمام غیر جاندار چیزیں اور زمان ومکان جیسے دیگر غیر مادی تصورات آجاتے ہیں۔جین مت کا ایک دوسرا بنیادی تصور ''کرم'' ہے جو غیر مرئی لیکن مادی ہوتا ہے اور جیو میں نفوذ کر کے روح کو جنم مرن کے لامتناہی چکر میں قید کر دیتا ہے۔آواگون کے اس چکر کو صرف مراقبے اور اچھے عملوں کی مدد سے ہی توڑا جا سکتا ہے جو بالآخر روح کو ارضی زندگی سے نجات دلا کر اکملیت سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔

جین کا حتمی نصب العین اپنی انفرادی اور دیگر جاندار اشیاء کی روح کا ارتقاء اور تکمیل ہوتا ہے اور اس کے اخلاقی نظام میں اہنسا یعنی تشدد سے احتراز کو خاص اہمیت حاصل ہے۔جین اس اصول پر اس سختی سے کاربند ہوتے ہیں کہ وہ بیمار اور عمر رسیدہ جانوروں کیلئے شفاخانے اور پناہ گاہیں بناتے ہیں جہاں ان کی بڑے پیار سے اس وقت تک نگہداشت کی جاتی ہے جب تک کہ وہ خود طبعی وجوہ کی بنا پر مر نہیں جاتے۔جین مت کے بعض پیرو تو اس حد تک جاتے ہیں کہ اپنے ناک اور منہ کو نقاب سے ڈھانپنا شروع کر دیتے ہیں تا کہ کہیں ان کے سانس کے ساتھ خردبینی جاندار مخلوقات ان کے اندر نہ چلی جائیں۔

جین مت صدیوں تک لوگوں کی زندگیوں کا رخ متعین کرنے میں اپنا کردار ادا کرتا چلا آرہا

http://muftbooks.blogspot.com/

ہے۔ایک روایت کے مطابق کامل واکمل اور داخلی نور سے منور وہ بڑے لوگ جنہیں تر تھانکر کہا جاتا ہے ہر زمانے میں اس دنیا میں آ کر جین اعتقادات کو نئے سرے سے ظاہر کرتے ہیں۔ پہلا تر تھانکر رہا تھا۔ جسے اس روایت کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ تاہم تاریخی اعتبار سے اس کا بانی مہاویر پر (پیدائش اندازاً 599 ق م) بتایا جاتا ہے جو کہ مہاتما بندھ کے ہم عصر لیکن عمر میں ان سے بڑے تھے۔ مہاویر جب اٹھائیس کے سن کو پہنچے تو انہوں نے درویشی اختیار کر لی اور خود کو زہد و مراقبہ کے لئے وقف کر دیا جس سے بالآخر انہیں نور باطنی کی منزل تک رسائی حاصل ہوگئی۔ وہ تیس برس تک تبلیغ وہدایت میں مصروف رہے اور 527 ق م میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

جین مت کے مقدس صحائف تقریباً چوتھی صدی قبل مسیح تک سینہ بہ سینہ چلتے رہے جس دوران مہاویر کی تعلیمات کو ایک منظم شکل دینے کیلئے علماء اور پیروکاروں کا ایک اجتماع منعقد کیا گیا۔ آج کل کے جین مت کو دیکھیں تو یہ ہمیں پنتالیس صحائف پر مشتمل نظر آتا ہے جو مجموعی طور پر قانون سویتا مبرا کے نام سے موسوم ہے۔ ان پنتالیس صحائف میں سے گیارہ رنگ (اجزا) بارہ اپ رنگ (ذیلی اجزا) چار مول سوتر (بنیادی صحائف) چھ چھید سوتر (تنظیم) دو کولیکا سوتر (ضمیمے) دس پراکرناک یعنی مختلفات ہیں۔ جین مت کا ایک دیگر مسلک جوڈگامر کہلاتا ہے، کرما پر بھرت (ابواب کرما) اور کاسیہ پر بھرت (ابواب کاسیہ) کو صحائف کا درجہ دیتا ہے۔

ہندوؤں کی طرح جین بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے دیوی دیوتاؤں پر یقین رکھتے ہیں جنہیں مختلف نام دیئے گئے ہیں لیکن ان سب کا درجہ تر تھانکر اور دوسری پاک اور کامل ارواح سے نیچے تصور ہوتا ہے۔ جینوں کیلئے زمان کا تصور بھی اسی طرح ابدی اور غیر متشکل ہے جیسے یہ کائنات غیر متناہی اور غیر مخلوق ہے۔ جہاں تک مکان کا سوال ہے تو اس کی بھی کوئی شکل نہیں اور یہ سب چیزوں پر محیط ہے۔ اس میں کائنات اور غیر از کائنات جو ہر طرح کے مادے یا جوہر سے خالی ہے، سمیت ہر شے آجاتی ہے۔ اس کائنات کے مرکز میں وہ دنیا آباد ہے جس میں انسان، حیوان، دیوتا اور شیطان بستے ہیں اور اس کے بالکل اوپر ایک عالم بالا ہے جس کے دو حصے ہیں۔ عالم بالا کے نیچے عالم زیریں ہے جو سات حصوں میں منقسم ہے۔ جین مت تحمل، بقائے باہمی اور رواداری پر مبنی روایت ہے جس میں مسابقت کا رجحان نہیں پایا جاتا۔ جین مت دوسرے مذاہب کو برا بھلا نہیں کہتے اور نہ ہی دوسری قوموں یا گروہوں کا مذہب بدلنے کے چکر میں ہوتے ہیں۔ جینوں کی اکثریت گجرات، مہاراشٹر کے تاجروں اور سوداگروں پر مشتمل ہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

چ

چاسر، جیفری (1343ء۔1400ء)

پہلا بڑا انگریز شاعر۔ محققین اسے وسطی انگریزی زبان کا اہم ترین مصنف قرار دیتے ہیں اور اس کا شمار مغربی ادب کے عظیم ترین قلمکاروں میں ہوتا ہے۔ چاسر کی بڑی وجہ شہرت اس کا نامکمل شاہپارہ ''حکایات کنٹربری'' ہے۔

چاسر کی ابتدائی زندگی کے بارے میں کوئی واضح معلومات میسر نہیں۔ 1375ء کے لگ بھگ وہ اپنی خاندانی روایت کے مطابق شاہی ملازمت اختیار کر چکا تھا جس کے دوران اس نے انگریز فوج کے فرانس پر حملے میں بھی حصہ لیا۔ تاہم بدقسمتی سے اس لڑائی میں وہ پکڑا گیا اور بعد میں اس وقت کے انگریز بادشاہ ایڈرڈ سوم (حکومت 77۔1327ء) کو اسے چھڑانے کے لیے تاوان ادا کرنا پڑا۔ 1366ء میں اس کی شادی ملکہ کی ایک خادمہ فلپا سے ہوئی۔ وہ رشتے میں اس کیتھرین سونفورڈ کی ہمشیرہ تھی جو بعد میں جان آف گانٹ کی شریکِ حیات بنی۔ جان آف گانٹ کا شمار چاسر کے اہم ترین مربیوں میں ہوتا ہے۔ اگلے ہی برس بادشاہ نے چاسر کو تاحیات وظیفہ دینے کا فیصلہ کیا جس کے بعد وہ دربار شاہی کی طرف سے مختلف ملکوں میں سفارتیں انجام دیتا رہا۔ یہ سفر ادبی حوالے سے اس کے بہت کام آئے۔ اس کا دانتے، پیٹرارک اور کاچیو جیسے عظیم یورپی شعرا سے تعارف انہی سفروں کا نتیجہ تھا۔ اگر ہم چاسر کے کلام کا جائزہ لیں تو ہم اس میں ان شعراء کے اثرات کو محسوس کیے بغر نہیں رہ سکتے۔ 1387ء میں اپنی زوجہ کے انتقال کے بعد چاسر کو کچھ عرصے کے لیے شاہی عتاب اور مالی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ بعدازاں اسے رچرڈ دوم (حکومت 99۔1377ء) کی طرف سے ایک بار پھر تاحیات وظیفہ ملا۔ چاسر رچرڈ اور پھر اس کے جانشین ہنری چہارم کے دربار سے بھی وابستہ رہا جو اس کے مربی جان آف گانٹ کا بیٹا تھا۔

چاسر کے کلام کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کی اوّلین تخلیقات پر فرانسیسی عشقیہ شاعری کی روایت کے بڑے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ چاسر کے اس دور کی بڑی تخلیق (1370ء) ''بیگم صاحبہ کی کتاب'' ہے۔ یہ جان آف گانٹ کی پہلی بیگم کے نوحے کے طور پر تمثیلی انداز میں لکھی گئی ہے۔ اپنے طالوی دوروں اور دانتے، پیٹرارک اور بوکاچیو کی نگارشات سے تعارف کے بعد چاسر اپنے دوسرے تخلیقی دور میں داخل ہوتا ہے جس کے دوران وہ ''ایک صالح

عورت کی داستان'' (1387ء نامکمل) لکھتا ہے اور اس میں ہم ردیف ہیروئک کپلٹ متعارف کراتا ہے۔ ''طیور کی مجلس شوریٰ'' (1382ء) اور ''ٹرائلس اور کریسیڈا کے معاشقے'' (1382ء) بھی اس عہد میں قلمبند کیے گئے۔ موخرالذکر نظم بوکاچیو کی ایک تخلیق سے ماخوذ ہے اور اس کا شمار انگریزی ادب کی عظیم عشقیہ نظموں میں ہوتا ہے۔ چاسر کے سب سے اہم تخلیقی دور کا آغاز 1387ء میں ہوا جس کے دوران اس نے اپنی مشہور زمانہ ''حکایات کنٹربری'' (اندازاً 1343ء۔1400ء) لکھی۔ چاسر کے انتقال کے وقت تک اس کے 17000 مصرعے لکھے جا چکے تھے۔ اس میں کنٹربری میں واقع سینٹ ٹامس اے بیکٹ کے مزار کو جانے والے ایک قافلے کے سفر کی روداد بیان کی گئی ہے۔ قافلے میں شامل زائرین راستے میں باری باری اپنی اپنی کہانیاں سناتے ہیں جس سے قرون وسطی کے انگریزوں کی محبت، شادی اور مذہب کے متعلق رویوں کی ایک جیتی جاگتی تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ چاسر کی قصہ گوئی کو صدیوں تک نظر انداز کیا جاتا رہا۔ اٹھارہویں صدی میں اس کی تخلیقات کو ایک مرتبہ پھر دریافت کیا گیا جس پر جا کے انھیں وہ مقام ملا جس کی کہ وہ حقیقت میں مستحق تھیں۔ آجکل ان منظومات کو عظیم ترین انگریزی نگارشات میں شمار کیا جاتا ہے۔

چاند دیوی

چینی دیومالا کا ایک کردار۔ چین کی ایک دیومالائی حکایت کے مطابق چاند دیوی ایک بہت خوبصورت حسینہ تھی جس نے اپنے خاوند سے ایک اکسیر چرا کر پی لیا جس سے وہ اڑ کر چاند کے پاس چلی گئی اور امر ہوگئی۔ قدیم دور کے چینی شعرا اور ناول نگار چھانج پر اس قدر فریفتہ تھے جتنے کہ خود چاند پر۔ جہاں اس کے حسن و جمال کی مدح و تعریف نظموں اور ناولوں میں کی جاتی ہے، اہل چین اس سے اپنی عقیدت کا اظہار وسط خزاں کا مشہور تہوار زونگ چو جائی منا کر بھی کرتے ہیں۔ چینی تقویم کے آٹھویں قمری مہینے کے پندرھویں روز لوگ میٹھے چاند کیک کھاتے ہیں اور اس دیوی کے حسن سے بہرہ یاب ہونے کے لیے آسمان پر تابندگی بکھیرتے پورے چاند کو دیکھتے رہتے ہیں۔ اس موقع پر وہ دور بیٹھے اپنے عزیز و احباب کو یاد کرتے ہیں اور ان کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہیں۔

چرچل، سر ونسٹن [لیونارڈ سپینسر]، (1874ء۔1965ء)

ممتاز برطانوی وزیر اعظم، مدبر اور ادیب۔ اس کی ماں ایک امریکن اور باپ برطانوی تھا

http://muftbooks.blogspot.com/

جس کا نام لارڈ رینڈولف چرچل تھا۔ ونسٹن چرچل جنگ عظیم دوم کا غالباً سب سے زیادہ نمایاں اور کرشماتی لیڈر تھا۔ لیکن مزے کی بات ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں بہت نالائق تھا اور وہ ملٹری کالج کے داخلہ ٹیسٹ میں تین بار فیل ہوا اور پھر چوتھی کوشش میں جا کے کہیں اسے پاس کرسکا۔ چرچل نے اپنے فوجی کیریئر کا آغاز 1895ء میں کیا اور بعدازاں اس نے ایک سپاہی اور صحافی کی حیثیت سے کیوبا، سپین، ہندوستان اور جنوبی افریقہ کے دورے کیے۔ اسی دوران اس نے لکھنا لکھانا شروع کردیا اور 1898ء میں ''مالاکنڈ کی زمینی فوج کی کہانی'' 1898ء میں ''دریائی راستہ'' اور 1900ء میں ایک ناول ''ساورولا'' شائع کیا۔ یہ تینوں تصانیف چرچل کے فوجی تجربات پر مبنی تھیں۔

چرچل نے 1899ء میں فوج سے استعفیٰ دے کر خود کو تصنیف وتالیف اور سیاست کے لیے وقف کردیا۔ اگرچہ وہ قدامت پسند پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے پہلی بار کامیاب نہ ہوسکا، لیکن 1900ء میں اس نے دارالعوام میں نشست حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ قدامت پسند پارٹی سے ٹیکسوں کے مسئلے پر اختلافات پیدا ہونے پر وہ 1904ء میں لبرل پارٹی میں شامل ہوگیا اور ڈیوڈ لائیڈ جارج اور جان مورلے جیسے لبرل برطانوی سیاستدانوں کے زیر اثر آ گیا۔ اس نے 1906ء میں امور نوآبادیات کے نائب وزیر خارجہ اور 1908ء میں تجارتی بورڈ کے صدر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ سماجی اصلاحات کے لیے بھی آواز بلند کرتا رہا۔ اس نے کان کنوں کے لیے آٹھ گھنٹے یومیہ کام، کم ازکم اجرت کے تعین اور بیروزگاری سے نمٹنے کے لیے سرکاری دفاتر روزگار قائم کرنے کا مطالبہ کیا۔ جب 1909ء میں دارالامراء نے اس بنا پر بجٹ مسترد کرنے کا فیصلہ کیا کہ اس میں اصلاحات پر پیسہ لگانے کے لیے زیادہ ٹیکس شامل کیے گئے تھے، تو چرچل اور اس کے ساتھیوں نے ان کی بڑی شدومد سے مخالفت کی جس سے 1911ء کے پارلیمنٹ ایکٹ کے اجراء میں بڑی مدد ملی اور دارالامراء کے اختیارات محدود ہوکر رہ گئے۔ اس تحریک سے چرچل کو عوام میں بہت مقبولیت ملی اور اسے وزیر داخلہ بنادیا گیا۔

بعدازاں اس کا تبادلہ بحریہ میں کردیا گیا جہاں اس نے جرمنی کی طرف سے بڑھتے ہوئے خطرے کے پیش نظر بحری فوج کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنانے کے لیے کام کیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران اس نے ایک فوجی افسر (16-1915ء) اور وزیر رسد (18-1917ء) کے طور پر کام کیا۔ جنگ کے بعد اسے وزیر جنگ (21-1919ء) بنادیا گیا۔ اس دوران اس نے اپنی توجہ زیادہ تر روس میں اتحادی فوجوں کی اینٹی بالشویک مہم پر مرکوز رکھی۔

http://muftbooks.blogspot.com/

آئندہ چند برسوں میں چرچل کے سیاسی خیالات میں تبدیلی دیکھنے میں آئی۔اس نے محکمہ نو آبادیات کے سربراہ (22۔1921ء) کے عہدے پر کام کرتے ہوئے مشرق وسطیٰ میں نئی عرب ریاستیں نیز فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کے لیے بہت کام کیا۔اس سے اس کے سیاسی موقف کا جھکاؤ قدامت پسندی کی طرف ہوگیا۔اس نے1924ء میں ایک قدامت پسند امیدوار کی حیثیت سے کامیابی حاصل کی اور نئی قدامت پسند حکومت میں وزیرخزانہ کا عہدہ حاصل کیا جس پر وہ1929ء تک فائز رہا۔لیکن اگلا سال چرچل کے لیے آسان ثابت نہ ہوا۔قدامت پسند حکومت کی سیاست سے ملک میں بہت زیادہ بیروزگاری پھیل گئی۔کان کنوں نے ہڑتال کردی اور پھر1926ء میں عام ہڑتال کردی گئی۔1931ء تک یہ صورت حال بنی کہ کوئی سیاسی جماعت بھی چرچل پر اعتماد کرتی نہ دکھائی دیتی تھی۔اسے اپنے عہدے سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ اس پر اس نے اپنی توجہ ایک مرتبہ پھر لکھنے لکھانے کی طرف کرلی اور کئی کتابیں لکھ کر ڈالیں جن میں زیادہ تر آپ بیتیاں تھیں یا پھر مضامین تھے جن میں وہ حکومت کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتا رہا کہ ہٹلر چونکہ جرمنی کو ایک بار مسلح کرنے کی کوشش کررہا ہے اس کے خلاف ایک بڑا اتحاد بنایا جانا بہت ضروری ہے۔

جب برطانیہ نے 3 ستمبر1939ء کو جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا تو چرچل کو پھر بحریہ میں اسی پہلے والے عہدے پر فائز کردیا گیا۔جب1940ء میں وزیراعظم چیمبرلین کو زبردستی استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا تو چرچل عوامی حمایت کے بل بوتے پر وزیراعظم بن گیا۔اس کے ساتھ انھوں نے وزارت دفاع کا قلمدان بھی سنبھال لیا۔وہ جنگ کے دوران دونوں عہدوں پر کام کرتا رہا۔چرچل نے فرانس اور امریکی صدر فرینکلن ڈی روزویلٹ کے ساتھ مل کر فوجی اتحاد تشکیل دیا اور جب ہٹلر نے سوویت یونین پر حملہ کیا تو چرچل نے روس کو بھی اتحاد میں شمولیت کی دعوت دے دی۔تاہم جنگ کے آخری مراحل میں یورپ کو روسی اشتراکیت کے خطرے کے مسئلے پر چرچل اور روز ویلٹ میں نااتفاقی پیدا ہوگئی۔ چرچل کو روس کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اس کے ایک عالمی طاقت کے طور پر ابھرنے کا خوف کھائے جارہا تھا۔جنگ کے بعد ایک بڑا ڈرامہ یہ ہوا کہ چرچل اور دوسرے قدامت پسند عام انتخابات میں شکست کھا گئے۔اس پر چرچل ایک مرتبہ پھر تصنیف وتالیف کی طرف واپس آگیا۔اس دور میں اس نے اپنی چھ جلدی کتاب ''دوسری جنگ عظیم'' (1948ء۔1953ء) شائع کی جس پر اسے1953ء میں ادب کا نوبل پرائز دیا گیا۔ 1951ء میں چرچل کو ستتر برس کی عمر میں ایک بار پھر وزیراعظم و وزیر دفاع منتخب کرلیا گیا۔

http://muftbooks.blogspot.com/

1953ء میں اسے نائٹ آف دی گارٹر کا خطاب ملا اور 1963ء میں اسے امریکی کانگرس کے ایک ایکٹ کے ذریعے امریکہ کا اعزازی شہری بنا دیا گیا۔ چرچل کا انتقال نوے سال کی عمر میں لندن میں ہوا اور اسے سرکاری طور پر انتہائی عزت و احترام سے دفن کیا گیا۔ اس کی آخری رسومات میں بہت سے عالمی رہنماؤں نے شرکت کی۔

چیپلن، چارلی

برطانوی فلمی اداکار اور ہدایت کار۔ چیپلن کا نام امریکی خاموش فلموں کے ایک درخشندہ ستارے کے طور پر دنیا کے طول و عرض میں مشہور ہے۔ اس کے علاوہ انھیں سینما کو ترقی دینے والے اولین لوگوں میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔ ہاتھ میں چھڑی اور سر پر ڈربی ہیٹ لیے اور تنگ جیکٹ، کھلی پتلون اور فلاپی شوز پہنے ان کے ''ٹریمپ'' کے کردار نے پوری دنیا میں شہرت حاصل کی جس نے انھیں سلور سکرین کے سب سے معروف فنکار میں تبدیل کر دیا۔

چیپلن نے اپنی تھیٹر کی زندگی کا آغاز 1898ء میں میوزک ہال کے ایک فنکار کے طور پر کیا اور 1907ء میں انھیں برطانیہ کی فریڈ کارنو پینٹومائم کمپنی میں شامل کر لیا گیا۔ ان کے ایک امریکی دورے کے دوران کی سٹون فلمز کے ایک نمائندے کی نظر ان پر پڑی اور 1913ء سے انھوں نے اس کمپنی کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔ ''ٹریمپ'' کا کردار پہلے ان کی کی سٹون کمپنی کے لیے دوسری فلم (1914ء) ''وینس میں بچوں کی آٹھ دوڑیں'' میں پیش کیا گیا۔ ازاں بعد یہ کردار شخصی اعتبار سے اور روز افزوں پیچیدہ تر ہوتی سماجی صورت حال کے سیاق سباق میں اپنی ارتقائی منازل طے کرتا چلا گیا۔ اگرچہ عموماً اس کردار کو نفس پرستی، فریب، بددیانتی اور حرص کی دنیا میں گھرے ایک مسکین آدمی کے طور پر پیش کیا جاتا تھا (آسان گلی، مہم جو)، جیسا کہ ''سوانگی'' اور ''میدہ اور بارود میں نظر آتا ہے اس کا اپنا بھی ایک بدطینت پہلو تھا۔ چیپلن نے بہت سے سٹوڈیو بدلے اور بالآخر فرسٹ نیشنل فلم سٹوڈیو کے ساتھ منسلک ہو گیا جہاں اس نے بطور اداکار، کہانی کار اور ہدایت کار کام کیا اور تقریباً ستر فلموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ چیپلن نے 1919ء میں ڈی ڈبلیو گرفتھ، میری پکفورڈ اور ڈوگلس فیئر بینکس کے تعاون سے یونائٹڈ آرٹسٹس کی بنیاد رکھی اور 80 فلمیں تیار کیں جن میں سے چار درج ذیل فیچرز 1925ء سے 1936ء تک کے عرصے میں پیش کیے گئے:

سونے کی تلاش (1925ء)

سرکس (1928ء)

شہر کی بتیاں (1931ء)

http://muftbooks.blogspot.com/

نئے زمانے (1936ء)

''نئے زمانے'' میں صنعتی دور کے انسان کی اخلاق باختگی پر طنز کی گئی ہے اور اس کا شمار چیپلن کی مقبول ترین فلموں میں ہوتا ہے۔ فلمی ناقدین نے بھی دل کھول کر اس کی تعریف کی۔ یہ فلمیں چیپلن کے ''شادی گروپ'' کے نام سے مشہور ہیں اور ان میں ''ٹریمپ'' ہمیں جنسی و رومانوی رفاقت کے لیے سرگرداں نظر آتا ہے۔

چیپلن نے اپنی آخری تین امریکی فلموں میں آواز کا استعمال بھی کیا۔ ان میں پہلی عظیم آمر (1940ء) تھی جس میں ہٹلر اور نازیوں کو تمسخرانہ رنگ میں پیش کیا گیا ہے: دوسری موسیو ورڈو (1947ء) تھی جس میں چیپلن ایک عادی قاتل کے روپ میں سامنے آتا ہے اور تیسری روشنی کا ہالہ (1952ء) تھی جس میں اس کے ساتھ امریکی خاموش فلموں کے ایک اور مشہور ستارے بسٹر کیٹن نے بھی کام کیا۔ یہ فلمی دنیا کی الوداعی خاموش پروڈکشن تھی۔ 1940ء میں ''ہرسٹ پبلیکیشنز'' نے چیپلن کو ''عظیم آمر'' میں اس کے کردار کی وجہ سے سرعام تنقید کا نشانہ بنایا اور 1947ء میں انھیں ان اخبارات اور سیاستدانوں دونوں کے وار برداشت کرنا پڑے جنھوں نے ان پر اشتراکیت نواز ہونے کا الزام عائد کیا۔

چیپلن کو آخری ایام میں بہت سی ذاتی اور سیاسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اول تو عدم ادائیگی کی وجہ سے ٹیکس والوں نے انھیں بہت تنگ کیا دوسرا مسئلہ ان کی لبرل سیاسی اہداف کی غیر متزلزل حمایت تھی اور تیسرا مسئلہ ان کے اشتراکیوں کے ساتھ مراسم کے اشتباہ میں دائیں بازو والوں کی طرف سے ان کی فلموں کا مسلسل بائیکاٹ تھا۔

1952ء میں جب چیپلن امریکہ سے یورپ کے دورے کے لیے روانہ ہوئے تو امریکی وزارت خارجہ نے کیا کیا کہ ان کے ملک میں دوبارہ داخلے پر پابندی عائد کردی۔ چیپلن اس پر بہت برہم ہوئے اور پھر انھوں نے بیس سال تک امریکہ کا منہ تک بھی نہیں کیا بلکہ اپنی فلمیں اس ملک میں بھیجنے سے بھی انکار کردیا۔ 1957ء میں انھوں نے ''نیویارک کا بادشاہ'' ریلیز کی جس میں انھوں نے امریکی جمہوریت کو طنز کا نشانہ بنایا۔ 1972ء میں سینما کے ارتقا و ترقی کے سلسلے میں ان کی گرانقدر مساعیوں کے اعتراف میں انھیں موشن پکچر اکیڈمی کے خصوصی انعام سے نوازا گیا اور 1975ء میں انھیں ملکہ برطانیہ کی طرف سے سر کا خطاب بھی مل گیا۔

چیخوف، اینٹون [پیولووچ] (1860ء۔1904ء)

روسی افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس۔ اس کا شمار روس کی عظیم ترین ادبی ہستیوں میں ہوتا ہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

شروع میں اس نے طب کے پیشے کی تربیت حاصل کی لیکن بعد میں وہ ادب کے میدان میں آ گیا اور اپنے افسانوں اور ڈراموں کی بدولت دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا میں شہرت کی بلندیوں تک جا پہنچا۔ وہ جنوبی روس کے ایک دکاندار کے چھ بچوں میں تیسرے نمبر پر پیدا ہوا۔ اس کا باپ کریانے کا کام کرتا تھا۔ چیخوف نے ماسکو یونیورسٹی سے طب کی تعلیم حاصل کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے لکھنے لکھانے کا کام بھی کرتا رہا۔ وہ ''برادر برادرم'' اور ''طبیب بدون مریضاں'' کے قلمی نام سے مقامی اخبارات وجرائد میں خاکے، مزاحیہ کہانیاں اور چٹکلے لکھتا رہا۔ اپنی ابتدائی کتب کی وجہ سے چیخوف کو سینٹ پیٹرز برگ کے ایک بڑے اخبار کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا جس کی انتظامیہ نے اس کے لیے یہ گنجائش نکالی کہ وہ اپنی کہانیوں کے معیار پر توجہ مرکوز کر سکے۔ اپنی خوبصورت مزاحیہ کہانیوں کے ساتھ ساتھ چیخوف نے زیادہ تیکھی طنزیہ اور شاعرانہ حکایات بھی قلمبند کرنا شروع کر دی تھیں اور 1880ء کے عشرے کے اواخر تک اس کی انگلیاں اپنے ایک منفرد اسلوب تک پہنچ چکی تھیں۔ اس وقت تک وہ اپنی کئی عظیم نگارشات سپرد قرطاس کر چکا تھا۔ جن میں ''چراگاہ'' (1888ء) اور ''ایک خوفناک افسانہ'' 1889ء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

چیخوف کو زمانہ طالب علمی میں ہی تپ دق لگ چکی تھی جس کی وجہ سے اسے طب کا پیشہ ترک کرنا پڑا۔ اس نے 1892ء میں ماسکو کے نواح میں اپنے خاندان کے لیے تھوڑی سی جگہ خریدی جہاں رہ کر اس نے اپنے معروف ترین شاہپارے تخلیق کے جن میں ایک مختصر ناول ''وارڈ نمبر 6'' (1892ء) اور ''سمندری بگلہ'' (1896ء) اور ''چاچووانیا'' 1897ء جیسے کھیل شامل ہیں۔ 1896ء میں ''سمندری بگلہ'' کی سینٹ پیٹرز برگ میں پہلی پیشکش کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور شاید وہ ڈرامہ لکھنے کے شغل کو ہمیشہ کے لیے ہی ترک کر دیتا لیکن ہوا کیا کہ کوئی دو سال بعد ماسکو آرٹ تھیٹر میں اس کھیل میں دوبارہ جان آ گئی اور یہ اس قدر مقبول ہوا کہ کمپنی نے بگلے کو اپنا مارکہ بنالیا۔

1898ء میں چیخوف خرابی صحت کی بنا پر کریمیا میں واقع ایک صحت افزا مقام یالٹا میں منتقل ہو گیا۔ یہاں اکثر اس کی بیٹھکیں دیگر مشہور روسی ادباء میکسم گورکی اور ٹالسٹائی وغیرہ سے ہوتی رہتی تھیں۔ یالٹا میں قیام کے دوران چیخوف نے اپنی زیادہ توجہ ڈرامہ نگاری پر مرکوز کر لی اور ماسکو آرٹ تھیٹر کے لیے ''تین بہنیں'' (1901ء) اور ''چیری کا باغ'' 1903ء جیسے کھیل تصنیف کیے۔ چیخوف کی سیاست روز بروز لبرل رخ اختیار کرتی چلی جا رہی تھی اور 1902ء میں جس

وقت روسی حکومت نے گورکی کے روسی اکیڈیمی کے لیے انتخاب کو کالعدم قرار دیا تو چیخوف اور ایک دوسرے ادیب دلا دیمیر کورولینکو نے بھی احتجاجاً اس ادارے کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔

چیخوف کو افسانے کی صنف پر کامل عبور حاصل ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں اکثر انسانی زندگی پر چھائے غم و یاس کی عکاسی کرتا اور انسانوں کے ایک دوسرے سے تعلق نہ جوڑ سکنے کے المیے پر بات کرتا نظر آتا ہے۔ اپنے ڈراموں میں اس کی توجہ زیادہ تر دم توڑتے جاگیردار طبقے اور زمانے کی تاریخی تبدیلیوں کے جواب میں اس طبقے کے ارکان کے ناقص ردعمل پر رہتی ہے۔ اس کی یہ کہانیاں دیکھنے میں تو سادہ ہیں لیکن ان کے توسط سے وہ اپنے کرداروں کے داخلی منظرنامے تک رسائی حاصل کر کے ان کی شخصیت کی ایک ایک باریکی قارئین کے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔

چیخوف نے 1901ء میں ماسکو آرٹ تھیٹر کی ایک اداکارہ اولگا نپر سے شادی رچائی لیکن چیخوف کی خرابی صحت کی وجہ سے دونوں کو اپنی زندگی کا بیشتر حصہ الگ الگ ہی گزارنا پڑا۔ اس نے جو خطوط اپنی بیگم کو تحریر کیے ہیں دیکھا جائے تو وہ اس کے افسانوں کا مقابلہ کرتے نظر آتے ہیں۔ چیخوف کی موت جرمنی کے شہر بیڈن ویلر میں گرم پانی کے ایک تالاب میں نہانے کے دوران واقع ہوئی۔

چیانگ کائی شیک (1887ء۔1975ء)

چینی فوجی رہنما۔ چیانگ چین کے صوبے ژے جیانگ کے ایک تاجر گھرانے میں پیدا ہوا۔ اسے فوج میں جانے کا شوق قدیم عسکری ماہرین جو چینی زبان میں ''سنزی'' کہلاتے ہیں، کی تحریریں پڑھ کر ہوا۔ اس نے 1906ء میں شمالی چین کی باؤدنگ ملٹری اکیڈیمی سے تربیت حاصل کی لیکن چنگ خاندان (1644ء۔1911ء) کے خلاف اس کے جذبات کو راہ اس کے قیام جاپان (11-1907ء) کے دوران ملی۔ ایک جاپانی ملٹری اکیڈیمی میں اس کی ملاقات ایک اور انقلابی سن یات سین سے ہوئی جنھوں نے چیانگ کے عروج میں کلیدی کردار ادا کیا۔ چیانگ کی وطن واپسی عین ان لمحات میں ہوئی جب انقلاب کا لاوہ پھوٹ نکلا تھا اور انقلابی مانچو شاہی اقتدار کے خلاف علم بغاوت بلند کر چکے تھے۔ وہ 1911ء اور 1913ء میں چین چے کی سرکردگی میں شنگھائی میں لڑتا رہا لیکن جب چین کو 1916ء میں قتل کیا گیا تو وہ ایک مختصر عرصے کے لیے منظر سے ہٹ گیا۔ دوبارہ منظر عام پر آنے کے بعد وہ سن یات سین کی انقلابی جماعت گومن ڈانگ (جی۔ایم۔ڈی) میں شامل ہو گیا۔ چیانگ نے ابتدا تو ایک آفیسر کے طور پر کی تھی لیکن جلد ہی اس

نے جی۔ایم۔ڈی میں ایک نمایاں مقام حاصل کرلیا خصوصاً جب ان کی افواج کی ریڈ آرمی کی طرز پر تنظیم نو کی تجویز پر عمل شروع ہوا۔ چیانگ 1923ء میں عسکری تنظیم کے مطالعے کے لیے روس گیا اور 1924ء میں ہانگ پوملٹری اکیڈیمی کے سربراہ کے طور پر کام کرنے لگا۔اس ادارے سے مستقبل کے بہت سے چینی عسکری قائدین تربیت لے کر نکلے۔

سن کی 1925ء میں وفات کے بعد وہ جی۔ایم۔ڈی کی طویل عرصے تک چلنے والی داخلی رسہ کشی میں مصروف پیکار رہا۔اگرچہ چیانگ نے جی۔ای۔ڈی کے بائیں بازو پر غلبہ حاصل کر لیا تھا اور شروع میں اپنے اشترا کی مخالفین کے خلاف اپنی پوزیشن بہتر بنانے میں بھی کامیاب ہوگیا تھا لیکن چینی فوج اور سیاست سے اشترا کیوں کا صفایا کرنا ان کے بس میں نہ تھا اور یہی چیز انجام کار اس کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔تاہم چیانگ نے دیوار کبیر کے جنوب میں واقع تمام چین کو اپنی فوجی مہمات کے توسط متحد کرلیا۔ان کا پیکنگ (اب بیجنگ) پر بھی قبضہ ہوگیا اور 1928ء میں وہ نئی قومی حکومت کا چیئرمین بن گیا۔لیکن چیانگ سے غلطی یہ سرزد ہوئی کہ وہ بجائے سامراجیت پسند جاپانیوں کو ایسا سمجھنے کے چینی اشترا کیوں کو ہی اپنے لیے بڑا خطرہ سمجھتا رہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چینی فوج بار بار کی تطہیر کے سبب کمزور پڑتی گئی۔1936ء کے واقعہ شیان میں اس کے اپنے فوجیوں نے ہی اسے پکڑ لیا اور سات روز تک حراست میں لیے رکھا۔انھیں رہائی یہ وعدہ کرنے پر ملی کہ وہ جاپان کے خلاف لڑنے کے لیے اشترا کیوں کے ساتھ مل کر متحدہ محاذ تشکیل دے گا۔ جاپان کے ساتھ جنگ کا آغاز 1937ء میں ہوا اور 1939ء تک جاپان تقریباً نصف چینی علاقے اور آبادی کو قبضے میں لے چکا تھا۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران اتحادیوں نے چائنہ تھیٹر آف آپریشنز قائم کیا اور چیانگ کو 1942ء میں اس کا سپریم کمانڈر مقرر کردیا گیا۔اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ چیانگ جاپانیوں کو جنگ میں الجھا کر ان کی توجہ بٹائے رکھتا لیکن اس کے دل میں اشترا کیوں کا خوف گھر کر گیا تھا اور اسے یہ یقین ہو چکا تھا کہ جاپانیوں کی شکست کے بعد چین کو خانہ جنگی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ان وسوسوں کی وجہ سے اس نے کہ اپنی فوج کے بہترین حصے کو مستقبل کی مفروضہ جدوجہد کے لیے بچائے رکھا۔ یہ حکمت عملی ناکام ثابت ہوئی۔ چونکہ جاپانیوں کے خلاف زیادہ جنگ اشترا کیوں نے لڑی تھی، ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوگیا اور چیانگ کی قدوقامت پست ہوگئی۔جب خانہ جنگی کی نوبت آئی تو اشترا کی جیت گئے اور پہنچی 1949ء میں عوامی جمہوریہ چین کا قیام عمل میں آ گیا۔ چیانگ اس برس بھاگ کر تائیوان جا پہنچے اور وہاں حکومت قائم کرلی لیکن وہ چین سے اشترا کیوں کو

http://muftbooks.blogspot.com/

نکالنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

چین کے شاہی خاندان

چین میں مختلف ادوار میں حکومت کرنے والے شاہی خانوادوں کا سلسلہ۔ ان خاندانوں نے کم وبیش تین ہزار سال تک حکمرانی کی۔ بڑے بڑے شاہی خاندانوں اور ان کے عہد اقتدار کے متعلق صحیح تواریخ کا تعین بعض اوقات مشکل ہوجاتا ہے۔ تاہم چین کی تاریخ کا پہلا داستانوی شاہی سلسلہ شیا خاندان کے بادشاہوں کا تھا جس کا آغاز 2200 قبل مسیح میں ہوا اور سب سے آخر میں چنگ خاندان آیا جس کا خاتمہ 1911ء میں ہوا۔

شیا خاندان کی ابتدا خیال کیا جاتا ہے کہ 2200 قبل مسیح میں ہوئی اور یہ سلسلہ اٹھارہویں صدی قبل مسیح کے آخر تک (اندازاً 1766 ق م) چلتا رہا۔ اس نیم متعین عہد میں چینی ثقافت نے وسعت اختیار کرنا شروع کی اور کسانوں میں مستقل سکونت کا رجحان شروع ہوا۔ اگرچہ اسے چین کا پہلا شاہی عہد تصور کیا جاتا ہے لیکن چینی تہذیب کی صحیح بنیادیں شانگ (یا پن) خاندان (اندازاً 1766۔1122 ق م) کے دور میں استوار ہوئیں۔ یہ پہلا سلسلہ ہے جسے ہم واقعی کوئی شاہی سلسلہ قرار دے سکتے ہیں جو مشرقی ہنان صوبے کے مختلف گروہوں کے ادغام سے وجود میں آیا۔ چین میں شہروں کا رواج، پہلی چینی تقویم کی ایجاد، تحریری زبان کی نشوونما اور کانسی کی چیزیں بنانے کا عمل اسی عہد میں شروع ہوا۔

آل شانگ کو مغربی چین سے وارد ہونے والے قزاقوں یعنی اہل جو نے تسخیر کیا جنھوں نے 1027ء میں اپنے شاہی خاندان کی بنیاد رکھی۔ بربر حملوں کے دباؤ اور داخلی خلفشار کے سبب انھوں نے 771 ق م میں دارالحکومت مشرق کی جانب منتقل کرلیا جس سے مشرقی جو عہد کا آغاز ہوا جو 256 ق م تک چلتا رہا۔ اس پورے دور میں جو کہ متحارب ریاستوں کے عہد (403۔221 ق م) کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، اہل ژھو کی حاکمیت کمزور پڑتی گئی۔ جاگیری ریاستوں کے درمیان مسلسل خانہ جنگی کے اس زمانے میں آسمانی یا فطری استحقاق پر مبنی حاکمیت وموزونیت کے سانچوں کی جگہ میرٹ پر مبنی سانچوں نے لینی شروع کردی۔ تاؤمت اور کنفیوشس مت کے شہری مذہبی نظام بھی اس دور میں زیادہ مقبول اور منظم ہوئے۔

متحارب ریاستوں کے پرآشوب خلفشار دور سے قانون پسند چن خاندان (221۔206 ق م) نے جنم لیا۔ اس خاندان کا دور نسبتاً مختصر تھا لیکن یہ چین اور اس کے شاہی نظام میں تبدیلیاں پیدا کرنے کے اعتبار سے کافی موثر ثابت ہوا۔ چن بادشاہوں نے ریاست کو مرکزیت دی، تحریری

http://muftbooks.blogspot.com/

نظام کو منظّم کیا، اوزان و پیمائش کا ایک ملک گیر نظام قائم کیا، دیوار کبیر بنائی اور بربر لشکروں کو شمال اور جنوب کی طرف دھکیل کر پہلی حقیقی چینی سلطنت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ انھیں بہت جلد فارغ کر دیا گیا لیکن اس کے بعد آنے والے ہان خاندان (200ق م۔220ء) کے حکمرانوں نے چن بادشاہوں کے تنظیمی ڈھانچے کا فائدہ اٹھایا اور اسے مزید نشوونما دی۔ ہان حکمرانوں کی اضافی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے ایسی پالیسیاں اختیار کیں جن سے کسان طبقے میں احساس بیگانگی پیدا نہ ہو۔ اس دور میں کنفیوشس مت کی سرکاری سطح پر حوصلہ افزائی کی گئی جس کے شواہد نئے امتحانی نظام کی ترویج میں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

تفرقہ پرستی اور خراب اقتصادی کارکردگی کی وجہ سے ہان خاندان اپنی قوت کھو بیٹھا اور اس کی جگہ ''عہد بے اتحادی'' نے لے لی۔ یہ تین صد سالہ دور متحارب ریاستوں کے متضاد اور متصادم مفادات سے پیدا ہونے والی بے چینی وانتشار سے عبارت تھا۔ اس دور میں بدھ مت نے چینی معاشرے میں ایک موثر قوت کی حیثیت حاصل کر لی۔ سُوئی فرمانرواؤں (518ء۔618ء) نے دیوار کبیر کی تعمیر نو اور نہر عظیم کی کھدائی جیسے منصوبہ جات شروع کر کے اور مرکزی حکومت کو نئے سرے سے تشکیل دے کے سلطنت چین کی کھوئی ہوئی عظمت کو ایک دفعہ پھر زندہ کرنے کی کوشش کی۔ بھاری ٹیکسوں اور عسکری ناکامیوں کے سبب سوئی دور انجام پذیر ہوا لیکن اس کے بعد آنے والے تانگ خاندان (618ء۔906ء) نے سوئی بنیادوں پر ایک ایسی طاقتور سلطنت استوار کی جس کی سرحدیں کوریا سے لے کر فارس تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس عہد میں دارالحکومت شیان میں دس لاکھ نفوس آباد تھے اور اس نے شاعری و مصوری جیسے فنون اور کنفیوش مت کو خوب نشوونما دی۔ عسکری مہم جوئیوں کے سبب تانگ بھی برباد ہوئے اور چین میں طاقت کا خلا پیدا ہو گیا۔ یہ خلاء 960ء میں اس وقت جا کر پُر ہوا جب سونگ خاندان برسر اقتدار آیا۔ سونگ عہد میں چینی معاشرے میں ایسے ثقافتی خدوخال ابھرے جو تقریباً آئندہ دس صدیوں تک دکھائی دیتے رہے۔ شہری علاقے پھیل گئے اور تجارت بتدریج زیادہ اہمیت اختیار کر گئی۔ تعلیم یافتہ متوسط طبقے نے ثقافت وسماج کا نظم ونسق سنبھال لیا اور ریاست کے زیر سرپرستی بدھ مت اور کنفیوشس مت کے مختلف پہلوؤں کو یکجا کر اسے ایک اور رنگ کے مذہب (neo-confucianism) میں ڈھال دیا گیا۔ چنگیز خاں کی کامیاب عسکری مہمات کے بعد سونگ سلسلے کی جگہ منگول حکومت نے لے لی۔ اس کے پوتے قبلائی خان نے یوآن سلسلے (1260ء۔1368ء) کی بنیاد رکھی اگرچہ یوآن دور میں مقامی چینیوں کے ساتھ امتیاز روا رکھا گیا، داخلی اور خارجی تجارت نے بہت زیادہ

ترقی کی۔اس عہد میں کئی مختلف مذہبی اور نسلی گروہ ساتھ ساتھ زندگی بسر کرتے رہے بلکہ یوآن حکمران ان کی سرپرستی بھی کرتے رہے۔ یوآن عہد میں مارکوپولو کے بشمول بہت سے یورپی سیاحوں نے بھی چین کا سفر کیا۔کلاسیکی ادب کو سرکاری سطح پر دبانے کی کوشش کی گئی جس کے نتیجے میں غیر کلاسیکی ادب نے خوب نمو پائی۔تاہم ان تمام اقدامات سے چینیوں کے دل نہ بہل سکے اور ایک بڑی کسان بغاوت نے منگول حکومت کا صفایا کر دیا۔

مِنگ عہد (1368ء۔1644ء) ایک زبردست آمرانہ دور تھا جس کے دوران دارالحکومت بیجنگ منتقل ہو گیا اور زراعت، ادب اور چین کی آبادی نے خوب ترقی کی۔ پورسلین اور چینی ناول میں سب سے زیادہ ارتقاء اسی عہد میں دیکھنے میں آیا۔اس کے علاوہ طب، تاریخ اور صنعت وحرفت کے موضوعات پر جمع شدہ علم کی ترتیب و تنظیم کے لیے بڑے بڑے علمی منصوبوں پر کام شروع ہوا۔

چین کا آخری شاہی خاندان، چنگ بھی ایک غیر ملکی (مانچو) حملے کے نتیجے میں اقتدار میں آیا۔انھوں نے1644ء سے1911ء تک حکومت کی جس کے دوران وہ ایک کسلت کے شکار معاشرے کا نظم ونسق جیسے تیسے چلاتے رہے۔ چنگ حکمرانوں نے سلطنت کی پہنچ میں اضافہ کیا اور وہ ایک سو سال سے زائد عرصہ تک بڑی کامیابی سے حکومت کرتے رہے لیکن انیسویں صدی تک وسیع پیمانے کی بدعنوانی اور پراسراف عسکری مہمات کی وجہ سے یہ حکومت اپنی قوت زائل کر چکی تھی۔ چینیوں کا اہل مغرب سے صحیح واسطہ اس وقت پڑا جب برطانوی سامراج افیون کی تجارت میں سے اپنا حصہ بٹورنے کے لیے آگے بڑھا۔اس دوران چینیوں کو بہت خجالت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ غیر ملکی طاقتوں کے مقابلے میں بہت سی جنگیں کھو بیٹھے اور1842ء میں ہانگ کانگ بھی ان کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔انیسویں صدی کے شروع میں اصلاحی تحریکوں نے شاہی نظام کو پھر زندہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکیں۔59۔1894ء میں جاپان کے خلاف لڑی گئی جنگ میں چین کی شرمناک شکست کو اس امر کی دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔1900ء کے عشرے کے اوائل کی انقلابی اصلاحات نے ملک کو بحران میں مبتلا کر دیا جو بالآخر انقلاب پر آ کے منتج ہوا۔12 فروری1912ء کو چین کا آخری شہنشاہ عبوری جمہوری حکومت کا سربراہ سن یات سین کے حق میں دستبردار ہو گیا جس سے تین ہزار سال سے زائد عرصے تک چلنے والا شاہی اقتدار اپنے انجام کو پہنچا۔

چینی ایجادیں

بارود، قطب نما، کاغذ، طباعت۔ یہ چاروں چیزیں جنھوں نے یورپ پہنچ کر مغربی دنیا کا حلیہ بدل دیا، صدیوں قبل اہل چین نے ایجاد کی تھیں اور ان سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ سرزمین چین میں عہد مسیحی سے قبل ایک نہایت ترقی یافتہ تہذیب موجود تھی۔ بارود چینی کیمیا گروں نے الکلائن دھاتوں کے نمک الگ کرنے کی صلاحیت حاصل کر کے آٹھویں صدی میں تیار کیا تھا۔ جب انھوں نے پوٹاشیم نائٹریٹ کو الگ کر کے اس کا تعامل کوئلے اور گندھک سے کرایا تو ان کے ہاتھ بارود آ گیا۔ چینیوں نے بارود کو فوجی مقاصد کے لیے استعمال کرنا دسویں صدی کے دوران کیا۔ گیارھویں صدی میں آ کے اسے کانوں، دستی بموں وغیرہ میں بھی استعمال کیا جانے لگا تھا۔ مسلمان تیرھویں صدی تک بارود کا استعمال نہ جانتے تھے۔ ان تک یہ ایجاد منگولوں کے توسط سے پہنچی۔ یورپ میں تو یہ کہیں چودھویں صدی میں جا کے پہنچا۔ لیکن اس کے بعد یورپ نے عسکری حرفت میں اس قدر تیزی سے ترقی کی کہ چین بہت پیچھے رہ گیا۔

قطب نما دوسری صدی قبل مسیح کے پیشین گوئیوں کے لیے استعمال ہونے والے تختوں پر نصب ''جنوب نما چمچ'' میں ترمیم کر کے بنایا گیا۔ ابتدائی طرز کا قطب نما ساتویں اور آٹھویں صدی میں پانی میں تیرنے والی مقناطیسی مرکز کی حامل سوئی سے بنایا گیا۔ اس آلے میں ایک بڑی تبدیلی آٹھویں اور نویں صدی میں مقناطیسی انحراف دریافت ہونے پر آئی۔ چونکہ یہ سوئی عین شمال وجنوب کی سمت رخ نہ کرتی تھی اس لئے قطب نما سے حاصل ہونے والے اعداد وشمار کو تبدیل کرنا پڑتا تھا۔ اہل چین نے بحری جہازوں پر قطب نما کا استعمال 1111ء میں شروع کر دیا تھا جبکہ اہل یورپ نے اس آلے کا یہ استعمال کوئی ایک سو سال بعد جا کر سیکھا۔

غالباً سب سے بڑی چینی ایجادات کاغذ اور طباعت تھیں۔ کاغذ پہلی صدی میں مغربی چین میں بنایا گیا۔ یہ کاغذ شہتوت کے درخت کی چھال، حشیش اور بعض دیگر ریشوں سے بنایا جاتا تھا۔ چوتھی صدی میں آ کے کاغذ بنانے کی صنعت ترقی کر گئی اور اس کے لیے بانس اور ریشمی کپڑے کو بھی استعمال کیا جانے لگا۔ تاہم کاغذ سازی نے فائن آرٹ اور کثیر پیداواری صنعت کا درجہ تانگ عہد (618ء۔906ء) میں حاصل کیا۔

ابتدائے طباعت کی تاریخ کا تعین اس سے بھی مشکل ہے۔ باریک کاغذ پر پتھر کی مدد سے نقوش حاصل کرنے کا عمل ہان عہد (200ق م۔220ء) میں شروع ہو گیا تھا۔ پھر آٹھویں صدی میں یہ ہونے لگا کہ پہلے چوبی ٹکڑوں (بلاکوں) پر تحریر تراشی جاتی تھی، پھر اس سے کاغذوں پر چھاپہ لگایا جاتا تھا اور پھر ان کاغذوں کو آپس میں سریش وغیرہ سے جوڑ کر کتاب کی شکل دے دی

جاتی تھی۔اس طرح کی چھپائی کا معیار کوئی زیادہ اچھا نہیں تھا جس کی وجہ سے اب بھی اکثر افراد کتابوں کو مسودوں کی شکل میں ہاتھ سے نقل کرنے پر ترجیح دیتے تھے۔1040ء میں پھر یہ ہوا کہ بی شینگ نامی ایک چینی شخص نے ایک ایسا چھاپہ خانہ تیار کرلیا جس میں حرکت پذیر ٹائپ استعمال کی جانے لگی۔اس میں سیرالک سے بنے حروف استعمال کیے جاتے تھے۔بعد میں منظر عام پر آنے والے طباعتی آلات میں لکڑی، تانبے اور سکے سے بنے حروف بھی استعمال کیے جانے لگے۔ چینی زبان میں کوئی درجن دو درجن حروف تو تھے نہیں بلکہ اسے لکھنے میں ہزاروں حروف استعمال کرنا پڑتے تھے۔اس لیے مذکورہ بالا طباعتی عمل بہت مشکل محسوس ہوتا تھا اور اس پر خرچہ بھی بہت زیادہ اٹھتا تھا۔اس وجہ سے انیسویں صدی تک چین میں بلاک پرنٹنگ ہی غالب رہی۔تاہم حرکت پذیر ٹائپ والی طباعتی مشین یورپ میں استعمال میں آنے سے کوئی چار سو سال قبل اہل چین کے پاس موجود تھی۔

چینی رسوم

کنفیوشس مت میں شامل آباء پرستی کی رسمیں۔عیسائی مبلغین نے چینیوں کو رومن کیتھولک مسلک کا پیرو بنانے کے لیے سولھویں صدی میں چین کا رخ کیا چین میں عیسائی پرچار کے اس بانی کو وہاں کی زبان میں لُو مادو بھی کہا جاتا ہے۔ان یسوعی مبلغوں نے میٹیو رچی کی قیادت میں ثقافتی رواداری کی حکمت عملی سے کام لیا۔دیگر رومن کیتھولک سلسلوں کے برعکس یسوعی جس علاقے میں بھی تبلیغ کے لیے جاتے تھے وہاں کی مقامی ثقافت کا بہت خیال رکھتے تھے۔یسوعیوں نے چینی درباروں کے معاملات کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ بالائی طبقات کا مذہب کنفیوشس مت عیسائیت سے متصادم نہیں ہے اور دونوں میں بڑی تال میل ہے۔ لہٰذا انھوں نے مقامی عقائد و رسوم کو عیسائیت کا جزو بنانا شروع کردیا۔آباء پرستی کی کئی رسوم وروایات آداب اور شائستگی کی علامت کی حیثیت اختیار کرچکی تھیں لہٰذا انھیں نئے کیتھولک مرکب میں شامل کرلیا گیا۔بجائے اس کے وہ تمام چینی روایات کو کفر قرار دے کر مسترد کرتے، یسوعیوں نے کیا کیا کہ عیسائیت قبول کرنے والے چینیوں کو کنفیوشس مت کی رسومات ادا کرتے رہنے کی بھی اجازت دے دی۔اس سے ان کا خیال تھا کہ عیسائیت کی طرف لوگوں کی کشش بڑھے گی۔ یسوعیوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ کنفیوشس مت میں روحانی و مذہبی عنصر موجود نہیں لہٰذا اس کے اخلاقی آداب میں کیتھولک مسلک کی روحانیت شامل کرنے سے اس کی تکمیل ہوگی۔

یسوعیوں نے محسوس کیا کہ وہ جس ثقافت میں تبلیغ کے لیے رہ رہے ہیں اس سے رواداری

برتنا اہم بھی ہے اور ضروری بھی۔ اسی بات کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے مقامی زبان سیکھنا شروع کی، نئے نام رکھ لیے۔ اپنے لباس کا رنگ ڈھنگ بدل لیا اور طاقتور اور پڑھے لکھے طبقوں کے افراد کو عیسائی بنانا شروع کر دیا۔ آخری مِنگ عہد (1368ء۔1644ء) کے حکمرانوں کی اختیار کردہ تالیفی پالیسی نے بھی اس یسوعی حکمت عملی کی حوصلہ افزائی کی جس میں کنفیوشس مت، بدھ مت اور تاؤ مت کے تینوں روایتی مذاہب کو اندر سے ایک ہی مذہب تصور کیا جاتا تھا۔

یسوعیوں نے 1651ء تک 150,000 چینیوں کو عیسائی بنایا۔ اس کے ساتھ چونکہ یسوعی بڑے اعلیٰ سائنسدان اور کاریگر بھی تھے، انھوں نے چینی اداروں میں طاقتور عہدے بھی حاصل کر لیے۔ پھر تصویر کا رخ بدلا اور مانچو حملے اور چنگ عہد (1644ء۔1911ء) کے قیام کے ساتھ چینیوں کے مذہبی رویے بھی بدلنے لگے اور انھوں نے مذہبی تخلیص کا وصف اپنا لیا جس سے عیسائیت کے خلاف مخالفت کی فضا پیدا ہو گئی۔ لیکن اس سے یہ نہیں کہ سب کچھ ہی ناس ہو گیا۔ اس سب کے باوجود بھی یسوعیوں کو چنگ دربار سے عزت و مراعات ملتی رہیں۔

مزے کی بات ہے کہ یسوعیوں کو سب سے زیادہ مخالفت و مخاصمت کا سامنا کیتھولک چرچ کے اندر سے ہی کرنا پڑا۔ غیر یسوعی کیتھولک سلاسل مثلاً ڈومینکن اور فرانسسکن فرقے کے علماء کا عقیدہ تھا کہ آباء پرستی اور عیسائیت کا جزو بننے والی کنفیوشس مت کی دیگر رسمیں بدعات ہیں اور انھیں کفر کے مترادف سمجھا جانا چاہیے۔ اس پر ایک بہت لمبا چوڑا تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ اگرچہ یسوعیوں نے جنھیں کہ چین کے دربار شاہی کی پشت پناہی بھی حاصل تھی، بہت کہا کہ ان کا مسلک بدعتی نہیں ہے اور انھوں نے تو کیتھولک مذہب کو کنفیوشس مت کا محض تڑکہ لگایا ہے لیکن ویٹکن نے ان کی نہ سنی اور اس نے 1704ء میں یسوعیوں کے مخالفین کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ تس پر بھی یسوعی دربار چین میں ریاضی دانوں اور فلکیات دانوں کے طور پر کام کرتے رہے لیکن انجام کار 1773ء میں پوپ نے ان کے فرقے کو کالعدم قرار دے دیا اور اس طرح عیسائیت نے چین میں جو رستے بنائے تھے وہ معدوم ہو گئے۔ (یسوعی سلسلہ 1814ء میں نپولین کی شکست کے بعد بحال کیا گیا۔

چینی مصوری

چینی ثقافت کا ایک درخشاں پہلو۔ چینی مصوری کی تاریخ چوتھی صدی قبل مسیح تک جا ملتی ہے جب مقبروں اور تربتوں پر تصویر کشی کی جاتی تھی۔ چینی مصور دیوار، ریشم اور کاغذ کی سطح پر حیوانی بالوں سے بنے برش اور سنگ سیاہی سے تصویریں بناتے تھے۔ جب سلکی اور کاغذی تصویروں نے

سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی تو طوماری مصوری نے موزوں ترین میڈیم کی حیثیت حاصل کر لی اور اس نے انتہائی نازک سکرین پینٹنگ اور ناحرکت پذیر دیواری مصوری کو پیچھے چھوڑ دیا۔ شروع شروع میں چینی مصور مذہبی و دیومالائی موضوعات پر تصاویر بناتے تھے نیز انسانی زندگی کی عکاسی بھی کرتے تھے۔ ابتدائی دور کی چینی مصوری میں مذہبی و انسانی موضوعات پر زور تو تھا ہی لیکن اس نے اپنا صحیح رنگ سونگ عہد (960ء۔1279ء) کے نصف اول میں لینڈ سکیپ کے ارتقاء سے پکڑا۔ اس دور میں ایک تو برش کے استعمال کی تکنیکوں میں ترقی دیکھنے میں آئی اور دوسرا یہ کہ فطرت کے انفرادی پہلوؤں کو فلسفیانہ مفاہیم سے مربوط کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ اس کے بعد کی چینی مصوری میں دانشور فنکاروں کا غلبہ نظر آتا ہے جو اس فن کو ذاتی اظہار کا ایک وسیلہ خیال کرتے تھے۔ مِنگ عہد (1368ء۔1644ء) سے لے کر چِنگ دور (1644ء۔1911ء) کے شروع تک چینی مصوری کا روائتی انگ ماند پڑتا اور طرح طرح کے اسلوب اور اصناف کا ایک اژدحام اس کی جگہ لیتا نظر آتا ہے جو چینی فنکاروں میں تخلیقی احیاء کی نشاندہی کرتا ہے۔

چینی نظام امتحانات

چینی سول سروس میں داخلے کا نظام۔ نوزائیدہ سول سروس میں داخلے کے لیے اس طریق کار کی ابتدا پہلی صدی عیسوی میں ہوئی۔ یہ چینی امتحانی نظام منگ (1368۔1644ء) اور چنگ (1644ء۔1911ء) عہد میں پروان چڑھا۔ یہ امتحان بہت طویل اور مہنگا تھا اور اس کی تیاری میں کئی کئی دھائیاں لگ جاتی تھیں اور اس کے باوجود اکثر امیدوار اس میں رہ جاتے تھے۔ لہٰذا صرف امیر گھرانے ہی اپنے بچوں کا رخ ادھر کرنے کا سوچ سکتے تھے۔ ہان عہد (202ق م۔220ء) کے دوران جس میں کہ اس طرح کے امتحان شروع ہوئے، صرف ایک فی صد امیدوار کامیاب ہو سکے۔ تانگ عہد (618ء۔906ء) میں اس امتحان کے مضامین میں اضافہ کر دیا گیا اور نہ صرف یہ کہ اس میں کنفیوشس مت کی کلاسیکی کتب بلکہ انتظامی امور پر مبنی سوالات بھی شامل کر دیے گئے۔ اتنے تفصیلی طریق کار سے تاثر تو یہ ابھرتا ہے کہ اس میں سب کام جائز ہی ہوتا ہوگا اور ملازمتیں صرف مستحق امیدوار ہی حاصل کرتے ہوں گے لیکن ستم ظریفی دیکھیے اتنے کڑے نظام کے باوجود بھی زیادہ ملازمتیں اہل زر کا ہی مقدر بنتی تھیں جو مال لگا کر یہ عہدے خریدتے تھے تاکہ معاشرے میں ان کی شان بنی رہے۔

سونگ عہد (960ء۔1279ء) میں طباعت کا آغاز ہوا جس سے زیادہ افراد تعلیم حاصل

http://muftbooks.blogspot.com/

کرنے لگے جس کے نتیجے میں زیادہ مختلف سماجی طبقوں کے افراد اس مقابلے میں شریک ہونے لگے۔ ایک اور تبدیل اس دور میں یہ رونما ہوئی کہ مقابلے کے امتحان کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا: پہلا حصہ علاقائی، دوسرا محکمہ جاتی اور تیسرا محلاتی۔ پہلے دو مرحلوں کی تکمیل پر امیدوار مزدوری کے کاموں اور جسمانی سزا سے مستثنیٰ ہو جاتا تھا۔ امتحان کے آخری مرحلے کا انعقاد چین کے مختلف صوبائی صدر مقاموں میں تین سال میں صرف ایک مرتبہ کیا جاتا تھا۔ یہ نظام وسیع پیمانے کی بدعنوانی اور حکام کی طرف سے نچلے درجے کی ڈگریوں کی فروخت کے باوجود میرٹ کے آئیڈیل اور ملکی نظام میں نئے جوہر کو متعارف کرانے کے وسیلے کے طور پر کام کرتا رہا۔ جب سترھویں صدی میں عیسائی مبلغین چین آئے تو وہ یہ نظام دیکھ کر بہت متاثر ہوئے، بالآخر اسے انیسویں صدی میں یورپ اور امریکہ میں بھی رائج کر دیا گیا اور اس نے رفتہ رفتہ سول سروس امتحان کے معیار کی حیثیت حاصل کر لی۔ بیسویں صدی میں اس امتحانی نظام کی اصلاح اور اسے جدید رنگ دینے کی کوششیں کی گئیں جو ناکام رہیں یہ آخری مرتبہ 1904ء میں منعقد ہوا اور 1906ء میں اسے ایک شاہی فرمان کے ذریعے ختم کر دیا گیا۔

ح

حافظ (اندازاً 1320ء۔1390ء)

فقید المثال فارسی شاعر، انہیں عرف عام میں حافظ یا حافظ شیرازی کہا جاتا ہے لیکن ان کا پورا نام محمد شمس الدین یا شمس الدین محمد تھا۔ وہ ایران کے شہر شیراز کے ایک سفید پوش گھرانے میں پیدا ہوئے اور انہوں نے مختلف اساتذہ سے عربی و فارسی علوم کی تعلیم حاصل کی۔ ان کی ذات کے بارے میں ہم زیادہ نہیں جانتے لیکن بعض روایتوں کے مطابق وہ ایک سالک اور مدرس قرآن تھے۔ انہوں نے اپنی بہت سی منظومات مقامی فرمانراؤں سے منسوب کی ہیں اور لگتا ہے کہ انتقال تک ان کی شہرت عالم العرب اور ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل چکی تھی۔ اگرچہ انہوں نے کئی اصناف سخن کو وسیلہ اظہار بنایا، وہ غزل کے خاص طور پر دلدادہ تھے۔ ان کی غزلوں کے مجموعے کا نام ''دیوان'' ہے۔ غزل گیارہ یا تیرہ یا پندرہ مختلف بحر کے ہم قافیہ اشعار پر مشتمل ہوتی ہے۔

''دیوان'' کے ذیلی عنوانات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حافظ کی وفات سے لگ بھگ بیس برس قبل ترتیب دیئے گئے۔ ان عنوانات میں عشق، خمریات، فطرت اور روحانیت وغیرہ شامل

ہیں اور اکثر ناقدین کے مطابق انہوں نے ان تمام استعارات کو علامات تصوف کے طور پر استعمال کیا ہے۔ حافظ سے منسوب کئی ''دیوان'' دیکھنے میں آتے ہیں جن میں تعداد، شعروں کی ترتیب حتیٰ کہ شعروں کے الفاظ تک کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کے قدیم ترین نسخوں میں پانچ ہزار کے قریب غزلیں شامل ہیں۔ حافظ کو فارسی کا بہترین غزل گو شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف مشرق بلکہ مغرب میں بھی بہت زیادہ عزت پائی۔ گوئٹے جیسا عظیم یورپی شاعر بھی ان کے مداحین میں شامل تھا۔ ان کا مقبرہ شیراز میں ہے۔

حج بیت اللہ

دین اسلام کا ایک رکن جو ہر صاحب حیثیت مسلمان پر فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے ذریعے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ اگر وہ استطاعت رکھتے ہوں تو زندگی میں ایک بار حج ضرور کریں۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر کسی کے پاس زادسفر موجود ہے، اس پر قرضے کا بار نہیں اور وہ گھریلو ذمہ داریوں سے بھی آزاد ہے تو وہ حج کر سکتا ہے۔ یہ فریضہ اسلامی سال کے بارھویں مہینے یعنی ذی الحجہ میں ادا کیا جاتا ہے۔ حج کیلئے مکہ شریف سے ایک خاص فاصلے پر ایک خاص قسم کا لباس جسے احرام کہا جاتا ہے اور جو دو ان سلی سادہ سفید چادروں پر مشتمل ہوتا ہے، پہننا لازم ہے۔ احرام باندھنا حضرت ابراہیمؑ کی سنت ہے۔ حاجی احرام کی ایک چادر کو تہمد کی طرح باندھتے ہیں اور دوسری چادر کندھوں پر اوڑھ لیتے ہیں۔ خواتین کیلئے چہرے کے سوا پورے سر کو اچھی طرح ڈھانپنا ضروری ہے۔ خواتین کیلئے چہرہ اور مردوں کیلئے سر ڈھانپنا ممنوع ہے۔

حج کی ادائیگی کے وقت مسلمان حضرت ابراہیمؑ کی سنت کی پیروی میں مختلف مناسک ادا کرتے ہیں۔ ان مناسک میں کعبۃ اللہ کا سات مرتبہ طواف سب سے اہم ہے۔ کعبہ شریف پر سیاہ غلاف چڑھا ہوا ہے اور اس کے پہلو میں ایک کالا پتھر نصب ہے جسے عربی میں ''حجر اسود'' کہا جاتا ہے۔ حجر اسود کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ جب جنت سے نکلتے وقت حضرت آدمؑ کو دیا گیا تھا تو اس کا رنگ سفید تھا۔ اس پتھر کو مس کرتے اور چومتے وقت حاجی دل میں یہ تصور کرتے ہیں کہ ان کے گناہ اس میں جذب ہو رہے ہیں۔ اس کے سیاہ ہونے کی وجہ یہی گناہ ہیں جو یہ صدیوں سے اپنے اندر جذب کرتا آ رہا ہے۔ حجر اسود فی الحقیقت چاندی کی پتری سے آپس میں جڑے تین پتھر کے ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ کعبہ کو کئی بار تباہ اور پھر نئے سرے سے تعمیر کیا گیا۔ قبل اسلام کے دور میں کفار نے اس میں پوجا کیلئے بت نصب کر رکھے تھے۔ حضرت آدمؑ نے اسی جگہ خدا کا پہلا گھر تعمیر کیا تھا اور پھر اسی جگہ حضرت ابراہیمؑ نے کعبۃ اللہ کی تعمیر کی۔

http://muftbooks.blogspot.com/

جب حضرت ابراہیمؑ اپنی بیگم بی بی حاجرہ کو مکہ چھوڑ کر گئے تھے تو وہ اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کیلئے پانی کی تلاش میں چکر لگاتی رہیں اور پھر اللہ کی قدرت سے ننھے اسماعیل کی ایڑیوں کے رگڑنے کی جگہ پر صاف اور شیریں پانی کا چشمہ جاری ہوگیا۔ جسے ءچاہ زم زم کہا جاتا ہے۔ خدا کی ان جلیل القدر ہستیوں کے عمل کی پیروی میں حاجیوں کو دو پہاڑیوں صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا (جسے سعی کہتے ہیں) اور پھر آب زم زم بھی نوش کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد حاجی ذی الحجہ کی نو تاریخ کو میدان عرفات کیلئے روانہ ہوتے ہیں جہاں پہنچ کر وہ عصر کی نماز ادا کرتے ہیں اور پھر اپنے رب کے حضور گڑگڑا کر دعائیں مانگتے ہیں۔ اس موقع پر توبہ و استغفار کرنے سے آدمی گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں حضرت آدمؑ نے اپنے پروردگار سے اپنی نافرمانی کی معافی مانگی تھی اور بی بی حوا سے دوبارہ وصال کی دعا کی تھی۔ اس کے بعد حاجی سورج غروب ہونے سے ذرا قبل مزدلفہ روانہ ہو جاتے ہیں جہاں جا کر وہ کنکریاں جمع کرتے ہیں جو وہ اگلے دن منیٰ کے مقام پر شیطانوں کو مارنے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ منیٰ میں شیطان علامتی طور پر تین پتھروں کی صورت میں نصب ہیں اور انہیں کنکریاں مارنے کا عمل جمرات کہلاتا ہے۔

دسویں ذی الحجہ کو حاجی اسی مقام پر جانوروں کی قربانی دیتے ہیں۔ یہ قربانی بھی حضرت ابراہیمؑ کی یاد تازہ کرنے کیلئے دی جاتی ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کے حلق پر چھری چلا دی تھی لیکن اللہ کے حکم سے فرشتوں نے حضرت اسماعیلؑ کی جگہ ان کی چھری کے نیچے ایک دنبہ رکھ دیا تھا۔ لیکن عیسائیوں کی مقدس کتاب بائبل کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے اپنے دوسرے بیٹے حضرت اسحاقؑ کی گردن پر چھری چلائی تھی۔ ہر سال پندرہ لاکھ سے زیادہ فرزندان توحید حج ادا کرتے ہیں۔ جو لوگ حج کیلئے مکہ مکرمہ نہیں جاتے وہ اپنے گھروں میں رہ کر ہی قربانی کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور قربانی کے گوشت کو غریبوں، ناداروں اور اپنے عزیز و احباب میں تقسیم کرتے ہیں۔ قربانی کے بعد حاجی مکہ واپس آ کر ایک مرتبہ پھر کعبے کا اختتامی طواف کرتے ہیں، اپنے سر منڈھوا لیتے ہیں اور احرام کھول دیتے ہیں جس سے حج کے مناسک مکمل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اکثر حاجی اپنی مرضی سے روضہ رسولؐ کی زیارت کیلئے مدینہ منورہ روانہ ہو جاتے ہیں۔

حدیث

آنحضورﷺ کے ارشادات، اسلام کے مطابق حضرت محمدﷺ کا ہم تک پہنچنے والا ہر قول و فعل حدیث ہے اور یہ مسلمانوں کیلئے قرآن کے بعد دوسرا بڑا سرچشمہ ہدایت ہے۔ قرون اولیٰ

http://muftbooks.blogspot.com/

کے مختلف خطوں میں بسنے والے مسلمانوں کیلئے قرآن پاک کی ہر بات سمجھنا ممکن نہ تھی، لہٰذا انہیں کسی اور ایسے ماخذ کی جستجو ہوئی کہ جو قرآنی احکامات کی تصریح زیادہ واضح انداز سے کر سکے۔ لہٰذا لوگوں کی توجہ ان روایات کی طرف پھرنے لگی جن میں حیات مبارکہ اور نبی ﷺ کے اقوال کا بیان تھا۔ ہر حدیث کے شروع میں نبی ﷺ کے اس صحابی یا راوی کا نام بھی لف کیا جاتا ہے جس نے ان کی بات کو آگے پہنچایا اور وہ احوال بھی بیان کیے جاتے ہیں جنہوں نے آنحضور ﷺ کو یہ بات کہنے پر مائل کیا۔ اس کے بعد حدیث کے اصل الفاظ آتے ہیں۔ لہٰذا حدیث سنت رسولؐ اور ان کے اسوہ مبارکہ کے احوال کی زبانی ترسیل کا دوسرا نام ہے۔ علم الحدیث پر قرون وسطیٰ سے ہی بہت کام ہوتا رہا ہے۔ محدثین نے مختلف احادیث کی صحت کے بارے میں جاننے کیلئے ان کے راویوں اور پھر ان راویوں کے راویوں جن کا سلسلہ نبی پاکؐ کی اپنی ذات تک پہنچ جاتا ہے، کے کردار و شخصیت کی جانچ پڑتال کی اور اس کی بنیاد پر ہم تک پہنچنے والی مختلف احادیث کی درجہ بندی کی۔ اس عمل کے دوران جب مختلف شخصیات پر تحقیق کی گئی تو اس سے ایک نیا سوانحی ادب بھی وجود میں آنا شروع ہو گیا۔

نویں صدی میں آکر مسلمانوں میں شریعت اسلامی کو ایک منظم انداز سے پیش کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ لہٰذا آزمائش کی کسوٹی پر پوری اترنے والی احادیث کو مدون کر کے انہیں چھ بڑے مجموعوں میں منضبط کیا گیا جنہیں صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔ حضورؐ کے صحابی ابو ہریرہؓ کو سب سے زیادہ احادیث کا راوی بتایا جاتا ہے اور ''مشکوٰۃ شریف'' اور وسطی ایشیا کے ممتاز عالم دین امام بخاری کی مدون کردہ ''صحیح بخاری'' کو حدیث کی کتابوں میں سب سے بلند مقام حاصل ہے۔

حسیدیت

ایک یہودی سماجی و مذہبی تحریک۔ یہ تحریک اٹھارھویں صدی کے اواخر میں مشرقی یورپ میں شروع ہوئی اور کرشماتی قیادت، تصوف اور باہمی طور پر انتہائی مربوط قومی زندگی اس کے بڑے خواص تھے۔ اس نے پولینڈ اور لتھوینیا کے بٹوارے اور مذہبی بحرانات (جھوٹی قبالہ اور مسیحائی تحاریک) کے ذیلی دور میں جنم لیا۔ اس تحریک کا بانی بعل شیم توف تھا جس نے اس کا بنیادی لب و لہجہ متعین کیا۔ اس میں روزمرہ زندگی کے تقدس اور اس عقیدے پر زور دیا گیا کہ بہت زیادہ نفس کشی اور نفی ذات مذہبی زندگی کیلئے لازم نہیں۔ 1760ء میں بعل کے انتقال کے بعد یہ تحریک ٹوٹ کر متعدد دھڑوں میں بٹنا شروع ہو گئی اور کئی پیشوا منظر عام پر آ گئے۔ مختلف حسیدی گروپوں کے درمیان جب فاصلوں میں اضافہ ہوا تو تحریک کی مرکزیت کمزور پڑنا شروع ہو گئی اور یہ گروہ

http://muftbooks.blogspot.com/

پولینڈ، روس، بالٹک اور آسٹریا میں بکھرتے چلے گئے اور ایک حسیدی جماعت اسرائیل میں بھی وجود میں آ گئی۔ نتیجتاً حسیدیت نے کئی مختلف طرح کے تصورات اور ثقافتوں کو اپنے اندر سمولیا۔ اس جماعت کی قیادت نسل در نسل خاندانی طور پر آگے منتقل ہوتی رہی اور گاہے گاہے ایسا بھی ہوا کہ مختلف خاندانوں اور سلسلوں کے درمیان کشیدگی نے بڑھ کر بڑے تصادم کی شکل اختیار کر لی۔

حسدیت کی اس قدر مقبولیت کے باوجود اس فرقے کو آرتھوڈوکس یہودیت کے بین بین اپنی بقا کیلئے بڑی جدوجہد کرنا پڑی۔ حسیدیت کو بہت زیادہ تنقید کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ مخالفین نے اس کے قائدین کے معجزوں اور کرامات کو شعبدہ بازی قرار دینا شروع کر دیا اور حسیدی دعا کو تالمودی اور روایتی طور پر قوی یہودی علم کے استرداد کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ حسیدیت نے انیسویں صدی میں اس کی قیادت کو کہیں تیسری پشت تک جا کے بقیہ یہودی دنیا میں تسلیم کیا جانے لگا۔ لیکن وہ بھی طوعاً کرہاً کو لیکن اس مرحلے پر آ کے بھی حسیدیت کے کردار میں تبدیلی کا عمل جاری رہا بالخصوص متذکرہ صدی کے آخری عشروں میں یہودیوں کی مغربی یورپ اور امریکہ وسیع پیمانے پر ہجرت کے بعد۔ حسیدیت کا آغاز تو ایک روحانی تحریک کے طور پر ہوا تھا لیکن انیسویں صدی کے اواخر میں جا کر یہ ایک آرتھوڈوکس اور سیکیولر معاشرتی ڈھانچے میں ڈھل گئی۔ حسیدی جماعتوں نے جدیدیت کی قوتوں کو روکنے (یا کم از کم ان کی رفتار کو کم کرنے) کیلئے خود کو الگ تھلگ کرنا شروع کر دیا۔ حسیدیت نے اشتراکیت اور صہیونیت جیسے ان تصورات کو مسترد کر دیا جو کہ یہودیت کے چہرے مہرے میں تبدیلی پیدا کر رہے تھے اور ایک حیران کن حد تک مختصر عرصے میں اس نے ایک متحرک تحریک سے تبدیل ہو کر قدامت پسندی کے قلعے کی شکل اختیار کر لی۔ 1918ء میں دوسری عالمی جنگ کے انجام پر پہنچ کر حسیدی عملی طور پر وہ واحد یہودی تھے جو اپنے روایتی لباس، زبان اور تعلیم کو برقرار رکھے ہوئے تھے۔

ہلکّا:

یہودیوں کے دینی و دنیوی معاملات پر محیط نظام قوانین۔ یہ ایک عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ''طریق'' ہے۔ یہ قوانین بائبل کی پہلی پانچ کتب یعنی تورات کی تکمیل کے زمانے سے ارتقاء کو پہنچے ہیں۔ روایتاً انہیں حضرت موسیٰ پر خدا کی طرف سے جبل سینا پر نازل ہونے والی وحیوں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ہلکّا قانونی معاملات سے متعلق ہیں اور ان میں تاریخ، ادب اور اخلاقی تعلیمات شامل ہیں۔

ہلکّا کے پانچ مآخذ بتائے جاتے ہیں۔ ان میں سے پہلا ماخذ تو موسیٰ علیہ السلام کے وہ

http://muftbooks.blogspot.com/

613احکامات ہیں جن پر تحریری قانون مبنی ہے۔ دوسرا ماخذ قبالہ یا روایتی بیانات ہیں جو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ قبالہ کے مآخذ چونکہ غیر دستاویزی ہیں اس لئے اس کے مستند ہونے پر بعض لوگ شک وشبہے کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ تیسرا ماخذ زبانی قانون ہے جو یا تو (تحریری قانون کی) ان تفاسیر پر متشکل ہے جو موسیٰ پر جبل سینا پر نازل کئے گئے تھے اور یا وہ موخر استخراج کی پیداوار ہیں۔ چوتھا ماخذ اولیاء کے ملفوظات ہیں جنہیں derabbanan کہا جاتا ہے۔ اولیاء کی اتھارٹی تالمود کے فرمودات سے ماخوذ ہے جو انہیں یہ اختیار تفویض کرتی ہے کہ اگر وہ کسی حلقے کو ضرر رساں یا زمانے کے تقاضوں کے منافی پائیں تو اسے معطل کر دیں یا اس میں تبدیلی کر دیں۔ پانچواں ماخذ اداج کا ہے۔ کسی شخص کیلئے کوئی ایسی حد مقرر کرنا کہ لوگوں کی اکثریت جس کا اتباع نہ کر سکے خلاف شریعت ہے۔ اگر ہلکخا میں کوئی ابہام ہو تو رواج سے رجوع کیا جاتا ہے اور اس کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے کیونکہ تصور یہ ہے کہ قوم بہ حیثیت مجموعی غلطی کا ارتکاب نہیں کر سکتی۔

پانچویں صدی کے آخر میں اس کے ''اختتام'' کے وقت سے ہلجّا کو یہودی شریعت کے معاملے میں حرف آخر تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ اس کا اتباع آہستہ آہستہ بہت مشکل ہو گیا تھا لیکن پھر ایک ہسپانوی یہودی جوزف کارو (1487ء تا 1575ء) نے ایک جامع کتاب بیت یوسف سے اس مسئلے کا حل نکالا۔ چھاپہ خانے کی ایجات پر بیت یوسف کی ملخص شکل شلحان آروخ (1565ء) تمام اہل یہود تک پہنچ گئی۔ لیکن چونکہ تعلق سپین سے تھا یہ کتاب ہسپانوی مکاتب قانون کی حمایت کرتی نظر آتی ہے لہٰذا جرمن یہودیوں نے ماپا کا اضافہ کیا۔ حلقہ کا ارتقار دعمل کے ادب کی صورت میں آج بھی جاری ہے جو یہودی رسوم وروایات کو اس جدید دنیا میں برقرار رکھنے کے چیلنج کا جواب مہیا کرتا ہے۔

یہودی حلقہ کو خدا کا کلام سمجھ کر احترام دیتے ہیں لیکن ان کی روزمرہ زندگیوں پر اس کے حتمی اطلاق کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ آرتھوڈوکس یہودی حلقہ کی تمام معاملات میں سختی سے پیروی کرتے ہیں لیکن اصلاح پسند جماعتوں کے لوگ عملی قانون کے معاملے میں حلقہ کے من وعن اتباع کو ضروری نہیں سمجھتے تاہم وہ اس کے اخلاقی تصورات پر عمل ضرور کرتے ہیں۔ قدامت پسند یہودیوں کا رویہ متذکرہ بالا دونوں مکاتب کے بین بین ہے۔ وہ روایتی حلقہ اور دور جدید کے حالات کے درمیان مفاہمت کی کوشش کرتے ہیں۔

خاتون متغیر

http://muftbooks.blogspot.com/

ایک نیوہودیوی۔ اسے ارضی خاتون بھی کہا جاتا ہے۔ پہلے لڑکے (خیال) اور پہلی لڑکی (گویائی) کی بیٹی خاتون متغیر کا شمار سب سے زیادہ مہربان اور قابل تعظیم دیویوں میں ہوتا ہے۔ وہ حیات نو، تجدید اور احیا کی علامت متصور ہوتی ہے۔ خاتون متغیر کو تمام نیوہو باشندوں کی ماں اور چاروں ابتدائی قبیلوں کے سروں کی خالق تصور کیا جاتا ہے۔ اسے نیوہو باشندوں کی محافظ بھی خیال کیا جاتا ہے۔ وہ انھیں بیماری سے بچاتی ہے اور انھیں خوراک اور سر چھپانے کے لیے چھت دیتی ہے۔ نیوہو عقیدے کے مطابق وہ زندگی کی خالق ہے اور اس کی روح ارض زندہ کے قلب میں بستی ہے۔

خلیفہ

اسلامی دنیا کا مرکزی رہنما۔ عربی زبان میں خلیفہ جانشین یا نائب کو کہتے ہیں۔ خلیفہ کا لقب آنحضورؐ کے وصال سے لے کر بیسویں صدی کے آغاز میں اس ادارے کے خاتمے تک مسلمانان عالم کے سب سے بڑی سیاسی و مذہبی قائد کے لیے استعمال ہوتا رہا۔ رسولؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ بالترتیب پہلے، دوسرے، تیسرے اور چھوتھے خلیفہ بنے۔ انھیں خلفائے راشدین بھی کہا جاتا ہے۔

اہل سنہ کے مطابق رسول اللہؐ نے بیماری کی حالت میں اپنے آخری ایام میں حضرت ابوبکر صدیقؓ (خلافت 34-632) کو مسجد نبوی میں مسلمانوں کی امامت کے فرائض سنبھالنے کو کہا تھا اور وہی حضورؐ کے بعد پہلے خلیفہ بنے۔ تاہم شیعہ حضرات خلفائے راشدین کی اس ترتیب سے متفق نہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ پہلے خلیفہ ہونے کا حق حضرت علیؓ (خلافت 61-656) کا تھا۔ حضرت علیؓ بعد میں دوسرے اور تیسرے خلیفہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے بعد چوتھے نمبر پر خلیفہ بنے۔ خلفائے راشدین کے عہد کو اسلامی تاریخ کا ایک مثالی دور قرار دیا جاتا ہے۔ تاہم ان چاروں خلفاء راشدین میں سے تین کو ان کے دور اقتدار میں شہید کیا گیا۔ عمرؓ 634ء میں، عثمانؓ 656ء میں اور علیؓ 660ء میں۔ حضرت علیؓ کے بعد ان کے مخالف اموی (اقتدار 661-750) برسر اقتدار آئے۔ انھوں نے دارالخلافہ دمشق منتقل کر لیا اور خلافت کے ادارے کو خاندانی ملوکیت میں بدل دیا۔ ان کے دور اقتدار میں اسلامی سلطنت مراکش سے لے کر بخارا تک پھیل چکی تھی۔

امویوں کا تختہ عباسیوں (اقتدار 750ء-1258ء) نے الٹا جو نبی کریمؐ کے چچا حضرت عباس کی آل سے تھے۔ انھوں نے بھی امویوں کی طرز کی خلافت قائم کی لیکن دمشق کی بجائے

بغداد کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ دور عباسیہ میں اسلامی سلطنت کئی ریاستوں میں بٹ گئی اور ان کے حکمران مرکزی خلیفہ کی بس زبانی کلامی اطاعت کرتے رہے۔ جب منگولوں نے 1258ء میں اسلامی سلطنت کو تاراج کیا تو انھوں نے خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ اس موقع پر سینتیسویں عباسی خلیفہ کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا اور بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ جب نویں صدی میں بغداد کی مرکزی خلافت کمزور پڑنا شروع ہوئی تو ہسپانیہ، مصر اور بعد میں ترکیہ اور ہندوستان میں بھی خودمختار حکومتیں وجود میں آ گئیں۔ سیاسی تجزیہ کار خلافت کے اس زوال کا سبب طاقت کے مذہب سے جدا ہونے کو قرار دیتے ہیں۔ 3 مارچ 1924ء کو ترک جمہوریہ کے قیام کے چند ماہ بعد ادارۂ خلافت کے خاتمے کے اعلان کو ہم مسلم اُمّہ کے اتحاد و مرکزیت کے خاتمے کی علامت تعبیر کر سکتے ہیں۔ بعد میں بھی ادارۂ خلافت کی بحالی کے لیے کوششیں ہوتی رہیں لیکن مختلف وجوہ کی بناہ پر ایسا نہ ہو سکا۔

خمینی، آیت اللہ روح اللہ (1900ء۔1989ء)

ایران کے ایک معروف مذہبی رہنما۔ آیت اللہ خمینی نے فرانس میں جلاوطنی کی زندگی میں رہ کر انقلاب ایران کے لئے کام کیا اور 1979ء میں شہنشاہ رضا شاہ پہلوی کا تختہ الٹنے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ ان کا خاندان نام ہندی تھا۔ خمینی ان کا نام وسطی ایران کے ایک قصبے خمین کی نسبت سے پڑا جہاں وہ پیدا ہوئے۔ خمینی حباب کے مطابق ان کے ابا کو رضا شاہ نے قتل کروا دیا تھا جس کے بعد ان کی پرورش ان کے بڑے بھائی نے کی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ پہلوی خاندان کے خلاف نفرت ساری عمر ان کے ساتھ رہی۔ انہوں نے دینی مدارس سے تعلیم حاصل کی اور پھر خود بھی مذہب اور فلسفے کے استاد بن گئے۔ کہتے ہیں کہ وہ یونانی فلسفی افلاطون کی کتاب ''جمہوریہ'' کے بڑے مداح تھے اور وہ ایک مثالی ریاست اور فلسفی بادشاہ کے تصور سے بھی بڑی رغبت رکھتے تھے۔ (لیکن اسے اسلامی شکل دے کر)۔

خمینی شیعہ اسلامی بنیاد پرستی کے بہت بڑے حامی تھے۔ انہیں آیت اللہ کا لقب 1950ء کے عشرے میں ملا۔ وہ رضا شاہ کی مغرب زدگی، اس کی مغرب نواز پالیسیوں اور مذہبی حلقوں پر اس کی حکومت کی طرف سے کئے گئے جبر کے کھلم کھلا مخالف تھے۔ خمینی کی حکومت پر اس سرعام تنقید کے سبب انہیں کئی بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں اور انجام کار 1964ء جب انہیں ملک بدر کر کے عراق بھیج دیا گیا۔ لیکن جب خمینی وہاں بھی کلمہ حق کہنے سے باز نہ آئے تو انہیں عراق سے بھی نکال دیا گیا اور وہ اپنی دوسری اہلیہ کے ساتھ پیرس کے قریب جا بسے۔ خمینی فرانس میں قیام کے دوران بھی بہت سرگرم رہے اور ایران میں شاہ مخالف مذہبی عناصر کی مسلسل

http://muftbooks.blogspot.com/

رہنمائی کرتے رہے۔ان کی تقاریر کی کیسٹیں تیار کر کے انہیں چوری چھپے ایران پہنچایا جاتا تھا اور پھر انہیں وہاں اسلامی انقلاب کے حامیوں کو سنایا جاتا تھا۔انہوں نے اکتوبر 1978ء میں عام ہڑتال کا اعلان کیا جس سے ایران میں تیل کے کنویں بند ہو گئے اور کچھ ہی عرصے میں سارا ملک جلسے جلوس اور بلووں کی لپیٹ میں آ گیا اور بالآخر رضا شاہ کو جنوری 1979ء میں ملک سے فرار ہونا پڑا۔

خمینی فروری میں انقلاب کی کمان اپنے ہاتھ میں لینے کیلئے جلا وطنی ترک کر کے ایران لوٹے۔شاہ نے بادشاہت سے دستبردار ہونے سے انکار کر دیا جس پر اپریل کے مہینے میں ملک میں استصواب رائے کروایا گیا جس کے نتیجے میں ایران اسلامی جمہوریہ بن گیا۔خمینی کوئی صدر یا وزیر اعظم تو نہ بنے مگر ان کے جیتے جی سارے ملک کی باگ ڈور عملاً انہی کے ہاتھ میں رہی۔ انہوں نے عہدے قبول کرنے سے انکار کر کے شہر قُم میں سکونت اختیار کر لی لیکن تمام اہم قومی معاملات کا حتمی فیصلہ وہی کیا کرتے تھے۔انہوں نے مقتدر انقلابی کونسل کے اراکین مقرر کر کے شاہ کے سینکڑوں حامیوں کو سزائے موت دینے کا حکم صادر کیا۔نومبر میں انقلابیوں نے تہران میں واقع امریکی سفارتخانے پر قبضہ کر لیا اور یہ اعلان کیا کہ وہ چھیاسٹھ امریکی یرغمالیوں کو صرف اس صورت میں رہا کریں گے کہ اگر شاہ کو مقدمے کا سامنا کرنے کیلئے ایران کے حوالے کیا جائے۔ تاہم شاہ نے مصر میں پناہ لے لی جہاں وہ 1980ء میں انتقال کر گیا۔امریکی صدر جمی کارٹر (حکومت 81-1977ء) کے بھیجے ہوئے کمانڈوز نے یرغمالیوں کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے۔ یہ یرغمالی جنوری 1981ء میں اس وقت رہا ہوئے جب رونالڈ ریگن (حکومت 89-1981ء) امریکی صدارت کا حلف اٹھا رہے تھے۔

ستمبر 1980ء میں عراقی صدر صدام حسین نے ایران کی سیاسی خلفشار سے فائدہ اٹھانے کیلئے اپنی افواج کو شمالی ایران پر حملے کا حکم دے دیا۔ایرانی فوج جس کی قیادت پاسبان انقلاب کر رہے تھے، نے اس عراقی جسارت کا دندان شکن جواب دیا اور 1982ء میں بالآخر عراق کو امن معاہدے کی کوششوں پر مجبور کر دیا۔لیکن اب ایران کی باری اور خمینی صدام حسین (جس کی مدد خفیہ طور پر امریکہ کر رہا تھا) کی حکومت کو گرانا چاہتے تھے۔لہٰذا یہ جنگ 1988ء تک جاری رہی اور پھر کہیں جا کر دونوں ملک اقوام متحدہ کے جنگ بندی کے ایک معاہدے پر متفق ہوئے اور وہ بھی اس لیے کہ اس کے طویل جنگ میں دونوں کے ان گنت سپاہی مر چکے تھے اور دونوں کی معیشتیں تباہی کے کنارے پر پہنچ چکی تھیں۔اس جنگ بندی کے ایک برس بعد خمینی اس دنیا سے

http://muftbooks.blogspot.com/

کوچ کر گئے۔

خوجہ

ہندوستان کا ایک اسلامی فرقہ۔ فارسی زبان میں خوجہ کا مطلب ''آقا'' یا ''سردار'' ہے۔ خوجوں کا تعلق نزاری اسماعیلیہ فرقے سے ہے جس کے روحانی پیشوا آغا خان ہیں۔ انہیں شام، ایران اور وسطی ایشیا میں ''اساسین'' اور پاکستان اور بھارت میں ''خوجے'' کہا جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ اساسین کا لفظ خواجوں کے اس عقیدے سے بنا ہوگا کہ دشمنوں کو قتل کرنا ہمارا مذہبی فریضہ ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے بلکہ یہ لفظ حشاشین، یا حشیشین سے ماخوذ ہے کیونکہ وہ شہادت کے مشن پر جانے سے پہلے فدائیوں کے دماغ میں حشیش کی مدد سے ایسے وجد آور رویا پیدا کرتے تھے جن سے انہیں یہ گمان ہوتا تھا کہ جیسے وہ جنت میں پہنچ گئے ہیں۔ (اثنا عشری مسلک کے اور تھوڑے سے وہ سنی مسلمان جو خود کو خوجے کہلاتے ہیں آغا خان کے پیروکار نہیں)۔

نزاری اسماعیلیہ فرقے کی بنیاد گیارہویں صدی میں حسن بن صباح نے رکھی تھی جو اپنے مریدوں میں ''پہاڑوں کا بوڑھا'' کے نام سے معروف تھا۔ یہ فرقہ تیرہویں صدی میں اس وقت تک طاقتور رہا جب مغلول حملہ آوروں نے ان کے ٹھکانوں کو قبضے میں لے لیا تھا۔

خوجوں کی مذہبی رسوم اور روایتی اسلامی عبادات میں کوئی زیادہ فرق نہیں ماسوائے اس کے کہ وہ اپنی ذات کی حدود و قیود پر اب بھی بہت سختی سے کاربند ہیں۔ خوجے نسبتاً مالدار لوگ ہیں اور اپنے ہم مسلک بھائیوں کی تعلیم اور ادبی کاموں پر بہت سا وقت صرف کرتے ہیں۔

د

دانتے، الغیری (1265ء۔1321ء)

اٹلی کا سب سے بڑا شاعر۔ دانتے فلورنس کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا لیکن 1301ء میں اسے پوپ پر تنقید کی پاداش میں جلاوطن کر دیا گیا۔ اس کی بیشتر شاعری اور نثر پر اس کی سیاسی دل چسپیوں کی چھاپ نمایاں ہے لیکن اس سے اس کی تخلیقات میں موجزن جذبے اور روحانیت کا رنگ پھیکا نہیں پڑا۔ دانتے نے بچپن سے ہی شعر لکھنا شروع کر دیے تھے اور ان فرانسسکن مدارس میں جا کر جہاں اس نے تعلیم حاصل کی اس کا یہ شوق اور بھی پروان چڑھا۔

http://muftbooks.blogspot.com/

اسے سسیرو جیسے قدیم لکھاریوں اور تھامس ایکویناس جیسے ازمنہ وسطی کے مفکرین اور ان کے افکار کا بڑا گہرا علم حاصل تھا جن کے اثرات اس کی نگارشات میں جابجا نظر آتے ہیں۔ تاہم اس کی زندگی نے سب سے زیادہ اثر بیاطریچے سے ملاقات سے قبول کیا جس کا تعلق فلورینس کے ایک بڑے گھرانے سے تھا اور جس کے لیے وہ ساری عمر چھپ چھپ کے آہیں بھرتا رہا۔ اس کا یہ عشق دانتے کی مختلف تخلیقات میں ایک مرکزی کردار ادا کرتا نظر آتا ہے۔

حیات نو 1576ء، ضیافت 1490ء، درمعنیٔ شہنشاہیت 1559ء اور الوہی طربیہ 1472ء کا شمار دانتے کی معروف ترین تخلیقات میں ہوتا ہے۔ ''حیات نو'' نثر اور شاعری کا ایک مجموعہ ہے جس میں دانتے بیاطریچے سے ملاقات کے بعد کی اپنی زندگی کے احوال بیان کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ اس ملاقات نے اس کی زندگی کی کیسے کایا کلپ کر کے رکھ دی تھی۔ ''ضیافت'' نسبتاً ایک زیادہ فلسفیانہ نظم ہے جس میں اس نے مقامی زبان کو ادبی لغت کے طور پر بڑے خوبصورت طریقے سے استعمال کیا۔ اس نصب العین کو جس نے مغرب کی ادبی ثقافت میں انقلاب برپا کر دیا، بعد کے عہد میں احیائے علوم کے بہت سے تخلیق کاروں نے بھی اپنائے رکھا۔ ''درمعنیٰ شہنشاہیت'' میں وہ مذہب اور ریاست میں علیحدگی پر زور دیتا اور یہ مؤقف اختیار کرتا نظر آتا ہے کہ چرچ میں دکھائی دینے والی خرابی اس کے سیاسی عزائم کا شاخسانہ ہے۔ ''الوہی طربیہ'' جسے اس نے اپنے آخری ایام میں مکمل کیا، کا شمار قرون وسطیٰ کے آخری دور کی عظیم ترین کلاسکس میں ہوتا ہے۔ اس میں بھی وہ بیاطریچے کے لیے اپنے عشق و محبت اور روحانی زندگی کے لیے اپنی جستجو کا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔ یہ نظم تین حصوں دوزخ، برزخ اور جنت پر مشتمل ہے اور ان میں قاری اس تینوں مقامات کا ایک تخیلاتی سفر طے کرتا ہے۔ بیاطریچے ایک ماورائی ہستی کے روپ میں معروف آنجہانی شاعر ورجل کے ذریعے دانتے اور نظم کے قاری کی اس سفر میں رہنمائی کا کام لگاتی ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ''الوہی طربیہ'' دانتے کی مذہبی رہنماؤں پر تنقید اور اس کی مغربی تاریخ، مذہب اور ثقافت پر گرفت کی عکاسی کرتی ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری کے بعض حصوں پر اس شاعر کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

دلائی لامہ چہاردہم (1935ء)

اہل تبت کا روحانی پیشوا۔ وہ چین کے صوبے شنگھائی میں پیدا ہوئے لیکن ان کے والدین کا تعلق تبت سے تھا۔ وہ تبتی بدھ مت کے ''آئندہ بدھ'' کے مقام پر 1939ء میں فائز ہوئے۔ جب 1949ء میں عوامی جمہوریہ چین کا قیام عمل میں آیا تو شروع میں دلائی لامہ نے حکومت کی

http://muftbooks.blogspot.com/

حمایت کرتے ہوئے اس بات سے اتفاق کرلیا تھا کہ تبت ایک خودمختار ریاست کے طور پر چین میں شامل ہوگا اور اس کے خارجی امور مرکز کے ذمہ ہوں گے۔ لیکن 1957ء میں تبت میں شورش بپا ہوگئی جسے جلد ہی دبا دیا گیا۔ دلائی لامہ نے بیجنگ حکومت سے قطع تعلقی کا اعلان کر کے تبت کی خودمختاری کا اعلان کر دیا اور خود بھارت ہجرت کر گئے۔ تب سے لے کر آج تک وہ جلاوطنی میں رہتے ہوئے تبت کی آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور چینی قبضے کی پُرامن مزاحمت جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی ان مساعیوں کے صلے میں انھیں 1989ء کا امن کا نوبل پرائز دیا گیا۔

دوستووسکی، فیودور [میخائلووچ] (1821ء۔1881ء)

روسی ناول نگار۔ دوستووسکی ماسکو میں آٹھ بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر پیدا ہوا۔ اس نے اپنی والدہ کے انتقال کے بعد ملٹری انجنئرنگ سکول سینٹ پیٹرزبرگ سے تعلیم مکمل کی اور فوج میں شمولیت اختیار کرلی لیکن ایک ہی سال بعد اس نے فوج سے نفرت کی بنا پر استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد اس نے تصنیف وتالیف کے شعبے میں قدم رکھا۔ فرانسیسی ادیبوں کے ترجمے کیے، اور اپنا پہلا ناول ''غریب لوگ'' (1846ء) تحریر کیا۔ اس کا اگلا ناول ''دوہرا'' (1846ء) اور متعدد افسانے تنقیدی لب ولہجے میں لکھے گئے لیکن وہ مالی طور پر ناکام رہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ مرگی کا مرض جس نے اسے ساری عمر خراب کیا، اسے پہلی بار انھی ایام میں لگا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ اس سے پہلے کی بات ہے، مرگی اسے اس وقت لگی تھی جب اس کے باپ کو اس کے مزارعوں نے اس کے گلے میں متواتر شراب انڈیل کر قتل کیا تھا۔

خیر جو بات بھی ہو دوستووسکی نے 1847ء میں سینٹ پیٹرزبرگ کے جمہوریت نواز دانشوروں کے ایک حلقے، پیترا شسکی سرکل میں شمولیت اختیار کرلی جس کے اجلاس میں اکثر فرانسیسی یوٹوپیائی اشتراکیوں کی تصانیف اور زارحکومت کی ممنوعہ دیگر تحاریر پڑھی جاتی تھیں اور ان پر بحث کی جاتی تھیں۔ 1849ء میں اس گروپ کے اراکین کو گرفتار کرلیا گیا۔ دوستووسکی آٹھ ماہ تک قید رہا جس کے بعد اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے مقتل میں لے جایا گیا اور اسے ڈرانے کے لیے اس کے سر کے اوپر گولیاں چلائی گئیں۔ اس کے بعد دوستووسکی اور اس کے مبینہ ساتھی سازشیوں کو سائبیریا کے مشقتی کیمپوں میں جلاوطن کر دیا گیا۔ اس نے چار سال ان کیمپوں اور بعدازاں چھ سال فوج میں گزرے۔ اس سارے کٹھن دور میں دوستووسکی کو بہت زیادہ بائبل پڑھنے اور روس کے نچلے طبقے کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جن کے حالات کے بارے میں اس نے موخراً بڑے مؤثر انداز سے لکھا اور اپنے دونوں اثرات کو خاص طور پر اپنے ناول ''احمق''

http://muftbooks.blogspot.com/

1868ء میں یکجا کیا۔

دوستووسکی اپنی فوجی ملازمت کے دوران ایک بیوہ ماریہ دیمیتری یوونا آتراایووا سے ملا جس سے اس نے 1857ء میں شادی کر لی۔1859ء میں فوج سے فارغ ہونے کے بعد وہ واپس سینٹ پیٹرز برگ چلا آیا جہاں اس نے دوبارہ لکھنے لکھانے کا کام شروع کر دیا۔اس دور میں اس نے خاندانی دوست (1859ء)، ذلتوں کے مارے لوگ (1861ء) اور مردگاہ کی یادداشتیں (1861ء) تصنیف کیں مغربی یورپ کے متعدد دوروں کے بعد اس نے اپنے بھائی کے نئے جریدے ''زمانہ'' کی ادارت سنبھال لی جس میں ''شذرات از زیرزمین'' (1864ء) پہلی دفعہ منظر عام پر آیا۔اس ناول کو اکثر دوستووسکی کی سب سے عمدہ اور شاندار تخلیق تصور کیا جاتا ہے۔ اسے وجودی تحاریر کا پیش رو قرار دیا جاسکتا ہے جس میں جدیدیت کے حواشی میں پڑے انسان کی تنہائی اور کمینہ ظرفی بیان کی گئی ہے۔دوستووسکی نے یہ ناول اپنی قریب المرگ بیوی کی تیمارداری کے دوران تحریر کیا۔اپنے بھائی کی وفات کے بعد مالی مشکلات کا شکار ہو کر اس نے ''زمانہ'' کو کامیاب بنانے کی کوشش کی لیکن اس کے قدامت پسندانہ جھکاؤ کے سبب بکری نہ بڑھ سکی۔قمار بازی کی لت میں گرفتار دوستووسکی نے ایک بڑی تصنیف ''جرم وسزا'' اس امید سے تیار کی کہ وہ اسے قرضوں کے بوجھ سے نکالے گی۔اس ناول کو 1866ء میں سلسلہ وار شائع کیا گیا۔جواری بھی اسی سال شائع ہوا لیکن چونکہ دوستووسکی مقررہ تاریخ سے بہت پیچھے جا رہا تھا اسے ایک سٹینوگرافر کو ملازم رکھنا پڑا تا کہ وہ بولتا جائے اور وہ لکھتی جائے۔اس عورت اینا گریگوریونا سنتیکنہ سے اس نے 1867ء میں دوسری شادی کر لی۔اگرچہ یہ خاتون کوئی دانشور یا عالمہ نہ تھی،اس کے سنجیدہ ذہن اور اس کی اپنے خاوند کے لیے چاہت نے دوستووسکی میں جوئے کی عادت کم کر دی اور اسے اس کی زندگی کے آخری ربع میں ایک مستحکم خاندانی آدمی میں تبدیل کر دیا۔اس داخلی تغیر کے باوجود دونوں کو 1868ء میں قرض خواہوں سے بچنے کے لیے روس سے فرار ہونا پڑا۔

دوستووسکی نے ''ابدی خاوند'' 1870ء باہر رہتے ہوئے تحریر کیا جس کا شمار اس کے بہترین چھوٹے ناولوں میں ہوتا ہے۔اس نے اپنی آخری تصنیف ''برادر کراماز وف'' کے لیے نوٹس بھی یہیں لینا شروع کیے جو 1880ء میں شائع ہوا۔اس ناول کو دوستووسکی کی بہترین تخلیق خیال کیا جاتا ہے۔''برادر کراماز وف'' میں کہیں کہیں تو ''جرم وسزا'' کی تکرار نظر آتی ہے لیکن اس میں شک، یقین اور امید کے وسیلوں کی تصویر کشی بھی بڑے مسحور کن انداز میں کی گئی ہے۔اس ناول نے بہت زیادہ عوامی وتنقیدی کامیابی حاصل کی اور اپنے خالق کو شہرت دوام بخشی۔

http://muftbooks.blogspot.com/

دہلی

شمال وسطی ہندوستان میں واقع ایک مشہور شہر۔ انگریزوں نے 1912ء میں پرانی دہلی سے چھ میل کے فاصلے پر نئی دہلی کی بنیاد رکھی۔ اس وقت سے نئی دہلی ہندوستان کا دارالحکومت اور انتظامی صدر مقام چلا آتا ہے جبکہ پرانی دہلی کی اپنی معیشت وآبادی کے مرکز کی حیثیت برقرار ہے۔

دہلی صدیوں تک شمالی ہند کا نمایاں تجارتی وکاروباری مرکز رہا ہے۔ بہت سے شہنشاہوں اور سلطانوں نے دہلی اور اس کے قرب وجوار کے خطے میں اپنا پایۂ تخت قائم کیا اور اس علاقے میں اپنے محلات، معبد اور بازار تعمیر کروائے جسے اب ''دہلوی مثلث'' کہا جاتا ہے۔ دہلی اب کلکتے اور ممبئی کے بعد بہ اعتبار آبادی بھارت کا تیسرا بڑا شہر ہے۔

ہندی لوک کہانیوں کے مطابق اس شہر کا نام شروع کے ایک بادشاہ راجہ دِھلو کے نام پر پڑا جو پہلی صدی قبل مسیح میں حکومت کرتا تھا اور شہر کی جگہ بار بار بدلتا رہتا تھا۔ دہلی اور اس کے گردونواح میں واقع قدیم ترین عمارات میں سے ایک سرخ قلعہ بھی تھا جو نئی دہلی کے جدید علاقے کے جنوب میں تین میل کے فاصلے پر اس جگہ واقع تھا جہاں آج کل قطب مینار ایستادہ ہے۔ یہ قلعہ گیارھویں صدی عیسوی میں ایک راجہ انگ پال نے تعمیر کروایا تھا۔

سلاطین دہلی فن تعمیر میں اپنی مثال آپ تھے۔ انھوں نے ہندی اور اسلامی اسالیب کو یکجا کر کے قطب مینار مسجد قوت الاسلام، درگاہ نظام الدین اولیا اور اس سے ملحقہ مسجد اور مقبرہ فیروز شاہ تغلق جیسی یکتائے روزگار عمارات بنائیں۔ لال قلعہ اور دہلی کی جامع مسجد مغلیہ دور کی یادگاریں ہیں۔ سلطنت دہلی کے عہد میں ہندوستانی موسیقی کو بھی بہت عروج ملا۔ مغل بادشاہ اکبر کے عہد (1556ء۔1605ء) میں تو اس نے خاص طور پر بہت ترقی کی۔ تان سین جیسے بڑے گویے جسے جدید ہندوستانی موسیقی کا پردادا تصور کیا جاتا ہے، کا تعلق بھی دربار اکبری سے تھا۔ دربار دہلی سے وابستہ مصوروں نے مقامی فارسی اسلوب میں مصور مسودے اور روایتی تصویری طغرے تخلیق کیے۔ عہد اکبری میں آ کر کتابی مصوری اور منی ایچر نے بطور بنیادی صنف فن دیواری مصوری کی جگہ لے لی تھی۔

1912ء میں برطانوی گُھس بیٹھیے اپنا دارالحکومت کلکتہ سے نئی دہلی لے آئے جس کی تعمیر 1931ء میں جا کے مکمل ہوئی۔ دہلی کی آبادی میں سب سے زیادہ اضافہ 1941ء اور 1951ء کے درمیانی عرصے میں دیکھنے میں آیا جس کی بڑی وجہ بٹوارے کے بعد آنے والا پناہ گزینوں کا

سیلاب تھا۔اب نئی دہلی ایک بین الاقوامی کردار کا حامل شہر بن چکا ہے جس میں جا بجا اس میں بسنے والوں کے مختلف ثقافتی پس منظر کی عکاسی ہوتی دکھائی دیتی ہے۔اس شہر میں اکثریت ہندوؤں کی ہے جبکہ مسلمان بھی اس میں بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ ہندوستان کے بہت سے بڑے ثقافتی ادارے اور کئی اہم یونیورسٹیاں بھی اسی شہر میں واقع ہیں جن میں یونیورسٹی آف دہلی بھی شامل ہے جو1922ء میں بنائی گئی تھی۔

دیکھنے والے کو پرانی اور نئی دہلی کے گلی کوچوں بلکہ بوباس میں بھی بہت فرق محسوس ہوتا ہے۔ پرانی دہلی میں وہی لاہور کے بھاٹی لوہاری جیسے گلی محلوں کا ماحول نظر آتا ہے جبکہ نئی دہلی میں امیر لوگ کشادہ و پرسکون آبادیوں اور کالونیوں میں رہتے ہیں۔دنیا کے دیگر بڑے شہروں کی طرح دہلی بھی روز بروز پھیلتا جا رہا ہے اور نئی دہلی کیا پرانی کیا سب ایک ہو چکا ہے۔

مشہور شعراء امیر خسرو اور اسد اللہ خاں غالب کی تربت بھی اسی شہر میں واقع ہے اور یہ وہی مقام ہے جس کے لٹنے پر میر تقی میر نے کہا تھا:

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں روزگار ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

دیکارت، رینے (1596ء۔1650ء)

فرانسیسی فلسفہ دان۔وہ فرانس کے شہر ہیگمیں پیدا ہوا ایک یسوعی کالج La Flecheسے پڑھا اور اس نے1616ء میں Poitiersسے قانون کی ڈگری حاصل کی۔1618ء میں وہ ہالینڈ چلا گیا جہاں جا کر اس نے مورس آف ناساؤ کی فوج میں شمولیت اختیار کر لی۔اپنی فوج سے وابستگی کے دوران اسے جرمنی کے سفر کا موقع ملا اور اوم کے مقام پر قیام کے دوران اس نے ٹھانی کہ وہ فلسفے اور سائنس کی ریاضیاتی اصولوں کے مطابق تشکیل نو کرے گا۔ سچ مچ وہ بقیہ ساری عمر یہی رہا۔

اول اول دیکارت کی علمی زندگی میں دو اہم واقعے رونما ہوئے۔ پہلے تو1628ء میں شاندو (جس کا خیال تھا کہ سائنس صرف امکانیت پر استوار کی جا سکتی ہے) سے اپنے مشہور مباحثے میں دیکارت نے یہ دلیل پیش کی کہ انسانی علم مطلق ایقانات پر استوار ہونا چاہیے۔دوسرا اس نے1634ء میں اپنا مقالہ مکمل کیا جس میں اس نے نظام شمسی کے بارے میں ایک نظریہ پیش کیا جو کوپرنیکسی نظام کی پیروی کرتا تھا۔لیکن جب اس کے کان میں یہ پڑی کہ چرچ نے گلیلیو سے بہت بری کی ہے اور اسے اپنے نظریات سے توبہ پر مجبور کر دیا ہے تو اس نے اپنی تحریر کو دبا دیا۔ان دونوں لمحات نے دیکارت کے فکر کے تعین میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے: یہ ایک ایسی فکر ہے جو

اس مقولے سے جُڑی ہے کہ سچے مسائل صرف وہی ہیں جن کے بارے میں ہم مطلقاً پر یقین ہوں لیکن یہ چرچ کی طاقت سے بیزار اور فن تحریر پر عائد سیاسی بندشوں کے معاملے میں حساس بھی دکھائی دیتی ہے۔

دیکارت نے جدید ذہن کو کئی طرح سے متاثر کیا۔ ریاضیات میں اس کا بنیادی کام تجزیاتی جیومیٹری کی تخلیق ہے۔ سائنس کے میدان میں دیکارت کے تصور کائنات کو نیوٹن کی طبیعیات نے گہنا دیا مگر دیکارت کے سائنسی منہاج..... کہ پہلے ایک مفروضہ پیش کرو اور پھر تجربی طور پر جمع شدہ حقائق کی بنا پر اس کی تصدیق یا استرداد کرو کو عہد تنویر کے دنوں سے لے کر آج تک سائنسی پریکٹس کے ایک جزو مستقل کی حیثیت حاصل چلی آتی ہے۔ اس نے سب سے زیادہ اثرات فلسفے پر مرتب کیے ہیں۔

دیکارت نے ''بیان بر منہاج'' 1637ء میں فرانسیسی زبان میں شائع کی اور اس نے صرف دانشور طبقے کو ہی نہیں بلکہ پڑھے لکھے عام لوگوں کو بھی پیش نظر رکھ کے لکھی۔ اس کتاب میں اس نے مسئلہ ایقان وتشکیک پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ صداقت کا ایک صحیح تصور صرف اسی صورت میں پیدا ہوسکتا ہے جب سوچ میں مصروف ایک صاف ذہن ایک ایسے نقطے پر پہنچ چکا ہو جہاں کوئی بھی شک ممکن نہ ہو۔ اب دیکارت کو صرف ایک بات کا ہی کامل یقین ممکن تھا کہ صرف شعور کا وجود ہی یقینی ہے جس کا اظہار اس نے اپنے مشہور فقرے ''میں سوچتا ہوں لہٰذا میں ہوں'' میں بھی کیا۔ 1641ء میں شائع ہونے والی اپنی تصنیف ''تاملات بر فلسفہ اولین'' میں تاہم اس نے ہشیاری سے ایک دوسری سچی صراحت کا بھی اضافہ کر دیا کہ خدا موجود ہے کہ ایک کامل واعلیٰ ہستی کا تصور اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ یہ تصور کہ ایک مثلث کے زاویوں کا مجموعہ 180 درجے کے برابر ہوتا ہے۔ دیکارت کی تشکیک کا ایک دوسرا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اس نے ذہن یا نفس بطور انا کو جسم پر فضیلت دے دی۔ ہمیں اس کی 1649ء میں شائع شدہ کتاب ''روح کے جذبے'' میں ملتی ہے اور یہ ہمیں پورے عہد تنویر میں گونجتی ملتی ہے۔

دیکارت نے علمیات اور فلسفۂ ذہن، دونوں شعبوں میں ایسے سوالات اٹھائے جن کا جواب بعد میں آنے والے فلسفیوں کو دینا پڑا۔ علمیات کے میدان میں اس نے لاک، برکلے اور ہیوم کی فکر کو متاثر کیا۔ اگر ہم زیادہ عمومی انداز میں بات کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ دیکارت کا منہاج تشکیک مغربی فلسفے کی صورت گری میں سترہویں صدی سے مدد دیتا چلا آرہا ہے۔ جس ثنویت کا دعویٰ اس نے اپنے فلسفۂ ذہن میں کیا ہے اس کا رنگ ہمیں پورے جدید عہد میں شدومد

سے جھلکتا اور بیسویں صدی کے بعض عظیم فلسفیوں کی تحاریر میں اپنا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔ دیکارت کا انتقال سویڈن میں ہوا جہاں وہ ملکہ کرسٹینا کو فلسفے کی تعلیم دینے پر مامور تھا۔

دیوالی

ایک ہندو تہوار۔ یہ تہوار پانچ دن تک رہتا ہے اور اس کا آغاز ہندی مہینے اسوج (کنوار) کے نصف تاریک کے تیرھویں دن اور انجام کارتک مہینے کے نصف روشن کے دوسرے دن ہوتا ہے جب اکتوبر کی تقریباً آخری تاریخیں گزر رہی ہوتی ہیں۔ یہ لفظ دراصل سنسکرت ''دیپاوالی'' کا بگاڑ ہے جس کا مطلب ''دیوں کی قطار'' ہے۔ اس تہوار کو تاجر طبقے کے نزدیک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسے دولت کی دیوی لکشمی اور بنگال میں کالی دیوی کے نام پر منعقد کیا جاتا ہے۔ اس تہوار کے موقع پر ہندو دیوتا وشنو کی ایودھیہ کے بادشاہ کی حیثیت سے تاجپوشی کی یاد منانے کے لیے بہت سے دیے جلائے جاتے ہیں جنھیں ندیوں، دریاؤں یا مندروں اور مکانوں کی منڈیروں پر رکھ دیا جاتا ہے۔ رام کو وشنو دیوتا کا اوتار تصور کیا جاتا ہے اور ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ وشنو یہ رام کا روپ دھار کر چودہ برس کی جلاوطنی کے بعد اپنا تخت لینے کے لیے واپس آیا۔ اس تہوار کے چوتھے دن کرم تقویم کے نئے سال کا آغاز بھی ہو جاتا ہے۔

دیوالی کے موقع پر لوگ ایک دوسرے کو تحفے تحائف اور ضیافتیں دیتے ہیں، جوا کھیلتے ہیں، اپنے گھروں کا سجاتے ہیں اور دوسروں کے گھروں میں جاتے ہیں۔ جواء بھگوان شیو اور پاربتی کے درمیان کوہ کائلاسا پر کھیلی گئی پانسے کی بازیوں کی یاد میں ہوتا ہے اور ہندو اسے نئے سال میں خوش قسمتی کے حصول کا وسیلہ خیال کرتے ہوئے اس کا خوب اہتمام کرتے ہیں۔ تاجر دیوالی نئے بہی کھاتے شروع کر کے اور پوجا پاٹ کر کے مناتے ہیں۔

یہ تہوار جین مت کے پیروکاروں کے لیے بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ وہ دیوالی اپنے سب سے آخری جین ترتھانکر یا پیشوا کی موت کی یاد میں مناتے ہیں۔ یہ لوگ نروان کی حالت میں مہاویر کے انتقال کو دنیا کے لیے ایک نقصان عظیم خیال کرتے ہیں اور وہ دیپ جلا کر اس نوری علم کی کمی پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اس عظیم گرو کی موت کے سبب فنا ہوا۔

ڈ

http://muftbooks.blogspot.com/

ڈاڈا

بصری فنون اور ادب کی ایک عالمگیر تحریک۔ ڈاڈا کا باقاعدہ آغاز 1916ء میں زیورچ میں اس وقت ہوا جب کچھ نوجوان فنکار اپنے فن اور اس کے فلسفے کے لیے فرنچ جرمن ڈکشنری سے کوئی نام تلاش کر رہے تھے اور دفعتاً ان کی نظر فرانسیسی زبان کے اس لفظ ''ڈاڈا'' پر پڑی جس کا انگریزی میں مطلب Hobbyhorse بنتا ہے۔ جین آرپ (1887ء۔1966ء) اور ٹرسٹن زارا کو اس تحریک کے بانیوں اور رہبروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اہل ڈاڈا کی مشترک چیز جنگ مخالف رویے، بورژوا اخلاقیات پر تنقید اور آرٹ کا فلسفہ بے معنویت تھا۔ فرانسیسی تخلیق کار مارسل ڈوچیمپ (1887ء۔1968ء) کے ریڈی میڈ آرٹ کو اس تحریک کا پیش خیمہ قرار دیا جاتا ہے۔

ڈاڈا کو ایک ایسے مزاج یا فکر کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے جس نے روایتی سماجی اور جمالیاتی معیارات کے خلاف بغاوت کا رویہ اختیار کیا۔ اس نے جہاں آرٹ کے روایتی اسالیب فکر کو ہدف تنقید بنایا وہاں اس نے اس دور کے جدید اظہاری رویوں کو بھی خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ اس تحریک کے مقلدین نے اپنے جذبات کا اظہار ایسی تخلیقات کی صورت میں کیا جن میں وہ منطقی ترتیب و اشکال کی جا بجا خلاف ورزی کرتے نظر آتے ہیں۔ جین آرپ کے ان مرقعوں کو جو بغیر کسی ترتیب پلان یا ڈیزائن کے جوڑے گئے ہیں اس غیر منطقیت اور اینٹی آرٹ اسلوب کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جسے کہ یہ تحریک آواز دینا چاہ رہی تھی۔ بصری فنون کے بعد اس مزاج کا اظہار ادبی پیرائے میں بھی ہوا اور لوئی آراگون، آندرے بریٹن، پال ایلوآرڈ اور فلپ سوپالٹ جیسے ادیبوں کی نگارشات سامنے آئیں۔ ان ڈاڈا ادیبوں نے 1919ء میں پیرس سے Litterature نامی ایک جریدہ جاری کیا جو 1924ء تک چلتا رہا جب اس کے تحریک کے بہت سے ارکان نے ڈاڈا کو ٹاٹا کر کے سریالزم سے وابستگی اختیار کر لی۔

اہل ڈاڈا اپنے فن پاروں میں ردی اور کوڑے کی اشیاء استعمال کر کے، عوام کے سامنے عجیب و غریب حرکات کا مظاہرہ کر کے اور بورژوا احساسات کو جھنجھوڑنے کی خاطر دیوہیکل اور چیختے گرجتے مناظر تخلیق کر کے لوگوں کو چونکاتے تھے۔ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے اس ڈاڈا نظریے اور تخلیقات کا تجزیہ کریں تو ہمیں انارکی پسندی، بغاوت کے میلان اور چانس کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔

اگرچہ ڈاڈا ایک تحریک کے طور پر صرف 1922ء تک ہی چل سکی لیکن اس کے مراکز

http://muftbooks.blogspot.com/

نیویارک، پیرس، زیورچ، برلن اور ہینوور تک نظر آتے رہے۔ ڈاڈا میں موجزن یوٹوپیائی لہریں پوری بیسویں صدی کے دوران فرانس کی Surrealist، Lettrist اور Situationist تحریکوں، پیرس میں مئی 1968ء کی ناکام بغاوت کی پرجوش سرگرمیوں، 1977ء پنک راک کی منفیت اور 1970 اور 1980ء کے عشروں کے اینگلو امریکی تصوراتی آرٹ میں اپنے درشن دکھاتی رہیں۔

ڈارون، چارلز [رابرٹ] (1809ء۔1882ء)

انگریز سائنسدان، نظریۂ ارتقاء کا خالق۔ ڈارون انگلینڈ میں شروزبیری میں پیدا ہوا اور اس نے وہیں پرورش پائی۔ وہ اپنا بیشتر وقت دیہات ومضافات میں گھومنے، شکار کرنے اور پتھر جمع کرنے میں گزارتا تھا۔ ڈارون نے ابا کے کہنے پر ایڈنبرا یونیورسٹی میں طب کی تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اسے وہاں کے لیکچر بہت بورنگ لگے اور ایک جراحت دیکھتے ہوئے وہ بیمار پڑ گیا۔ اس کے بعد اس نے پادری بننے کے لیے آکسفورڈ میں داخلہ لے لیا۔ آکسفورڈ کے دنوں میں اس کی ملاقات نباتیات کے ایک پروفیسر سٹیفن ہینلو سے ہوئی۔ ہینلو نے ڈارون کی شخصیت میں وہ صلاحیتیں اور میلانات بھانپ لیے جو حیاتیاتی سائنسدان بننے کے لیے ضروری ہوتے ہیں اور اس نے کر کرا کے ڈارون کو جنوبی امریکہ، جزائر گلاپاگوس اور افریقہ کے سفر پر روانہ ہونے والے جہاز ایچ ایم ایس بیگل پر ایک طبیعی ماہر کے طور پر ملازمت دلوادی۔

ڈارون جب 1831ء میں اس سفر پر روانہ ہوا تو وہ کوئی بہت پڑھا لکھا یا منجھا ہوا سائنسدان نہیں تھا اور نہ ہی اسے بائبل میں بیان کیے گئے اس نظریہ تخلیق کے بارے میں کوئی شک شبہ تھا کہ ان سب انواع واقسام کی لاتعداد مخلوقات کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ جاتے وقت تو یہ تھا لیکن 1836ء میں اپنے واپسی کے سفر تک ڈاون ایک کہنہ مشق طبیعی ماہر کی شکل میں ڈھل چکا تھا اور فنون کے حساب سے وہ معلومات ومشاہدات ونمونہ جات جمع کر چکا تھا جو اس کی اولین تصنیف ''ایچ ایم ایس بیگل کے 36-1832ء کے مشاہدے میں آنے والے مختلف ممالک کی جیالوجی اور طبیعی تاریخ پر تحقیقات کا روزنامچہ (1839ء) میں درج ہیں۔ اب اس نے نامیاتی ارتقاء کے نظریے کے بارے میں بھی سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اگرچہ یقیناً ڈارون نظریہ ارتقاء پیش کرنے والا پہلا سائنسدان نہیں تھا لیکن وہ ان اولین دو سائنسدانوں میں ضرور شامل ہے جنھوں نے اس نظریے کو ثابت کرنے کے لیے درکار ضروری معلومات وشواہد اکٹھے کیے۔ ابتداء میں ڈارون اپنی تحقیقات کو شائع کرنے میں متامل تھا مگر جب اس نے ایک اور سائنسدان کی اس کے کام سے ملتی

http://muftbooks.blogspot.com/

جلتی ایک مختصر تحریر پڑھی تو اس نے اپنے نظریات سے پردہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی وہ کتاب تصنیف کی جس نے طبیعی سائنس کے منصب اور دائرہ کار کو سرے سے ہی بدل کے رکھ دیا۔ اس کا عنوان ''ابتدائے انواع بہ وسیلۂ انتخاب فطری'' (1859ء) تھا۔ 1838ء میں مالتھس کا ''مقالہ براصول آبادی'' پڑھنے کے بعد ڈارون نے انتخاب فطری کا اپنا وہ مشہور نظریہ تشکیل دینا شروع کردیا جس کے مطابق تمام جاندار اشیاء نے سادہ تر جانداروں کی ایک بہت محدود تعداد سے جنم لیا ہے اور کسی خاص نوع کی حیات کے تسلسل کے ارتقاء کا انحصار اس کی اپنے گردونواح کے ماحول سے تطابق پیدا کرنے کی صلاحیت پر ہوتا ہے۔ ڈارون کے اس نظریے میں صدیوں پرانے ''بقائے اصلح'' کے تصور کی بازگشت بھی بصراحت سنی جاسکتی ہے۔

اپنی کتاب تخلیق آدم (1871ء) میں ڈارون نے یہ موقف اختیار کیا کہ انتخاب فطری نے نوع انسانی کی پیدائش ونمو میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔

ڈارون کے نامیاتی ارتقاء بذریعہ انتخاب فطری کے نظریے نے انیسویں صدی میں ایک تنازعے کی شکل اختیار کرلی اور یہ تنازعہ بیسویں صدی میں بھی چلتا رہا۔ ہوا کیا کہ اس نظریے نے تخلیق آدم سے متعلقہ بائبلی بیان کی صداقت کو چیلنج کردیا تھا جس سے سائنس اور مذہب کے درمیان براہ راست ہاتھا پائی شروع ہوگئی۔ ڈارون خود اس جرح اور دلیل بازی سے صاف دامن بچا گیا۔ انیسویں صدی کے آخری ربع تک ڈارونی نظریہ ارتقاء تمام طبیعی سائنسوں میں قبولیت حاصل کرچکا تھا اور ادب وفنون پر اس کے اثرات پڑنا شروع ہوگئے تھے۔ مڑ کے دیکھیں تو اینگلوامریکی تحریک فطرتیت (جیک لندن جیسے ادیبوں کے توسط) اور فرانسیسی تنزل (ازیڈورڈ کاس کی پروٹوسریالسم تحاریر کے توسط) اس نظریے سے متاثر نظر آتا ہے۔ ڈارون کا انتقال 1882ء میں غالباً مرض چاگاز کے سبب ہوا جو اسے 1830ء کے عشرے میں اپنی مہمات کے دوران لگی تھی۔

ڈالٹن، روک (1935ء۔1975ء)

ایل سیلواڈور سے تعلق رکھنے والا ایک شاعر، تاریخ دان اور انقلابی۔ ڈالٹن 1950ء کے عشرے میں ایک طالب علم رہنما کے طور پر ابھرے اور انھوں نے ایل سیلواڈور کی ظالم فوجی آمریت کے خلاف ہڑتالوں اور مظاہروں کے انعقاد میں اہم کردار ادا کیا جس کی پاداش میں انھیں کئی بار قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں اور جلاوطنی اختیار کرنا پڑی۔ 1973ء میں وطن واپسی پر انھوں نے فوجی آمروں کا تختہ الٹنے کے لیے ایک گوریلا فوج (ERP) کے قیام

کے لیے کام کیا۔ ڈالٹن کی بڑی وجہ شہرت ان کی شاعری رہی جس میں انھوں نے کسانوں کی روزمرہ زندگی کی مشکلات اور تبدیلی کی خاطر کی جانے والی عوامی جدوجہد کی عکاسی کی ہے۔ انھیں اس پیکار میں شریک کسانوں اور مزدوروں کی تاریخ سے بہت دل چسپی تھی۔ انھوں نے بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں کے انقلابی رہنماؤں کے طویل انٹرویوز پر مبنی کئی کتابیں تحریر کیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ مشہور میگل مارمول کی حیات اور عہد کی تاریخ ہے جو 1932ء کی بغاوت کے قائد تھے۔

1975ء میں ای آر پی کے اندر یہ تنازعہ پھوٹ پڑا کہ آمریت کے خلاف جاری جدوجہد کی شکل کیا ہونی چاہیے اور ان کے اپنے تنظیمی ساتھیوں نے ڈالٹن کو تنظیم کے کئی دوسرے اراکین کے ہمراہ ''مخلوط'' سیاسی نظریات کی پاداش میں قتل کر دیا۔

ڈائیاسپورا

یونانی زبان کے اس لفظ کا مفہوم ''بکھراؤ'' ہے اور اس سے یہودیوں کی طویل جلاوطنی مراد لی جاتی رہی ہے۔ تاہم آج کل یہ لفظ اسرائیلی ریاست سے باہر دوسری جگہوں پر بسنے والے یہودی افراد کی طرف اشارے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ڈائیاسپورا کے طفیل یہودیوں کا واسطہ دنیا کی کئی ثقافتوں اور فلسفوں سے پڑا۔ اس لفظ کو اکثر و بیشتر صہیونیت سے بھی نتھی کر دیا جاتا ہے کیونکہ اس اصطلاح میں یہ بات مضمر ہے کہ منتشر اور بے گھر یہودیوں کو فلسطین میں اپنا وطن بنانے کا پورا استحقاق حاصل ہے۔

پہلا بڑا ڈائیاسپورا یعنی ہجرت بابلیہ اس وقت رونما ہوئی جب 586 قبل مسیح میں اہل بابل نے یہودیہ کو فتح کر کے بہت سے یہودیوں کو غلام بنالیا تھا۔ بعدازاں جب یہودیوں کو واپس جانے کی اجازت ملی تو ان میں سے بہت سے لوگوں نے سلطنت فارس کے طول و عرض میں واقع اپنے نئے گھروں میں ہی رہنے کو ترجیح دی۔ اب چونکہ جلاوطنوں کے لیے یروشلم اور ہیکل جیسے مذہبی مراکز بہت دور ہو گئے تھے اس لئے یہودی معبد Synagogue نے ایک اہم ادارے کی حیثیت حاصل کر لی۔

یہودی تاریخ کے سب سے اہم ڈائیاسپورے جو اٹھارہ صدیوں تک چلا اور جس میں پچاس لاکھ یہودی جلاوطن ہوئے، کا آغاز پہلی صدی قبل مسیح میں ہیکل دوم کی تباہی کے بعد ہوا۔ اکثر یہودیوں نے سکندریہ میں گھر بنالیے جہاں پہلی صدی عیسوی تک آبادی کا چالیس فیصد حصہ یہودیوں پر مشتمل ہو چکا تھا۔ دوسرے کئی مصر و شام (جو اس وقت سلطنت روم کا حصہ تھے) روم،

اور ایشیائے کوچک اور بعد میں سپین، فرانس اور شمالی افریقہ میں جا آباد ہوئے۔ بعدازاں قرون وسطیٰ کی خونریزی سے تنگ آ کر بہت سے یہودیوں نے مشرقی یورپ کا رخ کرلیا۔ جب انیسویں صدی میں ان کا روس میں قتل عام شروع ہوا تو بہت سے یہودی امریکہ، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ جا پہنچے۔

جدید دور کی آمد تک ان ہجرتوں اور جلاوطنیوں کو قوم یہود کے ماضی کے گناہوں کی سزا تصور کیا جاتا رہا۔ یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ یہ عذاب ایک مسیحا کے کفارے سے اس وقت ختم ہوگا جب ''جلاوطن اکٹھے ہوں گے'' اور جب خدا اس زمین پر آ کر اپنے لوگوں کو اپنے پاس جمع کرے گا۔ آجکل ڈائیاسپورے کی بحث کا مرکز یہودی پن اور ممیّز قومی شناختوں کے درمیان کشیدگی ہوتا ہے۔ یہودی مذہب کے اکثریتی گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد صہیونی تحریک کی حمایت کرتے ہیں جس کا نصب العین تمام یہودیوں کو واپس اسرائیل لانا ہے۔ بہت سے یہودی ''انکار جلاوطنی'' کے عقیدے پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ وہ ڈائیاسپورے کو کمزوری کی علامت سمجھتے ہیں اور انھیں یہ خوف دامن گیر ہے کہ یہودیوں کے دوسری ثقافتوں میں انجذاب سے یہودی شناخت ختم ہوسکتی ہے۔

یہودیوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو جدید اسرائیلی ریاست کو جائز تصور نہیں کرتا۔ ان کے خیال میں صحیح اسرائیلی ریاست وہی ہوگی جسے مسیحاؑ دنیا میں آ کر خود قائم کریں گے۔ اصلاح شدہ یہودیت کے پیروکاروں کا ایک اپنا موقف ہے۔ ان کا ہیڈکوارٹر یروشلم میں ہے اور ان کے اہداف جدید سیاسی صہونیت کے نصب العین کے عین مطابق ہیں گو وہ ڈائیاسپورا کے جواز کو تسلیم کرتے ہیں اور یہودی مذہب، تشخص اور ارض اسرائیل کے مابین کسی لازمی تعلق کا دعویٰ نہیں کرتے۔

ڈان جوآن

مغربی ادب کا ایک مشہور کردار۔ وہ یورپی ادب کی ایک بہت متاثر کن شخصیت ہے جو ایک ایسے بدکار ہیرو کے طور پر قارئین کے سامنے آتی ہے جس کا اپنے قبیح گناہوں پر توبہ کرنے سے انکار اسے اس کی تباہی تک لے آتا ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ پہلی بار کس تحریر میں ظاہر ہوا لیکن اس کا کردار پانچ سو سے زائد تخلیقات میں مذکور ہے۔ ان میں سے کچھ کہانیاں تو مشابہ ہیں لیکن بعض ایک دوسری سے متصادم بھی ہوجاتی ہیں۔ اس کردار کا پہلا افسانوی روپ سپین کے ایک ڈرامہ نگار ترسودی مولینا کے ایک کھیل ''اشبیلیہ کے عاشق'' 1630ء میں ظاہر ہوا۔ ڈان جوآن کو اکثر عورتوں کا پیچھا کرتے دکھایا جاتا ہے جو ان کی کمزرویوں سے فائدہ اٹھا کر انھیں ورغلاتا ہے۔

وہ دیہاتی دوشیزاؤں سے جھوٹے وعدے کرتا ہے اور امیر خواتین کو اور طرح کے چکمے دیتا ہے۔ آخر میں وہ اپنی مکاریوں کا آپ شکار ہو کر دوزخ کو سدھار جاتا ہے۔

زیادہ تر تخلیقات اسی کہانی پر مبنی ہیں۔ ڈان جوآن ایک نوجوان لڑکی کو ورغلاتا ہے اور اس کے باپ کو قتل کر دیتا ہے کیونکہ وہ اس کو پسند نہیں کرتا ڈان جوآن بعد میں اس کی قبر پر آتا ہے اور بھولے سے نعش کو کھانے پر مدعو کر بیٹھتا ہے۔ اب کیا ہوتا ہے کہ لاش سچ مچ دسترخوان پر پہنچ جاتی ہے اور ڈان کی موت اس کے سر پر منڈلانے لگتی ہے۔ آخر میں وہ توبہ کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور اس کی روح ہمیشہ کے لیے دوزخ کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ اس کہانی کا مذہبی و اخلاقی لب ولہجہ واضح ہے اور گنہگاروں کے لیے اس میں مضمر سزا کی وعید بھی۔

ڈان جوآن کے کردار کا ارتقاء شاعری، ناول اور اوپرا میں دیکھنے میں آیا۔ اس حکایت کی سب سے مشہور پیش کش آسٹرین موسیقار موزارٹ (1756ء۔1791ء) کا اوپرا ڈان جیووانی (1787ء) ہے۔ یہ کہانی صدیوں کا سفر طے کر کے اب ایک عالمی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ سترھویں صدی کے اطالوی گویے اس داستان کو فرانس لے گئے اور بعد ازاں اس کے جرمن اور فلیمش ترجمے بھی نمودار ہونا شروع ہو گئے۔ اٹھارھویں صدی میں اسے زیادہ فکاہیہ رنگ میں ہلکے پھلکے اوپرا اور پتلی تماشوں میں پیش کیا جانے لگا۔ ''ڈان جیووانی'' جیسی تخلیقات میں ڈان جوآن کو زیادہ رومانوی بلکہ قریب قریب ایک ایک ہیرو کے روپ میں پیش کیا گیا۔ اس کے ارادے بھی زیادہ تخیلاتی رنگ اختیار کر گئے۔ اب وہ یا تو ایک کامل خاتون کی تلاش میں سرگرداں نظر آنے لگا اور یا پھر اپنی بے حد وحساب اشتہا کی تسکین کے لیے بہت سی عورتوں کی صحبت کی تلاش میں۔ یہاں فرانسیسی ادیب مولیئر کا ضیافت سنگ (1665ء) برطانوی شاعر لارڈ بائرن کی رزمیہ طنز ڈان جوآن (1819ء۔24ء) بھی قابل ذکر ہیں۔ اس کردار پر مبنی سپین میں پیش کی جانے والی سب سے عمدہ تخلیق ہوزے زورلا مورال کا ڈان جوآن ٹینوریو (1844ء) ہے۔ اس کھیل کو ہیلووین کے موقعے پر روایتاً بڑے بڑے ہجوموں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کھیل کے تخلیق کار نے اس مرکزی کردار سے زیادہ ہمدردانہ رویے کا مظاہرہ کر کے اسے آخر میں ابدی سزا سے بچا لیا ہے۔

ڈزنی، والٹ (1901ء۔1966ء)

امریکی اینی میٹر۔ پروڈیوسر اور فلم ایگزیکٹو۔ والٹ ڈزنی نے کنساس سٹی آرٹ انسٹیٹیوٹ سے تربیت لینے کے بعد اپنا پہلا فلم سٹوڈیو لافو گرام فلمز شروع کیا جو کہ دیوالیہ ہو گیا۔ اس پر اس نے

http://muftbooks.blogspot.com/

ہالی وڈ کا رخ کیا اور ایم جے ونکلر کے لیے ایک سیریز ''ایلس کارٹونوں کی سرزمین میں'' پر کام کیا۔ 1927ء میں ونکلر کے ساتھ تنخواہ کے معاملے پر جھگڑا ہونے کے بعد ڈزنی والٹ نے ڈزنی پروڈکشنز کے نام سے اپنی کمپنی قائم کر لی جہاں اس نے 1928ء میں ''سسٹم بوٹ وِلی'' تیار کی جو پہلی صوتی کارٹون فلم تھی جس میں اس نے کی ماؤس کا کردار شامل کیا۔ کی ماؤس نے بعد میں نہ صرف امریکہ بلکہ دنیا کے چپے چپے میں شہرت حاصل کی۔

اگرچہ فلم اینی میشن ڈزنی کی ایجاد نہ تھی، یہ لفظ اس کے نام کے ساتھ چپک کے رہ گیا ہے۔ ایمیلی کوہل (''پہلا اینی میٹر'' جس نے 1900ء کے عشرے میں 250 فلمیں تیار کیں) اور ونسر مکے 1914ء میں پہلی متحرک کارٹون شخصیت ''گرٹی دی ڈائنوسار'' تیار کرنے والا شخص) جیسے پہل کاروں نے طویل دورانیے کے جدید متحرک کارٹونوں (اور کی ماؤس) کو امریکی تخیل کا ایک مستقل جزو بنا دیا۔ ڈزنی وہ پہلا شخص تھا جس نے اتنے جاندار، منفرد، یادگار اور پیارے کارٹون کردار تخلیق کیے۔ متحرک کارٹونوں میں آواز شامل کرنے کے سلسلے میں پہل بھی اسی نے کی۔ اس کی فلم ''سٹیم بوٹ وِلی'' میں جانوروں کی ایک محفل موسیقی ہو رہی ہوتی ہے کہ گائے کا جسم ایک آلۂ موسیقی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کے تھن بیگ پائپ اور اس کے دانت زائیلوفون بن جاتے ہیں۔ ڈزنی کے اختراعی ذہن اور اس کی کاروباری سمجھ بوجھ نے اس کے سٹوڈیو کو متحرک کارٹون فلموں کا لیڈر بنا دیا۔ 1912ء میں اس کے سٹوڈیو نے ''گل واشجار'' تیار کی جو پہلی ٹیکنی کلر کارٹون فلم تھی۔ پہلا اکیڈیمی ایوارڈ بھی اسی کارٹون فلم کو دیا گیا۔ اس نے پہلی فیچر لینتھ کارٹون فلم ''سنو وائیٹ'' 1937ء میں ریلیز کی۔ 1954ء میں ڈزنی نے ٹی وی سیریز ''ڈزنی لینڈ'' کی میزبانی کے فرائض سرانجام دینا شروع کیے جس میں ڈزنی سٹوڈیو کی تیار کردہ کارٹون فلمیں اور جنگلی حیات سے متعلق دستاویزی فلمیں بھی دکھائی جاتی تھیں۔ بعد میں اس شو کا نام بدل کر ''ڈزنی کی حیران کن دنیا'' رکھ دیا گیا۔ 1955ء میں کیلی فورنیا ریاست کے ایک شہر اینا ہائم میں ڈزنی لینڈ تفریحی پارک کھولا گیا جس میں ڈزنی کے بہت سے مشہور کارٹون کردار بھی شامل کیے گئے۔ والٹ ڈزنی کی دنیا کا افتتاح 1971ء میں اورلینڈو، فلوریڈا اور یوروڈزنی کا 1990 کے عشرے کے اوائل میں فرانس میں ہوا۔

ڈکنز، چارلز (1812ء۔1870ء)

انگریز ناول نگار۔ اس نے اپنے بچپن کے ایام انگلستان کے مقام چیٹ ہیم میں گزارے اگرچہ اس کے خاندان کا تعلق متوسط طبقے سے تھا اسے مالی پریشانی نے آن لیا جس کے سبب اس

http://muftbooks.blogspot.com/

کے بڑوں کو قرض خواہوں کی قید بھگتنا پڑی اور اس بچے کو ایک عرصے تک اپنی تعلیم ترک کر کے ایک جوتا فیکٹری میں نوکری کرنا پڑی۔ اس وقت تک اس کا خاندان محنت کش طبقے میں شامل ہو چکا تھا۔ اس دور کے کڑے تجربات کے اثرات ہمیں ڈکنز کی تحریر میں بھی ملتے ہیں۔ اس نے ایک ادیب کے طور پر اپنی زندگی کا آغاز 1833ء میں اخبارات و رسائل میں لکھنے سے کیا اور ادب میں آ کر وہ مقبولیت حاصل کی جو اب تک کسی بھی انگریز ادیب کے حصہ میں نہ آئی تھی۔ 1836ء میں اسے وہ سیریز لکھنے کے لیے کہا گیا جو ''دی پک وک پیپرز'' (1837ء) کے نام سے معروف ہوئی۔ اس سلسلہ تحاریر نے لوگوں کی فوری توجہ حاصل کی جس سے اسے ''اولیور ٹوسٹ'' (39-1837ء) لکھنے کا حوصلہ ملا۔ یہ ناول بھی قسطوں میں شائع ہوا۔ پک وک پیپرز اور اولیور ٹوسٹ ڈکنز کی سماجی مسائل کے بارے میں تشویش اور اس کی غیر انسانی اداروں کی طنزیہ کردار نگاری کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کی کامیابیوں کا سفر اس کے افسانے ''کرسمس کیرل'' (1843ء) کی اشاعت کے ساتھ جاری رہا اگرچہ اس کی ابتدائی نگارشات میں سب سے بلند مقام ''ڈومی اینڈ سن'' (1846-48) اور اس کی اپنی زندگی سے ماخوذ ناول ڈیوڈ کوپر فیلڈ (50-1849ء) کو ملا۔

1850ء اور 1870ء کے درمیان ڈکنز نے اپنی معروف ترین نگارشات تحریر کریں۔ 1859ء میں اس نے ''دو شہروں کی کہانی'' اور پھر بڑی ''توقعات'' (61-1860) ''بلیک ہاؤس'' (53-1852ء) ''کم سن ڈورٹ'' (57-1855ء) اور ''برے وقت'' (1854ء) لکھا۔ ان ناولوں میں ڈکنز تہہ دار کردار متعارف کراتا اور معاشرے کی ناقدانہ تصویر کشی کرتا نظر آتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری سال اپنی تخلیقات کو عوام و خواص کے آگے پڑھ کر سناتے اور اپنے کرداروں خصوصاً ''اولیور ٹوسٹ'' کے سائیکز اور نسینی کے درمیان کشمکش کو سٹیج پر پیش کرتے گزارے۔ اس کی نثر کی شدت اور معاشرتی ناانصافی اور اصلاح پر اس کے تبصروں نے اسے انیسویں صدی کے عظیم ترین ادیبوں کی صف میں لا کھڑا کیا اور وہ ضمیر کی ایک پر اثر آواز بن گیا۔ اس نے اپنی نگارشات پڑھنے کے لیے امریکہ و انگلینڈ کے جو بار بار مشقت طلب دورے کیے انھوں نے اس کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا جس سے وہ بالآخر 1870ء میں انتقال کر گیا۔

ر

رابن ہڈ

http://muftbooks.blogspot.com/

انگریزی لوک کہانیوں کا ایک مشہور ہیرو۔ روایت کے مطابق رابن ہڈ ایک شریف بدمعاش قسم کا شخص تھا جو ناٹنگھم شائر کے علاقے میں واقع شروووڈ کے جنگلوں میں رہتا تھا۔ اس کے وفا شعار اور آزاد منش ساتھیوں میں میڈ مارین، فرائر ٹک، لٹل جان اور کسانوں کا ایک ٹولہ شامل تھا۔ رابن ہڈ مسکین اور معمولی لوگوں کو زور اور زر والوں کے ظلم سے بچاتا تھا اور امیروں کا مال لوٹ کر غریبوں میں تقسیم کرتا تھا۔ اسے دولت منداونچے طبقے کی علامت ناٹنگھم کے جابر شیرف کیلئے مکافات کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

محققین اس بارے میں کوئی یقینی رائے پیش نہیں کرتے کہ آیا رابن ہڈ کوئی حقیقی شخص تھا یا محض ایک تخیلاتی کردار، لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ 1100ء کے عشرے میں واقعی موجود اور سرگرم تھا۔ اس کردار کا سب سے پہلا تذکرہ ہمیں پیئرز پلاؤمن کے 1377ء کے ایڈیشن میں ملتا ہے۔ سکاٹ لینڈ کے معروف ناول نگار سر والٹر سکاٹ کے ''آئیون ہو'' نیز انگریز ڈرامہ نگار الفریڈ لارڈ ٹینیسن کے کھیل ''جنگل واسی'' میں بھی یہ کردار شامل ہے۔ 1859ء میں آرول پریسکاٹ نے ''رابن ہڈ، شروڈ کے جنگل کا ڈاکو'' تحریر کیا جبکہ ہوورڈ پائل کا ''رابن ہڈ کی رنگیلی وارداتیں'' 1883ء میں شائع ہوا۔ رابن ہڈ کی کہانی انگلستان میں آج بھی بہت مقبول ہے۔

رافیل (سانزیو) (1483ء۔1520ء)

یورپی نشاۃ ثانیہ کے دور کا ایک نامور اطالوی مصور۔ ان کا اصلی نام رافیلو سانزیو تھا اور وہ اربینو میں پیدا ہوئے جس کا شمار نشاۃ ثانیہ عہد کے اٹلی کے نمایاں ثقافتی مراکز میں ہوتا تھا۔ رافیل کے والد بھی ایک مصور تھے اور رافیل نے مصوری کی ابتدائی تعلیم انہی سے حاصل کی۔ رافیل کے والدین ان کی کم عمری میں ہی ان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے جس کے بعد ان کے ایک چچا یا ماموں نے انہیں ٹموٹیو وٹی اور پیٹرو پیروجینو سے تعلیم دلوائی جن کی شاگردی میں انہوں نے تنظیم و تناسب کے اصول سیکھے۔ انہوں نے ان اساتذہ سے بشری فلسفے کے اثرات بھی قبول کئے۔

رافیل اکیس برس کی عمر میں لیونارڈو دوانچی اور مائیکل اینجلو جیسے نابغہ روزگار فنکاروں کے شہ پاروں کے مطالعے کیلئے فلورنس چلے آئے۔ ''مریمؑ اور سنہری چڑیا'' (اندازاً 1505ء) اور ''مریمؑ اور ان کا برخوردار یوحنا ان کے ساتھ'' (1507ء) جیسی ان کی تخلیقات روشنی کے استعمال، رنگوں کی آمیزش اور تناسب کے معاملے میں ان کے لیونارڈو سے اکتساب فیض کا پتہ دیتی ہیں۔ اسی طرح رافیل کی رومن تخلیقات خصوصاً ویٹیکن پیلس کے دیواری طغروں (11-1508ء) کی اشکال اور ادا بھاؤ سے مائیکل اینجلو کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ ان دیواری تصاویر میں شاہکار تصور

http://muftbooks.blogspot.com/

کی جانے والی ''مکتبہ ایتھنز''، جس میں افلاطون اور ارسطو کو ایک جدید اطالوی محل میں دکھایا گیا ہے، لیونارڈو اور مائیکل اینجلو کے اسالیب کے تناؤ اور تاریخ سے آگے ایک نئی مطمئن عینیت میں جاتی محسوس ہوتی ہے۔ 1513ء میں تخلیق کی جانے والی ''گیلٹیا کی فتح'' سے بوٹی چیلی کی ''وینس کی پیدائش'' کی باس آتی ہے لیکن اس تصویر کے دیگر پہلو طبعزاد ہیں۔

وہ اپنے آخری برسوں میں روم میں سرکاری کاموں اور اطالوی فن تعمیر کے نئے تصورات اور ہائی رینی ساں روایت کی مصوری میں مشغول رہے۔ ان کی جواں سال موت کا سوگ پورے اٹلی میں منایا گیا۔

رامائن

ایک ہندوستانی رزمیہ نظم۔ یہ ایک دوسری مشہور ہندی رزمیہ نظم مہابھارت سے چھوٹی ہے۔ سنسکرت زبان میں ''رامائن'' کا مطلب ہے ''رام کا عشق''۔ اسے مبینہ طور پر ایک شاعر والمیکی نے 300 ق م میں لکھا اور یہ 24000 ابیات پر مشتمل ہے جو سات ابواب میں منقسم ہیں۔

یہ نظم درباری سازشوں، پیار و محبت اور خیر و شر کی کشمکش جیسے موضوعات سے پر ہے اور اس کے کئی ورژن ملتے ہیں۔ اس کا آغاز ریاست ایودھیا میں رام کی پیدائش سے ہوتا ہے۔ رام ایک مقابلے میں شیو کی طاقتور کمان کو خم دے کر سیتا کا ہاتھ جیتتا ہے۔ رام کے باپ کے اپنی دوسری بیگم کیکئی کو دیئے ایک وعدے کی وجہ سے رام اور سیتا کو بن باس دے دیا جاتا ہے تاکہ کیکئی کے بیٹے کو ولی عہد بنایا جا سکے۔ رام کی جلا وطنی کے دوران لنکا کا شیطان صفت بادشاہ راون سیتا کو اس سے چھین لیتا ہے لیکن سیتا کی وفا شعاری میں کوئی لغزش نہیں آنے پاتی۔ رام بندروں کے بادشاہ سگریو اور بندر نما جرنیل ہنومان کی مدد سے راون کو شکست دے کر سیتا کو اس کے چنگل سے نجات دلاتا ہے۔ سیتا رام سے اپنی وفا سچ ثابت کرنے کیلئے آگ پر چل کر دکھاتی ہے لیکن اس کی سچائی کی وجہ سے اسے کوئی گزند نہیں آتی۔ ایک رامائن کے مطابق رام اس ثبوت کو کافی تصور نہ کرتے ہوئے اسے جنگل بھیج دیتا ہے جہاں وہ والمیکی کی کٹیا میں رام کے دو بچوں کو جنم دیتی ہے۔ جب یہ دونوں لڑکے بڑے ہوتے ہیں تو سارا خاندان دوبارہ اکٹھا ہو جاتا ہے اور سیتا جو کہ اب بھی اپنی معصومیت کا رونا رو رہی ہوتی ہے، زمین سے کہتی ہے کہ اسے نگل لے۔ ایک دوسری رامائن کے مطابق یہ آزمائش کارگر ثابت ہوتی ہے اور رام اور سیتا دونوں سورگ (جنت) میں پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کا بڑا پرتپاک خیر مقدم کیا جاتا ہے۔

اس رزمیے نے شارکجر (دوسطری اشعار جس کی ہر سطر میں سولہ اکائیاں ہوتی ہیں) اور

سنسکرت شاعری کے دیگر بہت سے اوصاف کونشو ونما دے کر ہندی شاعری کو بہت متاثر کیا ہے۔ آج کل رامائن کو پورے ہندوستان میں ڈراموں اور مذہبی تہواروں میں پڑھا اور گایا جاتا ہے۔

رباب

ایک عرب آلہ موسیقی۔ کبھی یہ لفظ خمار آلہ موسیقی کیلئے ایک عمومی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ آج کل اسے عموماً عرب سارنگی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو پہلی مرتبہ دسویں صدی میں منظر عام پر آئی۔ رباب کے ایک بطن نما سرے پر جھلی چڑھی ہوتی ہے، جس پر عموماً دو یا تین تار کس کر بندھے ہوتے ہیں اور یہ کئی مختلف شکلوں میں آتی ہے۔ سارنگی کے برعکس، اس پر کوئی فنگر بورڈ نہیں ہوتا اور سازندہ تاروں کو انگلیوں کی مدد سے مرتعشی کرتا ہے۔ رباب کسی نہ کسی صورت میں افریقہ، شمالی ہندوستان، جنوب مشرقی ایشیا اور وسطی ایشیا کے بشمول مشرق وسطیٰ سے باہر بھی بہت سے خطوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ رباب بازنطینی سلطنت کے توسط سے یورپ تک بھی پہنچا جہاں اسے لیرا کا نام دیا گیا۔ عرب اس آلہ موسیقی کو سپین لائے جہاں اس سے ایک اور ساز بربط نے جنم لیا۔

رباعیات عمر خیام

رباعی چار مصرعوں پر مشتمل ایک صنف سخن ہے جس کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم ردیف ہوتا ہے۔ بہت سے عربی، فارسی اور اردو شعرا نے رباعی کے فن میں کمال حاصل کیا ہے لیکن اس صنف کو فارسی شاعر اور ریاضی دان عمر خیام کے حوالے سے خاص شہرت حاصل ہوئی ہے۔ اس شہرت کا بڑا سبب امریکی شاعر اور مترجم فٹز جیرالڈ ہے جس نے عمر خیام کی رباعیات کا انگریزی میں آزاد ترجمہ کر کے انہیں مغربی دنیا میں متعارف کرایا۔

عمر خیام ایران کے مشہور شہر نیشا پور میں پیدا ہوئے۔ تاہم ''رباعیات'' کے شائع شدہ مجموعے میں بیس سے بھی کم رباعیاں ایسی ہوں گی جنہیں ہم یقین سے عمر خیام سے منسوب کر سکتے ہیں۔ ''رباعیات'' کا قدیم ترین مسودہ 1457ء میں لکھا گیا اور یہ 131 رباعیوں پر مشتمل تھا جبکہ 1394ء میں شائع ہونے والے ایڈیشن میں 770 رباعیاں موجود ہیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے انگریزی دنیا میں رباعیات کو ملنے والی بے پناہ شہرت فٹز جیرالڈ کے ترجمے کا نتیجہ ہے جو 1859ء میں شائع ہوا۔ فٹز جیرالڈ نے یہ ترجمہ اپنے انداز سے کیا اور یہ ضروری نہیں سمجھا کہ اصل اشعار کے ساتھ چلا جائے بلکہ اس نے عمر خیام کے مضامین لے کر انہیں

ایک نئے ڈھنگ اور قالب میں قارئین کے سامنے پیش کیا۔انہوں نے رباعی کی صنف میں تغیر و تبدل کر کے اسے انگریزی روایت میں شامل کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے پیش نظر یہ چیز بھی تھی کہ اصل فارسی اشعار کی لے، تال، ردیفیں اور کیفیات بھی قاری تک پہنچ سکیں۔اس ترجمے کے طفیل 1892ء میں لندن میں ایک عمر خیام کلب کا قیام بھی عمل میں آیا۔اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ شاعری کو باجماعت پڑھا جائے اور رباعیات کے عارفانہ معانی سے شناسائی حاصل کی جائے۔

اگر چہ اس عہد کی بیشتر فارسی شاعری کی طرح رباعیات میں بھی صوفیانہ استعارات استعمال کیے گئے ہیں تاہم اس مجموعے کو مجموعی طور پر صوفی شاعری قرار دینا بھی ٹھیک محسوس نہیں ہوتا۔ان رباعیوں پر بنیادی طور پر بے معنویت اور عیش کوشی کا رنگ غالب ہے۔

رشدی (احمد) سلمان (1947ء۔.....)

ہندنژاد برطانوی ناول نگار۔رشدی نے بمبئی کے ایک مسلم گھرانے میں ان دنوں آنکھ کھولی جب ہندوستان کو برطانوی سامراج سے آزادی ملی اور پاکستان ایک نئے اور خود مختار ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر ابھرا۔رشدی نے پہلے بمبئی کے کیتھڈرل سکول سے تعلیم حاصل کی اور پھر 1961ء میں اسے چودہ سال کی عمر میں انگلستان کے رگبی پبلک سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ وہاں اسے ہندوستانیوں کے بارے میں پائے جانے والے تعصب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔1964ء میں جبکہ شدی ابھی رگبی میں ہی تھا، اس کے والدین ہجرت کر کے کراچی آ بسے اور اس سے اگلے برس رشدی اپنے والدین کی خواہش پر بادل نخواستہ کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔1968ء میں اس نے یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک مختصر عرصے کیلئے کراچی میں قیام کیا اور پھر وہ پاکستان کو ہمیشہ کیلئے خیر باد کہہ کر انگلستان جا بسا۔1976ء میں اس کی شادی ایک بدیسی خاتون کلیریسا لوآرڈ سے ہوئی جن سے ایک لڑکا پیدا ہوا لیکن 1987ء میں دونوں میں طلاق ہوگئی۔

رشدی کا شائع ہونے والا پہلا ناول ''گرائمس'' 1975ء میں منظر عام پر آیا۔یہ ناول ایک فارسی شعری داستان سے ماخوذ تھا جس میں سائنس فکشن اور طلسمی حقیقت نگاری کی تکنیکوں سے بھی استفادہ کیا گیا تھا۔اس ناول کو بکری کے اعتبار سے تو کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی لیکن وہ ادبی ماہرین کی نظر میں آ گیا۔رشدی پیدائشی طور پر ہندوستانی تھا لیکن اس نے انگریزی ثقافت کو بھی بڑے قریب سے دیکھا تھا چنانچہ وہ تاریخی اعتبار سے مربوط ان دونوں خطوں کی باہم پیوستہ

http://muftbooks.blogspot.com/

کہانیوں کو از سر نو قلمبند کرنے کیلئے بہت اچھی پوزیشن میں تھا۔ اس نے اپنے ناولوں میں پوری کی پوری تاریخوں اور واقعات کا از سر نو جائزہ لیا اور انہیں ایک نیا جیون دیا بلکہ گاہے گاہے ان کا تمسخر بھی اڑایا۔

1981ء میں بکر پرائز حاصل کرنے والے ناول ''نصف شب کے بچے'' میں وہ ہندوستان کی آزادی سے قبل اور بعد کی تاریخ کو گھنگالتا نظر آتا ہے۔ اس کے سیاسی طنزیہ ناول ''شرم'' (1983ء) میں ہندوستان کی بجائے پاکستان کا منظر نامہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول پر پاکستان میں پابندی بھی عائد رہی۔

رشدی کا نام سب سے زیادہ اس کے ناول ''شیطانی آیات'' (1988ء) کی وجہ سے دنیا میں متعارف ہوا۔ یہ ناول رشدی کی اپنے سکول کے دنوں کی یادوں، اپنے آبائی شہر بمبئی سے وابستگیوں اور ان کے والد کے انتقال سے متعلق ہے لیکن اس میں رسول خداؐ اور ان کے بعض صحابہ کے کرداروں نیز تاریخ اسلامی کے بعض واقعات کو بھی مسخ کر کے پیش کیا گیا۔ اس تصنیف نے برطانیہ میں تو وٹ بریڈ انعام حاصل کر لیا لیکن اس گستاخانہ کتاب کی اشاعت سے پوری دنیا کے مسلمان مشتعل ہو گئے اور دنیا کے مختلف خطوں میں احتجاجی مظاہرے ہونے لگے جس پر بھارت، پاکستان، جنوبی افریقہ، سعودی عرب اور مصر میں اس ناول پر پابندی لگا دی گئی۔ جب ایران کے مذہبی رہنما آیت اللہ خمینی نے فروری 1989ء میں رشدی کے قتل کا فتویٰ اور اس کے سر کیلئے ایک ملین ڈالر سے زائد کی رقم مقرر کی تو رشدی روپوش ہو گیا۔

رشدی اس کے ناشر اور ''شیطانی آیات'' فروخت کرنے والے کتب فروشوں کو متواتر دھمکیاں موصول ہوتی رہیں۔ بہت سے امریکی کتب فروشوں نے اپنے ملازمین کے تحفظ کے پیش نظر اس کتاب کو عارضی طور پر اپنی دکانوں سے اٹھا لیا اس کتاب کے اطالوی اور جاپانی مترجمین کو ہلاک کر دیا گیا۔ تاہم 1990ء کے عشرے کے اوائل سے رشدی نے ایک مرتبہ پھر منظر عام پر آنا شروع کر دیا اور خیالی وطن : مضامین اور تنقید 1981ء-1991ء'' اور ''مشرق و مغرب'' (1994ء) کے بشمول کئی تصانیف شائع کیں۔ رشدی کو 1993ء میں ان کے ناول ''نصب شب کے بچے'' پر سلور جوبلی ''بکر آف بکر پرائز'' سے بھی نوازا گیا۔

ربی

یہودی مذہبی پیشوا۔ عبرانی زبان میں اس کا لغوی مطلب ''میرا استاذ'' ہے۔ ربی کا لقب ابتداء میں روم کے خلاف دوسری بغاوت کی ناکامی (35-132ء) کے بعد کے دور میں فلسطین

http://muftbooks.blogspot.com/

کی اعلیٰ ترین درسگاہ سے فارغ التحصیل ہونے والے یہودی علماء کو عطا کیا جاتا تھا۔ یہ درسگاہ جہاں طلباء بنیادی طور پر توریت اور ان یہودی علوم کی تعلیم حاصل کرتے تھے جو کہ بالآخر تالمود کا حصہ بنے اسی کے تحت کام کرتی تھی جسے یہودی فلسطین میں رومن حکام اور بنی اسرائیل دونوں اعلیٰ ترین مذہبی و دنیاوی اتھارٹی تسلیم کرتے تھے۔ چنانچہ ربی مقامی لوگوں کے رہنما بھی تھے۔ وہ دیگر حکومتی وانتظامی کردار بھی ادا کرتے تھے۔

وہ یہودیوں کی طویل جلاوطنی کے دوران روایت کے ساتھ تعلقات استوار رکھنے کیلئے خاص طور پر بہت موزوں ثابت ہوئے۔ اگرچہ ان کے بہت سے شہری وظائف پر خصوصا یورپ میں قومی ریاست کے تصور کے جڑ پکڑنے کے بعد غیر یہودی حکام نے تسلط جما لیا تھا، وہ بدستور اجتماعات کی امامت کے فرائض سرانجام دیتے رہے لہٰذا کلیسائی طاقت انہی کے ہاتھ میں رہی۔ بعض ملکوں میں بعض ملکوں کی نسبت ربیوں کا نظام زیادہ متشکل اور پر تحکم ہے۔ اسرائیل کی جدید ریاست میں ربیوں کے ہاتھ میں اب بھی کچھ نہ کچھ انتظامی اختیار موجود ہے۔ وہاں دو بڑے ربی ہیں۔ انہیں سلطنت عثمانیہ کی تاریخی باقیات کہا جاسکتا ہے جس میں مذہبی گروہ (یہودی، مسلمان اور عیسائی) ایک بڑے شاہی نظام کے اندر رہ کر نیم خود مختار اکائیوں کے طور پر کام کرتے تھے۔ امریکہ میں باجود ایک قابل قدر یہودی آبادی کے اس طرح کی کوئی مرکزی اتھارٹی موجود نہیں ہے جس کی بڑی وجہ وہاں یہودیوں کا تین مختلف فرقوں میں منقسم ہونا ہے۔

آج کل کے جدید دور کے ربی مذہبی اجتماعات میں لوگوں کی پیشوائی کے ساتھ ساتھ رفاہی اور فلاحی خدمات بھی سرانجام دیتے ہیں۔ ربی یہ دیکھنے کیلئے خوراک کا معائنہ بھی کرتے ہیں کہ آیا یہ شریعت کے مطابق ہے کہ نہیں۔

رمضان

اسلامی سال کا نواں مہینہ جس میں مسلمان اللہ کے حکم کی پیروی میں ہر روز صبح صادق تا غروب آفتاب روزہ رکھتے ہیں۔ رمضان میں روزے رکھنا اسلام کے پانچ ارکان میں شامل ہے۔

چونکہ اسلامی (ہجری) سال چاند کے مطابق تشکیل پاتا ہے، اس لئے رمضان ہر سال انگریزی سال کے لحاظ سے گیارہ روز پہلے آتا ہے۔ رمضان کے اختتام کا اعلان شوال کا چاند نظر آنے پر کیا جاتا ہے جس سے اگلے روز مسلمان عید الفطر مناتے ہیں۔ اس موقع پر مسلمان نماز عید ادا کرتے ہیں، اپنے دوستوں اور عزیزوں کے گھر جاتے ہیں، نئے کپڑے پہنتے ہیں اور ایک دوسرے کو تحفے تحائف دیتے ہیں۔ عید کے دن روزہ رکھنا ممنوع ہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

روزہ رکھنے اور افطار کرنے کے اوقات مختلف علاقوں میں مختلف ہیں لیکن روزے سے متعلقہ بقیہ احکام ایک جیسے ہیں۔ روزہ دار کو روزے کی حالت میں کھانے پینے، جنسی تعلقات اور برے خیالات سے بچنا ہوتا ہے۔ زیادہ پرہیز گار افراد ٹیلیوژن اور فلمیں دیکھنے سے بھی احتراز کرتے ہیں۔ اس طرح کی فضولیات کی بجائے روزہ دار اپنا وقت مختلف قسم کی عبادات مثلاً نماز، تسبیح اور تلاوت قرآن وغیرہ میں گزارتے ہیں۔ چھوٹے بچے، مسافر، حاملہ خواتین، معمر افراد اور مریض روزے کی پابندی سے بری ہیں۔ جو لوگ استطاعت کے باوجود کسی وجہ سے روزہ چھوڑ دیتے ہیں انہیں یہ روزہ قضا کر کے بعد میں رکھنا پڑتا ہے۔

روسو، ژاں ژاک (1712ء۔1778ء)

سوس نژاد فرانسیسی فلسفی اور سیاسی اصول دان۔ رسو کو ان کے ابا نے پالا پوسا جو کہ گھڑی ساز تھے۔ انہیں اپنی روزی روٹی کیلئے سولہ برس کی عمر میں ہی میدان عمل میں کودنا پڑا۔ زندگی میں ذرا اور آگے بڑھے تو ان کی شناسائی مادام دوارنی سے ہوگئی جن کے شرف نظر نے انہیں کیتھولک بنا دیا۔ اگلے کئی برس روسو آوارہ کبھی ادھر کبھی ادھر مارے مارے پھرتے رہے اور اس دوران مادام ان کی سرپرست کا کردار ادا کرتی رہیں۔ روسو 1742ء میں موسیقی کا کوئی نیا طریقہ ذہن میں لے کر پیرس پہنچے مگر انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ موسیقی کے میدان میں تو انہیں ناکامی ہوئی مگر ہوا کیا کہ ان کا کئی مالدار اور صاحب حیثیت لوگوں سے تعارف ہو گیا۔ معروف فرانسیسی ادیب ڈلنی ڈیڈرو (1713ء۔1748ء) بھی ان کے دوست بن گئے اور انہیں ایک ایک انسائیکلوپیڈیا میں مضامین لکھنے کا کام بھی مل گیا۔ 1745ء میں ان کا ایک معمولی پڑھی لکھی خادمہ Therese Le Vasseur سے معاشقہ شروع ہوا جو پوری عمر چلتا رہا۔ ان کے ہاں پانچ بچے ہوئے جنہیں روسو ایک ایک کر کے یتیم خانے بھیجتے رہے۔

روسو اپنی پہلی اشاعت ''مضامین در بارہ علوم فنون'' (1750ء) کے ساتھ راتوں رات شہرت و مقبولیت کی بلندیوں پر جا پہنچے۔ اس کتاب میں روسو نے اس عام تصور کی پرزور مخالفت کی کہ سائنسی ترقی انسانی مسرت و شادمانی میں اضافے کا باعث بنی ہے۔ روسو نے اپنی دوسری فلسفیانہ تحریر ''انسانی عدم مساوات کی بنیادوں کی ابتدا پر ایک مقالہ (1754ء) میں نجی جائیداد اور سیاسی ریاست کو انسانی فطرت کے بگاڑ کا سبب قرار دیا۔ اس اشاعت کے بعد روسو جنیوا چلے گئے جہاں جا کر انہوں نے دوبارہ اپنے پروٹسٹنٹ ہونے کا اعلان کیا۔ 1756ء میں وہ واپس پیرس آ گئے جہاں تصنیفی اعتبار سے انہوں نے ایک بھرپور وقت گزارا۔ 1762ء میں انہیں ان کی کتب

ایمیل (1762ء) اور معاہدہ عمرانی (1762ء) میں شامل بعض تنقیدی عبارات کی وجہ سے فرانس سے نکال دیا گیا۔ اس پر روسو سکاٹ لینڈ کے اپنے فلسفی دوست ڈیوڈ ہیوم (1711ء۔ 1776ء) کی دعوت پر انگلستان چلے گئے اور وہاں رہتے ہوئے انہوں نے 1766ء میں اپنی معروف سوانحی کتاب ''اعترافات'' پر کام شروع کیا۔

روسو کے ذہن پر اکثر یہ خبط سوار ہو جایا کرتا تھا کہ اس کے اردگرد کے لوگ اس کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں اور اسے نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔ اب کے بار روسو کے اس شک کا نشانہ ہیوم بنا چنانچہ وہ انگلستان کو خیر باد کہہ کر نکل کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد کچھ برس تک تو وہ Therese جو اب ان کی قانونی شریک حیات بن چکی تھی، اور ان کی والدہ کے ساتھ بے مقصد ادھر ادھر گھومتے رہے اور پھر انجام کار پیرس واپس آ گئے۔ Therese روسو کیلئے ایک ایسا سہارا تھیں جو درمیان میں آ کر انہیں بیرونی دنیا کے تھپیڑوں سے بچا لیتی تھیں اور روسو اس مشفق رفیقہ کی آڑ لے کر بقیہ ساری عمر ایک ملنگ کے جاگتے سپنے تحریر کرتے رہے۔ اس دوران انہوں نے پولینڈ کے ایک بڑے آدمی کے کہنے پر اس ملک کا دستور بھی تشکیل دیا (1782ء)۔ آخر کار روسو 1784ء میں اس عظیم انقلاب سے صرف چند سال پیشتر انتقال کر گئے جسے ان کے خیالات و افکار سے سینچا گیا تھا۔ انہیں ان کی روایتی سیاسی و سماجی نظاموں کے خلاف بغاوت کے سبب آج بھی یاد رکھا جاتا ہے۔ جب ہم روسو کی حیات و آثار پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ یہ شخص کس قدر حساس تھا اور وہ جذبات کو کس قدر اہمیت دیتا تھا۔ یہی وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے روسو کو ان کے بعد آنے والی رومانوی پود میں بھی بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا۔

روسی آرتھوڈوکس چرچ

مشرقی آرتھوڈوکس چرچ کی ایک ذیلی شاخ۔ سرزمین روس میں آرتھوڈوکس (تقلیدی) عیسائیت 860ء میں ہی جڑیں پکڑ چکی تھی۔ اسے روس کے سرکاری مذہب کا درجہ 988ء میں ملا اور 1589ء میں اسے باقاعدہ طور پر ایک خودمختار چرچ کی حیثیت دے دی گئی۔ دیگر آرتھوڈوکس چرچوں کی طرح یہ چرچ بھی بازنطینی سلطنت کے چرچ سے نکلا ہے۔ اگرچہ اٹھارہویں صدی میں پطرس اعظم (حکومت 1682ء۔ 1725ء) اور کیتھرین عظمیٰ (حکومت 1762ء۔ 1796ء) کے عہد میں اس چرچ کے بہت سے اختیارات چھین لئے گئے تھے، مگر یہ کسان طبقے میں بدستور ایک اہم ادارے اور علم و دانش کے مرکز کے طور پر دیکھا جاتا رہا۔ اس مسلک کے تحت روزے رکھے جاتے تھے، تہوار منائے جاتے تھے اور پوپ یا پادری کو علاقے کے لوگوں میں

بہت اہمیت حاصل تھی۔ بیسویں صدی کے شروع میں روسی دانشور حلقے کے بہت سے ارکان کو اس چرچ میں ایک نئی دلچسپی پیدا ہوگئی اور چرچ کے اکابرین نے اسے ریاست کے کنٹرول سے آزاد کرنے کے مطالبات بلند کرنا شروع کر دیے۔ تاہم مذہبی احیاء کی اس تحریک کو 1917ء کے اشتراکی انقلاب سے بہت جھٹکا پہنچا جس کے بعد چرچ کو ختم کر دیا گیا اور اس کے ماننے والوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ چرچ کے اکابرین نے انقلاب کی شدید مخالفت کی اور نئی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں بہت سے پادریوں کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں اور متعدد کو جان سے ہاتھ بھی دھونا پڑے۔ ہزاروں چرچوں کو مقفل کر دیا گیا اور ان کی ایک بڑی تعداد کو تباہ کر دیا گیا۔ مذہب کے خلاف اس شدید مہم میں ذرا نرمی صرف تب جا کر پیدا ہوئی جب حکومت کو محسوس ہوا کہ ایسا کرنا ان کے اپنے مفادات کیلئے مناسب ہے۔ (مثلاً جب دوسری عالمی جنگ کے موقع پر لوگوں کو محاذ پر بھیجنے کا وقت آیا۔)

روسی آرتھوڈوکسی حکومت کی تمام تر مخالفت کے باوجود خصوصاً دیہاتی علاقوں میں اپنا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب رہی ہے اور اسے اب بھی روسیوں کیلئے ایک اہم ثقافتی اور مذہبی ادارے کی حیثیت حاصل ہے۔ 1980ء کے عشرے کے اواخر میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے دوران اور سوویت یونین کے خاتمے کے بعد اس چرچ کو ایک نئی زندگی ملی ہے، اس کے حقوق و اختیارات میں اضافہ ہوا ہے اور ملک کے طول و عرض میں بہت سی عبادت گاہوں اور خانقاہوں کو اہل ایمان کیلئے دوبارہ کھول دیا گیا ہے۔

روسی انقلاب (1905ء)

روسی بغاوت۔ اس انقلاب کے نتیجے میں روس میں آئینی بادشاہت کا قیام عمل میں آیا اور 1917ء کے بڑے انقلاب کی راہ ہموار ہوئی۔ نکولس ثانی (حکومت 1894ء-1917ء) کی زار حکومت کے دور میں خاص طور پر روس اور جاپان کی جنگ (05-1904ء) کے بعد اصلاحات کے مطالبے نے ڈرامائی طور پر بہت زیادہ شدت اختیار کر لی تھی۔ اس عوامی بے چینی کا نتیجہ (22 جنوری 1950ء) جیسے واقعات کی صورت میں رونما ہوا جب حکومت کے سپاہیوں نے پرامن احتجاجی مظاہرے میں شرکت کرنے والے بے شمار کارکنوں اور مزدور تحریک کے ارکان کو انتہائی بے دردی سے ہلاک کر دیا تھا۔ اس سے لوگوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور دوسرے قصبوں اور شہروں میں بھی ہڑتالوں اور بلووں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بہت سے صنعتی مراکز میں مزدوروں کی سیلف گورنمنٹ کے خودمختار اعضاء کے طور پر مزدور نائبین کی مجالس کا قیام عمل میں

آیا۔نکولس کومنشور اکتوبر جاری کرنے پر مجبور ہونا پڑا جس میں اس نے اپنے لئے آئینی حکومت قبول کر کے ایک پارلیمان (ڈوما) کی تشکیل کا عہد کرلیا تھا۔تاہم اس سے عوام کی تسلیم نہ ہوسکی اور دسمبر میں ماسکو میں مزدوروں کی ایک بڑی شورش پھوٹ پڑی۔حکومت نے اس شورش کو سختی سے دبا دیا۔اگرچہ مزدور احتجاج اس کے بعد بھی 1907ء تک کسی نہ کسی صورت جاری رہا۔بغاوت ماسکو کی ناکامی سے یہ انقلاب اپنی موت آپ مرگیا۔1917ء کے انقلاب میں زار حکومت کو مکمل طور پر ختم کردیا گیا۔

روسی انقلاب (1917ء)

روسی بغاوت۔یہ انقلاب حقیقت میں دو الگ انقلابات یعنی انقلاب فروری جس میں زار نکولس ثانی (حکوت 1894ء۔1917ء) کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور انقلاب اکتوبر جس میں انقلابیوں نے اشترا کی رہنما ولادی میر لینن (1870ء۔1924ء) کی قیادت میں اقتدار پر قبضہ کیا تھا، پر مشتمل ہے۔انقلاب کے فوراً بعد خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہوگیا اور یہ بلوے 1920ء میں جا کر ختم ہوئے اور اشترا کی ریاست قائم ہوگئی۔

انقلاب کی فوری وجہ پہلی عالمگیر جنگ (17-1914ء) کے دوران حکومت کا نظم ونسق مناسب طریقے سے چلانے میں زار کی ناکامی تھی۔لوگ خوراک اور دیگر اشیائے ضروریہ کی قلت اور جنگ میں ساڑھے پانچ ملین روسیوں کی ہلاکت سے بہت مشتعل ہو چکے تھے اور وہ بے چینی جسے نکولس 1905ء میں رام کرنے میں کامیاب رہا تھا اب کی بار اس کی حکومت کو تنکوں کی طرح بہالے گئی۔

زار کی مارچ میں تخت سے دستبرداری کے بعد پہلے شہزادہ لواف اور پھر الیکساندر کرینسکی کی قیادت میں ایک عبوری حکومت کا قیام عمل میں آیا۔اپریل میں ولادیمیر لینن بھی جلاوطنی ختم کر کے واپس روس پہنچ گئے اور انقلابیوں نے پیٹروگراڈ اور ماسکو کی مزدور اور فوجی مجلسوں میں بڑی اکثریت حاصل کرلی۔اگرچہ بعض بالشیوک اس انتخابی فتح پر قانع نظر آتے تھے مگر لینن نے بغاوت برپا کر کے حالات کا رخ بدل دیا۔انقلابیوں نے نومبر میں اقتدار پر قبضہ کر کے جرمنی سے ایک الگ امن معاہدہ کرلیا۔تاہم انہیں سفید افواج یعنی انقلاب مخالفوں کے خلاف ایک طویل خانہ جنگی لڑنا پڑی جنہیں غیر ملکی طاقتوں کی امداد بھی حاصل تھی۔یہ خانہ جنگی بالآخر 1920ء میں اپنے انجام کو پہنچی اور بالشیوک فوجوں کو روس میں مکمل کنٹرول حاصل ہوگیا۔

http://muftbooks.blogspot.com/

رومی، جلال الدین (1207ء-1273ء)

مسلمان صوفی شاعر۔ ان کیلئے احتراماً مولانا یا مولوی کا لقب بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ رومی کے والد ایک صاحب نظر عالم دین تھے اور بلخ کے دربار سے وابستہ تھے جو کہ آج کل افغانستان میں آتا ہے۔ ان کی سوانح کے متعلق بہت سے امور متنازعہ ہیں۔ اس بارے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ ان کا گھرانہ بلخ سے نقل مکانی کر کے قونیہ کیوں گیا۔ تاہم ایک روایت کے مطابق انہوں نے 1220ء کے عشرے میں ہونے والے منگول حملے کے بعد انا طولیہ کے شہر قونیہ کو ہجرت کی جو اس وقت سلجوقی بادشاہوں کا پایہ تخت تھا۔ رومی کے والد قونیہ میں کسی علمی مسند پر فائز تھے۔ 1231ء میں ان کے انتقال کے بعد یہ عہدہ رومی کے پاس چلا آیا۔

رومی ایک عرصے تک ایک عالم وفقیہہ کے طور پر اپنے فرائض سرانجام دیتے رہے لیکن پھر کیا ہوا کہ 1244ء میں ان کا سامنا ایک اہل دل درویش شمس تبریز سے ہو گیا۔ اس صاحب نظر بزرگ نے رومی کے قلب پر کچھ ایسا اثر کیا کہ وہ اپنی ساری سدھ بدھ کھو بیٹھے۔ نہ انہیں گھر والوں کی ہوش رہی اور نہ مریدوں کی۔ ان کے شاگردوں نے خفیہ طور پر شمس کو قتل کر دیا جس پر رومی کی پوری ہستی غم وحزن میں ڈوب گئی اور انہوں نے بقیہ تمام عمر اپنے بچھڑے دوست کے متعلق شعر لکھ لکھ کر گزار دی۔

رومی کی دو شعری تصنیفات سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان دونوں میں سے زیادہ بڑی ''دیوان شمس'' حضرت شمس تبریز سے منسوب نظموں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے بیشتر تخلیقات روایتی اسلوب میں قلمبند کی گئی ہیں جو مولانا کے قلبی و روحانی احساسات کی گہرائی اور ان کے حبیب شمس تبریز کیلئے ان کی شدت جذبات کا پتہ دیتی ہیں۔ لگتا ہے شمس تبریز کو ان منظومات میں خدائے تعالیٰ کی ہمہ گیریت کو ایک استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ان میں مولانا کا اپنا تشخص پست ہوتا اور ہر طرف شمس ہی شمس حاوی ہوتا دکھائی پڑتا ہے اور بات یہاں تک پہنچتی ہے کہ وہ اپنے پورے دیوان کو ہی شمس کے نام لگا دیتے ہیں۔

مولانا کی تخلیقات میں عظمت کے اعتبار سے ''مثنوی معنوی'' کو سب سے ممتاز مقام حاصل ہے۔ یہ مثنوی نصیحت آموز قصوں پر مشتمل ہے اور رومی نے اسے اپنے ایک شاگرد کی فرمائش پر تحریر کیا تھا۔ کہاوتوں اور حکایتوں سے پر اس مثنوی کو سالکان راہ معرفت کا ایک رہنما مینوئل قرار دیا جا سکتا ہے۔ ثانوی وثالثی داستان نہایت مہارت سے مربوط کر کے رنگا رنگ کہانیاں اور واقعے بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں سے بہت سی حکایات سادہ، سلیس اور دلنشین انداز میں لکھی گئی ہیں اور

http://muftbooks.blogspot.com/

تصوف کی ٹیکنیکل اصطلاحات سے احتراز برتا گیا ہے۔

اگرچہ فنی اعتبار سے فارسی شعر کے میدان میں رومی سے بڑے اور لوگوں کے نام بھی آتے ہیں۔لیکن عارفانہ حلقوں میں جس قدر مقبولیت و پذیرائی رومی کو ملی ہے وہ اور کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ان کی شاعری میں جذبات کی شدت اور حدت اس قدر زیادہ ہے کہ قاری اس کے ترجمے پڑھتے ہوئے بھی اس شدت اور حدت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ان کا کلام آج بھی بہت سے اسلامی ملکوں میں شوق سے پڑھا اور گایا جاتا ہے۔

مولانا روم کو صوفیوں کے سلسلہ مولویہ کا روحانی بانی تصور کیا جاتا ہے۔اس سلسلے سے منسلک افراد اپنی روحانی محفلوں میں مسلسل گھومتے ہوئے ایک خاص قسم کا رقص بھی کرتے ہیں جس کے سبب وہ مغرب میں Whirling Dervishes کے نام سے مشہور ہو گئے ہیں۔

ریفارمیشن (تحریک اصلاح)

سولھویں صدی کے دوران یورپ میں رونما ہونے والا مذہبی انقلاب۔اس انقلاب کے سرخیل مارٹن لوتھر (1483ء۔1546ء) اور جان کیلون (1464ء۔1509ء) تھے۔اس تحریک نے، جسے کہ پروٹسٹنٹ ریفارمیشن بھی کہا جاتا ہے، مغربی عیسائیت کا ناک نقشہ بدل کر رکھ دیا اور دین عیسوی کا ایک تیسرا مسلک یعنی پروٹسٹنٹزم وجود میں آ گیا۔سولہویں صدی کی اس اصلاحی تحریک نے درحقیقت پندرہویں صدی کی مذہبی اصلاح کی تحریکوں سے جنم لیا تھا۔چیک عالم اور مصلح جان ہس کا نام ان اولین افراد میں شامل ہے جنہوں نے مغرب میں پیدا ہونے والی تفرقہ پرستی اور چرچ کی بدکاریوں کو ختم کرنے کیلئے ریفارمیشن سے کوئی اک سو برس قبل ہی اپنی جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا۔ہم یہ بھی پڑھتے ہیں کہ جان ہس کو بدعتی قرار دے کر زندہ جلا دیا گیا تھا۔تاہم ان جیسی شخصیات کی کوششوں کے باوجود چرچ کی طاقت کو مزید سو سال تک غلط انداز سے استعمال کیا جاتا رہا تاوقتیکہ مارٹن لوتھر اور جان کیلون جیسے حضرات نے میدان میں آ کر ان بری روشوں کے سدباب کا بیڑا اٹھایا۔ان کا موقف تھا کہ پادری معافی نامے اور دیگر مذہبی سندیں بیچ کر عیسائیوں کا استحصال کرتے ہیں اور اس کے ساتھ مذہب کے نام کو بھی بٹہ لگاتے ہیں۔

مارٹن لوتھر نے ان کلیسائی خرابیوں کے خلاف اپنی جنگ کا آغاز 31 اکتوبر 1517ء کو عیسائیوں کے یوم مشائخ کے موقع پر کیا۔انہوں نے پہلی آواز توبہ اور کفارے کی خرید و فروخت کے خلاف بلند کی۔ان کا کہنا تھا توبہ اور بخشش خدا اپنی رحمت سے اپنے بندوں کو عطا کرتا ہے اور مذہب کے ٹھیکے داروں کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کے بدلے میں لوگوں سے مال بٹوریں یا ان

سے مشقت کرائیں۔ انہوں نے اپنے مشہور ''پچانوے مقالات'' میں اس بات کی بھرپور مذمت کی کہ پوپ اس بات کا تعین کرے کہ ابدی مسرت کا حقدار کون ہے اور کون نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہر کس و ناکس کو ہدایت و رہنمائی کیلئے صرف کتاب مقدس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ عیسیٰؑ کے ماننے والے کتاب مقدس پر اپنا ایمان مضبوط بنا کر نجات حاصل کر سکتے ہیں اور کسی بابے، پادری یا پوپ کی سیوا سے کچھ نہیں ملتا۔ لوتھر کی انہی باتوں کے سبب ان پر 1521ء میں مقدمہ چلا جس کے بعد انھیں انہی مسیحی برادری سے خارج کر دیا گیا۔

مصلحین کی ایک اور جماعت بھی تھی جو انقلابی مصلحین یا اینا بپٹسٹس کہلائے۔ یہ لوگ ابتداء میں ہلڈوچ رونگلی کے ساتھ تھے مگر بعد میں وہ ان سے الگ ہو گئے۔ وہ بائبل کی تعلیمات کی سختی سے پیروی کرنے کے قائل تھے اور ان کا خیال تھا کہ بپتسمہ بچپن میں نہیں بلکہ بلوغت پر دیا جانا چاہیے۔ اینا بپٹسٹس حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کو مثال بنانے کے قائل تھے جیسا کہ وہ ہمیں انجیل میں نظر آتی ہے۔ وہ مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے مکمل طور پر جدا کرنے کے حامی تھے اور یہ بات رومن کیتھولک مسلک کے لوگوں کو کسی صورت بھی گوارا نہ تھی۔

کیلونیت کیا ہے، اس کی شرح جان کیلون کی کتاب ''دسا تیر عیسائیت'' میں ہوئی جو 1536ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ ایک مفصل مذہبی تصنیف ہے جس میں ریفارمیشن کی توضیح نہایت خوش اسلوبی سے کی گئی ہے۔ کیلون مطلقیت ایمان کے مسئلے پر لوتھر کا ساتھ تو دیتا ہے لیکن چرچ اور ریاست کی علیحدگی کے معاملے پر وہ دیگر مصلحین سے جدا کھڑا نظر آتا ہے بلکہ اس کا خیال تھا کہ ان دونوں اداروں کو ایک ہونا چاہیے اور اگر وہ نہ ہوں تو انہیں ایک کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ اس کا موقف تھا کہ اگر انسانی والہامی دونوں قوانین موجود ہوں تو انسان بہتر زندگی بسر کر سکتا ہے۔

زیر بحث اصلاحی تحریک نے بہت سے پروٹسٹنٹ فرقوں کو جنم دیا جس سے یورپ بٹ کر رہ گیا۔ لوتھریت کو شمالی یورپ خصوصاً جرمنی میں زیادہ پذیرائی ملی۔ انتہا پسندی کو مشرقی یورپ میں فروغ حاصل ہوا جہاں پہلے بھی کئی رنگوں کے مسالک موجود تھے۔ جنوبی یورپ کیتھولک ہی رہا۔ انگلستان میں ایک جدا قسم کی مذہبی اصلاح دیکھنے میں آئی۔ اس کا آغاز بادشاہ ہنری ہشتم (1491ء۔1547ء) نے اپنی غرض پوری کرنے کیلئے کیا تھا۔ پوپ ہنری کو طلاق کا حق نہیں دیتا تھا اور ہنری نے کیا کیا کہ اپنا چرچ ہی الگ بنا لیا جو اینگلکن چرچ کے نام سے معروف ہوا۔ اس مسلک نے بادشاہ کو کھلی چھٹی دے دی کہ جسے چاہے طلاق دے اور جسے چاہے نہ دے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

مزید برآں اینگلکن مسلک والوں نے کہا کہ ہم لاطینی میں دعائیں کیوں مانگیں چنانچہ مذہبی تحریروں کو لاطینی سے انگریزی ترجمہ کیا گیا اور انگلستان والے بک آف کامن پریئر سے استفادہ کرنے لگے۔ سکاٹ لینڈ میں اصلاحی تحریک جان راکس (1514ء۔1572ء) نے متعارف کرائی اور ایک نئے مسلک یعنی پریسبیٹیرین چرچ کی بنیاد رکھی۔

ریمبراں (ہارمنزون) فان رائن (1606ء۔1669ء)

ہالینڈ کے ایک معروف مصور۔ ریمبران نے ایمسٹرڈم میں پیٹر لاسٹ کے سٹوڈیو میں تربیت حاصل کی۔ انہیں تاریخی و مذہبی موضوعات سے رغبت بھی اسی دور میں پیدا ہوئی۔ ریمبران 1625ء میں اپنی جائے پیدائش لیڈن میں واپس آ گئے جہاں انہوں نے تدریس کے علاوہ اپنے سو کے قریب پورٹریٹ تیار کیے جو ان کے فنی ارتقاء کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ وہ 1632ء میں ایمسٹرڈم واپس آئے اور ایک چوٹی کے پیکر نگار کے طور پر اپنے فن کا لوہا منوایا۔ ان ابتدائی تصویروں میں سے ''ڈاکٹر نکولاس ٹلپ کا اناٹومی کا سبق'' (1632ء) ریمبراں کی شبیہوں میں پائی جانے والی قوت حیوانی کی بہترین مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

ریمبراں کی تصویروں کی ایک اور نمایاں خاصیت روشنی اور سائے کا ڈرامائی استعمال ہے جو ''کیپٹن فرانز، بنینگ کوک کی صحبت'' (1642ء) جیسی تصویروں میں بہت نکھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

ریمبراں کے پاس اپنی مختصر لیکن آسودہ حال شادی کے بعد کے دونوں میں اچھے خاصے پیسے جمع ہو گئے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کی دلچسپی کا رخ پیکر نگاری سے مذہبی تصاویر اور لینڈ سکیپ کی طرف پھرتا چلا گیا جس سے ان کی مقبولیت کو زوال آنا شروع ہو گیا اور ان کے مالی حالات بھی خراب ہوتے چلے گئے۔ نتیجے کے طور پر انہوں نے 1656ء میں دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دیا اور انہیں اپنی جائیداد اور تصویریں بیچنا پڑیں۔ ان کی اس عہد کی تصویروں میں ''دی سنڈکس آف دی کلاتھ گلڈ'' (1661ء) اور ''دی بٹاویز'' (1663ء) شامل ہیں جن میں سے موخر الذکر فن پارے کی اب ایک دھجی ہی باقی رہ گئی ہے۔ چھ سو سے زائد تصاویر، تین سو تیزابی شبیہوں اور تقریباً دو ہزار خاکوں پر مشتمل ریمبراں کا یہ حیرت انگیز تخلیقی سرمایہ نہ صرف طبع زاد ہونے کی وجہ سے ہمیں متاثر کرتا ہے بلکہ اپنے موضوعات کی وسعت اور تنوع کی وجہ سے بھی۔

http://muftbooks.blogspot.com/

س

سارتر، ژاں پال (1905ء۔1980ء)

فرانسیسی فلسفی، نقاد، ڈرامہ نگار اور ناول نویس، سارتر نے (Ecole Normale Superieure) سے تعلیم حاصل کی جہاں ان کی ملاقات دو اور نوجوان دانشوروں سے ہوئی جنہوں نے آگے جا کر اپنی زندگی اور فرانس کی فکری تاریخ میں اہم کردار ادا کیا۔ ان دانشوروں سے مراد سیموں دی بووا (1908ء۔1986ء) جن سے سارتر کی پچاس برس تک قریبی رفاقت رہی اور لیبنغ کامیو (1913ء۔1960ء) ہیں جو کافی عرصہ تک سارتر سے مل کر کام کرتے رہے۔ سارتر تعلیم مکمل کرنے کے بعد کچھ عرصہ تک پیرس اور بیرون پیرس مختلف درسگاہوں کے ساتھ بطور معلم منسلک رہے اور پھر وہ دیگر یورپی ملکوں کی سیاحت کیلئے روانہ ہو گئے۔ جرمنی میں انکی ملاقات اس دور کے دو عظیم فلسفیوں ایٹ منٹ ہسیرل اور مارٹن ہائیدیگر سے ہوئی۔ سارتر نے ان دونوں حضرات سے مل کر بہت کچھ سیکھا جس کے اثرات ہمیں سارتر کی فکر پر بہت نمایاں طور پر ملتے ہیں۔

اس اثناء میں سارتر نے اپنا پہلا ناول ''متلی'' (1938ء) بھی شائع کیا جس نے انہیں بین الاقوامی صف کے ادیبوں اور دانشوروں کے ساتھ لا کھڑا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس تخلیق میں انسانی زندگی پر جاری ظلمت و بے معنویت کو آشکارہ کیا گیا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار رفتہ رفتہ اپنے دل میں مادی دنیا اور اپنے بدن دونوں کے لئے ناپسندیدگی اور حقارت کے جذبات پیدا کر لیتا ہے۔ ''متلی'' میں شعور کی رو جیسی جدید فنی تکنیک استعمال کی گئی ہے اور اس میں ہمیں سارتر کے وجودی فلسفے کی بنیادیں بھی تشکیل پاتی دکھائی دیتی ہیں۔ ''متلی'' کی اشاعت کے بعد ہوا یوں کہ سارتر کو 1939ء میں جنگ عظیم دوم میں فوجی خدمات ادا کرنے کیلئے بلا لیا گیا اور ان کی ادبی کاوشیں وقتی طور پر ٹھپ ہو کر رہ گئیں۔ اگلے ہی برس وہ جرمنوں کے ہتھے چڑھ گئے اور انہیں نو ماہ تک نازیوں کی حراست میں رہنا پڑا۔ پھر وہ جیسے تیسے فرار ہو کر زیر زمین سرگرم مزاحمتی عناصر کے ساتھ کام کرنے لگے۔

1943ء میں سارتر نے اپنی پہلی اہم فلسفیانہ تصنیف ''ہستی و نیستی'' شائع کی۔ اس تحریر کا بڑے مثبت انداز سے استقبال کیا گیا اور اس اشاعت سے سارتر وجودی تحریک کے بے تاج

http://muftbooks.blogspot.com/

بادشاہ بن گئے۔انہوں نے1945ء میں دی بووااور مرلو پونٹی سے مل کر بائیں بازو کا ایک وجودی رسالہ ''زمانہ نو'' (لے تاں ماڈین) بھی نکالا۔سارتر کے (اور وجودیت کے) بائیں بازو کی سیات کے ساتھ مراسم کی صورت کبھی واضح نہ ہوسکی۔ان کے کامیو اور میلو پونٹی کے ساتھ مراسم بھی سیاسی اختلافات کی وجہ سے ختم ہوئے۔سارتر نے مارکسی روش اختیار کر کے1956ء میں ہنگری میں روسی مداخلت تک سوویت نظام کی غیر متزلزل حمایت جاری رکھی۔ بعد ازاں انہوں نے سوویت اشتراکیت کی حمایت ترک کرنے کا اعلان کر کے اشتراکیوں سے تعلقات توڑ لئے۔ وہ اپنی 1960ء کی ایک تحریر ''تنقید عقل جدلیاتی'' میں مارکسیت اور وجودیت کے درمیان پوشیدہ روابط پر روشنی ڈالتے نظر آتے ہیں۔

سارتر نے بہت طویل عرصے کام کیا جس کے دوران انہوں نے بہت کچھ لکھا اور کہا۔انہوں نے ناولوں اور فلسفیانہ تصانیف کے علاوہ کئی ڈرامے بھی تحریر کئے جن میں بند دروازہ (1944ء) میلے ہاتھ (1948ء) شیطان اور نیک سردار (1951ء) زیادہ مشہور ہوئے۔انہیں1964ء میں ان کی ثقافتی و سیاسی کاوشوں اور کارناموں کے صلے میں ادب کے نوبل پرائز سے نوازا گیا۔ تاہم سارتر نے یہ انعام لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ایسے انعامات ادباء کے کارناموں کو دنیا کے سامنے غلط طور پر بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں جس سے ان کی سیاسی وابستگی دب کر رہ جاتی ہے۔

ساسانی خاندانی

ایک قدیم ایرانی شاہی خانوادہ۔ ساسانی خاندان کی بنیاد ارد شیر اول (حکومت 41-224ء) نے رکھی اور اس نے224ء سے لے کر651ء تک حکومت کی۔ یہ خاندان ارد شیر کے کسی بزرگ غالباً اس کے دادا کے نام سے موسوم ہوا۔اردشیر کے حکم پر ساسانیوں نے اشکانی فرمانروا آرٹا بارس کو شکست دے کر سلطنت کا دائرہ شمال میں موجودہ دور کے جارجیا سے لے کر جنوب میں عرب علاقے مازون تک وسیع کر لیا تھا اور مشرق میں ساسانی سلطنت کی سرحدیں دریائے سندھ اور مغرب میں دجلہ و فرات کی وادیوں تک جا پہنچی تھیں۔اردشیر کے لڑکے شاپور اول (حکومت72-241ء) نے اپنے باپ کی چھوڑی ہوئی سلطنت کو مزید وسعت دی اور 258ء یا259ء میں رومن شہنشاہ ویلرین کو بھی پچھاڑ ڈالا۔

ساسانی عہد میں ایرانی قوم پرستی کو بہت جلا ملی۔ مجوسیت کو سرکاری مذہب بنا دیا گیا اور زرعی و تعمیراتی منصوبوں کیلئے ایک مرکزی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ساسانی دور میں فنون لطیفہ خصوصاً فن تعمیر نے خوب نشو ونما پائی جو ان کے پایہ تخت ٹیسفون اور فیروز آباد کے عالی شان محلات سے

http://muftbooks.blogspot.com/

ظاہر ہے۔ ساسانی خاندان یزدگرد سوم کے دور اقتدار میں عرب فاتحین کے ہاتھوں تاراج ہوا جن کے حملے 637ء سے لے کر 651ء تک جاری رہے۔ کئی ساسانی ادارے ان شکستوں کے باوجود بھی فعال رہے اور عہد عباسیہ پر اثرات مرتب کرتے رہے۔

سالواڈور، گوسنز آئندے (1908ء-1973)

چلی کے ایک سیاسی رہنما سالواڈور پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے اور وہ سیاست اور طب دونوں شعبوں میں بہت فعال رہے۔ اُن کا شمار 1933ء میں چلی کی سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد رکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ بعد میں وہ چلی کی مخلوط حکومتوں میں سینیٹر اور وزیر صحت کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔ اپنی تمام تر سیاسی مصروفیات کے باوصف آئندے نے طب کے میدان میں بھی لوگوں کی خدمت جاری رکھی۔ انھوں نے چلی کے متعدد طبی اداروں کے ساتھ کام کیا، کئی کانگرسوں میں شرکت کی، طبی جرائد کی ادارت کے فرائض سرانجام دیے نیز 1940ء میں ''چلی کی طبی وسماجی صورت حال''، کے عنوان سے ایک کتاب بھی شائع کی جسے ایک ادبی انعام سے بھی نوازا گیا۔ سوشلسٹ پارٹی نے اسے پہلی بار 1952ء میں صدارت کے لیے نامزد کیا۔ اگرچہ انتخابات میں وہ آخر پر رہے لیکن اس سے ان کی شہرت چلی کے سرکردہ اشتراکی کی حیثیت سے مستحکم ہوگئی۔ انھوں نے Frente de Accion popular (Frap) اور 1957ء میں مختلف اشتراکی دھڑوں کے درمیان دوبارہ اتحاد بنانے میں بھی بہت اہم کردار ادا کیا۔ 1958ء میں انھوں نے دوبارہ صدارتی انتخاب میں حصہ لیا لیکن تھوڑے سے فرق سے ہار گئے۔ آئندے 1964ء میں پھر ہارے کیونکہ کیوبا کے میزائلوں کے مسئلے کی وجہ سے اس وقت تک عوامی جذبات مارکسیت کے خلاف ہو چکے تھے۔

وہ بالآخر 1970ء میں پاپولر یونٹی کے امیدوار کی حیثیت سے کامیاب ہوئے۔ ان کی کامیابی اس پارٹی میں اشتراکیوں، کمیونسٹوں، انقلابیوں اور بعض منحرف عیسائی جمہوری لیڈروں کی حمایت کی وجہ سے ممکن ہوئی۔ آئندے نے 1970ء میں جمہوری طریقے سے اقتدار تک پہنچنے والے پہلے مارکسی سربراہ حکومت کی حیثیت سے صدارت کا منصب سنبھالا۔ حکومت میں آکر آئندے نے معاشرے کی اشتراکی خطوط پر تعمیر نو کا عمل شروع کیا۔ انھوں نے جمہوری طرز حکومت اور شہری آزادیوں اور مروج قانونی نظام کے احترام کا وتیرہ برقرار رکھا۔ انھوں نے ریاستی کنٹرول کے ایک پروگرام پر عمل کرتے ہوئے معدنی ذخائر، غیر ملکی بنکوں اور اجارہ دار کمپنیوں کو قومیانے کا اعلان کیا۔ ان کے چلی میں کام کرنے والی امریکی تانبہ کمپنیوں کو بلا کسی معاوضے کے

قومی ملکیت میں لینے کے اقدام سے امریکہ ان کا مخالف ہو گیا اور غیر ملکی سرمایہ کاروں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی۔ آئندے نے بڑی بڑی زرعی جاگیریں قبضے میں لے کر انھیں کسانوں کی انجمنوں کے حوالے کر دیا اور آمدنیوں کے از سر نو تعین کے لیے اجرتوں میں بڑے پیمانے پر اضافے کیے اور قیمتوں کی حدود مقرر کر دیں۔ 1972ء تک چلی شدید معاشی بحران کا شکار ہو چکا تھا جس سے ملک گیر ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ قیمتیں آسمان کو جا لگیں۔ غذائی قلت پیدا ہو گئی اور داخلی خلفشار انتہا کو پہنچ گئی۔ بین الاقوامی قرضہ جات صرف ہو گئے اور آئندے اپنے حمائیتوں میں شامل انتہا پسند عناصر کو قابو میں نہ رکھ سکے جس سے متوسط طبقوں میں مخالفت کی فضا پیدا ہو گئی۔ 1973ء میں امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے کی پشت پناہی سے برپا ہونے والی ایک فوجی بغاوت میں ان کا تختہ الٹ دیا گیا۔ آئندے کو صدارتی محل پر حملے کے دوران قتل کر دیا گیا اور ایک قدامت پسند فوجی حکومت نے جنرل پنوشے کی قیادت میں اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

سانتا کلاز

وہ تخیلاتی بزرگ جو کرسمس کے موقع پر بچوں کیلئے تحفے لے کر آتے ہیں۔ سانتا کلاز اصل میں سینٹ نکولاس کو کہا جاتا ہے جو پندرہویں صدی میں ایشیائے کوچک میں ایک پادری تھے۔ ان سے خیر عامہ کے بہت سے کام منسوب ہیں۔ ایک دفعہ تین خواتین نے غربت سے تنگ آ کر بدکاری کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ نکولاس نے کیا کیا کہ چمنی کے ذریعے چپکے سے ان کے گھر داخل ہو گئے اور ان کی جرابوں جو کہ خشک کرنے کیلئے لٹکائی گئی تھیں، میں سونا ڈال کر آرام سے باہر آ گئے۔ سینٹ نکولاس سے منسوب یہ حکایات خدا جانے کیسے نیو ایمسٹرڈم اور امریکہ کی دیگر ڈچ نو آبادیوں تک پہنچیں اور یہاں انہوں نے ان نارڈک قصوں سے امتزاج کر کے موجودہ رنگ کے اختیار کیا جن میں ایک تحفے بانٹنے والا ان بچوں کیلئے تحائف چھوڑ کے جاتا ہے جو گزشتہ برس اچھے بچوں کی طرح پیش آتے رہے ہوں۔ تاہم تحفے تحائف دینے کے ان مواقع کا تعلق عیسائی مذہب سے نہیں۔ کم از کم چار ایسے یونانی اور رومن تہواروں کا تحریری ذکر ملتا ہے جن کی جگہ کرسمس نے لی۔ ان میں سے دو یعنی کیلنڈز اور سیٹرنیلیہ بڑے پر مسرت تہوار ہیں اور انہیں بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ تیسرا البانیس کا تہوار ہے جس میں زور تحائف کے لین دین پر ہوتا ہے۔ چوتھا تہوار ڈیوس سول انوٹکس ہے جو 25 دسمبر کو ہوا کرتا تھا۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں کرسمس منانے کی جو تاریخ مقرر ہے اس کی یہی وجہ ہے۔ لگتا یہی ہے کہ عیسائیت نے یورپ میں اپنے ابتدائی دور کے دوران بہت سے غیر عیسائی تہواروں اور رسموں کو

http://muftbooks.blogspot.com/

بھی اپنے میں شامل کرلیا تھا۔

ان وجوہ کی بنا پر تحفے دینے والی ہستی مختلف ثقافتوں میں مختلف روپ میں نظر آتی ہے۔ بعض ملکوں مثلاً جرمنی، آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ میں تصور کیا جاتا ہے کہ ننھے عیسیٰ کا اوتار تحفے دیتا ہے اور وہ اسے کرائسٹ کنڈل یا کرس کرنگل کہتے ہیں۔ بعض معاشروں کے تہوار سے تو صاف صاف پتہ چل جاتا ہے کہ اس کی ابتداء عیسائیت سے نہیں ہوئی مثلاً سکنڈے نیویا ممالک میں تحفے تین شیطان روحوں سے لیے جاتے ہیں۔ پولینڈ میں آپ کو ان دونوں وتیروں کا امتزاج ملے گا۔ پولینڈ والے تحفوں والے کو سٹارمین کہتے ہیں۔ قیاس ہے کہ اسے اس کی بیت اللحم کے ستارے سے نسبت کی وجہ سے یہ نام دیا جاتا ہے۔ فرانس میں تحفے دینے والا پیئر نول، انگلستان میں فادر کرسمس اور روس میں گرینڈ فادر فراسٹ کہلاتا ہے۔ روس کے تہوار میں لگتا ہے سانتا کلاز کے بشمول بہت سی چیزیں امریکی تہوار سے مستعار لی گئی ہیں۔ آج کل کے جاپان کو بھی ایک ایسی ہی مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے جہاں تہواروں پر تحفے تحائف دینے کا رواج بہت عام ہوگیا ہے اور اسے سانتا کلاز سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اگرچہ کچھ جاپانیوں نے تحفے دینے کی رسم تو لے لی ہے لیکن وہ تحفے بانٹنے والے کا کردار ایک دیوتا ہوٹیوشو سے منسوب کرتے ہیں۔

سامبا

ایک برازیلی رقص۔ اس کا اصل وطن مغربی افریقہ ہے اور اس نے کانگو اور انگولا کے بعض رقصوں سے چیزیں مستعار لی محسوس ہوتی ہیں۔ سامبا کوئی ایک رقص نہیں بلکہ اس اصطلاح کے دائرے میں کئی ناچ آجاتے ہیں جن میں پیروں کو ایک خاص انداز سے آگے اور پیچھے حرکت دی جاتی ہے اور جسم کو مختلف طریقوں سے جھکایا یا جھلایا جاتا ہے۔ لوک سامبا کی ایک اور خاص بات ''امبی گادا'' یعنی دوسروں کو رقص میں شامل ہونے کی دعوت دینا ہے جس میں جوڑے نافوں کو چھوتے ہیں۔ یہ روایت تقریباً تمام برازیلی رقصوں کا حصہ ہے۔ اس رقص کے ساتھ گانا لازم و ملزوم ہے۔ جس میں شرکاء عموماً ایک دوسرے کے جواب میں ٹپے بولتے ہیں اور ٹیپ کا مصرعہ اور گانے کے بند باری باری گائے جاتے ہیں۔ سامبا کی کئی قسمیں ہیں۔ رقص گاہوں کے پرتکلف ماحول میں پیش کیا جانے والا سامبا مختلف ہے، شہروں اور میلوں ٹھیلوں میں پیش کیا جانے والا سامبا اور ہے اور ریوڈی جنیرو کی مفلس پہاڑی بستیوں میں پیش کیے جانیوالے سامبا (باٹو کاڈا) کا اپنا انداز ہے۔ باٹو کاڈا میں شرکاء ملکر دائروں یا قطاروں کی شکل میں ناچتے ہیں۔ رقص گاہ والے سامبا کو 1940ء کے عشرے میں امریکہ اور مغربی یورپ میں بہت مقبولیت ملی۔ اس رقص میں

http://muftbooks.blogspot.com/

آرکسٹرا کا انتظام بھی کیا جاتا تھا۔

سائمن، بولیور (1783ء۔1830ء)

لاطینی امریکہ کا ایک جرنیل اور مدبر۔ اس نے ہسپانوی استعمار کے خلاف پے در پے کئی انقلابی تحریکوں کی قیادت کی اور کولمبیا، وینیز ویلا، ایکواڈور، پیرو اور بولیویا پر مشتمل خطے کو آزادی وخودمختاری سے ہمکنار کیا۔ وہ وینیز ویلا کے ہسپانوی نسل کے ایک نواب گھرانے میں پیدا ہوئے لیکن ان کے والد بچپن میں ہی اس دنیا سے چلے گئے۔ بولیور نے اپنی تعلیم سپین کے شہر میڈرڈ میں مکمل کی۔ وہ جب 1804ء میں یورپ واپس آئے تو یہ نپولین بوناپارٹ کے عروج کا وقت تھا۔ وہ اس فرانسیسی جرنیل سے بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے دل میں تہیہ کرلیا کہ وہ بھی امریکہ کو غیر ملکی طاقتوں کے پنجے سے چھڑا کر ہی دم لیں گے۔

جب 1810ء میں کاراکس میں ہسپانوی کیپٹن جنرل کا تختہ الٹا گیا تو بولیور نے جو کہ اس وقت لندن میں تھے جلاوطن انقلابی رہنما فرانسسکو ڈی مرنڈا کو مشورہ دیا کہ وہ ان کے ساتھ واپس جا کر تحریک آزادی کی قیادت سنبھالیں۔ وینیز ویلا نے 1811ء میں آزادی کا اعلان کیا لیکن ایک مرتبہ پھر ہسپانوی افواج کے نرغے میں آ گیا۔

بولیور نے اپنی پہلی سیاسی تصنیف ''منشور کارٹجنا'' 1812ء میں کارٹجنا کو فرار ہوتے ہوئے لکھی۔ انھوں نے ایک نئی فوج تشکیل دی، ہسپانویوں کو شکست دی اور 1813ء میں کاراکس میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور ایک مرتبہ پھر وینیز ویلا کی آزادی کا اعلان کیا۔ انھیں ''نجات دہندہ'' کا لقب دیا گیا اور وہ ملک کے سیاہ وسپید کے مالک بن گئے۔ لیکن ان کی یہ فتح اور وینیز ویلا کی یہ نئی ریاست صرف ایک سال ہی برقرار رہ سکی۔

بولیور کو ایک دفعہ پھر جلاوطنی اختیار کرنا پڑی۔ جمیکا میں اپنے قیام کے دوران انھوں نے ایک بار پھر برطانیہ کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے۔ اس کے لیے انھوں نے ''مکتوب از جمیکا'' تحریر کی جسے ان کی زندگی کی عظیم ترین تصنیف قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے آزادی کے منصوبے کا خاکہ پیش کیا اور یہ رائے دی کہ لاطینی امریکہ میں برطانوی حکومت کی طرز پر آئینی اور جمہوری ریاستیں قائم کی جائیں۔ ان کا مقصد پورے ہسپانوی امریکہ میں سیاسی اتحاد قائم کرنے کے لیے میکسیکو وسطی امریکہ، شمالی ممالک اور جنوبی ممالک پر مشتمل ایک فیڈریشن قائم کرنا تھا۔

انھوں نے 1819ء میں نیوگرینیڈا پر حملہ کر کے سانتافے دے لوگاٹا پر یلغار کی جسے عسکری

http://muftbooks.blogspot.com/

تاریخ کی ممتاز ترین مہمات میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے سپاہیوں نے ہسپانوی فوجوں کو اچانک دبوچنے کے لیے ایسے علاقوں میں سے مارچ کیا جن کے بارے میں ہسپانوی عسکری قیادت کا خیال تھا کہ کوئی مائی کا لال انھیں عبور نہیں کرسکتا۔ جنگ بویا کا میں بیشتر شاہی فوج کو بولیور کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے۔ اگرچہ ہسپانوی استبداد کا مکمل خاتمہ 1821ء میں جنگ کارابوبو کے موقع پر ہوا، فتح بویا کا کو شمال جنوبی امریکہ کی تاریخ میں ایک انتہائی اہم موڑ کی حیثیت حاصل ہے۔

بولیور نے دسمبر 1819ء میں جمہوریہ گرین کولمبیا کے صدر اور فوجی آمر کا عہدہ سنبھالا اگرچہ ونیز ویلا اور کوٹو (ایکواڈور) ابھی تک شاہی فوجوں کے قبضے میں تھے۔ چھ ماہ کی جنگ بندی کے بعد بولیور نے کارابوبو کی لڑائی لڑ کر ونیز ویلا کو بھی آزاد کرالیا۔ اسی سال خزاں کے موسم میں کولمبیا کے آئین کی تشکیل کے لیے ایک کانگریس کا انعقاد ہوا لیکن اس کی پیش کردہ سفارشات بولیور کو نہ بھائیں اور اس نے مایوس ہو کر کولمبیا کی حکومت فرانسسکو ڈی پاؤلا سانتاندر کے حوالے کردی۔ ان کا خیال تھا کہ ان سفارشات سے فیڈریشن کی بقا کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ انھوں نے ایکواڈور کی خودمختاری کے لیے اپنی فوجی مہم جاری رکھی اور سال کے آخر تک اسے بھی آزاد کرا لیا۔ اس مہم میں انھیں انٹونیو ہوزے ڈی سوکرا کی مدد بھی حاصل تھی جس کا شمار بولیور کے سب سے شاندار افسروں میں ہوتا ہے اور جو بولیویا کا پہلا آئینی صدر بنا۔ بولیور کی اپنی محبوبہ مینیولا سائنز سے ملاقات بھی یہیں پر ہوئی۔ جو ایک جری انقلابی کارکن تھی۔ اس نے میدان جنگ سے لے کر صدارتی محل تک بولیور کا ساتھ نبھایا۔

اب صرف پیرو کو آزادی دلانا باقی تھی۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ہوزے ڈی سان مارٹن سے مل کر کام کیا جو اس سے قبل ارجنٹینا اور چلی کو آزاد کرا چکا تھا۔ سان مارٹن بولیور کی آمد سے قبل ہی لیما میں داخل ہو کر پیرو کی خودمختار کا اعلان کر چکا تھا لیکن وہ اس وقت تک ہسپانوی فوجوں کا مکمل صفایا نہ کر پایا تھا۔ دونوں فوجی رہنماؤں کی ملاقات ایکواڈور میں ہوئی جس میں انھوں نے ممکنہ حکمت عملی پر بات چیت کی مگر علاقائی سرحدوں اور لاطینی امریکہ کے سیاسی ڈھانچے پر اتفاق رائے نہ ہوسکا۔ سان مارٹن نے اپنی فوجیں پیچھے ہٹا کر لیما میں اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور سب کچھ بولیور کے ہاتھ میں دے کر خود ایک طرف ہوگیا۔ بولیور کی فوجی مہم کامیاب رہی اور سپین نے 1824ء میں شکست تسلیم کرلی۔

بولیور 1825ء تک گرین کولمبیا، پیرو اور بولیویا کا صدر بن چکا تھا لیکن اس کے متعارف کردہ آمرانہ دساتیر کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ 1826ء میں ہسپانوی امریکی ریاستوں کا ایک اتحاد

http://muftbooks.blogspot.com/

عمل میں آ گیا۔ بولیور کے انتقال کے دنوں میں بدامنی اور افراتفری کا دور دورہ تھا۔ وہ لیما کی حکومت چھوڑ کر گرین کولمبیا کے مطلق العنان حکمران بن گئے۔ اس دوران ان پر ایک قاتلانہ حملہ بھی ہوا جس میں وہ بال بال بچ گئے۔ بعد میں انھوں نے کولمبیا کے ایک فارم ہاؤس میں پناہ لے لی جہاں وہ تپ دق میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

سپینوزا، باروخ (1632ء۔1677ء)

ایک عظیم ولندیزی فلسفہ دان۔ سپینوزا نے اندلسی یہودیوں کے ایک خاندان میں آنکھ کھول جو مذہبی جبر سے تنگ آ کر ہالینڈ آ آباد ہوا تھا۔ سپینوزا نے ایمسٹرڈم کے ایک آرتھوڈوکس یہودی مدرسے سے تعلیم حاصل کی جہاں انھیں علوم دینیہ اور فلسفہ پڑھایا گیا۔

سپینوزا کے فلسفی بننے کے زیادہ امکانات نظر نہیں آتے تھے۔ وہ ایک سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور پیشے کے اعتبار سے ایک عدسہ تراش تھے۔ اس کے باوجود کہ انھوں نے سترھویں صدی کے منطقی اور وحدت الوجودی مکاتیب کے امام کی حیثیت حاصل کر لی۔ وحدت الوجود نے خدا، انسان اور فطرت کو ایک ہی وجود کے پرتو قرار دیا اور ان کے درمیان کسی قسم کی علیحدگی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

سپینوزا کے مذہبی افکار اور ان کی بائیبل سے متعلقہ تاویلات کو بدعتی قرار دے کر انھیں 1656ء میں یہودی برادری سے خارج کر دیا گیا۔ اسی اثناء میں انھوں نے اپنا عبرانی نام براک کر کے لاطینی نام بنیڈکٹ اختیار کر لیا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں صرف ایک کتاب شائع کی جس کا عنوان ''فلسفۂ مذہب وسیاست'' (1670ء) ہے۔ انھیں 1673ء میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں پروفیسر کا عہدہ پیش کیا گیا لیکن انھوں نے یہ سوچ کر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ کہیں اس سے ان کی آزادی فکر نہ چھن جائے۔ سپینوزا بہت خاموش اور پرسکون زندگی کے عادی تھے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے عہد میں بہت مشہور ہوئے۔ بہت سے لوگ ان کے پاس آتے جاتے تھے اور کئی افراد سے ان کی خط و کتابت چلتی رہی۔ انکی موت تپ دق کے مرض سے واقع ہوئی جو غالباً انھیں عدسوں کی گرد سے لاحق ہوئی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی اہم تصنیف ''اخلاقیات'' (1677ء) شائع ہوئی نیز ان کے خطوط اور دیگر فلسفیانہ تحریریں بھی منظر عام پر آئیں۔

ستار

ہندوستان کا ایک آلہ موسیقی۔ یہ آلہ طویل ہوتا ہے جس پر تاریں لگی ہوتی ہیں اور ایک سرے پر بڑے کدو کی شکل کا ایک عضو ہوتا ہے۔ جسے زمین پر ٹکایا جاتا ہے۔ یہ عضو دونوں سروں پر بھی ہو سکتا ہے۔ اس پر تین سے سات تک کی تعداد میں تار کس کے باندھے جاتے ہیں جنہیں چاروں یا پانچوں (یا دونوں میں) ٹیون کیا جاتا ہے۔ نیچے بارہ تاروں کا ایک الگ سیٹ ہوتا ہے جو پہلے سیٹ کے ساتھ مرتعش ہوتا ہے۔ ستار بجانے کا مظاہرہ اکیلے یا چھوٹے طائفے کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ ستار ہندوستان کی ایجاد ہے اور اسے 1960ء کے عشرے میں عظیم بھارتی فنکار روی شنکر نے مغرب میں متعارف کرایا۔

ستی

ہندوؤں کی ایک مذہبی رسم۔ لغوی اعتبار سے اس لفظ کا مفہوم ''باعصمت بیوی'' ہے اور اس سے مراد وہ رسم لی جاتی ہے جس میں بیوہ اپنے آنجہانی شوہر کی چتا میں بیٹھ کر خود کو بھی بھسم کر لیتی ہے۔ ممکن ہے کہ بہت سی بیوائیں اپنی مرضی سے خود کو ہلاک کر لیتی ہوں لیکن ہندوستان میں اس رسم کی تاریخ جبر و فرار کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اس نوع کی ایک اور رسم ''جوہر'' بھی سننے میں آتی ہے جس میں بیوی جنگ میں اپنے خاوند کی متوقع ہلاکت کے پیش نظر خود کو ختم کر لیتی تھی تاکہ وہ دشمنوں کے ہاتھ آنے سے بچی رہے۔ جوہر کا ہندوستان میں مسلم بادشاہوں کے دور میں راجپوتوں میں خاص طور پر بہت رواج رہا۔

ستی کی رسم میں مرنے والی خواتین کی یاد میں نصب 510ء تک کے پرانے کتبے اور لوح ملتی ہیں۔ بیوہ سوزی کی یہ رسم غالباً اس قدیم ہندی عقیدے کی وجہ سے وجود میں آئی جس کے مطابق مرنے والے کو دوسری دنیا میں بھی ساتھیوں کی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی کہ اس دنیا میں۔ اگر آپ اس رسم کی ابتداء کو کھوجنے کی کوشش کریں تو آپ کو ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتاب مہابھارت میں بھی اس کے کئی حوالے ملیں گے۔ اس رسم کے پھیلاؤ کی ایک وجہ وہ معاشی مشکلات بھی ہو سکتی ہیں جن میں سے قدیم دور کی غریب بیواؤں کو گزرنا پڑتا تھا۔

1680ء سے 1830ء کے درمیانی عرصے میں اس رسم کو بنگال کے براہمن طبقے میں بہت ترقی ملی جس کی بڑی وجہ غالباً ان کا وہ نظام قانون (اندازاً 1100ء) تھا جس کے مطابق پتی کی موت پر ترکہ بیواؤں کے حصے میں آتا تھا۔ ہو سکتا ہے اس قانون کی وجہ سے لالچی رشتہ دار بیواؤں کو ترغیب یا جبر سے موت کے منہ میں دھکیل دیتے ہوں۔

مغل شہنشاہ ہمایوں اور اس کے بیٹے اکبر کا نام ان شخصیات کی فہرست میں سب سے پہلے

آتا ہے جنہوں نے اس بری رسم کو ختم کرنے کیلئے مؤثر اقدامات کئے۔ بعد میں راجہ رام موہن رائے اور رومیش چندر دت جیسے حضرات نے بھی اس سلسلے میں بہت جدوجہد کی۔ ہندوستان کے انگریز حکمرانوں نے اس رسم کے خلاف بڑھتے ہوئے احتجاج کے پیش نظر بالآخر اسے 1829ء میں خلاف قانون قرار دے دیا۔ اس کے باوجود پولیس کی 1987ء کی ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق اس برس بھارت میں ستی کے 1187 واقعات پیش آئے جبکہ احمد آباد ویمنز ایکشن گروپ کے ایک تخمینے کے مطابق اس برس صرف گجرات کی ریاست میں ہزار سے زائد عورتیں ستی کی رسم کی نذر ہوئیں۔ دوسری طرف ایک سروے کے مطابق بھارت کی ریاست مہاراشٹر اور ممبئی میں پندرہ سے چوبیس برس کی عمر میں ہلاک ہونے والی خواتین میں سے انیس فیصد ''حادثاتی طور پر آگ لگنے سے موت کا شکار ہوتی ہیں۔

سٹالن، جوزف (1879ء۔1953ء)

سوویت کمیونسٹ رہنما۔ ان کا اصل نام آئیوسف وساریونووچ زوگاش ولی تھا۔ وہ جارجیا کے ایک انتہائی غریب گھرانے میں پیدا ہوئے جو 180ء سے روسیوں کے تسلط میں تھا۔ سٹالن کے والد ایک جوتا ساز تھے جو سٹالن کے لڑکپن میں ہی ایک دنگے میں مارے گئے۔ اس کے بعد ان کی والدہ نے تنہا تگ ودو کر کے انھیں تعلیم دلوائی تا کہ ان کا بیٹا پادری بن سکے لیکن وہ مدرسے میں ہی تھے کہ انھوں نے جارجیا کی قوم پرست تحریک کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا اور انھیں سیاسیات خصوصاً مارکسی نظریے سے گہری دل چسپی پیدا ہوگئی۔ انھیں ان کے انقلابی نظریات کی پاداش میں 1899ء میں مدرسے سے خارج کر دیا گیا جس پر انھوں نے زیر زمین سوشل ڈیموکریٹک موومنٹ میں شمولیت اختیار کر لی۔ یہاں سٹالن کی روسی کمیونسٹ لیڈر ولادی میر لینن سے پہلی ملاقات ہوئی اور انھوں نے لینن کی بالشیوک جماعت کی حمایت کا اعلان کر دیا لیکن وہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے گرفتار ہوئے اور انھیں جیل میں ڈال دیا گیا جس کی وجہ سے وہ بالشیوکوں کی تحریک میں زیادہ سرگرم حصہ نہ لے سکے۔

1917ء میں زار حکومت کے خاتمے کے بعد انھیں سائبیریا کی جلاوطنی سے رہا کر دیا گیا اور انھوں نے لینن اور دوسرے سرکردہ بالشیوک رہنماؤں کے ساتھ مل کر کام کرنا شروع کر دیا۔ پارٹی میں ان کی حیثیت اور کردار میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا اور 1922ء میں انھیں کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سیکرٹری بنا دیا گیا۔ یہ عہدہ کمیونسٹ پارٹی میں انہی دنوں متعارف کرایا گیا تھا۔ ابتدا میں جنرل سیکرٹری کے ذمے صرف انتظامی امور تھے لیکن بعد میں یہ عہدہ پارٹی کے قائد کے پاس

http://muftbooks.blogspot.com/

چلا گیا۔

اسی برس لینن اور سٹالن کے مابین اختلافات پیدا ہو گئے۔ ان کی روسی ریاست میں اقلیتوں کی سیاسی خودمختاری کے مسئلے پر پہلے ہی نااتفاقی چلی آتی تھی۔ سٹالن کی تجویز تھی کہ ان نسلی گروہوں کو متحدہ سوویت ریاست میں ضم کر لیا جائے جبکہ لینن ایک کنفیڈریشن بنانے کے حق میں تھے۔ 1924ء میں لینن کے انتقال کے بعد پارٹی کے اندر اقتدار کی رسہ کشی میں سٹالن نے فتح حاصل کر لی اور وہ 1920ء کے عشرے کے آخر میں پارٹی کے قائم مقام سربراہ بن چکے تھے۔ اس حیثیت میں سٹالن پارٹی کے نظریے کے باقاعدہ ترجمان بن گئے اور انھوں نے پارٹی کی ایک ایسی پالیسی وضع کی جو ان کے مطابق لینن کے تصورات کے عین مطابق تھی لیکن اس میں انحراف کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس پالیسی کے مطابق ٹراٹسکی کے عالمی پیمانے پر ''مسلسل انقلاب'' کے تصور کی جگہ ''ایک ملک میں اشتراکیت'' کا قوم پرستانہ تصور اپنا لیا گیا۔ (ٹراٹسکی کو 1940ء میں میکسیکو سٹی میں غالباً سٹالن کے حکم سے قتل کر دیا گیا تھا۔

اب سٹالن کے راستے میں کوئی ایسی مخالفت نہ تھی جو ان کی پالیسیوں کی مزاحمت کر پاتی چنانچہ انھوں نے بڑے پیمانے پر زراعت وصنعت کی اجتماعیت کا عمل شروع کر دیا جسے پانچ سالہ منصوبے کا نام دیا گیا۔ اگرچہ اس کا شمار سٹالن کے بڑے کارناموں میں کیا جاتا ہے، مگر اس منصوبے کے طویل المدتی فوائد کے بارے میں متضاد آراء پائی جاتی ہیں۔ یہ منصوبہ یوکرائن کے دیہی علاقوں میں شدید قحط کا باعث بنا جس سے کئی لاکھ لوگ موت کا شکار ہوئے۔

ثقافتی میدان میں بھی سٹالن نے عوام پر طرح طرح کی پابندیاں مسلط کر دیں۔ جو لوگ سٹالن کے نظریات کے مخالفت ہوتے تھے اور پارٹی سے ''وفاداری'' نہیں کرتے تھے انھیں قید میں ڈال دیا جاتا تھا یا پھر عقوبتی کیمپوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔ پہلے پہل تو ان جابرانہ اقدامات کے لیے جھوٹے مقدمات کا سہارا لیا گیا لیکن بعد میں سٹالن انتظامیہ نے زیادہ ننگا طرزِ عمل اختیار کر لیا۔ 1930ء اور 1940ء کے عشروں میں لاکھوں دانشوروں اور مشکوک خیال کیے جانے والے افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا یا پھر انھیں جبری مشقت کے کیمپوں کے سپرد کر دیا گیا۔ جب دوسری عالمی جنگ کا آغاز ہوا تو ان جابرانہ ہتھکنڈوں میں قدرے نرمی دیکھنے میں آئی اور سٹالن نے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے سوویت فتح میں نمایاں کردار ادا کیا۔ تاہم ان کی ماضی کی غلط پالیسیوں نے روسی دفاع کو بہت کمزور کر دیا تھا جس سے سوویت یونین کو لاکھوں شہریوں کی ہلاکت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک تخمینے کے مطابق جنگ عظیم دوم میں پچاس ملین افراد مارے گئے

http://muftbooks.blogspot.com/

تھے جن میں بیس ملین روسی تھے۔

جنگ عظیم کے بعد سٹالن کی مطلق العنانیت میں اور بھی اضافہ ہو گیا، اگرچہ جنگ کے اختتامی دنوں میں انھوں نے سوویت مفادات کا بھرپور طریقے سے دفاع کیا اور مشرقی یورپ میں بہت سی کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ وہ فوجی ترقی کے بارے میں بہت سنجیدہ تھے اور انھوں نے مغربی ممالک سے سرد جنگ کے سفارتی تعلقات کی بنا رکھی۔ داخلی محاذ پر انھوں نے پارٹی کانگرس بلکہ سینٹرل کمیٹی کے اجلاسوں کو بھی پورے ایک عشرے تک معطل کیے رکھا اور چند ساتھیوں کے ہمراہ اکیلے اقتدار پر چھائے رہے۔ سٹالن 1953ء میں دماغ کی شریان پھٹنے سے انتقال کر گئے اور انھیں ماسکو کے ریڈ سکوئیر میں لینن کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔

سرویتیز [ساویدرا]، (1547ء۔1616ء) مسگل ڈی

سپین کا ناول نویس، ڈرامہ نگار اور شاعر۔ ایک ادیب کی حیثیت سے اس کی بڑی وجہ شہرت اس کا معروف عالم ناول ڈان کیہوٹی ہے جو اس نے دو الگ الگ حصوں میں بالترتیب 1605ء اور 1615ء میں شائع کیا۔ اسے ایک عالمی کلاسیک کا درجہ حاصل ہو چکا ہے اور یہ اکثر ادبی تاریخ کے بہترین ناولوں کی فہرستوں میں پہلے یا دوسرے نمبر پر رکھا ملتا ہے۔

سرویتیز طبعاً ایک مہم جو قسم کے شخص تھے۔ انھوں نے 1569ء میں اٹلی کا سفر کیا اور لے پانٹو کی بحری جنگ میں حصہ لیا جس دوران ان کا بایاں ہاتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بیکار ہو گیا۔ 1575ء میں سپین واپسی کے سفر کے دوران ان کا جہاز بحری قزاقوں کے ہتھے چڑھ گیا جو انھیں اور ان کے بھائی کو غلام بنا کر الجیریا لے آئے۔ انھوں نے فرار ہونے کی کئی کوششیں کیں لیکن ہر مرتبہ ناکام رہے اور ان کے آئندہ پانچ برس حراست میں ہی گزر گئے۔ آخر کار کچھ عیسائی راہبوں نے ایک خطیر رقم تاوان ادا کر کے ان کی جان بخشی کرائی۔ وطن واپسی پر انھوں نے شادی کی، ایک ناجائز بچے کے باپ بنے اور بحریہ کے ایک عہدے پر کام کرنے لگے۔ تاریخی دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں اور ان کے خاندان کو انتہائی کسمپرسی کے دن بھی گزارنا پڑے۔

ڈان کیہوٹی 1605ء میں شائع ہوا اور جلد ہی کامیابی کی منزلوں کو چھونے لگا اور اس سے اس کے تخلیق کار کے مالی حالات بھی بہتر ہونے لگے۔ سرویتیز نے یہ ناول رومانوی ادب پر طنز کے لیے تحریر کیا تھا جو قرون وسطیٰ کی معاشرت اور اس کے کیش شجاعت (Chivalry) کو کچھ زیادہ ہی بنظر تحسین دیکھتا تھا۔ اس ناول میں بیان کی گئی کہانی کے دو بڑے کردار تھے۔ ایک کیہوٹی جو کہ ایک ادھیڑ عمر نائٹ (سردار یا سالار) ہے جو بہت سی رومانوی کہانیاں پڑھ کر اپنے حواس

http://muftbooks.blogspot.com/

کھو چکا ہے اور اپنے گھوڑے روز انیسٹی پر سوار ہو کر ناانصافی کے خلاف لڑنے کے لیے نکل پڑتا ہے اور دوسرا کردار ایک معمولی نوکر سینچو پانزا کا ہے جو دنیا کو حقیقت کے رنگ میں دیکھتا ہے اور اپنے آقا کی خدمت میں مصروف رہتا ہے۔ اس ناول میں ایک تو اس کا مزاحیہ پہلو قاری کو محظوظ کرتا ہے اور دوسری سروینتیز کی انسانی صورت حال کی ماہرانہ تصویر کشی ہے پڑھنے والا جس کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ دونوں پہلو باہم مل کر اس کتاب کو ایک شاہکار میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس میں زندگی واقعات وحوادث کے ایک تسلسل کے طور پر نظر آتی ہے جس میں حُزن ومزاح اور حقیقت اور خواب تانے بانے کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ طوعاً کرہاً چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ ناول کے دوسرے حصے میں مصنف کتابوں کی حقیقت اور حقیقت کی تشکیل وتخریب میں ان کے کردار کے متعلق پے در پے کئی سوالات اٹھاتا چلا جاتا ہے۔ اس ناول کی اشاعت کے بعد جب سروینتیز کے پاس پیسہ آیا تو وہ میڈرڈ منتقل ہو گئے اور انھوں نے اپنی بقیہ زندگی لکھنے لکھانے کے لیے وقف کر دی۔

سروینتیز نے کوئی بیس سے تیس تک کی تعداد میں ڈرامے قلمبند کیے۔ ان میں سے ایک کھیل الجیریا کے حمام (1784ء) میں وہ الجیریا میں عیسائی غلاموں کے احوال بیان کرتے ہیں۔ سروینٹیز کے ان تمام ڈراموں میں سے صرف پیڈرو (1615ء) ایک ایسی تخلیق ہے جسے نقادوں نے سراہا ہے۔ ان کی آخری تصنیف ایک رومانس ''پرسیلیز اور سگس منڈا کی مہمات'' (1617ء) ہے جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ سروینتیز کا اس تخلیق کے بارے اپنا خیال یہ تھا کہ یہ یا تو اس کی بہترین تحریر ثابت ہوگی اور یا بدترین۔ اس کے ابتدائیے میں جو کہ انھوں نے اپنے انتقال سے صرف چار روز قبل مکمل کیا، وہ ایک قدیم ہسپانوی گیت کا حوالہ دیتے ہیں جس میں کسی کے ''یک پا در رکاب'' ہونے کی بات کی گئی ہے۔ غالباً یہ ان کا اپنی موت کی طرف اشارہ بھی تھا۔

سقراط (اندازاً 469 ق م۔ 399 ق م)

یونانی فلسفی۔ اگرچہ سقراط نے اپنی کوئی تحریر نہیں چھوڑی لیکن انھوں نے یونانی حکماء میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی ہے۔ اور آنے والے ادوار پر سب سے زیادہ دیرپا نقوش مرتب کیے ہیں۔ ہمیں ان کی فکر، سوانح، مقدمے اور موت کے بارے میں ان کے شاگرد افلاطون کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے۔ ژینومون کی تحریروں میں بھی ان کا تذکرہ موجود ہے اور ارسٹوفینز کی ''بادل'' میں ان کا بہت بری طرح تمسخر اڑایا گیا ہے تاہم سقراط کی بہترین، مفصل اور سب سے جاندار تصویر کشی ہمیں افلاطون کے مکالمات میں نظر آتی ہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

سقراط نے ایتھنز کے ایک خوشحال گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے خاندان کی خوشحالی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انھوں نے متعدد جنگی مہمات میں حصہ لیا۔

ان کے فقر وغنا کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ (ارسٹوفینز نے انھیں چیتھڑوں میں ملبوس ایک ننگے پاؤں، بدصورت اور بدبودار شخص کے روپ میں پیش کیا ہے)

انھیں عمر کے آخری حصے میں دیوتاؤں کی توہین اور نوجوانوں کا اخلاق بگاڑنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا اور بہت سے عقیدت مندوں، مداحوں اور صاحب حیثیت مربیوں کے احتجاج کے باوجود انھیں سزا کے طور پر زہر نوش کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ بعض محققین کے مطابق سقراط پر یہ مقدمہ درحقیقت ان کی ایتھنز کے بااثر جمہوریت مخالف افراد کی ایک جماعت ''تیس کا ٹولہ'' سے یاری کی وجہ سے بنایا گیا تھا۔ ان کی تعلیمات خصوصاً ان کے بے باکانہ مسلسل استفسارات کو بھی غیر اخلاقی گردانا گیا۔

سقراط کا نظریہ تھا کہ وہ منطق اور دلائل بھی اسی قدر اہم ہوتے ہیں جتنی کہ وہ سچائی جوان سے جنم لیتی ہے اور سچائی کی جستجو بذات خود سچائی کی ہی ایک شکل ہے۔ ''خود کو پہچانو'' سقراط کا ہی ایک مشہور قول ہے۔ حکیم سقراط کی بحث کا طور نرالا تھا۔ وہ بحث کے لیے آنے والے شخص پر پہلے خوب جرح کرتے تھے تاکہ اس کے ذہن اور اس کے دلائل میں مضمر تضادات واضح ہو جائیں۔ اس کا مطلب مخاطب کو اس کے اپنے نفس کے علم سے روشناس کرانا ہوتا تھا تاکہ وہ کسی ایسے نقطے پر پہنچ جائے جو داخلی تضادات وتناقضات سے مبرا ہو خواہ وہ اس منزل تک پہنچتا پہنچتا سقراط کے نتیجے ''میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا'' پر ہی کیوں پہنچ جائے۔ سقراط اکثر کہا کرتا تھا کہ اسے خود بھی کسی شے کا علم نہیں اور اس کے بے رحم سوالات اس کے خود سے شناسائی حاصل کرنے کی جدوجہد کا ہی ایک حصہ ہوتے ہیں۔ سقراطی فلسفے کے مطابق خود آگاہی کا حصول نیکی کے ہم پلہ ہے اور اخلاقیات اور علم کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

سلجوق خاندان

پہلا بڑا ترک شاہی خاندان۔ سلجوق خاندان دسویں صدی کے اواخر سے لے کر تیرہویں صدی تک کے زمانے میں ایران، شام، عراق اور ترکیہ کے علاقوں میں پھلا پھولا۔ سلجوقوں کا تعلق وسطی ایشیاء کے ایک ترک قبیلے اغوز سے تھا اور ان کے جدامجد کا نام سلجوق تھا۔ انہوں نے اس نام سے کئی بادشاہتیں بنائیں جن میں سے زیادہ اہم ان دو بادشاہتوں کو قرار دیا جاتا ہے جو انہوں نے بغداد اور قونیہ میں قائم کیں۔ سلجوق غالباً دسویں صدی کے وسط میں مسلمان ہوئے اور پھر وسطی ایشیا

http://muftbooks.blogspot.com/

میں سیاسی اور عددی دباؤ کی وجہ سے مغرب کی طرف نقل مکانی کرتے رہے۔ انہوں نے پہلے 1040ء میں فارس میں غزنوی خاندان کو تسخیر کیا اور پھر 1055ء میں عباسیوں کے دارالخلافہ بغداد میں داخل ہو گئے۔ سلجوق کے پوتے طغرل نے عظیم سلجوقی عہد کی بنیاد رکھی اور پھر ان سلجوقوں نے دنیائے اسلام کے محافظین اور دنیوی قائدین کے طور پر فارس کے آل بویہ کی جگہ لے لی جو بہ اعتبار مسلک شیعہ تھے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں حکمران مسلم سلاطین جو پہلے عباسی خلیفہ کے اطاعت گزار تھے اب سلجوقوں کے مطیع ہو گئے جو بہ لحاظ مسلک سنی تھے اور خلیفہ کو اسلامی دنیا کا علامتی سربراہ تصور کرتے تھے۔ عظیم سلجوق سلطانوں نے 1157ء میں سلطان سنجر کے انتقال تک حکومت کی۔ مالک شاہ (حکومت 92-1072ء) جیسے سلطان خود تو کوئی زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے چنانچہ انہوں نے سلطنت کا نظم ونسق نظام الملک جیسے وزیروں کو سونپے رکھا۔ یہ وہی نظام الملک ہیں جنھوں نے ''سیاست نامہ'' لکھ کر شہرت دوم حاصل کی۔ اس کتاب کو اسلامی ادب کی عظیم ترین تصانیف میں شمار کیا جاتا ہے۔

رومی سلجوق، سلیمان کی زیر سرکردگی 1071ء میں ملاذکرد کی مشہور جنگ میں بازنطینیوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد اناطولیہ (موجودہ ترکی) وارد ہوئے۔ سلیمان 1075ء تک نکایا (اب ازنک) میں خود کو مستحکم کر چکا تھا جو کہ قسطنطنیہ میں قائم بازنطینی سلطنت کی دہلیز پر واقع تھا۔ تاہم 1097ء میں پہلی صلیبی جنگ کے دوران ٹکایا دوبارہ بازنطینیوں کے قبضے میں چلا گیا اور اس کے بعد یہ مسلمانوں کے پاس اس وقت لوٹا جب تیرہویں صدی کے اواخر میں عثمانیوں کو عروج حاصل ہوا۔ اس کے بعد رومی سلجوقوں نے اپنا صدر مقام قونیہ اور الانیہ میں منتقل کر لیا۔ وہاں سلیمان کے بیٹے قلیچ ارسلان اور اس کے جانشینوں کے دور میں سلجوق سلطنت نے خوب ترقی کی لیکن پھر انہیں 1243ء میں کوزہ داکے مقام پر منگولوں سے زبردست ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد یہ خاندان 1302ء تک منگولوں کے باجگزار کی حیثیت سے کسی نہ کسی طور حکومت کرتا رہا۔ تاہم تیرہویں صدی کا اول نصف رومی سلجوقوں کے عروج کا زمانہ تھا جنہیں ترکی کے جنوبی ساحل کے اہم علاقے پر قابض ہونے کی وجہ سے بین الاقوامی تجارت تک بڑی آسان رسائی حاصل تھی۔

اس عہد میں بہت سی عظیم الشان مساجد، درسگاہیں اور کاروان سرائیں تعمیر ہوئیں جو ترکی کے مختلف قصبوں اور شہروں میں اب بھی موجود ہیں۔ کیقباد اول (حکومت 37-1220ء) جیسے حکمرانوں کے دور اقتدار میں سلجوق اس قدر طاقت کے مالک تھے کہ انہوں نے ایک مہم کریمیا بھی روانہ کی۔ سلجوق سلاطین نے دنیا کے مختلف خطوں سے علماء شعرا اور مصوروں کو مدعو کر کے اپنے

http://muftbooks.blogspot.com/

دربار میں جمع کیا جس سے ان کی سلطنت میں علم وفضل نے خوب ترقی پائی۔ان کی مذہبی رواداری کے طفیل تصوف کو بھی بہت نمو ملی۔ عظیم صوفی شاعر مولانا جلال لالدین رومی کا تعلق انہی کے عہد سے ہے۔سلجوقوں میں یہ رواج تھا کہ وہ ملک کو اپنے جانشینوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انا طولیہ میں ترکوں کی کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجود میں آ گئیں۔یہ ریاستیں سلجوق حاکمیت کو تسلیم تو کرتی تھیں لیکن اپنا نظم ونسق خود مختار طریقے سے چلاتی تھیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلجوقوں میں بیرونی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت کمزور ہوتی چلی گئی۔ان ریاستوں میں سے ایک کے والی کا نام عثمان تھا جس نے سلطنت عثمانیہ کی بنیاد رکھی۔

سمتھ، ایڈم (1723ء۔1790ء)

سکاٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والے ایک سیاسی ماہر معاشیات اور فلسفی۔سمتھ نے گلاسگو اور آکسفورڈ سے تعلیم حاصل کی اور 1748ء میں ایڈنبرا میں اپنے اقتصادی نظریات پر لوگوں کو لیکچر دیے۔ یہ اس قدر کامیاب رہے کہ انھیں یہ لیکچر دوبارہ دینا پڑے۔1751ء میں انھیں گلاسگو یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔وہ اخلاقی فلسفے کے شعبے سے منسلک ہوئے اور انھوں نے 1759ء میں ''اخلاقی جذبات کا نظریہ'' کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی جس سے ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔سمتھ نے1763ء میں پروفیسر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور ایک کم عمر نواب کے اتالیق کے طور پر کام کرنے لگے۔انھوں نے اپنے متمول شاگرد کی معیت میں فرانس کا دورہ کیا جہاں انھیں فرانسیسی مفکرین کے ایک گروپ سے ملاقات کا موقع ملا جو فزیوکریٹس کے نام سے معروف تھے اور جنھوں نے اقتصادیات کے پہلے نظام کی داغ بیل ڈالی تھی۔آئندہ دس برسوں کے لیے سمتھ اپنی اہم ترین تصنیف ''دولت اقوام'' کی تکمیل میں جُتے رہے۔اس کتاب میں سمتھ نے محنت کو تقسیم کرنے کے حق میں بات کی اور یہ خیال پیش کیا کہ لوگوں کا بہترین مفاد اس چیز میں ہے کہ انھیں آزادانہ تجارت کا موقع دیا جائے، کاروبار اور تجارت پر کم از کم پابندیاں عائد کی جائیں اور حکومت منڈی کے معاملات میں داخل نہ دے۔اسے آزاد معیشت کی مبادیات قرار دیا جاسکتا ہے۔

سمتھ نے ''دولت اقوام'' میں اقتصادی تاریخ کے مفصل سروے سے مدد لی جس کی وجہ سے اس کتاب نے معاشیات کو ایک علمی شعبے کا درجہ دلانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ایک فلسفیانہ تحریر کے طور پر یہ کتاب اس بات پر زور دیتی ہے کہ ذاتی مفاد کو کسی ترقی پذیر معیشت میں رویہ جاتی رجحانات کی پیش بینی کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔دیکھا جائے تو اس کا یہ تصور اس کی سابق

http://muftbooks.blogspot.com/

تصنیف ''اخلاقی جذبات کا نظریہ'' سے مطابقت نہیں رکھتا جو کسی اخلاقی نتیجے کے ضمن میں انسان کی ہمدردی کی صلاحیت پر مرکوز ہے۔ تاہم ''دولت اقوام'' اپنے انقلابی مضمرات اور ان نظریات کی وجہ سے اس سابقہ کتاب سے بہت اہم ہے جنھوں نے مغربی دنیا میں آزاد جمہوریت کی صورت گری میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔

سمتھ کا شمار ان اولین دانشوروں میں ہوتا ہے جنھوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ''ہر شخص کو بشرطیکہ وہ قوانین عدل کی کوئی خلاف ورزی نہیں کرتا، مکمل طور پر آزاد چھوڑ دیا جائے تا کہ وہ اپنے مفاد کے لیے اپنے انداز سے جستجو کرے اور اپنی محنت اور اپنے سرمائے کو کسی بھی دوسرے شخص یا اشخاص کے گروہ کی محنت یا سرمائے مقابلے میں لائے۔ اس طرح ''دولت اقوام'' سرمایہ داریت کے بنیادی اصولوں کی صورت گری کا سبب بنی اور اس نے ایک ایسی فکری نظام کی شکل اختیار کر لی جس کا استرداد کرتے کرتے معروف جرمن سماجی و معاشی نظریات دہندہ کارل مارکس (1818ء 1883ء) نے اپنی اشتراکیت کی بنیادیں استوار کیں۔ ایڈم سمتھ کو آج بھی تاریخ انسانی کے سب سے زیادہ اثر آفریں مفکرین میں شمار کیا جاتا ہے۔

سنتری

ایک اصطلاح جو جزیرہ جاوہ میں اسلام کے طالب علم کیلئے استعمال کی جاتی ہے۔ سنتری ایسے طالب علم کو کہتے ہیں جو اپنا لباس، وضع قطع اور رنگ ڈھنگ مکمل طور پر اسلامی طریقوں کے مطابق ڈھال کر خود کو دین اسلام کی تعلیم کیلئے وقف کر دے۔ یہ اصطلاح زیادہ راسخ العقیدہ صنف کے مسلمان خود کو ''ابانگان'' یعنی ایسے ظاہری مسلمانوں سے ممیّز کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں جن کے طور طریقوں میں قبل اسلام کے بعض مقامی عناصر بھی شامل ہیں۔ حقیقت میں دونوں قسم کے گروہوں کے درمیان فرق کی شناخت کرنا یا انہیں بیان کرنا کوئی اتنا آسان کام نہیں۔ تاریخی اعتبار سے انڈونیشیا کی آزادی سے قبل سنتری مقامی اسلامی جماعتوں کی حمایت میں زیادہ پیش پیش رہے۔ ان کے مقابلے میں ابانگان کی اکثریت انڈونیشیا کی قوم پرست اور اشتراکی جماعتوں کے ساتھ تھی۔ 1962ء تا 1965ء ان دونوں گروہوں کے درمیان چپقلش اپنے عروج پر رہی۔

سندھ

پاکستان کا ایک صوبہ۔ یہ خطہ دریائے سندھ کے طاس میں واقع ہے اور اسی دریا کے نام سے موسوم ہے۔ اس دریا کو مقامی لوگ سندھو بھی کہتے ہیں۔ موہن جوڈارو، امرکوٹ اور کوٹ ڈیجی

http://muftbooks.blogspot.com/

کے قبل از تاریخ شہروں کی دریافت سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ سندھ کئی قدیم تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے جن کا زمانہ تین ہزار قبل مسیح تک کا ہوسکتا ہے۔ سندھ شہنشاہ دارا اول (اقتدار 522۔486ق م) کے عہد میں سلطنت فارس کا حصہ تھا اور جب سکندر اعظم نے 326ق م اور 325ق م میں اس خطے پر لشکر کشی کی تو سندھ اس کے حکم کے تحت آ گیا۔ اس کے بعد سندھ ایک تسلسل کے ساتھ ہند یونانی، بدھ اور برہمن سلطنتوں کے ساتھ بھی رہا اور 711ء میں نوجوان عرب جرنیل محمد بن قاسم نے اس علاقے پر قدم رکھے اور اس علاقے میں دین اسلام کو متعارف کرایا۔

عربوں نے صدیوں تک سندھ پر حکومت کی اور پھر سندھ طاقتور مغلیہ سلطنت (1591ء۔ 1700ء) میں شامل ہو گیا۔ 1700ء کے بعد 1843ء تک سندھ کے آزاد کلہوڑا (1700-82ء) اور تالپور (1782ء۔1843ء) خاندان نے اس علاقے پر حکومت کی جس کے بعد انگریزوں نے سندھ پر تسلط جما لیا۔ انگریز دور میں سندھ بمبئی پریذیڈینسی کا حصہ بھی رہا لیکن 1937ء میں اسے ایک الگ صوبے کا درجہ دے دیا گیا۔ 1947ء کے بٹوارے کے بعد سندھ پاکستان میں شامل ہو گیا جس کے بعد مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد بھارت سے نقل مکانی کر کے یہاں پہنچی۔ دور ایوبی میں سندھ اور مغربی پاکستان کے بقیہ صوبوں کو ملا کر ایک وحدت تشکیل دی گئی لیکن 1970ء میں یہ وحدت توڑ دی گئی جس کے نتیجے میں سندھ کو ایک بار پھر ایک الگ صوبے کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

سرزمین سندھ ایک بہت قدیم اور منفرد موسیقانہ روایت کی امین ہے۔ لواسیوں کو سندھ کے قدیم ترین موسیقار تسلیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنا فن ایران کے دور دراز علاقوں تک متعارف کرایا جہاں انہیں بڑی محبت ملی اور ان کی موسیقی کو لوری موسیقی کا نام دیا گیا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی (1689ء۔1572ء) کے شاہ جو رسالو جو شاہ جو راگو کے نام سے بھی معروف ہے، کو سندھی کلاسیکی اور لوک روایتوں کے ساتھ یکجا کر کے موسیقی کا ایک نیا شاہکار تخلیق کیا گیا۔ سندھی موسیقی میں سائیں سچل سرمست (1739ء۔1826ء) کا نام بھی بہت اونچا ہے۔ انہوں نے سندھی اور سرائیکی دونوں زبانوں میں اپنا کلام ترتیب دیا۔

سنیاس

ایک ہندو مذہبی عقیدہ۔ یہ اصطلاح سنسکرت زبان کے لفظوں ''سام'' اور ''یام'' سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ''مکمل طور پر تیاگ دینا'' ہے۔ سنیاس سے مراد رسمی تیاگ ہے۔ سنیاسی کسی ہندو

درویشی سلسلے سے منسلک ایسے راہب کو کہتے ہیں جو ایک نہایت سادہ اور زہد و ریاضت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ تاہم یہ اصطلاح ہندوستانی سیاق وسباق میں ایک وسیع تر مفہوم کی حامل ہے۔

اگر قدیم ادوار سے لے کر آج تک کی ہندو روایات کا جائزہ لیا جائے تو ہندو پروہتوں یعنی برہمنوں کا مقام ہر جگہ تیاگیوں یا سنیاسیوں سے کمتر نظر آتا ہے۔

گوتم بدھ کے وقتوں سے لے کر مہاتما گاندھی (1869ء-1948ء) اور اس کے بعد کے زمانے تک درویشی کی زندگی یا سنیاس کو اس قدر اہمیت دیئے جانے کی بڑی وجہ غالباً یہ تصور ہے کہ سنیاس خصوصاً ازدواجی زندگی سے پرہیز سے روحانی قوت اور بلندی حاصل ہوتی ہے اور سنیاسی کاملیت و علم حقیقی حاصل کر کے مقام الوہیت پر فائز ہو جاتا ہے۔

سنیاس سے متعلقہ مذہبی و فلسفیانہ ادب بہت قدیم اور وسیع ہے۔

سوفوکلیز (496ق م-406ق م)

قدیم یونانی شاعر اور ڈرامہ نگار۔ وہ ایتھنز کے نزدیک واقع ایک مقام کولونس میں ایک متمول اسلحہ ساز کے گھر پیدا ہوئے۔ انھیں ایسی تعلیم دلوائی گئی کہ وہ ایتھنز کے بڑے سے بڑے افراد کے بچوں سے بھی مقابلہ کر سکیں۔ لڑکپن میں وہ جمناسٹکس اور موسیقی دونوں میں ممتاز تھے اور ان دونوں شعبوں کو ان دنوں یونانی تعلیم میں سب سے زیادہ فوقیت دی جاتی تھی۔ سوفوکلیز جسمانی اعتبار سے اس قدر خوبصورت تھے کہ انھیں سولہ برس کی عمر میں فارسی شہنشاہ دارا کے بیڑے پر ایتھنز کی فتح کی خوشی میں منائے جانے والے جشن میں کورس کی قیادت کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ کورس کے وقت وہ سرتاپا عریاں تھے اور انھوں نے ہاتھ میں ایک بربط اٹھا رکھا تھا۔ ستائیس برس کی عمر میں انھوں نے ڈرامہ نگاری کے مقابلوں میں پہلی بار شرکت کی اور اس وقت کے استاد فن ایسکائی لس (525ق م-546ق م) کو مات کر کے پہلا انعام حاصل کیا۔ اس سے پہلے یہ تاج ایک پوری نسل تک ایسکائی لس کے سر چلا آتا تھا۔ اس کے بعد سوفوکلیز نے خود کو ڈرامہ نگاری کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے بہت سے کھیل لکھے اور وہ بہت طویل عرصے تک لکھتے رہے۔ انھوں نے کوئی 123 کے قریب ڈرامے قلمبند کیے ہوں گے جن میں سے کسی نے بھی کسی مقابلے میں دوسری سے نیچی پوزیشن حاصل نہیں کی۔ انھوں نے نوے برس کی عمر پائی لیکن تادم مرگ ان کا قلم مسلسل حرکت میں رہا۔

المیہ ڈرامے کی بہت سی اختراعات کا سہرا ان کے سر باندھا جاتا ہے۔ مثلاً ان سے پہلے سٹیج پر صرف دو اداکاروں کا رواج چلا آتا تھا۔ انھوں نے تھیٹر میں تیسرا اداکار متعارف کرایا۔ اس سے

ان کے پیش رو ایسکائی لس کے ڈراموں کی نسبت زیادہ مفصل اور تہہ در تہہ پلاٹ اور موضوعات سٹیج پر پیش کرنا ممکن ہوا۔ اس کے علاوہ سوفوکلیز نے کورس کے ارکان کی تعداد بھی بارہ سے بڑھا کر پندرہ کر دی۔ انھوں نے ایسکائی لس کے تین تین چار چار کی تعداد کے سلسلہ وار ڈراموں کی روایت کو بھی خیر باد کہا اور عوام میں اکہرے ڈرامے کو مقبول کرایا۔

سوفوکلیز کو ان کی زندگی میں ہی بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا۔ شاعری تو وہ کرتے ہی تھے، انھیں کم از کم دو مرتبہ ایتھنز کی فوج میں جرنیل بھی مقرر کیا گیا۔ وہ خدائے شفا ایمینوس کے کاہن بھی تھے اور اپنے گھر میں شفاء کے ایک دوسرے دیوتا ایسکلیپئس کی پوجا بھی منعقد کیا کرتے تھے۔ انھوں نے ایک انجمن ادب و موسیقی کی بھی قائم کی۔

ان کے سات ڈرامے ہم تک پہنچ پائے ہیں جن میں اژاکس، انیٹیگونی، ٹرائے کی عورتیں، ایڈیپس ریکس، الیکٹرا، فلوکٹیٹیز اور ایڈیپس ایٹ کولونس شامل ہیں۔ ان ڈراموں کی خاص بات علت و معلول کا وہ سلسلہ ہے جو مربوط تو انسانی لوبھ سے لگتا ہے لیکن بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ تو محض کسی پیش گوئی یا بددعا کی تعبیر تھی۔ اس طریقے سے سوفوکلیز مذہبی اعتقاد کا اظہار کرتا ہے، انسانی کوششوں پر غالب الوہی رضا کی تصویر کشی کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایسے انسانی کردار بھی تخلیق کرتا ہے جن کی اپنے مقصد یا فرض سے غیر متزلزل وابستگی دیکھ کر ان کی تعریف کرنے کو دل کرتا ہے۔ سوفوکلیز نے ڈرامہ نگاری کے فن میں بعض وہ ضائع بدائع بھی متعارف کرائے ہیں جو ان کے نام سے منسوب ہو کر رہ گئی ہیں، مثال کے طور پر ٹریجک آئرنی کی یہ تکنیک کہ جس سے تماشائیوں کو کسی کردار کے مکالمات سن کر ان میں مضمر مفاہیم کا پتہ چل جاتا ہے۔

سوفوکلیز کی تخلیقات کو دنیا بھر میں بہت زیادہ پڑھا گیا ہے اور بابائے نفسیات سگمنڈ فرائیڈ (1856ء۔1939ء) نے ایڈیپس کے نفسیاتی تجزیے کو بروئے کار لاتے ہوئے ایڈیپس کمپلیکس کا اپنا مشہور نظریہ بھی وضع کیا جس کے مطابق لڑکا لاشعوری طور پر اپنی والدہ سے جنسی قربت کا طالب ہوتا ہے اور اس سبب اس کے ذہن کے کسی گوشے میں اپنے باپ سے رقابت و حسد کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے۔

سیاہ ادبی تحریک

سیاہ فام امریکیوں کی ایک ادبی تحریک۔ یہ افریقی نسل کے امریکی شعرا اور ادیبوں کا ایک ایسا گروہ جنھوں نے سیاہ قوم پرستی کے امکانات اور سیاہ فام باشندوں کی انقلابی سیاست کے موضوعات پر کام کیا۔ سیاہ فام ادیب لیری نیل اپنی تصنیف ''سیاہ ادبی تحریک'' میں کہتا ہے ''سیاہ

http://muftbooks.blogspot.com/

ادبی تحریک، سیاہ سیاست کے تصور کی بہن ہے .....ایک آرٹ اور سیاست کے درمیانی تعلق سے متعلق ہے اور دوسری سیاست کے آرٹ کے متعلق۔

سیاہ ادبی تحریک میں اماموعامری بارا کہ (متیلاً لے روئی جونز)، سونیا شانزے، نکی جیووانی اور حا کی مادھو بولتی (ڈان ایل لی) جیسے شعرا شامل ہیں اور اسے امریکی سیاہ فام باشندوں کے غصے اور ان کی سیاسی امنگوں کا اظہار قرار دیا جاسکتا ہے جو اکثر و بیشتر متشدد رنگ بھی اختیار کرتا رہا ہے۔ اس تحریک نے سفید فام لوگوں کی نسل پرستی کی مذمت اور سیاہ فام نسل کی یکجہتی اور حق خودارادیت کے نصب العین کی حمایت کی۔ اس نے کسی خاص سیاسی دھڑوں سے وابستگی کے بغیر شاعری میں ایک جارحانہ پیرایہ اختیار کیا اور سیاہ فام نسل کے لسانی اسلوب اور لے کو اپنانے کی کوشش کی۔ ''سیاہ آرٹ'' (1971ء) جسے اس تحریک کی نمائندہ تحاریر میں شمار کیا جاتا ہے، میں سیاہ فام شعرا کو سیاسی طور پر انقلابی، قوم پرستانہ نظمیں لکھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس میں اس تحریک کے اسلوب اور سیاسی تصورات کے چیدہ چیدہ خصائل بھی ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

سیاہ آرٹ نظموں نے سیاہ فام اور سفید فام ادیبوں اور نقادوں کے درمیان تنازعہ بھی پیدا کیا اور اسے پر از نفرت اور نسل پرستانہ بھی قرار دیا گیا۔ تاہم اس تحریک کے اثرات اسماعیل ریڈ جیسے بعد میں آنے والے ادیبوں کی تخلیقات پر بھی دیکھے جاسکتے ہیں جو بعض سیاہ ادبی تصورات ''موجمبو'' جیسے ناولوں میں استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔

سیٹھ، وکرم (1952ء۔.....)

بھارتی شاعر اور ناول نگار۔ وہ کلکتہ میں پیدا ہوئے اور انھوں نے آکسفورڈ، نانجنگ اور سٹینفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ سیٹھ نے پہلے سفری تصانیف کی بدولت شہرت حاصل کی۔ جھیل فردوس سے: سنکیانگ اور تبت کے سفر (1984ء) 1983ء میں شائع ہوئی جس میں انھوں نے چین کی نانینگ یونیورسٹی سے کلکتہ میں اپنے گھر تک کے تنہا سفر کی روداد بیان کی۔ سیٹھ نے راستے میں پڑنے والے چھوٹے چھوٹے قصبوں میں اپنی مہمات کے وسیلے سے چینی ثقافت و معاشرت کے بارے میں ایک ہندوستانی کے تاثرات قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے 1986ء میں سانیٹ کی شکل میں 593 بندوں کا ایک مجموعہ ''باب زریں'' شائع کیا جسے چارلز جانسٹن کے روسی شاعر پشکن کی ''یوجین اونیگن'' (1810ء) کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے۔ ''باب زریں'' ریگن دور میں سان فرانسسکو کے ہپیوں کے ایک ٹولے کی زندگیوں اور معاشقوں کی عکاسی کرتا ہے اور اس کی تکنیکی خوبصورتی کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اگرچہ

http://muftbooks.blogspot.com/

بعض ناقدین نے اسے اس کی سطحی کردار نگاری کے سبب ہدف تنقید بھی بنایا ہے تاہم ایک ایسی صنف کو حیات نو دینے کا سہرا سیٹھ کے سر ضرور جاتا ہے جو نثری ناول کی مقبولیت کی وجہ سے دم توڑ رہی تھی۔ سیٹھ کو ان کے ناول ''موزوں لڑکا'' 1993ء کے طفیل بہت زیادہ بین الاقوامی پذیرائی ملی۔

سیفو (اندازاً 600 ق م)

قدیم یونانی دور کی ایک معروف شاعرہ۔ سیفو کی حیات وتخلیقات کے بارے میں ابھی تک کوئی مکمل علم حاصل نہیں ہوسکا۔ وہ جزیرہ لیز بوس میں پیدا ہوئیں اور انہوں نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ وہیں بسر کیا۔ انہوں نے اس جزیرے کے ایک صاحب ثروت شخص سے شادی کی اور ایک بچی کلیئس کو جنم دیا۔ ایک متمول خاتون کی حیثیت سے سیفو خواتین کی محافل میں باقاعدگی سے شرکت کرتی تھیں جن میں شاعری پڑھی اور لکھی جاتی تھی۔ ان کی بیشتر شاعری خواتین اور ان کے درمیان کے معاشقوں، نفرتوں اور رقابتوں سے متعلق ہے۔ سیفو کے کلام میں موجود خواتین سے متعلق انتہائی شدید جنسی وشہوانی خیالات کی وجہ سے ہم جنس پرست خواتین کو ''لیز بین'' کہا جاتا ہے جو کہ سیفو کے مسکن ''لیز بوس'' سے مشتق ہے۔

سیفو نے بہت سی بحریں استعمال کی ہیں جن میں سے ایک بحر تو اس کے نام سے ہی موسوم ہو چکی ہے۔ انہوں نے اینکر بن اور کٹالس جیسے آنے والے دور کے شعراء کو بھی متاثر کیا لیکن آٹھویں یا نویں صدی کے اواخر تک ان کا اصل کلام قریب قریب ناپید ہو چکا تھا۔ تاہم بیسویں صدی میں دریافت ہونے والی بعض قدیم تحاریر سے سیفو کے کلام اور ان کی سوانح کے بارے میں ہماری معلومات میں قدرے اضافہ ہوا ہے۔ سیفو کو آج بھی قدیم دور کے اہم ترین اور سب سے زیادہ اثر آفریں شعراء میں شمار کیا جاتا ہے۔ انہیں معلوم ادبی تاریخ کی پہلی خاتون شاعرہ کہا جاسکتا ہے۔

ش

شا، جارج برنارڈ (1856ء۔1950ء)

آئرش نژاد ڈرامہ نگار اور نقاد۔ وہ 1856ء میں ڈبلن میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد غلے کے ایک ناکام سوداگر تھے۔ انہوں نے ویسلیان کنکشنل سکول سے تعلیم حاصل کی جہاں وہ سب طلباء سے پیچھے رہے۔ ان کے اساتذہ کا تاثر ہے کہ ایسے مضامین کی تدریس کے وقت جو انہیں

پسند نہیں تھے وہ بہت سستی اور عدم دل چسپی کا مظاہرہ کرتے تھے بلکہ بدتمیزی پر بھی اتر آتے تھے لیکن انہیں انگریزی انشاء، موسیقی اور مصوری سے بہت شغف تھا اور ان میں وہ اچھی کارکردگی دکھاتے تھے۔ وہ پندرہ برس کی عمر میں سکول کی تعلیم سے فارغ ہو کر ایک لینڈ ایجنسی میں بطور کلرک ملازمت کرنے لگے۔ شا کی والدہ کو موسیقی سے بہت لگاؤ تھا اور ان کی وجہ سے موسیقی کے ایک ممتاز استاد جارج جان واندالیور لی نے ان کے ہاں بطور مہمان رہنا شروع کر دیا تھا۔ جب لی 1872ء میں لندن منتقل ہوئے تو مسز شا اور ان کی دو بیٹیاں بھی ان کے پیچھے پیچھے لندن پہنچ گئیں۔

شا بھی 1876ء میں کلرکی چھوڑ کر اپنی والدہ اور بہنوں کے پاس آ گئے۔ شا آئندہ نو برس تک مکمل بیروزگاری کا شکار رہے۔ ان کے پاس کپڑوں کا ایک جوڑا ہوتا تھا یا پھر انہیں پیانو بجانے کی کچھ سدھ بدھ تھی اور یہی وہ دو چیزیں تھیں جن کے بل پر ان کی سماج سے میل ملاقات جاری رہتی۔ ان کی آمدن کا ایک اور ذریعہ یہ تھا کہ وہ لی کے نام پر ہفت روزہ دی ہارنیٹ میں موسیقی پر ناقدانہ مضامین لکھا کرتے تھے۔ 1879ء سے 1883ء کے عرصے میں انہوں نے پانچ ناول لکھے۔ ان میں وکٹورین اخلاقیات اور معیار عزت کو ہدف تنقید بنایا گیا تھا۔ 1879ء میں وہ ایک مباحثی حلقے زٹیٹکل سوسائٹی میں شامل ہو گئے جس سے انہیں مجمع کے سامنے فی البدیہہ بولنے کی مہارت حاصل کرنے میں بہت مدد ملی۔

شاہ کی بڑی وجہ شہرت ڈرامہ نگاری ہے۔ انہوں نے اپنا پہلا ڈرامہ ولیم آرچر کی معاونت سے 1885ء میں تحریر کیا۔ شا کے بیشتر ڈراموں پر سیاسی تنقید کی بنا پر پابندی عائد کر دی گئی یا پھر لوگوں نے انہیں سٹیج کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے اپنا پہلا مجموعہ 1898ء میں ''خوشگوار اور ناخوشگوار ڈرامے'' کے عنوان سے شائع کیا جس میں ''اسلحہ اور انسان'' کینسڈ ڈا'' اور ''مسز وارن کا کسب'' جیسے کھیل شامل تھے۔ دوسرا مجموعہ 1900ء میں ''پیورٹینوں کیلئے تین کھیل'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ شا نے اپنے معروف ترین کھیل پہلی عالمگیر جنگ کے دنوں میں تحریر کئے۔ ان میں جان ہل کا جزیرہ دیگر (1904ء) بشر اور فوق البشر (1905ء) میجر بابرا (1905ء) فینی کا پہلا کھیل (1912ء) اینڈرو کلیز اور شیر (1912ء) پگ میلین (1913ء) ہارٹ بریک ہاؤس (1913ء) میتھوسلہ کو واپسی (1921ء) اور سینٹ جون (1923ء) وغیرہ شامل ہیں۔ شا نے اپنے کھیلوں کے ساتھ جو دیباچے تحریر کیے وہ بھی بہت مقبول ہوئے اور بعض اوقات تو یہ دیباچے کھیلوں سے بھی زیادہ طوالت اختیار کر جاتے تھے۔ شا کو 1925ء میں ادب کا نوبل

پرائز دیا گیا۔

شا نے 1882ء میں آکر اشتراکیت کی حمایت شروع کر دی تھی۔ بعد میں انہوں نے فیبین سوسائٹی میں بھی شمولیت اختیار کر لی۔ انہوں نے سماجی اداروں اور مسئلوں پر بہت زیادہ لکھا۔ ان کی اس نوع کی طویل ترین تصنیف ''ذہین خواتین کے لیے سرمایہ داریت اور اشتراکیت کے متعلق معلومات'' (1928ء) ہے۔ انہوں نے پہلی عالمی جنگ کے دوران جو کچھ لکھا اس سے انگلستان میں ان کی شہرت خراب ہوئی۔ لیکن وہ اپنی ایک عالمی ڈرامہ نگار ہونے کی شہرت کے طفیل بچے رہے۔ جب چورانوے برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا تو وہ ایک طربیہ کھیل پر کام کر رہے تھے۔ ان کا نام روایت شکنی کی ایک علامت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

شارلمین، شہنشاہ (اندازاً 742ء۔814ء)

سلطنت رومہ کا بانی۔ انھیں کیرولس میگنس اور چارلز اعظم کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ انھوں نے 768ء سے 800ء تک فرینک قبائل کے بادشاہ اور 800ء سے 814ء تک نئی مغربی سلطنت کے پہلے شہنشاہ کے طور پر حکمرانی کے امور سرانجام دیے۔ مقدس رومن سلطنت کے بانی کی حیثیت سے انھوں نے پورے مغربی یورپ میں کیتھولک مسلک کے فروغ کے لیے مرکزی کردار ادا کیا۔

شارلمین نے عیسائیت کی خاطر بہت سی لڑائیاں لڑیں۔ ان میں سے پہلی لڑائی 74۔773ء میں ریاست لومبارڈ کے خلاف پوپ ہیڈرین اول کے کہنے پر لڑی گئی۔ لومبارڈ جرمینک نسل کے لوگ تھے جو ہنگری میں آ آباد ہوئے تھے اور مسیحی قیادت کو مسلسل آزار پہنچاتے رہتے تھے۔ شارلمین نے لومبارڈ باشندوں کو شکست دے کر ویٹیکن کی آرزو بھی پوری کر دی اور ان کی اپنی بادشاہت کی سرحدیں بھی دور دور تک پھیل گئیں۔ اسی طرح انھوں نے 770ء اور 784ء کے درمیانی عرصے میں شمالی جرمن میدانوں میں آباد سیکسنوں کے خلاف بھی کامیابی حاصل کی۔ شارلمین ہر فتح کے بعد مفتوحہ علاقے کا ایک حصہ پوپ کی نذر کر دیتا تھا۔ اس سے یہ ہوتا تھا کہ پوپ بھی مسلسل اس کی حمایت کرتا رہتا تھا۔ اس نے شمالی سلاووں، ایشیا ٹک اواروں اور یورپ کے کناروں پر آباد دیگر ریاستوں کو زیر کر کے عیسائی مبلغین کے لیے نئی راہیں کھولیں۔ گو اسے مسلم سپین کے خلاف اپنی لشکر کشی 778ء میں روکنا پڑی لیکن اس کے جرنیل فرینک نے بادشاہت کی سرحدوں کو مآل کار جنوب میں دریائے ایبرہ تک پہنچا دیا۔

شارلمین کو عیسائیت کے پھیلاؤ سے بہت دل چسپی تھی۔ وہ مفتوحہ علاقوں کے سب لوگوں کو

http://muftbooks.blogspot.com/

عیسائی دیکھنا پسند کرتا تھا۔اس نے عیسائی مبلغوں کی مزاحمت کرنے والوں، بپتسمہ سے انکار کرنے والوں، گرجوں کی املاک خراب کرنے والوں اور قدیمی مذاہب کی رسومات ادا کرنے والوں کے لیے موت کی سزا مقرر کی۔ دوسرے عیسائی مسالک پر بھی مکمل پابندی تھی۔ اسے علم وفضل سے بھی خوب رغبت تھی اور بہت سے ممتاز اطالوی اور برطانوی علماء اس کے دربار سے منسلک تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ لاطینی بول لیتا تھا، یونانی سمجھ سکتا تھا اور اسے عبرانی کی کچھ شُد بد بھی تھی۔ شارلمین علم وفہم کی ترویج کے لیے خانقاہوں اور گرجا گھروں کو بہت اہمیت دیتا تھا۔780ء کے لگ بھگ کسی وقت اس نے ان اداروں کے سربراہان کے نام ایک فرمان جاری کیا کہ وہ اپنی ملکیت میں موجود تحاریر وتصانیف کی نقول شاہی کتب خانے کو ارسال کریں۔790ء تک یہ کتب خانہ عیسائی دور سے پہلے کی اور عیسائی دور کے شروع کی لاتعداد انمول تحاریر وتصانیف کے ذخیرے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

800ء میں شارلمین کی طرف سے پوپ لیوسوم (پوپ795ء۔816ء) کی حمایت کے نتیجے میں اس کے روم کے ساتھ تعلقات اور بھی مضبوط ہو گئے۔ شارلمین پوپ کی درخواست پر خود چل کر روم پہنچا تا کہ پوپ پر عائد کیے گئے الزامات کے خلاف اس کا دفاع کیا جا سکے اور اس کی بے گناہی کو ثابت کیا جا سکے۔ اس سال کرسمس کے روز پوپ لیو نے ممنونیت کے جذبات سے مغلوب ہو کر شارلمین کو آگسٹس یعنی شہنشاہ روم بنانے کا اعلان کر دیا۔

شارلمین اپنے پیشرو سیزروں کے دیس میں اس تاجپوشی کو اپنا استحقاق سمجھتا تھا۔ اب اس پر پوپ نے بھی اپنی مہر رضا مندی ثبت کر دی تھی اور شارلمین اب رومن چرچ کے زیر سایہ ایک عالمگیر سلطنت کا فرمانروا بن چکا تھا۔ تاہم مشرقی سلطنت کے حکمران اس تبدیلی کو کسی اور نظر سے دیکھتے تھے اور اسے اپنی آزادی وسالمیت کے لیے ایک براہ راست خطرہ تصور کرتے تھے۔800ء میں شارلمین کی اس تخت نشینی سے مغربی اور مشرقی سلطنتوں کے مابین کشیدگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

شامانیت

ایک مذہبی عقیدہ۔ اس اصطلاح کو ایسی مختلف مذہبی رسوم کیلئے استعمال کیا جاتا ہے جو اس اعتقاد پر مبنی ہیں کہ دنیا پر ارواح کا راج ہے جن کا تعلق گزرے ہوئے افراد اور فطری قوتوں سے ہوتا ہے اور کسی ''شامان'' کے وسیلے سے ان ارواح کی خوشنودی حاصل کی جا سکتی ہے۔ شامان کے بارے میں ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ ایک سلاوی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے استعمال کی ابتداء سائبیریا

http://muftbooks.blogspot.com/

کے قبائلیوں میں ہوئی اور غالباً پہلے اس کی شکل ''سامان'' تھی جس کا مفہوم تھا ''جاننے والا''۔ آج کل اس اصطلاح کو امریکی انڈین معالجین اور افریقہ کے ان قبائلی طبیبوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو جادوٹونے سے مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔ ان سب میں مشترک چیز یہ ہے کہ وہ ان غیبی چیزوں یا ارواح سے رابطہ بناتے ہیں جو مافوق الفطرت علم کے استعمال سے مادی قوتوں اور واقعات کو کنٹرول کرتے ہیں۔ شامان کے بارے میں ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ انہیں قبائلی چن کر شامان نہیں بناتے بلکہ ارواح خود ان کا انتخاب کرتی ہیں۔ شامان عموماً نارمل لوگوں کی نسبت جسمانی یا نفسیاتی طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ بعض صورتوں میں شامان کو یہ مقام باپ دادے کی طرف سے وراثت میں ملتا ہے۔ بعض علاقوں میں شامان جادوٹونے اور دیگر ایسے عملیات کیلئے مشہور ہوتے ہیں۔ لوگ علاج کی غرض سے ان کے پاس جاتے ہیں اور یا پھر مرے ہوئے لوگوں سے رابطے کیلئے۔ کئی شامان ان مقاصد کیلئے ادا کی گئی رسوم میں ناچتے گاتے ہیں یا پھر نذر و نیاز اور قربانی سے کام لیتے ہیں۔

مختلف خطوں میں آپ کو مختلف طرح کی رسمیں نظر آئیں گی۔ شامان پادریوں یا پروہتوں کی طرح کسی خاص مذہبی کتب یا عبادات کی پیروی نہیں کرتے اور وہ اپنی رسوم ادا کرتے وقت ایسی عجیب وغریب حرکات وسکنات کرتے ہیں جو عام آدمی کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں۔ وہ کئی طرح کے جنتر منتر پڑھتے ہیں، ناچتے ہیں، چیختے اور چلاتے ہیں اور بعض اوقات دیکھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ حالت وجد میں آ گئے ہیں۔ بیشتر شامان آپ کو مرد ہی ملیں گے لیکن ان کا لباس اکثر عورتوں جیسا ہوتا ہے اور یا انھوں نے جانوروں کا سا بہروپ بنایا ہوتا ہے۔ انہیں اپنے قبیلے میں بہت عزت و وقار دیا جاتا ہے اور لوگ ہر چھوٹے بڑے مسئلے پر مشورے کیلئے ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ سائبیرین اور ارل قبیلوں میں شامانیت عام ہے اور مختلف صورتوں میں یہ اسکیمو باشندوں اور جنوب مشرقی ایشیا اور اقیانوسیہ میں بھی پائی جاتی ہے۔

شاہراہ ریشم

چین میں قدیمی راستوں کا ایک جال جس پر کاروان سفر کرتے تھے۔ شاہراہ ریشم کی لمبائی 7000 کلومیٹر سے زائد اور اس کی تاریخ 2000 سال سے پرانی ہے۔ اس کی ابتدا مغربی ہان عہد (206 ق م۔25ء) کے پایہ تخت چھانگ آن (اب شی آن) سے ہوئی اور پھر یہ مغرب میں صحراؤں اور برف پوش پہاڑوں سے گزرتی، وسطی ایشیا اور شرق الاوسط سے ہوتی بحیرہ روم تک جا پہنچی۔ ایک ہزار برس سے زائد عرصے تک شاہراہ ریشم مشرق کو مغرب سے ملانے والی شہ رگ کا

http://muftbooks.blogspot.com/

کام دیتی رہی اور ریشم اور دیگر اشیاء اس پر سے گزر کے رومن اور بازنطینی سلطنت تک پہنچتی رہیں۔ بدھ مت کی مشرق کی جانب ہندوستان سے وسطی چین تک اشاعت بھی اسی راہ گزار کے توسط سے ہوئی۔

قدیم دور میں جب کاروان موجودہ گانسو صوبے کے مغرب میں ڈن ہوآنگ پہنچتے تھے اور اس سے آگے مغرب کو بڑھتے تھے تو وہ لق ودق اور دشوار گزار صحرائے تاکلا مکان میں پہنچ جاتے تھے۔ کسی کاروان کے لیے اس صحرا میں سے سلامتی سے گزرنا ممکن نہ تھا چنانچہ وہ اس کے باہر باہر سفر کرتے جاتے تھے۔ لہٰذا یہ راستہ دو شاخوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ ایک راستہ صحرا کے شمالی محیط کے ساتھ ساتھ سفر کرتا نخلستانی قصبوں کی طرف چلا جاتا تھا جبکہ دوسرا جنوب کی طرف مڑ جاتا تھا۔ یہ دونوں راستے مغرب میں پامیر کے پہاڑوں کے دامن میں کاشغر کے مقام پر آپس میں مل جاتے تھے اور پھر یہ شاہراہ مشرق وسطیٰ کی جانب نکل جاتی تھی۔

قدیم چین اسی شاہرہ ریشم کی وساطت سے بیرونی دنیا سے مربوط تھا۔ اس شاہراہ پر جن مشہور ہستیوں نے قدم رنجہ فرمایا ان میں ایک تو تانگ عہد (618ء-906ء) کے بدھ راہب شواں زانگ ہیں جنھوں نے بدھ صحائف کی تلاش میں بہ جانب مغرب ہندوستان تک کا سفر کیا اور دوسرے مشہور اطالوی سیاح مارکو پولو ہیں جنھوں نے قبلائی خاں کے افسر بکار خاص کی حیثیت سے (1275-91ء) یوآن عہد (1260-1368ء) میں مشرق کی طرف دورہ کیا۔

جب سولھویں صدی میں بحری تجارت نے ترقی کرنا شروع کی تو شاہراہ ریشم کی تجارتی اہمیت میں کمی واقع ہونا شروع ہوگئی۔ پھر دنیا نے اسے ایسا فراموش کیا کہ اس کے ساتھ ساتھ کبھی جو بڑے خوشحال قصبے ہوا کرتے تھے ریت اور مٹی کے ٹیلوں تلے دفن ہوتے چلے گئے۔ ان قصبوں کا پتہ بیسویں صدی میں جا کر اس وقت لگا جب ماہرین آثار قدیمہ نے اس علاقے میں تحقیق کی اور دنیا کو ماضی کی اس عظیم گزرگاہ سے ایک مرتبہ پھر متعارف کرایا۔

شاہنامہ فردوسی

فردوسی کی لکھی ہوئی مشہور فارسی رزمیہ نظم۔ یہ نظم دسویں صدی کے اواخر اور گیارہویں صدی کے اوائل میں روایتی قصوں اور داستانوں کو نئے پیرائے میں ڈھال کر تیار کی گئی۔ شاہنامہ میں ملک فارس کی تاریخ بیان کی گئی ہے جو اس کے ابتدائی دیومالائی بادشاہوں سے شروع ہو کر اس کے عہد زریں اور پھر ساتویں صدی میں اس کی عرب فاتحین کے ہاتھوں تسخیر تک سفر کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ نظم جدید فارسی زبان میں لکھی گئی ہے اور یہ 35000 سے 60000 تک ہم ردیف ابیات پر

مشتمل ہے۔ بعض اوقات تاریخی صحت ٹھیک نہ ہونے کی بنا پر اس نظم کو ہدف تنقید بنایا جاتا ہے مگر شاید یہ نقاد اس امر کو ذہن میں نہیں رکھتے کہ اس کا بنیادی مقصد دیو مالائی پہلوان رستم کے توسط سے سلطنت فارس کی عظمت رفتہ اور شاہان فارس کے تسلسل کی مدح تھا اور اس کا صحیح تجزیہ ہم درباری ادب کے طور پر ہی کر سکتے ہیں۔ اس کا آغاز سامانی عہد میں ہوا لیکن منسوب اسے بعد میں آنے والے سلطان محمود غزنوی کے نام سے کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ فردوسی کو یہ رزمیہ لکھنے پر محمود غزنوی کی جانب سے وہ انعام و اکرام نہ مل سکا جس کی اسے توقع تھی۔ اس پر فردوسی نے محمود غزنوی کی ایک انتہائی چبھتی ہوئی ہجو لکھی اور بھاگ نکلا اور پھر لوٹ کر اپنے وطن میں اس وقت پہنچا جب اس کی موت قریب آ چکی تھی۔ یہ ہجو اب بھی شاہنامے کے ساتھ دیباچے کے طور پر منسلک کر دی جاتی ہے۔

شاہنامے کا شمار فارسی ادب کے شاہکاروں میں ہوتا ہے اور بہت سی ایرانی منی ایچر تصویریں اس سے متاثر ہو کر تخلیق کی گئی ہیں۔

شرپا

ہمالیہ کے علاقے کا ایک نسلی گروہ۔ آج کل شرپا باشندے کوہ ایورسٹ کی کھمبو وادیوں، ہمالیہ کے بلند و بالا پہاڑوں میں واقع سولو وادی اور بھارت کے علاقے دارجلنگ میں الگ تھلگ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ شروع میں شرپا منگولوں کے شر سے بچنے کیلئے بھاگ کر یہاں آئے تھے۔ شرپا بنیادی طور پر بدھ مت کے پیرو ہیں لیکن ان کے بدھ مت پر تبت کی لامہ پرستی کا رنگ غالب ہے۔ وہ نظریہ تناسخ (آوا! گون) پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ شرپا اپنا گاؤں عبادت گاہ کے گرداگرد بناتے ہیں لیکن ان میں شامل مختلف برادریاں اپنے مختلف معبدوں میں پوجا کرتی ہیں۔

شرپا روح کے معاملات میں بدھ مت کے معبودوں پر انحصار کرتے ہیں لیکن دنیوی مسئلوں میں وہ تانتریہ مسلک سے وابستہ ارضی ارواح سے مدد طلب کرتے ہیں۔ مثلاً وہ سانپوں کی پرستش گھریلو ارواح کے طور پر کرتے ہیں۔ وہ بہت سے بھوتوں اور بھتنیوں کی پوجا بھی کرتے ہیں اور عمارات کی دیواروں پر ان کی بڑی بڑی تصویریں بناتے ہیں۔ وہ ان ارواح کی خوشنودی حاصل کرنے اور یا پھر انہیں رام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے لامہ مسلسل اسی کام میں لگے رہتے ہیں۔

شرپا روایتی طور پر جانور پال کر، کھیتی باڑی کر کے اور تجارت کے ذریعے روزی کماتے ہیں۔ نیپال کی دیگر قوموں کی نسبت شرپا باشندوں نے معاشی طور پر بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے

http://muftbooks.blogspot.com/

اور آپ کو بہترین بدھ خانقاہیں شرپا بستیوں میں ہی ملیں گی لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ سارے شرپا تونگر ہیں۔ان میں بعض بہت غریب لوگ بھی آپ کو ملیں گے۔کبھی شرپاؤں کو تبت میں نمک،فولاد،پشم اور دھان کی تجارت پر اجارہ داری حاصل تھی لیکن پھر کیا ہوا کہ انگریز آ گئے اور انہوں نے لاھسہ کو کلکتے سے ایک تجارتی راستے کے ذریعے ملا دیا۔اس تبدیلی سے ان کی اجارہ داری تو چھن گئی لیکن بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر انہوں نے نئے نئے پیشے اپنا لیے۔بہت سے شرپا باشندوں نے ہمالیہ میں کوہ پیمائی کیلئے آنے والے سیاحوں کی رہبری کا کسب اختیار کر لیا۔

شریعت

قانون اسلامی۔بارہویں صدی کے ایک نامور فقیہہ شمس الدین شریعت پر اپنی ایک طویل تصنیف کے شروع میں لکھتے ہیں کہ ''اللہ پر ایمان لانے کے بعد سب سے ضروری فرض علم کی جستجو ہے.....اور علم کی دو قسمیں ہیں: خدا کی وحدانیت کا علم اور قانون صالح اور شرعی احکامات کا علم۔''
شریعت عربی لفظ شریعہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کا مطلب ہے ''جانا'' اس سے مذہبی و قانونی دائرے میں صحیح عمل اور راستے کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔شریعت کے احکامات تمام طرح کے دنیوی معاملے (قانون ،تجارت، عائلی قوانین، وراثت، اوقاف، ہرجانہ، جرائم وغیرہ) اور عبادات کی صحیح ادائیگی دونوں کا احاطہ کرتے ہیں۔فقہاء نے شریعت کی وضاحت کرتے ہوئے بہت گراں بہا ادب تصنیف کیا ہے۔

فقہ کی پہلی جامع کتاب آٹھویں صدی کے آخر میں لکھی گئی۔آج کل افریقہ تا فلپائن شریعت اسلامی کے نفاذ کا بڑا چرچا ہے۔بہت سے مسلمانوں کو یقین ہے کہ اگر اسلامی قوانین نافذ کر دیئے جائیں تو ان کے بہت سے معاشی و معاشرتی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

شریعتی،علی (1933ء-1977ء)

مسلمان فلسفی،علی شریعتی کو ایرانی انقلاب کے حوالے سے بہت اہم شخصیت خیال کیا جاتا ہے۔وہ ایران کے ایک شمال مشرقی شہر مشہد کے ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔انہوں نے ابتدائی دینی و دینوی تعلیم وہیں سے حاصل کی۔بعد میں انہوں نے ایک مقامی ٹیچرز کالج میں داخلہ لیا اور ایک نجی دینی مدرسے میں پڑھانے لگے۔پھر انہیں ایک وظیفہ ملا جس پر وہ پانچ سال تک پیرس میں عمرانیات اور اسلامیات پڑھتے رہے۔وہ 1964ء میں ڈاکٹریٹ کے بعد ایران واپس آئے جس پر انہیں مشہد یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔

http://muftbooks.blogspot.com/

ڈاکٹر شریعتی اپنے انقلابی خیالات کے باعث گرفتار ہوئے لیکن شہنشاہ کی حکومت نے انجام کار انہیں رہا کر دیا اور انھیں اپنے عہدے پر کام جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ تاہم تھوڑے ہی عرصے بعد انہیں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس پر انہوں نے ایک نجی ادارے میں پڑھانا شروع کر دیا جسے کچھ عرصہ بعد بند کر دیا گیا اور ڈاکٹر شریعتی روپوش ہو گئے۔ لیکن جب خفیہ پولیس نے ان کے والد کو یرغمال بنایا تو وہ باہر آ گئے۔ ایرانی عوام نے ان کی حراست کے خلاف شدید احتجاجی مظاہرے کیے جس کے نتیجے میں حکام نے انہیں قید سے نکال کے فرانس جلا وطن کر دیا جہاں وہ کچھ ہی عرصہ بعد پراسرار حالات میں انتقال کر گئے۔

ڈاکٹر شریعتی کی فکر میں اس عقیدے کو مرکزی حیثیت حاصل ہے کہ اسلام سب زمانوں کیلئے ایک کامل ترین دین ہے۔ یہ نظریہ عوام کو معاشرے کی بنیاد اور واقعات کا رخ کا تعین کرنے والی اساسی شے قرار دیتا ہے۔ ڈاکٹر شریعتی کے نظریات کی پرورش میں برگساں (1869ء۔ 1914ء)، البیغ کامیو (1913ء۔1960ء) اور ژاں پال سارتر (1905ء۔1980ء) جیسے یورپی مفکرین اور جزائر غرب الہند کے محلل نفسی اور سماجی فلسفی فرانز فینن (1923ء۔ 1961ء) کا بڑا ہاتھ ہے۔ علی شریعتی کی دینی تحاریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فکر اقبال (1877ء ۔1938ء) سے بھی بہت زیادہ متاثر تھے۔ اگرچہ ڈاکٹر شریعتی انقلاب کا خواب شرمندہ تعبیر ہونے سے پہلے ہی اس دنیا سے چلے گئے، ان کی تحریریں ایرانی عوام کے دلوں کو گرماتی رہیں گی اور ان تک یہ پیغام پہنچاتی رہیں گی کہ دینی اعتقادات کی بنیاد پر ایک کامیاب جدید معاشرہ استوار کیا جا سکتا ہے۔

شیو

ہندو دیوتا۔ شیو کا شمار ہندو مذہب کے بڑے دیوتاؤں میں ہوتا ہے۔ اسے مہادیو بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے کل 1008 نام ہیں جس سے اس ویدک عقیدے کی توثیق ہوتی ہے کہ الوہی طاقت ایک ہے لیکن اس کے کئی مظہر ہیں۔ شیو پوجا کا ذکر اپنشدوں اور مہابھارت (500-200 ق م) جیسی قدیم ہندو مذہبی کتب میں بھی ملتا ہے۔ شیو کو قہرناک ویدک دیوتا رُدر سے مشخص کیا جاتا ہے اور غصے کی حالت میں وہ تباہی اور فنا کا دیوتا بھی ہے۔ اس کی پرستش عموماً لنگ کی صورت میں کی جاتی ہے جو مذکر جنسی عضو کی علامت ہے۔ اس کے دوسرے بڑے روپ یوگی اور نٹ راج یعنی عالمی رقص کے دیوتا کے ہیں۔ یوگی کے طور پر اسے ہمالیہ کے پہاڑوں میں گہرے مراقبے میں منہمک بیٹھا دکھایا جاتا ہے جس کے ہاتھ میں ایک ترشول اور گلے میں سانپ لپٹا ہوتا ہے۔ اس

http://muftbooks.blogspot.com/

کے سر پر لمبی جٹائیں اور جسم پر راکھ ملی دکھائی جاتی ہے۔ نٹ راج کے روپ میں اس کی چار بانہیں دکھائی جاتی ہیں جن سے اس نے چار مختلف علامتی اشیا پکڑی ہوتی ہیں اور وہ اوندھے منہ لیٹے شیطان پر ایک پاؤں پر کھڑا رقص کر رہا ہوتا ہے۔ شیو کی سواری نندی بیل اور اس کی زوجہ کالی دیوی ہے جس کے اور بھی کئی نام ہیں۔

شوپنہاوَر، آرتوَر (1788ء۔1860ء)

جرمن فلسفی۔ وہ ڈینسک میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک کاروباری شخص تھے جبکہ والدہ ایک ناول نگار تھیں۔ شوپنہاوَر کے والد کی موت 1805ء میں غالباً خودکشی سے ہوئی تھی۔ اس واقعے تک وہ اپنے والدین کے ساتھ یورپ میں قریہ قریہ گردش کرتے رہے جس کی وجہ سے۔ انہیں کوئی باقاعدہ ابتدائی تعلیم نہ مل سکی تاہم 1908ء میں انہوں نے ٹنگن یونیورسٹی میں طب کے طالب علم کے طور پر داخلہ لے لیا۔ لیکن انہیں افلاطون (اندازاً 427۔347 ق م) اور عمانوئیل کانٹ (1724ء۔1804ء) جیسے فلسفیوں کی تصانیف میں اس قدر رغبت پیدا ہوئی کہ وہ 1811ء میں طب کی تعلیم چھوڑ کر فلسفہ پڑھنے کیلئے یونیورسٹی آف برلن میں داخل ہو گئے۔ جب فرانسیسی فاتح نپولین کے خلاف جرمن ریاستوں کی بغاوت کے دوران جرمن درسگاہیں بند ہوئیں تو شوپنہاوَر جو کہ قوم پرستی کے مخالف تھے، برلن چھوڑ کر روڈل سٹیڈ منتقل ہو گئے جہاں 1813ء میں انہوں نے اپنا پہلا مقالہ شائع کیا۔ ان کی نامور جرمن شاعر گوئٹے (1749ء۔ 1832ء) سے ملاقات وائما میں اپنی والدہ کی مجلس میں ہوئی۔ گوئٹے کے خیالات سے متاثر ہو کر شوپنہاوَر نے رنگوں کے ادراک پر ایک مختصر کتاب تحریر کی۔ اس کے بعد چار سال وہ اپنی معروف ترین تصنیف ''دنیا بطور ارادہ و خیال'' لکھنے میں مصروف رہے۔ یہ کتاب 1818ء میں لائپ سک سے شائع ہوئی۔ اگرچہ اسے وہ پذیرائی نہ مل سکی جس کی کہ وہ توقع کر رہے تھے، یہ ضرور ہوا کہ انہیں برلن یونیورسٹی میں لیکچرار کی ملازمت مل گئی۔ ان دنوں جرمنی کے ایک اور نامور فلسفی جارج ولیہم ہیگل کافی مشہور تھے اور دونوں دانشوروں میں کچھ رقابت بھی چل نکلی تھی۔ کہتے ہیں کہ شوپنہاوَر اسی رقابت کی وجہ سے یونیورسٹی میں دانستہ اپنی کلاسوں کا وہی شیڈول رکھوایا کرتے تھے جو ہیگل کا ہوتا تھا۔

شوپنہاوَر ذاتی طور بہت اکھڑ اور متکبر مزاج تھے لیکن ان کے نظریات رفتہ رفتہ قنوطیت کا رنگ اختیار کرتے چلے گئے۔ انہوں نے اپنے اگلے کئی سال اٹلی اور جرمنی کی سیاحت میں گزارے اور پھر آخر کار فرینکفرٹ میں مستقل سکونت اختیار کر کے خاندان کی بچی کھچی جائیداد پر

http://muftbooks.blogspot.com/

گزارا چلاتے رہے۔ لکھنے لکھانے کا شغل بدستور جاری رہا۔ 1836ء میں ''فطرت کے بارے میں'' اور 1841ء میں ''اخلاقیات کی بنیاد'' منظر عام پر آئی۔ 1844ء میں انہوں نے ''دنیا بطور ارادہ وخیال'' کو دوسری بار شائع کیا جس میں پچاس اضافی ابواب شامل کیے گئے تھے۔ شوپنہاؤر کو ہمیشہ یہ خلش رہی کہ انہیں جو عزت وشہرت ملنا چاہیے تھی وہ نہ مل سکی۔ آخر کار جب انہوں نے 1851ء میں مقولات ومقالات کی دو کتابیں ''پریرگا'' اور ''پرالپومینا'' شائع کیں تو انہیں لوگوں کی وہ توجہ بھی حاصل ہونا شروع ہوگئی جس کا انہیں مدتوں سے انتظار تھا۔

کانٹ کی طرح شوپنہاؤر بھی اس نظریے کے قائل ہیں کہ ہمارے ادراکات میں ہمیشہ ایک مقولاتی سانچہ حائل ہوتا ہے جو کہ ہمارے دنیا کے بطور خیال علم کی ایک ضروری شرط ہے چنانچہ ان کا اطلاق حسی تجربے کے علاوہ کسی اور چیز پر نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی فکر یہاں آکر کانٹ سے مختلف ہوجاتی ہے کہ وہ اس لحاظ سے زمان ومکان کے مقولات کو بھی موضوعی خیال کرتے ہیں۔ ان کے مطابق انسانی داعیات اور فطرت کی قوتیں دونوں ہی زندہ رہنے کے ارادہ (Will) کی آئینہ دار ہیں۔ چونکہ یہ ارادہ اپنا اظہار بلا تسکین مستقل جدوجہد میں کرتا ہے۔ زندگی دکھ سے عبارت ہے جسے کسی حد تک عقل کے وسیلے سے کم کیا جاسکتا ہے جو خود بھی ارادہ کا ایک جزو ہے۔ شوپنہاؤر دنیا کو ایک ایسی کلیت کے طور پر دیکھتے ہیں جو کسی بھی عقلی یا اخلاقی نظام سے تہی ہے لیکن جو بغیر کسی حتمی مقصد کے تگ وتاز اور خود آگاہ ''ارادوں'' سے عبارت ہے جو زندہ رہنے کی مستقل جدوجہد میں گرفتار ہے۔ اس اعتبار سے شوپنہاؤر کے تصور ارادہ کو بہت سی جدید نفسیات کا پیش خیمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

شہر ممنوعہ

چین میں محلات کا سب سے بڑا اور مکمل قدیم تعمیراتی کامپلیکس۔ بیجنگ شہر کے قلب میں واقع یہ شہر ممنوعہ (جسے شاہی محل بھی کہا جاتا ہے)۔ جنگ (1368ء۔1644ء) اور چنگ (1644ء۔1911ء) خاندان کے بادشاہوں کے لیے رہائشی محل کا کام دیتا رہا۔

یہ محل 250 ایکڑ اراضی پر مشتمل ہے اور اس کے 150,000 میٹر رقبے پر عمارات ایستادہ ہیں جو 9000 سے زائد کمروں پر مشتمل ہیں۔ یہ ایک مستطیل کی شکل میں ہے اور اس کے گرداگرد دس میٹر اونچی فصیل اور باون میٹر چوڑی ایک خندق ہے۔ دیوار کے ہر کونے میں ایک برج ہے۔ محل کی عمارات کی چھتیں شوخ نارنجی رنگ کی چمکیلی ٹائلوں سے بنی ہیں۔ صرف ایک عمارت جہاں شاہی خاندان ایام سوگ میں قیام کرتا تھا، کی چھت نیلی ہے۔ محل کی تمام دیواروں پر شوخ سرخ رنگ کا روغن کیا گیا ہے۔

اس محل کے دو حصے ہیں۔ شہر ممنوعہ میں داخلے کا بڑا راستہ جسے وُمن دروازہ کہا جاتا ہے، جنوبی سرے پر ہے اور یہ عوامی حصے کی طرف جاتا ہے۔ یہ حصہ تین دیوہیکل ایوانوں پر مشتمل ہے جہاں بادشاہ شاہی خاندان کے افراد کی شادیوں، غیر ملکی مہمانوں کے استقبالیوں اور اعلیٰ سطحی مقابلے کے امتحانوں جیسی اہم سرکاری تقریبات کا انعقاد کرتے تھے۔ یہ حصہ محل کی تقریباً نصف اراضی پر واقع ہے۔ دوسرے نصف پر تین بڑے محل اور ان کے ساتھ کئی چھوٹے چھوٹے محل ہیں جن میں شاہی خاندان کے مختلف افراد رہتے تھے اور جن کے اردگرد وسیع وعریض شاہی باغات ہیں۔ پورا شاہی خانوادہ مع بادشاہ، اس کی متعدد بیگمات، ہزاروں کنیزوں اور اکثر وبیشتر بچوں کی فوج ظفر فوج کے ساتھ اس شہر ممنوعہ کی فصیلوں کے اندر زندگی گزارتا تھا اور یہ افراد شاذ ہی محل کی دیواروں سے باہر آتے تھے۔

چینی تاریخ کے تمام شاہی خاندانوں سے متعلق قیمتی نوادرات اور زر وجواہر سے پر اس وسیع وعریض خزانے کو 1930ء کے عشرے کے دوران جاپانی قبضے کے دوران بہت بے دردی سے لوٹ لیا گیا۔ گومنتانگ افواج نے بھی تائیوان کی طرف پسپا ہونے سے قبل اس کے ساتھ یہی کیا۔ آجکل اس کا تاریخی محل ایک عجائب گھر کی شکل میں مرجع عام وخاص ہے۔

شیکسپیئر، ولیم (1564ء۔1616ء)

انگریز ڈرامہ نگار، شاعر اور اداکار۔ شیکسپیئر کی جائے پیدائش سسٹر یفرڈ اپون ایون ہے۔ انہوں نے اپنا بچپن یہیں گزارا۔ مورخین کا خیال ہے کہ انہوں نے شروع میں ایک گریمر سکول سے لاطینی اور یونانی زبانوں کی تعلیم حاصل کی۔ اٹھارہ برس کی عمر میں ان کی شادی این ہیتھاوے سے ہوئی جس سے ان کی دو بیٹیاں سوزانہ اور جوڈتھ اور ایک بیٹا ہیمنٹ پیدا ہوا۔

شیکسپیئر کی 1584ء سے 1592ء تک کی تخلیقات کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں کیا جا سکا تاہم انہوں نے ڈرامہ نگاری میں صحیح مہارت اس وقت حاصل کی جب وہ لندن کی ایک بڑی تھیٹر کمپنی لارڈ چیمبر لینز کمپنی سے منسلک ہوئے۔ یہ تھیٹر بعد میں کنگز مین کے نام سے معروف ہوئی۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس کمپنی کے زیادہ تر کھیل شیکسپیئر نے ہی تحریر کئے یا پھر ہوسکتا ہے کہ بعض اوقات وہ کسی دوسرے لکھاری کی معاونت سے بھی لکھتے رہے ہوں۔ انہوں نے 1590ء تا 1613ء تقریباً 38 ڈرامے پیش کئے۔

شیکسپیئر کی ابتدائی تحریروں میں تجرباتی رنگ جھلکتا نظر آتا ہے اور ان کے اولین تاریخی کھیلوں ہنری ششم (92-1589ء) اور رچرڈ سوم (93-1592ء) میں وہ نفاست اور برجستگی

http://muftbooks.blogspot.com/

دکھائی نہیں دیتی جو ان کی موخر تخلیقات مثلاً رچرڈ دوم (96-1595ء) ہنری چہارم (99-1598ء) یا ہنری پنجم (99-1598ء) میں نظر آتی ہے۔ بات کچھ نہیں، واویلا زیادہ (99-1598ء)، جیسے آپ پسند فرمائیں (1599ء۔1600ء) اور بارھویں شب جیسے عظیم طربیہ ڈراموں کا تعلق بھی اسی دور سے ہے۔ شیکسپیئر عشق کی خطاؤں پر مبنی ان حکائیتوں میں ذومعنویت، رعایت لفظی اور ضلع جگت کا استعمال بہت عمدگی سے کرتے نظر آتے ہیں۔ اپنی المیہ حکایت عشق رومیو اور جیولیٹ (95-1594ء) میں انہوں نے غمگین اختتام تک پہنچنے کیلئے تقدیر کی قوتوں سے مدد لی ہے۔

شیکسپیئر کے 1599ء کے بعد کے ڈراموں میں ایک اور رنگ مشاہدے میں آتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب ان کی کمپنی نے روز تھیٹر لے لیا تھا۔ اس عمر میں آکر انہوں نے اپنی کہانیوں کے کرداروں کی تقدیر کا فیصلہ کرنے والی خارجی اور ناقابل کنٹرول قوتوں کے ساتھ ساتھ انسان کی خطا پذیری کا عنصر بھی متعارف کرانا شروع کیا۔ ہیملٹ (01-1600ء) اوتھیلو (05-1604ء) کنگ لیئر (06-1605ء) اور میکبیتھ (06-1605ء) کا شمار شیکسپیئر کے مشہور ترین المیہ ڈراموں میں ہوتا ہے۔ ان میں انتہائی شاعرانہ اور جذباتی زبان اور بے مثال درجے کی کردار نگاری کے ذریعہ فلسفیانہ پیغامات کو انتہائی موثر انداز سے شائقین تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ شیکسپیئر نے اپنے آخری ڈراموں خصوصاً حکایت سرما (11-1610ء) اور تلاطم (12-1611ء) میں رومانس، ٹریجیڈی اور کامیڈی کے مختلف پہلوؤں کو مربوط کرنے کی کوشش کی۔ ان تخلیقات میں زبان بہت ہلکی پھلکی اور طلسماتی استعمال کی گئی ہے لیکن اس سے ان کی المیاتی نوعیت متاثر نہیں ہوتی۔ ان میں شیکسپیئر نے قسمت کی بجائے تحیر پر زور دیا ہے اور گیت اور منظر کے استعمال میں اضافہ کر کے ان تخلیقات میں ایک انوکھا انداز پیدا کر دیا ہے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ بعض سنجیدہ موضوعات ہمیں شروع سے اخیر تک رواں دواں نظر آتے ہیں اور ڈرامائی الجھن بذریعہ کفارہ معافی اور باہمی مفاہمت سلجھتی نظر آتی ہے۔

شیکسپیئر نے کھیل لکھنے کے علاوہ بہت سی نظمیں بھی قلمبند کیں۔ ان کی دو طویل منظومات وینس اور ایڈونس (1593ء اور لکریس کی بے حرمتی (1594ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور یہ اووڈ کی ''تغیرات'' اور ''فاستی'' سے ماخوذ ہیں۔ انہوں نے عنقاء اور کچھوا کے عنوان سے ایک 67 سطری نوحہ بھی تخلیق کیا جو 1601ء میں رابرٹ چیسٹر کے ''شہید عشق'' میں شائع ہوا تھا۔ شیکسپیئر مقبول عام صنف سانیٹ کے دھنی تھے۔ انہوں نے اس صنف کے مشہور اطالوی استاد پیٹرارک کی

http://muftbooks.blogspot.com/

بنائی شکل میں تغیر وتبدل کر کے اپنے ایک الگ اسلوب کی بنیاد رکھی۔

شیکسپیئر 1610ء کے لگ بھگ عزلت اختیار کر کے اپنے آبائی علاقے میں واپس آ گئے تھے۔ان کا انتقال اس سے کوئی چھ ایک برس بعد ہوا اور انہیں سٹریفرڈ کے ایک گرجے میں دفن کیا گیا۔1623ء میں ان کے ڈراموں کا پہلا مجموعہ ''فرسٹ فولیو'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

ص

صلاح الدین ایوبی (1138ء۔1193ء)

مسلم فرمانروا۔سلطان صلاح الدین ایوبی کو اپنی شجاعت، بلند حوصلگی اور عسکری مہارت کی بدولت مشرق ومغرب ہر جا بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔انہیں قوت، اتحاد اور عدل کی علامت کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔صلاح الدین کا زمانہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان صلیبی جنگوں کا زمانہ ہے جنہوں نے اسلام اور مغرب کے تعلقات کے سلسلے میں بہت تشکیلی کردار ادا کیا۔

صلاح الدین عراق میں پیدا ہوئے اور نسلاً وہ کرد تھے۔انہوں نے ایک جرنیل کے طور پر اپنی زندگی کا آغاز ترکوں کی حکومت کے تحت کیا۔جب انہیں مصر اور شام کی مہم پر بھیجا گیا تو انہوں نے خود مختاری کا اعلان کر کے ایوبی خاندان کی بنیاد رکھی جس نے 1174ء سے 1260ء تک کے عرصے میں مصر وشام، فلسطین اور عرب کے بعض علاقوں پر حکمرانی کی۔ایوبی نے تیسری صلیبی جنگ (92-1188ء) کے دوران یورپی حملہ آوروں کے خلاف صف آراء مسلم افواج کی قیادت کی اور 1187ء کی جنگ حطین میں فتح حاصل کر کے یروشلم پر مسلم حکومت بحال کی۔اس طرح کی ڈرامائی فتوحات کی بدولت صلاح الدین کی شجاعت کے چرچے دور دور تک پھیل گئے۔

صلاح الدین صلیبیوں کے ہاتھ آئے تمام علاقے واپس لینے اور مسلمانوں کو ایک مشترکہ نصب العین پر متحد کرنے کے بعد شام کے شہر دمشق میں فوت ہوئے اور انہیں وہیں سپرد خاک کیا گیا۔

صوفی ازم

اسلامی تہذیب میں پنپنے والی تصوف کی روایت۔عربی لفظ ''صوف'' کا لغوی مطلب

http://muftbooks.blogspot.com/

''اون'' ہے اور اسے غالباً اس روایت سے منسوب اس لئے کیا گیا ہے کہ ابتدائی دور میں مسلمان درویش اونی چوغے پہنا کرتے تھے۔ تصوف کی جڑیں تلاش کرنے کیلئے ہمیں ان مسلم مفکرین اور زہاد تک جانا ہوگا جنہوں نے دین کو شریعت کی حد سے آگے جا کر دیکھنے کی کوشش کی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس زاہدانہ تحریک نے ایک منفرد فلسفہ تصوف کی شکل اختیار کر لی۔ صوفی ازم کو ہم کوئی الگ فرقہ قرار نہیں دے سکتے بلکہ اس سے وابستہ افراد آپ کو اہل سنہ اور اہل تشیع دونوں مسالک میں نظر آئیں گے۔

نویں صدی میں آ کر مختلف اہل کشف بزرگوں اور مشائخ کے گرد ارادت مندوں کے حلقے وجود میں آنا شروع ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ حلقے ٹریڈ گلڈز کے نظام میں امتزاج کرتے چلے گئے جس کا نتیجہ ان بہت سے صوفی سلسلوں کی صورت میں برآمد ہوا جنہیں طرائق کہا گیا۔ ان سلسلوں کو حقیقی یا متصورہ بانی شخصیات کے نام سے موسوم کیا گیا اور ہر ایک سلسلے کا اپنا ایک مخروطی نظام مراتب وجود میں آ گیا۔ ایسے کسی سلسلے سے وابستگی اختیار کرنے کیلئے مرید کو اس سلسلے کے سربراہ (شیخ / مرشد) کے ہاتھ پر بیعت کرنا پڑتی تھی جس کا مطلب مرشد کی روحانی قیادت کا اقرار کرنا تھا۔ جب تیرہویں صدی میں دنیائے اسلام کی مرکزی اتھارٹی کا خاتمہ ہوا تو مذہبی و معاشرتی تنظیم میں پیدا ہونے والے خلا کو پر کرنے کیلئے یہ صوفی سلسلے آگے بڑھے۔

صوفی ازم کو دو بڑی اصناف میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک صوفی ازم فلسفیانہ اور اشرافیہ ہے اور دوسرا عوامی۔ دانشورانہ اور فلسفیانہ صوفی ازم بنیادی طور پر دین و تصوف کے تصورات کی ترتیب وار وضاحت پر توجہ دیتا ہے جبکہ عوامی صوفی ازم شخصیت شیخ، اور درگاہ یا پیر خانے کی رسموں اور عام اوران پڑھ لوگوں کی بلا واسطہ ذات الٰہی کے تجربے کی صلاحیت پر زور دیتا ہے۔ مسلم ممالک میں تعلیم کی کمی کے باعث مریدین کا اپنے سلسلے کے پیر یا شیخ پر بہت زیادہ انحصار دیکھنے میں آتا ہے اور بعض صورتوں میں تو یہ انحصار اس قدر زیادہ ہو جاتا ہے کہ وہ سلسلے کے دیگر اداروں اور روایتوں کا بھی خیال نہیں کرتے۔ ان زمروں کو سنجیدہ تصوف اور وجدانی تصوف کے زمروں میں رکھ کر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ سنجیدہ سلسلے صوفی ازم کے فلسفیانہ اور نظریاتی پہلوؤں پر زور دیتے ہیں جبکہ وجدانی سلسلے اجتماعی رسموں اور پیر اور پیر خانے سے متعلق مذہبی زندگی پر زیادہ توجہ مرکوز کرتے ہیں۔

اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود اشرافیہ اور عوامی دونوں انواع کی صوفی روایتوں نے تہذیب اسلامی کے سماجی اداروں کی تشکیل اور ادبی اظہار کی صورت گری میں اپنا کردار ادا کیا

ہے۔ سرزمین ترکی و فارس پر یہ بات خاص طور پر صادق آتی ہے جہاں کی بیشتر درباری اور لوک شاعری تصوف کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ موسیقی اور فنون لطیفہ (مصوری اور خطاطی) کے مختلف مکاتیب بھی اپنے ارتقاء کے دوران صوفی سلسلوں سے منسوب کیے جاتے رہے ہیں۔ اس وقت فعال صوفی سلسلوں میں نقشبندیہ، سہروردیہ، چشتیہ، شاذلیہ، ذہبیہ، بیکتاشی اور سلسلہ مولویہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ع

عادات

یہ عربی اصطلاح روایات اور قانونی انتظامات کے اس نظام کی طرف اشارہ کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو جنوب مشرقی ایشیا کے مسلم علاقوں (بشمول ملائشیا، انڈونیشیا، تھائی لینڈ اور جنوبی فلپائن) میں قدیم ادوار سے چلی آتی ہیں۔ ان عادات کا آغاز جو کہ شریعت سے الگ ہیں بلکہ بعض اوقات اس سے متصادم بھی ہوجاتی ہیں، ان علاقوں میں قبل از اسلام (اور قبل از ہندومت) کے دیہی معاشرے میں ہوا۔ جس طرح شرعی امور کو علماء وفقہاء دیکھتے ہیں، ان عادات کا نظام شامانوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور ان کا عمل دخل ہر شعبہ زندگی میں تھا۔ مختلف انڈونیشی حملوں کے دوران عادات نے مقامی روایت اور رسوم ورواج کے ایک بہت پختہ نظام کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ اس اصطلاح نے انیسویں صدی میں ولندیزی اور برطانوی ان نوآبادیاتی حکمرانوں کے زیر اثر ایک باقاعدہ ادارے کی شکل اختیار کرلی جو ایک ایسے موافق اور قابل عمل نظام قانون کی جستجو میں تھے کہ جو ان کے اپنے ملکوں کے قانون سے بھی مختلف ہو اور اسلامی شرعی قوانین سے بھی۔

آج کے دور میں عادات کے روایتی اور مشترک قانون کو ملائشیا اور انڈونیشیا کے قومی اور ریاستی قانون کی شکل دے دی گئی ہے اور ان میں شرعی ضوابط کی آمیزش کرکے اور ان میں بعض ترامیم کرکے انھیں مقامی رنگ سے ہم آہنگ کردیا گیا ہے۔

عباسیہ، خاندان

اسلامی خلفاء کا دوسرا بڑا سلسلہ۔ عباسیوں نے 750ء تا 1258ء حکومت کی۔ اس دور

http://muftbooks.blogspot.com/

خلافت کا اختتام منگولوں کے ہاتھوں ہوا جنہوں نے عباسی دارالخلافہ بغداد کو تاراج کیا اور 37ویں عباسی حکمران کو قتل کر دیا۔ یہ خاندان پہلے عباسی فرمانروا ابوالعباس السفّاح کی نسبت سے عباسی کہلاتا ہے جن کا انتقال 653ء میں ہوا۔ وہ رشتے میں نبی پاکؐ کے چچا تھے۔

عباسیوں نے بڑے منظّم انداز سے اپنی تحریک کو آگے بڑھایا اور ابومسلم کی قیادت میں متحد ہو کر 750ء میں اپنے پیشرو اموی خلفاء کا تختہ الٹا۔ بعض مؤرخین کے مطابق یہ تحریک غیر عرب مسلمانوں میں پیدا ہونے والی بے چینی کے سبب پروان چڑھی جو عرب حکمرانوں کے رویوں سے نالاں تھے۔ اس انقلاب کے موقع پر خاندان امیّہ کے افراد کو چن چن کر قتل کر دیا گیا۔ صرف ایک اموی نوجوان عبدالرحمٰن بچ نکلنے میں کامیاب ہوا جس نے جزیرہ عرب سے فرار ہو کر اندلس میں اموی حکومت کی بنیاد رکھی۔

دارالخلافہ بغداد کا قیام عباسیوں کے برسراقتدار آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد 762ء میں عمل میں آیا۔ اس شہر میں انتہائی عالی شان اور پرشکوہ عمارات تعمیر کی گئیں۔ بغداد نہ صرف ایک وسیع وعریض سلطنت کا محور بنا بلکہ اس نے جلد ہی علم وفضل، تعلیم وتحقیق اور تجارت وثقافت کے ایک بڑے مرکز کی حیثیت بھی اختیار کر لی۔ عباسی دور میں بغداد عالمی ثقافت کا مرکز بن گیا تھا۔

خلیفہ ہارون الرشید کا شمار نامور ترین عباسی خلفاء میں ہوتا ہے۔ انھوں نے 786ء تک حکومت کی۔ مشہور ہے کہ انھوں نے عظیم یورپی بادشاہ شارلمین کو اس کی تخت نشینی کے موقع پر ایک ہاتھی تحفے میں بھیجا۔ انھوں نے تاریخ میں ایک عادل حکمران اور علوم وفنون کے مربی کے طور پر بہت شہرت پائی۔ ان کا ذکر ہمیں چودھویں صدی میں تصنیف کردہ مشہور سلسلۂ حکایات 'الف لیلہ ولیلہ' میں بار بار ملتا ہے۔ بغداد کی درسگاہوں میں اسلامی دنیا کے طول وعرض سے آنے والے علماء وفقہا کا تانتا بندھا رہا جنھوں نے وہاں تعلیم وتدریس اور بحث ومناظرہ کی بے مثال روایت کی بنیاد رکھی۔ اس دور میں یہاں بے شمار رصدگاہیں، دانشگاہیں، شفاخانے اور طب وقانون کے مدارس قائم ہوئے۔ فنون لطیفہ خصوصاً ادب وشعر نے بھی بہت ترقی پائی۔

خاندان عباسیہ نویں صدی عیسوی کے اواخر میں زوال پذیر ہونا شروع ہوا۔ اگرچہ خلیفہ نے اپنی علامتی اہمیت برقرار رکھی مگر اب وزرا اور سول وفوجی حکام بہت زیادہ طاقتور ہو گئے تھے جس سے خلیفہ کی حاکمیت بہت محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ عباسی حکمران عیش وعشرت کے دلدادہ ہو گئے اور ان کی گرفت سلطنت پر کمزور پڑتی چلی گئی۔ مزید برآں مصر اور شمالی افریقہ جیسے دور دراز کے علاقوں میں مقامی سرداروں اور حاکموں نے آہستہ آہستہ سرکشی کا شیوہ اختیار کر کے مرکز کو کمزور کرنا شروع

http://muftbooks.blogspot.com/

کر دیا تھا۔

نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی میں آ کے بیشتر سیاسی و عسکری طاقت بغداد سے مقامی علاقائی حکمرانوں کے ہاتھوں منتقل ہو چکی تھی۔ عباسی صلیبی جنگوں کے دور میں یورپ سے یلغار کے لیے وارد ہونے والے عیسائی لشکروں کے مقابلے کے لیے مسلم اُمہ کو ایک پرچم کے نیچے متحد کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔ بالآخر جب آخری عباسی خلیفہ نے 1258ء میں جابر منگول حملہ آوروں کی بغداد کی طرف چڑھائی کی خبر سن کر غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے کا اعلان کیا تو رہا سہا عباسی اقتدار بھی دم توڑ گیا۔

عربی

لسان القرآن اور ساری عرب دنیا میں تحریری و تقریری اظہار کے لیے استعمال کی جانے والی زبان۔ اسلام کی آمد سے قبل مختلف قبیلے مختلف طرز کی عربی بولتے تھے۔ موجودہ عربی غالباً مختلف قبیلوں کے لسانی اجزا کے اجتماع سے وجود میں آئی اور پھر سارے عرب میں رابطے کی زبان کی حیثیت اختیار کر گئی۔ عربی کے مذہبی اور ثقافتی مقام کی وجہ سے بہت سے غیر سامی زبانوں نے بھی اس سے اثرات قبول کیے ہیں۔ مثال کے طور پر فارسی اور قبل از کمال اتاترک ترکی اور اردو کے لیے عربی رسم الخط ہی استعمال کیا گیا۔

عرب اپنی زبان کو اپنی سب سے قیمتی متاع سمجھتے ہیں اور اس میں واقعی کوئی شک والی بات نہیں کہ یہ زبان ہزاروں سال پرانی ادبی، مذہبی اور علمی روایت کی امین ہے۔ عربی زبان میں شروع ہی سے نئے نئے معانی شامل ہوتے چلے آئے ہیں اور نئے تصورات کے اظہار کے لیے نئی نئی اصطلاحات منظر عام پر آتی رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ اس کی تمام قدیم لفظیات اور قواعد آج بھی زندہ ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بعض الفاظ، محاورے اور اصطلاحیں آج زیادہ استعمال میں نہ آتی ہوں لیکن انھیں متروک خیال نہیں کیا جاتا۔ اس پر طرہ یہ کہ قرآن کو اسلامی دنیا میں ایک نادر حیثیت حاصل ہے۔ نہ صرف ایک مذہبی کتاب ہونے کے ناطے بلکہ ایک ادبی شاہکار کی حیثیت سے بھی اور اس کے اسلوب کو زبان دانی کے آئیڈیل کے طور پر لیا جاتا رہا ہے۔

صرف و نحو کے علم کو اسلامی تعلیم اور دوسرے شعبوں میں تحقیق کے لیے ایک پیشگی شرط تصور کیا جاتا تھا۔ علماء مختلف نوع کی عربی کے لیے مختلف اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ کلاسیکی عربی، جدید معیاری عربی اور بول چال کی عربی سب سے عام استعمال کی جانے والی اصطلاحات

http://muftbooks.blogspot.com/

ہیں۔ اگر چہ عربی کو بعض اوقات مصری عربی اور مراکشی عربی جیسے قومی زمروں میں بھی رکھا جاتا ہے، یہ قومی خطوط لسانی نقشے کے خدوخال کی صحیح عکاسی نہیں کرتے۔

اپنی ادبی، مذہبی اور ثقافتی اہمیت کے ساتھ ساتھ عربی زبان سیاسی اعتبار سے بھی بولنے والوں کے لیے بہت اہمیت اختیار کر چکی ہے۔ عربی زبان بائیس مختلف ممالک میں آباد 200 ملین افراد کو ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہے۔ یہ انھیں رابطے کا ایک وسیلہ مہیا کرتی ہے جو نسلی و مذہبی امتیازات اور مغرب کی مسلط کردہ ریاستی سرحدوں سے بالا ہے۔ یہ کسی عرب باشندے کی شناخت کا سب سے اہم جزو ہے۔

علیؓ

پیغمبر خدا حضرت محمدؐ کے چچازاد بھائی، ان کے داماد اور اسلامی تاریخ کے چوتھے خلیفہ۔ فقہ جعفریہ کے مقلدین انھیں رسولؐ کا جانشین مانتے ہیں۔ حضرت علی کے والد کا نام ابو طالب تھا مگر انہوں نے دس سال کی عمر سے نبی پاکؐ کے ساتھ رہنا شروع کر دیا تھا۔ آپ کا شمار ان صحابہ میں ہوتا ہے جنھوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ آپ کو رسول خداؐ سے اس قدر محبت تھی کہ جس رات آپؐ نے مکہ سے مدینے کی طرف ہجرت کی تو حضرت علی اپنی جان خطرے میں ڈال کر آپؐ کے بستر پر سوئے رہے۔ بعدازاں حضرت علیؓ خود بھی مدینہ چلے آئے اور آنحضورؐ کی بیٹی فاطمۃ الزہرہ کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ آپ کے ہاں دو بیٹوں حسنؓ اور حسینؓ کی ولادت ہوئی جنھوں نے بعدازاں اسلامی تاریخ میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ حضرت علیؓ نے مسلمانوں اور کفار کے درمیان بہت سی جنگوں اور غزوات میں حصہ لیا اور بے مثال بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھائے۔ بعض مؤرخین کے مطابق 632ء میں رسول اکرمؐ کی وفات پر حضرت علیؓ اور بعض دوسرے اکابر صحابہ کے درمیان جانشینی کے مسئلے پر اختلافات پیدا ہو گئے تھے جس کی وجہ سے امت مسلمہ دو فریقوں میں بٹ گئی۔ شیعہ حضرات علیؓ کو مسلمانوں کا پہلا امام قرار دیتے ہیں۔ آپ 656ء میں تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد منصب خلافت پر فائز ہوئے اور 661ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ 661ء میں ایک خارجی نے کوفہ کی ایک مسجد میں آپ پر تلوار سے وار کر کے آپ کو زخمی کر دیا تھا۔ اس افسوسناک واقعہ کے دو دن بعد آپ 63 برس کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ کو نجف میں دفن کیا گیا۔ نجف شریف میں آپ کا مقبرہ مبارک مرجع عام و خاص ہے۔ شیعہ حضرات خاص طور پر پوری دنیا سے چل کر اس جگہ کی زیارت کو آتے ہیں۔ نجف ایک بہت بڑے علمی و دینی مرکز کی حیثیت بھی اختیار کر چکا ہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

حضرت علیؓ کے تدبر وفہم اوران کے تقویٰ، شجاعت کوساری دنیا مانتی ہے۔

علی، محمد (1942۔)

مشہور زمانہ امریکی باکسر۔ ان کا یہ نعرہ کہ ''میں عظیم ترین ہوں۔'' جسے وہ اکھاڑے میں آنے کے بعد بار بار دہراتے تھے ساری دنیا میں مشہور ہوگیا۔ محمد علی نے ٹیلیوژن کا دور شروع ہونے کے بعد بحیثیت باکسر سب سے زیادہ شہرت پائی۔ ابھی تک وہ واحد باکسر ہیں جنھوں نے ہیوی ویٹ چیمپئین ہونے کا اعزاز تین مرتبہ حاصل کیا۔ محمد علی کا پہلے نام کیسیس کلے تھا اور وہ امریکی ریاست کنٹکی میں ایک انتہائی معمولی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ کلے سے باکسنگ کا تعارف لڑکپن میں ایک پولیس مین نے کروایا۔ ان کی اس کھیل میں دل چسپی اس قدر بڑھی کہ انھوں نے کنٹکی کا گولڈن گلووز چیمپئن ہونے کا اعزاز چھ مرتبہ جیت لیا اور 1960ء میں نیشنل گولڈن گلووز چیمپئین بھی بن گئے۔ اسی سال انھوں نے روم میں منعقد ہونے والے اولمپک مقابلوں میں شرکت کر کے لائٹ ہیوی ویٹ کلاس میں سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے ابتدائی ایام میں محمد علی نے جہاں ایک توانا اور چاق وچوبند کھلاڑی کے طور پر شہرت پائی۔ وہاں وہ اپنی بذلہ سنجیوں، دل چسپ حرکات اور آئندہ مقابلوں کے متعلق درست پیشین گوئیوں کی وجہ سے بھی بہت مقبول ہوئے۔ وہ اپنے مدمقابل کی جوڑ سے پہلے باتیں کر کر کے ہی ہمت توڑ دیتے تھے۔ وہ اکثر رنگ میں آ کر اپنی پیشین گوئیاں نغماتی اور نظمیہ انداز میں بولتے جس سے تماشائی بہت محظوظ ہوتے۔ محمد علی نے باکسنگ کے کھیل کو جو شہرت ومقبولیت بخشی اس سے باکسنگ سے آنے والی آمدنی جو 1950ء میں چار ملین ڈالر تھی، 1964ء میں بڑھ کر 18.1 ملین ڈالر تک پہنچ گئی۔ اس نے 1963 میں اسلام قبول کر لیا اور اپنا نام کیسیس کلے سے تبدیل کر کے محمد علی رکھ لیا۔

محمد علی نے 25 فروری 1964ء میں میامی بیچ کے مقام پر سونی لسٹن کو ہرا کر عالمی ہیوی ویٹ چیمپئین شپ کا اعزاز جیتا۔ جب انھوں نے ورلڈ ہیوی ویٹ ایسوسی ایشن کے چیمپئن ارنی ٹیرل کو شکست دی تو وہ باکسنگ کی دنیا کے بلاشرکت غیرے بادشاہ بن گئے۔ امریکہ کی ویت نام سے جنگ کے موقع پر جب 1967ء میں محمد علی کو فوج میں شامل ہونے پر مجبور کیا گیا تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس جنگ میں لڑنا ان کے ضمیر کے خلاف ہے۔ اس پر ان کے خلاف ملکی قانون کی خلاف ورزی کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا لیکن 1971ء میں سپریم کورٹ نے انھیں بری کر دیا۔ اس انکار کی وجہ سے ان پر امریکہ میں باکسنگ کھیلنے پر پابندی لگا دی گئی اور ان سے ورلڈ چیمپئین کا اعزاز چھین لیا گیا۔ جب محمد علی نے 1970ء میں دوبارہ کھیل کا آغاز کیا تو انھیں جو

http://muftbooks.blogspot.com/

فریزر کے ہاتھوں اپنی پیشہ ورانہ زندگی کی پہلی شکست کا سامنا کرنا پڑا لیکن چار سال بعد انھوں نے اس ہزیمت کا بدلہ چکا دیا۔1974ء میں وہ جارج فورمین کو ہرا کہ دوبارہ غیر متنازعہ ہیوی ویٹ چیمپئین بن گے۔1978ء میں ایک غیر متفقہ فیصلے کے نتیجے میں لیون سپنکس سے ہارنے کے صرف سات ماہ بعد محمد علی نے سپنکس کو چاروں شانے چت کر دیا اور اس طرح دنیا کو تیسری مرتبہ ورلڈ چیمپئن بن کر دکھا دیا۔لیکن یہ رنگ میں ان کے آخری ایام تھے۔1979ء میں انھوں نے بطور چیمپئین ریٹائر منٹ کا اعلان کر دیا۔ بعدازاں علی نے بیماری کی وجہ سے عوام میں آنا کم کم کر دیا۔ یہ مرض انھیں فعال زندگی کے دوران لاحق ہوا تھا۔

عہد تنویر یا روشن خیالی (Enlightenment)

یہ انسانی عقل پسندی کی وہ تحریک ہے جو اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے یورپی فکر پر چھائی رہی۔اس کے نمایاں خصائل رواداری، معاشرے کی عقلی تشکیل کے توسط سے سماجی ترقی کی امید، سائنس اور فطرت انسانی کی فیاضی پر اعتماد تھے۔تحمل و برداشت کا روز افزوں رویہ دراصل سولھویں صدی کی تحریک اصلاح مذہب سے ورثے میں ملنے والی مذہبی عدم رواداری کے خلاف ایک ردعمل تھا۔

دیکھا جائے تو سائنس اور انسانیت کی فطری خیر خواہی کے توسط سے ترقی پر یقین کے اس رویے کی جڑیں سولھویں صدی کے سائنسی کارناموں اور ازلی گناہ کے عقیدے کے استرداد میں نظر آتی ہیں۔ان عقیدوں کے فروغ کے لیے کام کرنے والے بیشتر افراد فلسفی تھے۔ان مفکرین میں کچھ تو جرمنی کے عمانوئل کانٹ کی طرح کے اکیڈیمک فلاسفر تھے لیکن ان میں زیادہ تعداد ان ادیبوں کی تھی جو دنیا کی تفہیم و تنظیم کے لیے تخلیقی و تنقیدی فکر کے اطلاق کے جذبہ لے کر میدان میں آئے تھے۔

یہ مفکرین آزادانہ استفہام و استفسار اور تنقیدی فکر کے آزادنہ تبادلے پر یقین رکھتے تھے۔ ان میں والٹیئر ، دیدیرو، بکاریا، ہیوم، بینتھم اور کانٹ جیسے دانشور شامل تھے۔

والٹیئر فرانس میں تنویری فکر کے اولین شارحین میں سے تھا اور اس کی تحریروں نے پورے یورپ میں مقبولیت حاصل کی۔وہ بہت ذہین و فطین شخص اور مباحثہ و مناظرہ میں بڑا طاق تھا۔اس نے (1754)"Candide" میں اپنی ساری صلاحیتیں مذہبی جنونیت اور عیسائی چرچ کی عدم رواداری پر لگا دیں۔دینس دیدیرو(1713ء۔1784ء) فرانسیسی تنویر کا ایک اور بڑا نام ہے۔ اس کا کارنامہ ایک سترہ جلدی بڑا انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں اس نے تنویری فکر کا پورا طائفہ شامل

کر دیا۔ اس نے یہ انسائیکلوپیڈیا 1745ء میں شروع کیا اور اس سے اس کا مقصد سیاست، مذہب، سائنس اور سماج پر جدید ترین علم کو ایک جگہ جمع کرنا تھا۔

انگریزی تنویر سے خاص معاہداتی عقلیت جریمی بینتھم (1748ء۔1832ء) کی نگارشات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کا مؤقف تھا کہ حکومت اور سماج پر منطقی قوانین کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ اس کی افادیت پسندی نے حکومت، قانون اور سماج کو منظم کرنے کی کوشش کی تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ بھلائی حاصل کی جا سکے۔

سکاٹش تنویر میں ڈیوڈ ہیوم (1711ء۔1776ء) نے اپنے ہموطن ایڈم سمتھ (1723ء۔1790ء) کی طرح روایتی عیسائیت کو ہدف بنایا۔ مابعد الطبیعات کے خلاف فلسفیانہ بغاوت جس کی نمائندگی تجربیت نے کی ہیوم کی بہت زیادہ مرہون منت ہے۔

قانون پسندی اور قانونی اتھارٹی کی خودمختاری اطالوی دانشور بکاریا (1738ء۔1794ء) کا امتیازی نشان تھا۔ اس کے اصرار کہ مجرمانہ سزا کسی عقل پر استوار ضابطہ قانون پر مبنی ہونی چاہیے نہ کہ حکومت کے تلون طبع پر، کی گونج پورے یورپ میں سنی گئی اور اس نے امریکی و فرانسیسی انقلابات میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

جرمن فلسفی عمانوئل کانٹ (1724ء۔1804ء) ایک سرکردہ تنویری دانشور تھا۔ اس نے اپنے مضمون ''تنویر سے کیا مراد ہے؟'' میں نوع انسانی کا ایک ایسا وژن پیش کیا جو مذہب اور آمریت جیسے سہارے اور بیساکھیاں پرے پھینک کر عقل کے توسط سے نفس پر قابو پاتی نظر آتی ہے۔ اس کے تین مقالوں جس میں سب سے مشہور ''تنقید عقل محض'' (1781ء) ہے، نے علم، اور ذوق کی تشکیل کے ضمن میں فرد کے دائرہ عمل کی تحدید کرنے کی سعی کی۔

بیسویں صدی میں انسانیت پسندوں اور مغربی مارکسسٹوں نیز فاشسٹوں نے ترقی اور حرفتی تخیل پر انحصار کی تنویری آئیڈیالوجی کو بہت آڑے ہاتھوں لیا۔ آج کے دور میں بھی تنویری ورثے اور اس کے پوشیدہ مصارف کا سوال سیاسی و سماجی تھیوری میں ایک مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔

عید الفطر

ایک اسلامی تہوار جو رمضان کے روزے ختم ہونے اور شوال کا چاند نظر آنے پر منایا جاتا ہے۔ اسے چھوٹی عید بھی کہا جاتا ہے۔ رمضان جو کہ ہجری سال کا نواں مہینہ ہے، میں مسلمان صبح سے شام تک روزہ رکھتے ہیں جس کے دوران وہ کھانے پینے حتیٰ کہ تمباکو نوشی اور سیکس سے بھی

پرہیز کرتے ہیں۔عید آنے پر زندگی معمول پر آجاتی ہے بچے، بوڑھے، نوجوان سب بڑی بے تابی سے اس دن کا انتظار کرتے ہیں۔ترکی میں اس تہوار کو سکر بیرام بھی کہتے ہیں جس کا مطلب میٹھی عید ہے۔اس موقع پر شیریں پکوانوں کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا ہے۔

عیسائیت

ایک عالمی مذہب جس کا آغاز فلسطین سے ہوا اور جس کی بنیاد حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے رکھی۔اس مذہب نے دنیا بھر کے بہت سے معاشروں اور ثقافتوں پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔اس مذہب کے مطابق یسوع ناصریؑ خدا کے فرزند ہیں اور الوہی تثلیث میں دوسرے درجے پر فائز ہیں۔یہ تثلیث آسمانی باپ، اس کے فرزند اور روح القدس سے مل کر بنتی ہے۔عیسائی عقیدہ یہ بھی کہتا ہے کہ عیسیٰؑ کا دنیا میں آنے اور اپنی جان کا صدقہ پیش کرنے کا مقصد خدا کی بنی نوع انسان کے لیے محبت کو ثابت کرنا اور اپنی موت سے انسانیت کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا تھا۔یہ مذہب ان لوگوں کو ابدی نجات کی نوید سناتا ہے جو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کا اقرار کریں اور ان پر عمل پیرا رہیں۔

اگرچہ حضرت عیسیٰؑ کے احوال اور ان کی تعلیمات بائبل کے جزو عہد نامہ جدید میں درج ہیں۔اس کے اخلاقی نظام کی جڑیں عہد نامہ عتیق خصوصاً احکامات عشرہ کی عبارات سے جڑی نظر آتی ہیں۔عیسائی مذہب میں چند رسومات Sacraments بھی بہت اہم ہیں جو کسی مقلد کی مذہبی و شخصی ارتقاء کی نمائندگی کرتے ہیں۔اس مذہب کی اکثر رسومات کسی تربیت یافتہ پادری کی اقتداء میں ایک مقررہ گرجے میں ادا کی جاتی ہیں لیکن جیسا کہ دوسرے ادیان و مذاہب میں بھی ہوا دین مسیحی بھی اپنے گذشتہ دو ہزار برسوں میں متعدد مسلکوں، سلسلوں اور فرقوں میں بٹتا نظر آیا ہے اور ان مختلف گروہوں کے عیسائی کئی مختلف رنگوں اور ڈھنگوں میں اپنی مذہبی عبادات کی ادائیگی کرتے رہے ہیں۔گرجے اور گرجے میں عبادت کی اہمیت بھی بعض مکاتیب فکر کے نزدیک کچھ ہے اور بعض کے نزدیک کچھ۔آجکل کے دین عیسائیت کی تین بڑی شاخیں رومن کیتھولک، پروٹسٹنٹ اور آرتھوڈوکس ایسٹرن ہیں۔پروٹسٹنٹ فرقے کی آگے اور کئی شاخیں نکلتی ہیں۔

عیسائیت خود بھی یہودیت سے پھوٹی ایک شاخ ہے۔عیسیٰؑ پیدائشی طور پر ایک یہودی تھے اور ان کا ذکر یہودیوں کی کتاب مقدس تورات میں بھی آتا ہے کہ دنیا ایک طویل عرصے تک ان کا انتظار کرے گی اور وہ ایک مسیحا کے روپ میں اس زمین پر تشریف لائیں گے۔ان کے پیش کردہ عقائد و تعلیمات میں بھی اس دور کی یہودیت کی جھلک نظر آتی ہے۔عیسائیت کا نیا مذہب اپنے

http://muftbooks.blogspot.com/

تشکیلی مراحل طے کرنے کے بعد ایشیائے کوچک سے لے کر سکندریہ اور یونان سے لے کر روم تک بڑی تیزی سے پھیلا جو اس کے ابتدائی مبغلین خصوصاً سینٹ پال کی ذہانت اور گرانقدر مساعیوں کا ثمر تھا۔ عیسائی عالموں کی تبلیغ کا عمل آج بھی وسیع پیمانے پر جاری ہے۔ یہ مبلغین انیسویں اور بیسویں صدی میں مغرب کے نوآبادیاتی منصوبوں کا حصہ بھی بنے رہے لیکن مبغلین کے بعض سلسلے مثلاً یسوعی، ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنی تبلیغی مساعیوں کا آغاز آزادانہ طور پر یورپی نوآبادیاتی دور سے بہت پہلے کر دیا تھا۔

اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ عیسائی مذہب میں اوپر سے نیچے درجہ بندی کا نظام دوسری صدی عیسوی میں موجود تھا جس میں ہر علاقے کے لیے ایک الگ بشپ مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ ڈھانچہ رومن کیتھولک چرچ میں آ کر ایک باقاعدہ ادارے کی شکل اختیار کر گیا جس میں بشپ آف روم یعنی پوپ کو تمام بشپوں کے سربراہ کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ عیسائی مذہب کے معاملات کو منظم طور پر چلانے کے لیے ایک مرکزی قوت کی اشد ضرورت تھی کیونکہ اس نے اپنے مبدے سے نکل کر کئی مختلف علاقوں کی قوموں میں پھیلنا شروع کر دیا تھا۔

ان قوموں نے نئے عیسائی اعتقادات کو اپنے قدیم عقائد و رسوم سے یکجا کر کے اس فکری کشادگی کا ثبوت دیا جس کی مثال کسی دور میں سینٹ پال نے خود کورنتھیوں کو عیسیٰؑ کی تعلیمات کی تبلیغ پہنچاتے وقت کی تھی۔ چند ہی صدیوں کے دوران حضرت مسیحؑ کی حیات مبارکہ اور ان کی تعلیمات کی سرکاری تعبیر کے فروغ کو رومن کیتھولک چرچ اور بائبل کے عہد نامہ جدید خصوصاً چاروں اناجیل میں ایک باقاعدہ ادارے کی شکل دے دی گئی۔ جن کا انتخاب تیسری صدی عیسوی میں عمل میں آیا۔

عیسائیت کو پہلے دو سو پچاس برس خوب رگڑا برداشت کرنا پڑا۔ رومن شہنشاہ خود کو دیوتا تصور کرتے تھے اور انھوں نے عیسائیت کی ترویج کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالیں۔ 313ء میں کونسٹنٹائن اول اور لسی نیئس کے عہد میں فرمان میلان کی رو سے عیسائیت سے رواداری کو سرکاری حیثیت دے دی گئی۔ مغرب میں بشپ آف روم شاہی طاقت سے آزاد رہا۔ مشرق میں جہاں ایک مرکزی مذہبی طاقت کی کمی تھی، چرچ بادشاہ کے کنٹرول میں آ گیا۔ اس روش کہ جس نے سیزرو۔ پاپائیت کا نام پایا، کی ابتدا کونسٹنٹائن نے کی تھی اور بعدازاں جسٹنین نے اسے قانون بنا دیا۔

عیسائیت کو جائز قرار دیے جانے کے بعد تین سو سال عیسائی دنیا عیسیٰ کی ماہیت، ان کے

خدا سے تعلق اور روح القدس سے متعلق مذہبی تنازعات میں الجھی رہی۔ ان سوالات پر مذہبی کونسلوں میں بحث مباحثے ہوتے رہتے تھے جن کے نتیجے میں وہ Nicene Creed منظر عام پر آیا جسے چرچ کے سرکاری مؤقف کا خاکہ کہا جاسکتا ہے۔ ان صدیوں کے دوران بہت سے اہم عیسائی مفکرین نے اپنی تصنیفات قلمبند کیں۔ مثلاً ان میں ایک نام تو بابا بیزل اعظم کا ہے جنہوں نے عیسائیت میں رہبانیت کے پہلے منظم عناصر متعارف کرائے۔ اوریگن اور جیروم بابا کے نام بھی نمایاں ہیں جنھوں نے بائبل کے مواد اور تنظیم کے یقین میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

ساتویں اور آٹھویں صدی میں دنیائے مشرق میں اسلام کو غلبہ حاصل ہوگیا۔ بت شکنی کی جدوجہد نے مشرق ومغرب میں فاصلے اور بھی زیادہ کردیے اور نویں صدی تک دونوں عیسائی دنیاؤں کے بیچ کوئی ثقافتی تعلقات باقی نہ رہے تھے۔ حتی کہ ان کے مشترک دین عیسوی کی عبادت میں بھی فرق پیدا ہو چکا تھا۔ 1054ء میں یہ تفرقہ اس وقت ایک پکی صورت اختیار کر گیا جب روم اور قسطنطنیہ کے مابین مذہبی منافرت کو ایک طرح کی قانونی توثیق مل گئی اور رومن کیتھولک چرچ اور ایسٹرن آرتھوڈوکس چرچ کی قطع تعلقی ایک باقاعدہ حیثیت اختیار کر گئی۔ سولھویں صدی میں کیتھولک چرچ کی رسوم وروایات اور دینوی معاملات میں اس کی حد سے زیادہ مداخلت کی وجہ سے عیسائی دنیا میں ایک بے چینی وعدم اطمینان کی لہر چل نکلی جس سے پروٹسٹنٹ یعنی اصلاح مذہب کی تحریک شروع ہوگئی۔ اس اصلاحی مسلک سے تعلق رکھنے والے مسیحیوں نے پوپ کو بے خطا اور زمین پر رضائے خداوندی کا واحد نمائندہ ماننے سے انکار کردیا۔ اس طرح الگ الگ چھوٹے فرقے وجود میں آگئے جنھوں نے رومن چرچ اور اس کے مخروطی نظام کو مسترد کردیا اور کیتھولک مسلک کی پیچیدہ اور پراسراف عبادات کو چھوڑ کر عبادت کے ذاتی اور سادہ طریقوں کو ترجیح دینا شروع کردی۔

اگرچہ عیسائیت کا گذشتہ کئی سو سالوں سے پوری سیاست ومعاشرت پر اثر بہت کم ہوا ہے، یہ مذہب صنعتی دنیا کے بعض حصوں میں اب بھی بہت زبردست اور نمو پذیر قوت کے طور پر موجود ہے اور بیسویں صدی میں یہ بالخصوص لاطینی امریکہ اور افریقہ میں بہت پھیلا ہے۔

1990ء کے عشرے میں طویل اشتراکی دور سے نکلنے والے مشرقی یورپ کے ملکوں میں عیسائیت کی مختلف شکلیں، خاص طور پر رومن کیتھولک مسلک اور ایسٹرن آرتھوڈوکس، زبردست سیاسی وسماجی قوتوں میں تبدیل ہوچکی ہیں۔

عیسیٰؑ (اندازاً 4ق م۔28ء)

عیسائیت کے بانی۔ انہیں انسانی تاریخ کی بڑی مذہبی شخصیات میں شمار کیا جاتا ہے اور عہد نامہ جدید میں مرقوم ان کے ارشادات وتعلیمات عیسائیت کی بنیاد سمجھے جاتے ہیں۔ ہمیں حضرت عیسیٰ ؑ کے بارے میں تمام معلومات ان کے ان حواریوں کی بیان کردہ چار انجیلوں سے ملتی ہیں جنہوں نے خود انہیں ایک مسیحا کے روپ میں دیکھا۔ ان کی آمد سے قبل عبرانی صحائف یعنی عہد نامہ عتیق میں ان کے آنے کی بشارت موجود تھی۔ یسوع کو عموماً عیسائی تصورات کی تجسیم کے طور پر ایک تاریخی شخصیت اور قابل پرستش ہستی تسلیم کیا جاتا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عیسیٰ ؑ ناصریہ کے ایک یہودی بڑھئی یوسف کی اولاد تھے لیکن انجیل کی ایک روایت کے مطابق وہ معجزانہ طور پر اپنی کنواری ماں مریم کے بطن سے پیدا ہوئے اور اس نومولود بچے کی اللہ کے فرزند کے طور پر منادی کی گئی۔ ہمیں عیسیٰ ؑ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں زیادہ باتیں معلوم نہیں، اگرچہ وہ بظاہر بیت اللحم میں پیدا ہوئے اور بعد میں انہوں نے ناصریہ میں زندگی گزاری اور اپنے والد کا پیشہ اختیار کیا۔ انجیلوں میں زیادہ تر ان کی نبوت اور ان کے لوگوں سے تعامل کی باتیں کی گئی ہیں اگرچہ ان میں ان کی جوانی کے بارے میں چند ایک مختصر سے بیانات بھی ملتے ہیں۔ ایک بیان میں عیسیٰ ؑ کو عالم شباب میں ایک معبد کی سیڑھیوں میں کھڑے ہو کر لوگوں کے ایک گروہ کو تبلیغ کرتے بتایا گیا ہے اور ایک دوسری جگہ اس واقعہ کا ذکر ہے جس میں انہوں نے ایک شادی کے موقع پر پانی کو شراب میں تبدیل کر دیا تھا۔

جان دی بپٹیسٹ سے بپتسمہ لینے کے بعد یسوع ؑ نے اپنے بارہ حواریوں کے ساتھ نگر نگر جا کر خداوند کی محبت اور عفو کی تبلیغ کی۔ ان کے پیغام کی بنیادی چیز قوت ایمانی اور ایک بہتر زندگی کی امید تھی۔ وہ آہستہ آہستہ بے کس اور پسے ہوئے لوگوں میں بہت زیادہ مقبول ہوتے چلے گئے۔ وہ لوگوں کو پیغام دیتے تھے کہ خداوند کی بادشاہت میں سب کو جگہ ملے گی۔ خدا نے انہیں بہت سی طاقتوں اور معجزوں سے سرفراز فرمایا تھا۔ کہتے ہیں وہ اپنی معجزانہ قوت سے کوڑھیوں کو اچھا بھلا اور نابیناؤں کو بینا کر دیتے تھے۔

عیسیٰ ؑ کے دور میں فلسطین پر رومیوں کی حکومت تھی اور ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے رومن حکمران اور یہودی سردار دونوں پریشان تھے۔ انہیں خوف تھا کہ عیسیٰ ؑ سیاسی و مذہبی باغی رہنما کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ ان کی انا پرکاری تنقید اور توبہ کی تلقین نے ان لوگوں کو مزید برہم کر دیا جو ان کی تبلیغ کو بند کرنے کے درپے تھے۔ وہ عید الفصح کیلئے یروشلم آئے اور اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ عشائے اخیر میں شریک ہوئے جس کے بعد، عیسیٰ ؑ کو ان کے ایک حواری جو

http://muftbooks.blogspot.com/

ڈاز نے دھوکے سے رومن حکام کے ہاتھوں پکڑوا دیا۔ انہیں پونٹس پائیلٹ نے سیاسی باغی قرار دے کر صلیب پر لٹکا دیا۔ بعد میں انہیں جوزف آف آریناتھیا کے مقبرے میں دفن کر دیا گیا۔ عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق عیسیٰؑ زندہ ہو کر اپنی تربت سے پھر باہر آ گئے تھے اور آسمانوں پر اٹھائے جانے تک تبلیغ کرتے رہے۔

غ

غالب، مرزا اسداللہ خاں (1787ء تا 1869ء)

ہندوستان کے ایک لاثانی شاعر جن کا زیادہ تر کلام اردو اور فارسی زبانوں میں ہے۔ شاعری کے علاوہ ان کی نثری نگارشات کا شمار بھی ہندوستان کے کلاسیکی ادب میں ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ ایک امیر اور متمول گھرانے میں پیدا ہوئے لیکن انکی بیشتر زندگی تنگدستی اور عسرت میں گزرتی۔ ان کی شادی اوائل عمری میں ہی ایک شاعر الٰہی بخش خان کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوگئی تھی۔ غالب کو جب 1854ء میں مغل بادشاہ بہادر شاہ دوم نے ملک الشعرا کے عہدے پر فائز کیا تو انہیں کچھ اچھے دن بھی دیکھنے کو ملے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد بہادر شاہ ظفر کو رنگون جلاوطن کر دیا گیا اور مرزا غالب کے حالات نے وہی پہلے والی ڈگر اختیار کر لی، غالب نے زیادہ تر غزل، قصیدے اور مثنوی کی اصناف کو وسیلۂ اظہار بنایا ہے اور انہوں نے پانچ ہزار سے زائد اشعار اردو میں جبکہ کوئی گیارہ ہزار کے قریب فارسی میں تحریر کئے ہیں۔ انہوں نے فارسی لغت اور قواعد پر بھی ایک کتاب بعنوان ''پنج آہنگ'' تحریر کی جس میں ان کی اپنی نثر اور شاعری کا انتخاب بھی شامل تھا۔ اس کے علاوہ مغلیہ عہد پر ان کی تصنیف، ''مہر نیم روز'' اور جنگ آزادی پر لکھی جانے والی ان کی تحریر ''دستنبو'' بھی قابل ذکر ہے۔ غالب کا اردو ادب کی ترویج و ترقی اور اسے دنیا کی دیگر ادبی روایتوں کے شانہ بشانہ لا کھڑا کرنے میں بہت بڑا کردار ہے۔ بہت سے نقاد انہیں اردو زبان کا عظیم ترین شاعر قرار دیتے ہیں۔

غرب زدگی

ایک فارسی اصطلاح جو پہلی مرتبہ ایرانی ادیب جلال آل احمد نے 1977ء میں اپنی اسی نام سے شائع ہونے والا کتاب میں استعمال کی اور اس کا اشارہ محمد پہلوی (1921ء۔1979ء)

http://muftbooks.blogspot.com/

کے آخری دو عشروں میں ایرانی معاشرے کو اپنی گرفت میں لینے والے ایک ثقافتی رجحان کی طرف ہے جب ایرانی معاشرے کے بعض طبقوں پر اہل مغرب کی نقالی کا خبط سوار ہو گیا تھا۔

غزالی (1058ء تا 1111ء)

عرب فلسفی اور متصوف عالم دین۔ ان کا شمار اسلامی تاریخ کے مجتہدین علماء میں ہوتا ہے۔ وہ 1058ء میں شمالی ایران کے شہر طوس میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے علوم دین پر ابتدائے عمر میں ہی عبور حاصل کر لیا تھا لیکن بعد ازاں وہ تشکیک کا شکار ہوئے اور یونانی منطق اور فلسفے کا مطالعہ کرنے لگے۔ جب ان کے ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ شاید حقیقت مطلق کا ادراک کسی طور پر بھی نہیں کیا جا سکتا تو وہ شدید ڈپریشن اور پریشانی کا شکار ہو گئے اور بغداد میں اپنا منبر و مرتبہ ترک کر کے مختلف طرح کے ارضی و روحانی سفروں میں مصروف ہو گئے۔ اس سارے روحانی و باطنی بحران کے بعد وہ اس عقیدے پر پہنچے کہ علم کا ماخذ صرف اور صرف تجربہ ہی ہو سکتا ہے استدلال نہیں۔ ان کا فرمانا تھا کہ یونانی فلسفہ انسان کو یقین کی منزل سے بہرہ ور کرنے سے قاصر ہے۔ غزالی تو بہت سی اندرونی مسافتوں کے بعد اسلام پر لوٹ آئے لیکن انہوں نے فلسفے کا جو بطلان کیا ہے اس کی بنیاد اصولی نہیں بلکہ خود فلسفے کے داخلی تضادات اور تناقضات ہیں۔ انہوں نے بعض فقہی معاملات پر بھی تنقید کی اور انھیں شریعت کے منافی قرار دیا۔ ان کا بیان ہے کہ انہیں ایمان استدلال یا عقلی دلائل سے نہیں بلکہ اس نور سے ملا ہے جو اللہ جل شانہ نے ان کے قلب پر وارد کیا۔ ان کے نظریات نے بعد میں آنے والے علماء و فقہا پر بڑے دور رس اثرات مرتب کئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اسلامی تہذیب کے ارتقاء کے ایک نازک مرحلے میں طریقت اور شریعت کی ایک دوسرے سے مفاہمت کا اہم فریضہ سرانجام دیا۔

غزنوی

دسویں سے بارہویں صدی تک افغانستان، مشرقی ایران اور شمال مغربی ہند پر حکمرانی کرنے والے ترک النسل بادشاہ، وہ ایک افغانی قصبے غزنی کی نسبت سے غزنوی کہلاتے ہیں جو اس متذکرہ تمام دور میں ان کا دارالحکومت رہا۔ غزنوی کی اس سلطنت کو جس کی بنیاد سبکتگین نے رکھی تھی، عروج اس کے بیٹے محمود کے دور میں آ کر ملا۔ اہل غزنہ جلد ہی فارسی ثقافت میں گھل مل گئے اور بہت سے علماء و فنکار ان کے دربار کا رخ کرنے لگے۔ ان میں سب سے مشہور نام شاہنامے

کے مصنف فردوسی کا ہے۔ غزنوی سلاطین کا سب سے بڑا کارنامہ شمال مغربی ہندوستان کی فتح اور وہاں دین اسلام کی اشاعت ہے۔ سلطان محمود غزنوی جو ہندوستان پر اپنے سترہ اہم حملوں کی وجہ سے مشہور ہے، محمد بن قاسم کے بعد ہندوستان پر حملہ آور ہونے والا اولین مسلم بادشاہ تھا۔ وہ اگرچہ جلد واپس لوٹ گیا لیکن اس کے بعد مسلمان فاتحین اور فرمانراؤں نے ارض ہند پر اپنے قدم جمانے شروع کر دیئے اور انہوں نے صدیوں تک پورے ہندوستان پر حکمرانی کی اور ہندی اور فارسی ثقافتوں کے امتزاج سے ایک نیا رنگ پروان چڑھایا۔

ف

فارسی

مشرق وسطیٰ کے بعض خطوں میں صدیوں سے بولی اور سمجھی جانے والی ایک زبان۔ اس زبان کا تعلق چھٹی صدی قبل مسیح میں قدیم سلطنت فارس سے جا ملتا ہے۔ آج کل فارسی ایران اور افغانستان کے تقریباً پندرہ ملین افراد کی مادری زبان ہے اور اس کا تعلق ہند یورپی زبانوں کے خاندان کے ہند ایرانی گروہ سے بنتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس زبان کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ قدیم فارسی (اندازاً 550۔330 ق م) اس ہخامنشی خاندان کے عہد کی کندہ تحریروں میں محفوظ ملتی ہے جسے سکندر اعظم نے تسخیر کیا تھا۔ وسطی فارسی (اندازاً 226ء۔640ء) جسے پہلوی بھی کہا جاتا ہے، ایک قسم کے آرامی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ اسے تیسری سے ساتویں صدی کے درمیانی عرصے میں ساسانی عہد کے دوران عروج ملا۔ جدید فارسی دسویں صدی کے اواخر میں اس وقت نمودار ہوئی جب ایران کے عربوں کے قبضے میں آنے کے بعد یہ ایک تحریری زبان کے طور پر عملاً بالکل ہی ناپید ہو چلی تھی۔ جدید فارسی قواعد کے اعتبار سے پہلے کی فارسیوں سے بہت سادہ ہے اور اس میں بہت سے عربی الفاظ شامل ہیں۔ صوری اعتبار سے تب سے اب تک اس میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور اسے اب بھی عربی رسم الخط میں تحریر کیا جاتا ہے۔ جدید فارسی کو چودھویں سے انیسویں صدی تک مسلم ہندوستان میں ایک بڑی زبان کی حیثیت حاصل رہی۔ ایران میں یہ نصف سے زائد آبادی کی روزمرہ زبان ہے، نیز اسے حکومت، تجارت اور تعلیمی نظام میں ایک غالب مقام حاصل ہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

فالکنر، ولیم (1897ء۔1962ء)

امریکی ناول نگار۔ فالکنر کے تہہ دار ناولوں نے اسے امریکی جنوب کے وقائع نگار کے طور پر شہرت بخشی۔ وہ نیوالبانی، مسی سپی میں پیدا ہوا اور اس نے ایک چھوٹے سے قصبے آکسفورڈ میں پرورش پائی۔ وہ بچپن میں شرمیلا تھا اور ادبی میلان شروع ہی سے اس کی شخصیت کا حصہ تھا۔ اس نے ہائی سکول کو تکمیل سے ایک برس قبل ہی خیر باد کہہ دیا تھا اور لگی بندھی تعلیم کی بجائے معاصر ادب کے خود سے آزادانہ مطالعے میں زیادہ دل چسپی لینا شروع کر دی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے مسی سپی یونیورسٹی کو بھی ایک سال کے بعد الوداع کہہ دیا۔

اس کے بعد وہ آکسفورڈ میں کئی سالوں تک چھوٹی موٹی ملازمتیں کرتا رہا لیکن پھر کیا ہوا کہ اس کا شروڈ اینڈرسن جیسے ادیبوں کے ساتھ بیٹھنا اٹھنا ہو گیا۔ اینڈرسن نے اسے اپنا پہلا ناول ''سپاہیوں کی تنخواہ'' (1926ء) کی اشاعت میں بھی مدد دی۔ فالکنر کو اس کی خاص تھیم اور اپنا امتیازی سلوب تین سال بعد ''سارنورس'' (1929ء) میں ہاتھ لگے یہ اس کی پہلی تصنیف تھی جو اس نے دیومالائی یوکناپتا پھا صوبے کے پس منظر کے ساتھ لکھی۔ اس نے پیچیدہ خاندانی احوال اور کئی کہانیاں ایک ساتھ چلانے کا تجربہ سارنورس میں کیا جو اس کی موخر تحریروں ''جب میں مرنے کو لیٹا'' (1930ء) اور ''چلتے جاؤ موسیٰ'' (1942ء) میں مرکزی اہمیت اختیار کر گیا۔

فالکنر نے اپنی فکشن میں جیمز جوائس اور مارسل پروسٹ کے انداز میں زمانی تسلسل میں ہیر پھیر اور ایک ساتھ شعوری کی کئی حالتوں کی منظر کشی جیسی جدید تکنیکوں کے تجربے کیے۔ ''دی ساؤنڈ اینڈ دی فیوری'' (1929ء) میں اس نے کامپسن خاندان متعارف کرایا جس کا شمار اس کے تخلیق کردہ مشہور ترین خاندانوں میں ہوتا ہے۔ زنا اور خودکشی کے موضوعات پر مبنی کیڈی، بینجی، کوینٹن اور جیسن کی یہ کہانی جنوبی و انسانی تاریخ سے متعلق فالکنر کی تاریک سوچ کی نمائندگی کرتی ہے۔ اپنی تخلیقات میں زمانی تسلسل کو پیش کرنے کا اس کا اپنا منفرد انداز ماضی کی مرکزیت کا غماز ہے۔ فالکنر کی فکشن میں تاریخ ایک ایسی زندہ شے کے طور پر سامنے آتی ہے جو زمانہ حال پر اپنا رنگ چھوڑتی بلکہ حال کے ساتھ ساتھ چلتی دکھائی دیتی ہے۔

فالکنر کی دیگر اہم تصانیف میں ایک غیر یقینی نسلی زمرے کے ایک شخص کی کہانی ''اگست میں روشنی'' (1932ء) اور ''ابسلوم، ابسلوم!'' (1936ء) شامل ہیں جس میں ٹامس سٹپین کے جنوب میں ایک ذاتی سلطنت قائم کرنے کے عزم کی حکایت بیان کی گئی ہے۔

مالی مشکلات اور کثرت شراب نوشی کی لعنت بھی فالکنر کی ادبی تخلیقات کے ساتھ ساتھ چلتی

رہی۔ اس نے جلد دولت کمانے کی غرض سے اپنا پہلا بیسٹ سیلر ناول ''پناہ گاہ'' 1931ء میں شائع کیا۔ اس انتہائی سنسنی خیز ناول میں جبری زنا کا ایک انتہائی کریہہ واقعہ بھی شامل تھا۔ اسے اپنے کنبے کا پیٹ پالنے کے لیے 1940ء کے عشرے میں کئی سال ہالی وڈ میں فلمی سکرپٹ تحریر کرنا پڑے۔ اسے 1950ء میں ملنے والا نوبل پرائز اس کی ڈوبتی شہرت کو سہارا دینے کے کام آیا اور 1962ء میں اس کی موت کے بعد اس کا نام عظیم ترین امریکی ادیبوں کی فہرست میں شامل کیا جانے لگا۔

فاؤسٹ

مغربی ادب کی ایک مشہور حکایت۔ اسے فاسٹس یا ڈاکٹر فاسٹس بھی کہا جاتا ہے اور یہ حکائت مغربی ادب میں سولھویں صدی سے مقبول چلی آتی ہے۔ اس کہانی کا تعلق قرون وسطیٰ کے اواخر سے ہے اور اس کا مرکزی کردار جس کا نام فاؤسٹ یا ڈاکٹر فاسٹس ہے عام علوم سے بیزار ہو کر سفلی علوم سیکھنا شروع کر دیتا ہے جس کے دوران اسے غیبی طاقتیں حاصل کرنے کے لیے شیطان سے ایک معاہدہ کرنا پڑتا ہے جس کی رو سے وہ اپنی روح شیطان کے نام کر دیتا ہے۔ فاؤسٹ نام کا کم از کم ایک تاریخی کردار بھی ملتا ہے جس کی موت 1540ء کے لگ بھگ واقع ہوئی اور جس نے اپنے پیچھے کچھ ایسی چیزیں چھوڑی تھیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے شیطان سے تعلقات تھے۔ فاؤسٹ کا کردار استعمال کرنے والی ادبی تخلیقات نے جن بنیادی مآخذ سے اکتساب کیا ہے ان میں سے ایک Foustbuch بتایا جاتا ہے جو 1587ء میں شائع ہوا اور جس کے مصنف کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ انگریزی ڈرامہ نویس کرسٹوفر مارلو کا کھیل ڈاکٹر فاسٹس (1604ء) Faustbuch کے انگریزی ترجمے سے بہت زیادہ استفادہ کرتا نظر آتا ہے۔ مارلو کے اس المیہ ڈرامے کے آخر میں معاہدے کے مطابق شیطان فاوسٹ کی روح کو کھینچ کر جہنم کی طرف لے جاتے ہیں تاہم جرمن شاعر اور ڈرامہ نگار گوئٹے کے ''فاؤسٹ'' میں جو کہ دو حصوں (1808ء۔1832ء) میں لکھا گیا، الوہی طاقتیں اثر انداز ہو کر فاؤسٹ کی روح کو شیطانوں سے چھڑا لیتی ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں جانے سے بچ جاتا ہے۔ گوئٹے کا ''فاؤسٹ'' نوع انسانی کی علم و طاقت کے لیے پیاس کے رجحانات و امکانات کی عکاسی کرتا ہے۔ بیسویں صدی کے جرمنی میں پیدا ہونے والے امریکی ادیب ٹامس مان کے ناول ''ڈاکٹر فاسٹس'' (1947ء) نے فاؤسٹ کی حکایت استعمال کر کے بیسویں صدی کے اول نصف میں جرمن ذہن پر چھائی بے معنویت کی تصویر کشی کی ہے شروع کے Faustbuch کی

http://muftbooks.blogspot.com/

اشاعت کے وقت سے فاؤسٹ کی حکایت ایسے انسانوں کے عبرتناک انجام پر تبصرے کے لیے استعمال ہوتی چلی آ رہی ہے جو علم اور طاقت کے پیچھے بھاگتے ہوئے اخلاقی و انسانی تقاضوں کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔

فرانسس آف اسسی، سینٹ (اندازاً 1182ء-1226ء)

اطالوی راہب اور فرانسسکن سلسلے کا بانی۔ ان کا اصل نام جیووانی فرانسیسکو برنارڈون تھا اور ان کے والد کپڑے کے ایک خوشحال تاجر تھے۔ سینٹ فرانسس جب چھبیس کے سن کو پہنچے تو انھوں نے دنیا سے کنارہ کر کے درویشی اختیار کر لی، اپنی زندگی کو اسوۂ عیسوی کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیا اور ریاضت اور فقر و فاقہ کو اپنا معمول بنا لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے گرد مریدین کا ایک اچھا خاصہ حلقہ جمع ہو گیا جو سب مل کر غریبوں، بیماروں اور کوڑھیوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

1210ء میں سینٹ فرانسس عیسائی دنیا کے مرکزی پیشوا یعنی پوپ سے ملنے روم تشریف لے گئے تا کہ پوپ سے اپنے فقیری سلسلے کی منظوری لی جا سکے۔ رفتہ رفتہ ان کے مریدین کو فرانسسکن کہا جانے لگا۔ اس سلسلے نے باقی عیسائی سلسلوں کی نسبت زیادہ مقبولیت حاصل کی یہاں تک کہ 1212ء تک اس کے وابستگان کی تعداد بڑھ کر 5000 تک پہنچ چکی تھی۔ اس سلسلے کے پاس اتباع کے لیے سینٹ فرانسس کے بتائے ہوئے زندگی گزارنے کے سادہ اصول تھے یا پھر ان کی اپنی زندگی کا نمونہ تھا لیکن کچھ آگے جا کر اس سلسلے میں بٹوارے کا عمل شروع ہو گیا اور مآل کار سینٹ فرانسس نے داخلی تنازعات سے تنگ آ کر اس فرقے کی قیادت سے استعفیٰ دے دیا۔

سینٹ فرانسس کو فطرت سے بہت لگاؤ تھا۔ انھیں اکثر پرندوں کو تبلیغ کرتے دکھایا جاتا ہے اور وہ انسانوں اور جانوروں سب کو خدا کے کنبے میں شریک سمجھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اپنے انتقال سے دو برس قبل کوہ الورنو پر چلے جانے کے بعد ان کے جسم پر بھی اس طرح کے زخم ظاہر ہو گئے تھے جو حضرت عیسیٰؑ کے جسم پر صلیب سے بنے تھے۔ وہ اپنے ان زخموں کو دوسروں سے چھپاتے رہتے تھے لیکن انھوں نے اپنی زندگی کے یہ آخری دو سال بڑی اذیت میں گزارے جس کے دوران وہ تقریباً مکمل طور پر اپنی بینائی کھو چکے تھے۔ رومن چرچ نے انھیں باقاعدہ طور پر ایک ولی کا درجہ 1228ء میں دیا۔ انھیں سینٹ کیتھرین کے ساتھ اٹلی کا سرپرست بزرگ تصور کیا جاتا ہے۔ ان کے مکتوبات، ملفوظات اور ان سے منسوب حکایات کو ایک مجموعے کی شکل دے کر ''گلہائے پیر فرانسس'' کے عنوان سے ان کی موت کے کوئی ایک سو سال بعد شائع کیا گیا۔

http://muftbooks.blogspot.com/

فرانسیسی انقلاب (1789ء-1799ء)

انقلاب فرانس کے اسباب اور اس کے نتائج کے بارے میں مبصرین کی آراء میں اختلاف پایا جاتا ہے تاہم ایک بات واضح ہے کہ اس انقلاب نے فرانس کی ایک بے لچک سماجی وسیاسی مخروطی نظام کی حامل ایک شاہی ریاست کو ایک نسبتاً زیادہ لچکدار سماجی اور زیادہ جمہوری نظام کے حامل ایک جدید ملک میں تبدیل کر دیا تھا۔ انقلاب فرانس کے زمانے کو مئی 1789ء تا دسمبر 1799ء کے درمیانی عرصے سے منسوب کیا جاتا ہے اور اس کا انجام اس وقت ہوا جب نپولین بونا پارٹ کی گرفت اقتدار پر پوری طرح مضبوط ہو چکی تھی۔

فرانس میں 1770ء کے عشرے سے ہی زرعی پیداوار میں کمی دیکھنے میں آ رہی تھی جس سے غذائی اجناس کی قیمتیں بہت زیادہ چڑھ گئی تھیں اور اس روز بروز بڑھتی ہوئی مہنگائی نے معاشرے کے تمام طبقات خصوصاً نچلے اور غریب طبقے کے افراد کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ اس دور کے فرانس میں سیاسی قوت اور قومی دولت کا ایک بہت بڑا حصہ اشرافیہ اور مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں تھا۔ فرانسیسی شاہی نظام قدیم جاگیرداری روش پر گامزن تھا جو نئی پود کے ان ادیبوں سے کوئی لگا نہیں کھاتا تھا جو شخصی حقوق پر مبنی اصلاح کے نظریات کا پرچار کر رہے تھے۔

اس انقلاب کا ایک بڑا سبب ملک کی مالی اور اقتصادی بدنظمی تھی اور امریکی انقلاب میں شمولیت کی وجہ سے ملکی معیشت بھاری قرضوں کے بوجھ تلے دب چکی تھی۔ اس دور کے فرانسیسی بادشاہ لوئی چہاردہم (حکومت 92-1774ء) نے دیوالیہ پن کے خدشے کے پیش نظر 5 مئی 1789ء کو ورسے کے مقام پر مجلس قانون ساز کا اجلاس طلب کیا تاکہ خزانے کی حالت کو بہتر بنانے کی کوئی ترکیب نکال سکے۔ اشرافیہ، مذہبی عمائدین اور عوامی نمائندوں پر مشتمل یہ قانون ساز ادارہ 1614ء کے وقتوں سے معطل چلا آ رہا تھا۔ اس سے قبل اشرافیہ جس کے ہاتھ میں ملک کا عدالتی نظام تھا، لوئی کے پیسہ جمع کرنے سے متعلق فرامین کی بجا آوری سے انکار کر چکی تھی۔ اس مرتبہ عوامی نمائندوں نے بھی پہلے کی طرح ہر چیز چپ چاپ ماننے کی بجائے مختلف رویہ اختیار کر لیا اور خود کو ایک قومی اسمبلی کی صورت میں منظم کر کے اشرافیہ اور مذہبی طبقے پر سیاسی وسماجی اصلاحات کے لیے دباؤ بڑھانا شروع کر دیا۔ بادشاہ نے ان کے اجتماع کو روکنے کی کوشش کی لیکن عوامی نمائندے ایوان کو چھوڑ کر ایک بند ٹینس کورٹ میں جمع ہونا شروع ہو گئے جہاں بالآخر انھوں نے 1789ء میں ''میثاق ٹینس کورٹ'' پر متفق ہونے کا اعلانیہ جاری کر دیا جس میں ان سب نے اس بات کا عہد کیا کہ وہ اس وقت تک منتشر نہیں ہوں گے جب تک کہ نیا آئین تحریر نہیں

کرلیا جاتا۔ بادشاہ نے ظاہراً تو اس اقدام کو قبول کرلیا لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ کیا کہ اپنے آزاد خیال اقتصادی مشیر ژاک نیکر جو کہ اصلاحات کا حامی تھا، کو برطرف کردیا اور اپنی فوج کو ورسے کا محاصرہ کرنے کا حکم دے دیا۔ قومی اسمبلی کو حاصل ہونے والی نئی طاقت سے حوصلہ پا کر 14 جولائی کو پیرس میں ایک عوامی جلوس نے باسٹیل کی جیل پر دھاوا بول دیا۔ یہ جیل کوئی اتنی بڑی تو خیر نہ تھی لیکن یہ حکومتی جبر کی ایک علامت ضرور بن چکی تھی۔ اس شاہی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے جس میں کہ بہت سے غیر ملکی کرائے کے سپاہی بھی شامل تھے مارکی ڈی لافئیت کی زیرِ قیادت ایک قومی گارڈ تشکیل پائی اور پورے ملک کے کسانوں نے زمینداروں کے خلاف بغاوت کردی۔

ان حالات کے پیشِ نظر لوئی کو اپنے رویے میں لچک پیدا کرنا پڑی اور اس نے نیکر کو اس کے عہدے پر بحال کردیا اور قومی اسمبلی کو سرکاری طور پر تسلیم کرلیا۔ اس اسمبلی نے ''فرد اور شہری کے حقوق کا اعلامیہ'' جاری کیا جس میں نئے آئین اور ایک ایسے جمہوری نظام کا خاکہ پیش کیا گیا جس میں بادشاہ اور چرچ کے اختیارات کو بہت محدود کردیا گیا تھا۔ اکتوبر میں مظاہرین نے بادشاہ اور ملکہ کو پیرس جانے پر مجبور کردیا جہاں انھیں قیدیوں کی سی حیثیت میں رکھا گیا۔

اگلے دو برسوں میں قومی اسمبلی نے بہت سی اصلاحات منظور کیں اور ملک کا سیاسی وسماجی نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ بادشاہ نے ملک سے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن وہ پکڑا گیا اس نے طوعاً کرہاً نئے آئین کو ماننے کی حامی بھرلی۔ اس پر اس خیال سے کہ انقلابی عمل تکمیل کو پہنچ چکا ہے، قومی اسمبلی برخاست کردی گئی۔ یکم اکتوبر 1791ء کو ایک نئی قانون ساز اسمبلی بلائی گئی۔ اس موقعے پر بہت سے سیاسی گروہوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہوا جن میں سے سب سے طاقتور گروہ جیکوبیوں کا تھا۔ 1792ء میں ''نپولین جنگیں'' چھڑ گئیں اور فرانس، آسٹریا اور جرمنی کے ساتھ لڑائی میں الجھ گیا۔ ان جنگوں نے بڑھتے بڑھتے سارے یورپ بلکہ بعد ازاں روس اور افریقہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ جنگیں عام لام بندی کے بعد تشکیل پانے والی پہلی قومی فوج کے بل پر لڑی جارہی تھیں۔ شہریوں نے جن کے ہاتھ میں نئی نئی طاقت آئی تھی، ابتدائی انقلابی شکستوں کی ذمہ داری شاہی سازشوں پر ڈال دی اور انھوں نے ستمبر کے قتلِ عام میں انقلاب مخالف تصور کیے جانے والے 1200 قیدیوں کو ہلاک کردیا۔

ژاں پال مارات اور جارجز ڈانٹن کی سرکردگی میں 22 ستمبر 1792ء کو منعقد ہونے والے قومی کنویشن نے فرانس کو جمہوریہ قرار دے دیا اور 21 جنوری 1793ء کو لوئی چہاردہم اور اس کی ملکہ کا سر قلم کردیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی فرانس کی مغربی یورپ کے کئی ایسے ممالک سے

جنگ چھڑ گئی جنھیں یہ خدشہ تھا کہ انقلاب کے اثرات فرانس سے نکل کر ان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ کنونشن کے اپنے اندر بھی Montagnards, Girondists اور Gordeliers کئی ایک گروہ وجود میں آ گئے جو ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونا شروع ہو گئے۔ انقلاب کی سمت متعین کرنے کے لیے کنونشن نے کمیٹی آف پبلک سیفٹی تشکیل دی جس کے پہلے سربراہ اور اعتدال پسند رہنما ڈانٹن نے 1793ء کے آئین کو نافذ کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی زیادہ انقلابی اراکین کے آگے کچھ نہ چلی اور 1794ء میں انھیں بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جولائی 1793ء سے کنونشن کے دوسرے بڑے رہنما جیکو بن ماملین روبز پیئر نے کمیٹی، انقلابی ٹرابیونل اور عوامی نمائندوں میں اپنے اثر و رسوخ کے بل پر فرانس پر آمرانہ انداز سے حکومت چلانا شروع کی۔ اس کے بعد کے زمانے کو فرانسیسی تاریخ میں دور دہشت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس میں تشدد کا رخ کمیٹی کے اندرونی و بیرونی دشمنوں کی طرف پھر گیا اور بہت سے افراد پر انقلاب مخالف ہونے کا الزام عائد کر کے ان کے سر قلم کر دیے گئے۔ 1794ء میں کنونشن نے دوبارہ اقتدار حاصل کر کے روبر پیئر کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ایک عوامی شورش کا آغاز ہوا لیکن اسے جلد ہی فوجی بوٹوں تلے روند دیا گیا۔ اس کے ردعمل میں جو تحریک شروع ہوئی اس کے دوران 1795ء میں ایک نیا آئین نافذ کر دیا گیا اور اقتدار ایک ڈائرکٹری کے ہاتھوں میں چلا گیا جن کے اراکین ایک طرف تو بہت زیادہ بدعنوان تھے اور دوسرا وہ مختلف فوجی مہمات کو بھی ٹھیک طرح نہ چلا سکے۔ اس کے بعد نپولین نے جو کہ اٹلی اور مصر کی جنگوں میں اپنی فتوحات کی بدولت فرانس میں ایک ہیرو کا درجہ حاصل کر چکے تھے، واپس لوٹ کر 9 نومبر 1799ء کو ڈائرکٹری کا تختہ الٹ دیا اپنا کونسلیٹ قائم کر لیا اور کیتھولک مذہب کو بحال کر دیا۔ انھوں نے فرانس پر 1804ء سے لے کر 1814ء تک ایک شہنشاہ کے طور پر حکومت کی جس کے بعد ملک کا اقتدار بوربن بادشاہوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔

فرائیڈ، سگمنڈ (1856ء۔1939ء)

تحلیل نفسی کا بانی۔ اسے جدید نفسیات کا باوا آدم تصور کیا جاتا ہے۔ وہ موراویہ میں پیدا ہوا جو آج کل جمہوریہ چیک کا حصہ ہے۔ بعد ازاں اس کے والدین ویانا چلے آئے جہاں اس نے ایک طبی درسگاہ سے تعلیم حاصل کی اور بقیہ پوری عمر سکونت اختیار کی۔ اس نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی کے ابتدائی چند برس ایک معالج کے طور پر کام کیا لیکن ان دنوں میں بھی اس نے علم الاعصاب میں گہری دلچسپی لینا شروع کر دی تھی اور خلل اعصاب کے مریضوں پر عمل تنویم

http://muftbooks.blogspot.com/

(ہپناسس) آزمانا شروع کر دیا تھا۔1885ء میں وہ پیرس چلا آیا جہاں اس نے یہ تحقیق شروع کی نفسیاتی عوارض کا تعلق دماغ سے زیادہ ہوتا ہے یا کہ ذہن سے۔ اگر ہم اس کی پہلی اہم تصنیف ''ہسٹیریا پر تحقیق'' (1895ء) پر نظر ڈالیں تو وہ ہمیں ان ذہنی عوامل کی کھوج میں مصروف نظر آتا ہے جو جسمانی امراض پیدا کرتے ہیں اور اس بات کی جانچ کرتا دکھائی دیتا ہے کہ ان ہسٹیریائی رجحانات کو کس نوع کے علاج سے ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔

فرائیڈ نے 1880ء کے عشرے کے اوائل میں ڈاکٹر جوزف بروئیر کی معیت میں کام کرنا شروع کیا۔ ان دونوں نے ملکر نفسیات کے ایک نئے شعبے کی داغ بیل ڈالی جس کی بنیاد ''تلازم افکار'' کا نظریہ تھا۔ اس طریقہ علاج میں معالج مریض کے لاشعور کی گہرائی تک رسائی حاصل کرتا تھا تا کہ ان دبی ہوئی تحریکات کو باہر لایا جا سکے جو اس مریض میں خلل اعصاب کا باعث بنتی ہیں۔ فرائیڈ کا کہنا تھا کہ یہ تحریکات مریض کے ذہن میں ''قابل قبول'' اور ''نا قابل قبول'' خیالات کے درمیان کشمکش کے باعث لاشعور میں دبا دی جاتی ہیں۔ نفسیاتی علاج ایسی الجھنوں کو حل کر کے مریض کو ان تحریکات کو شعوری اور منطقی طور پر قبول کرنے یا مسترد کرنے کا موقع دیتا ہے۔ فرائیڈ جنسیت کو انسانی رویے کا سب سے بڑا محرک قرار دیتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ انسان کے مرکزی نفسیاتی اوصاف کی جڑیں اس کے بچپن میں ہوتی ہیں۔

فرائیڈ نے اپنا اصل کام 1897ء میں اپنے ذاتی نفسیاتی تجزیے سے شروع کیا۔ اس نے یہ خیال پیش کیا کہ انسان خوابوں میں وہ کچھ دیکھتا ہے جس کی خواہش اس کے اندر دبی ہوتی ہے خواہ یہ چیز معاشرتی طور پر قابل قبول ہو یا نہ ہو۔ اس نے اس نظریے کو اپنی تصنیف ''خوابوں کی تعبیر'' (1900ء) میں بڑے مفصل انداز سے بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق خوابیں ذہن کی توانائیوں کے اخراج کا کام کرتی ہیں اور ان دبی ہوئی خواہشات کی تسکین کا موقع فراہم کرتی جنہیں ہم اپنی روزمرہ زندگی میں عملی جامہ نہیں پہنا سکتے۔

شروع میں فرائیڈ کے تصورات خصوصاً سیکس کے بارے میں اس کے نظریے کو سائنسی حلقوں میں پذیرائی نہ مل سکی۔ چونکہ اس کے بہت سے نظریات کا مدار نفسیاتی تعبیر پر تھا، انہیں نادرست اور غیر سائنسی کہہ کر مسترد کر دیا گیا۔ تاہم آج جب ہم مڑ کر دیکھتے ہیں کہ فرائیڈ نے جدید نفسیات پر کس قدر اثرات مرتب کیے ہیں تو ہمارے لئے اس کا حساب لگانا بھی مشکل ہو جاتا ہے، اس نے ان اصطلاحات کی پہلی مرتبہ تعریف کا کام سرانجام دیا جو آج بھی علم نفسیات کی لغت میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ عوامی ثقافت پر اس کے اثرات اس سے بھی بڑھ کر ہیں۔ ریلزم

http://muftbooks.blogspot.com/

سے لے کر وجودیت تک بیسویں صدی کے بیشتر ادب اور فلسفے پر فرائیڈ کے نظریات کی چھاپ محسوس کی جاسکتی ہے۔اس کی اختراع کردہ اصطلاحات مثلاً ''فرائیڈین سلپ'' ایڈیپس کمپلیکس'' ''مینٹل سٹرکچر'' ''ایگو''، سپر ایگو''، ''اڈ'' وغیرہ آج ہماری روزہ زبان کا حصہ بن چکی ہیں اور امریکہ تا افریقہ دنیا کے ہر علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔

فرائیڈ اگرچہ یہودیت پر عمل نہیں کرتا تھا لیکن وہ اپنی یہودی قوم کا بڑا وفادار تھا۔اس کے چاہنے والوں میں بہت سے یہودی طلباء بھی شامل تھے۔اسے اپنی اس نسبت کی وجہ سے زمانہ طالب علمی اور پیشہ وارانہ زندگی کے دوران بعض حلقوں کی جانب سے ہدف بھی بنایا گیا۔وہ مذہب کو خلل اعصاب کی ایک قسم قرار دیتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ مذہب کی بنت انسانی ذہن انسانی ذات کی داخلی اور ابتدائی الجھنوں کے نتیجے میں تیار کرتا ہے۔اس نے خداؤں اور دیوتاؤں کی پرستش کو انسان کی اپنے آباؤ اجداد کیلئے تعظیم سے منسوب کیا ہے۔

فرائیڈ نے 1935ء میں نازی حملے کے بعد بھاگ کر لندن میں سکونت اختیار کر لی تھی اور اس کا انتقال لندن ہی میں سرطان کے باعث ہوا تھا۔ہم اس کے مقام کا اندازہ اسے علم کے کسی ایک پلڑے میں رکھ کر نہیں کر سکتے۔فرائیڈ وہ شخصیت ہے جس نے ہمیں انسانی صورتحال کے تجربے کیلئے کئی جہتوں سے روشناس کرایا۔

فرخ زاد، فروغ (1935۔1967ء)

ایرانی شاعر۔فرخزاد کی خاص بات یہ ہے کہ اس نے ایک عورت ہونے کے باوجود سماجی قدغنوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے محبت، سیکس، سماج اور نفس کے متعلق اپنے قلبی احساسات کا اظہار اس جرأت و بیباکی سے کیا کہ جس کی نظیر فارسی ادب کی تاریخ میں اس سے قبل نہیں ملتی۔

فرخ ذاد نے شادی کے اپنے مختصر اور تلخ تجربے کے بعد جس میں اس کا بچہ بھی اس سے چھن گیا، خود کو مکمل طور پر شعر و ادب کے لیے وقف کر دیا تھا۔اس نے اپنی زندگی کے آخری سولہ برسوں میں شاعری کے پانچ مجموعے نیز انگریزی و فرانسیسی ادب کے متعدد تراجم شائع کیے۔اس کے ابتدائی مجموعے قیدی (1955ء)، دیوار (1956ء) اور بغاوت (1957ء) تقریباً سارے کے سارے دور بین اور اعترافیہ نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہیں جو روایتی اسلوب میں تحریر کی گئی ہیں۔جیسا کہ ان کتابوں کے عنوانات سے ہی پتہ چل رہا ہے ان میں شاعرہ ایک روایت پرست معاشرے میں پھنسی ایک عورت کے طور پر اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں نظر آتی ہے۔ جنسی و رومانوی محبت اس کے پہلے دو مجموعوں کا بنیادی مضمون ہے جسے اس نے اظہار ذات اور

سماجی احتجاج کے وسیلے کے طور پر استعمال کیا ہے۔اس کی تیسری تصنیف میں مذہب کا غصہ نظر آتا ہے جس میں وہ روایتی مذہبی عقائد پر بڑے آتشیں جذبے سے تنقید کرتی نظر آتی ہے۔

بعد میں اس نے اپنی دو مزید کتابیں ''ایک اور پیدائش'' (1963ء) اور ''آیئے سرد موسم کے آغاز پر یقین کریں'' (1974ء) شائع کیں جس میں اس کا حیطۂ نظر وسعت اختیار کرتا دکھائی دیتا ہے۔ان میں وہ ایک ''حیات نو'' کا تجربہ کرتی ہے اور اپنی ذاتی الجھنوں کے ساتھ ساتھ پورے سماج کی مشکلات پر سوچ بچار کرتی نظر آتی ہے۔وہ ہماری پروین شاکر کی طرح اپنے کیریئر کے عروج پر کار کے ایک المناک حادثے میں جاں بحق ہوئی۔

فرینکلن، بینجمن (1706ء۔1790ء)

امریکی پرنٹر، ادیب، موجد اور مدبر۔ان کا شمار برطانوی سامراج سے امریکی نوآبادیوں کی آزادی کی جدوجہد کے بڑے رہنماؤں میں ہوتا ہے۔وہ ایک مانے ہوئے سفارت کار تھے اور اعلان آزادی اور امریکی آئین بھی انھوں نے تیار کیا۔انھوں نے کئی جگہ پر پیسہ لگا رکھا تھا جس سے انھیں اچھی خاصی آمدن حاصل ہوتی تھی۔اس طرح انھیں جو فرصت ملتی تھی وہ اس میں طرح طرح کی ایجادیں اور اختراعات کرتے رہتے تھے۔آپ شاید جانتے ہوں کہ بجلی کا ٹیوب راڈ، دوچشمی عینک اور وائر ہارمونیکا بھی انھی کی ایجاد ہے۔

فرینکلن نے دس برس کی عمر تک سکول کو خیر باد کہہ دیا تھا اور بارہ سال کی عمر میں انھوں نے اپنے بھائی جیمز کی شاگردی اختیار کر لی تھی جو کہ ایک اخباری پرنٹر تھے۔فرینکلن 1723ء میں بوسٹن سے بھاگ کر فلاڈیلفیا آ گئے جہاں کچھ عرصے بعد انھوں نے پنسلوینیا گزٹ کے نام سے اپنا اخبار نکالنا شروع کر دیا۔انھوں نے رچرڈ سانڈاز کے قلمی نام سے ایک سالانہ رپورٹ Poor Richard's Almanac بھی شائع کی جس میں وہ محنت و دیانت داری کے اصولوں کی فضیلت میں ضرب الامثال تحریر کیا کرتے تھے۔

آئندہ تیس برسوں کے دوران فرینکلن نے کئی علمی و سماجی کاموں میں ہاتھ ڈالا۔انھوں نے آگ بجھانے کی ایک کمپنی، ہسپتال، فلسفیوں کی ایک انجمن اور ایک عسکری تنظیم بھی قائم کی۔ 1753ء میں انھیں شمالی نوآبادیوں کا ڈپٹی پوسٹ ماسٹر جنرل بنا دیا گیا۔انھوں نے ایک تعلیمی ادارے کی بنیاد بھی رکھی جس نے آگے جا کر یونیورسٹی آف پنسلوینیا کی شکل اختیار کی۔ان کی ٹیوب لائٹ کی ایجاد کے سبب انھیں 1752ء میں لندن کی رائل سوسائٹی میں شامل کر لیا گیا اور فرانس کا بادشاہ لوئی چہاردہم بھی ان کا مداح بن گیا۔

امریکہ کے اعلان آزادی پر دستخط بھی انھوں نے کیے تھے۔1776ء میں انھوں نے امریکی نوآبادیوں کے لیے مالی اور فوجی امداد حاصل کرنے کی غرض سے فرانس کا دورہ کیا۔ پیرس میں انھیں بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور فرانسیسی ان کی شخصیت کو ان تمام خوبیوں کا مرقع خیال کرتے تھے جن کے گن فلسفی اور دانشور گاتے رہے ہیں۔ وہ اتحاد کے معرض وجود میں آنے یعنی 1778ء تک فرانس میں رہے۔1783ء میں وہ ان سفارتکاروں میں شامل تھے جنھوں نے برطانیہ سے امن معاہدے کے لیے مذاکرات میں حصہ لیا۔انھوں نے 1787ء میں وفاقی آئینی کنونشن میں بھی شرکت کی۔ جارج واشنگٹن کی سرکردگی میں قائم ہونے والی نئی امریکی حکومت کو منظور کرانے کی مہم میں بھی ان کا بڑا ہاتھ رہا۔

فلانی

ایک مسلمان نسلی گروہ جو سینیگال سے لے کر جمہوریہ وسطی افریقہ تک کے پورے مغربی سوڈانی خطے میں پھیلا ہوا ہے۔ فلانیوں کی کل تعداد 70 لاکھ کے لگ بھگ ہے جن میں سے چالیس لاکھ نائیجیریا، نو لاکھ سینیگال اور مالی، چار لاکھ کیمرون اور تین لاکھ نائیجر میں آباد ہیں۔ اگر ان کی ظاہری شباہت کو دیکھا جائے تو وہ حبشی اور قضقاذی خدوخال کا امتزاج محسوس ہوتے ہیں۔ وہ خود کو فولا، فلاٹا، پلو اور فلبے جیسے کئی مختلف نام دیتے ہیں۔ فلانی کے نام سے انہیں موسوم شمال مغربی نائیجیریا میں آباد ایک اور گروہ ہاؤسا کے باشندوں نے کیا۔تقریباً آدھے فلانی ہاؤسا قبائل میں حکمران طبقے کے افراد کے طور پر زندگی بسر کر رہے ہیں اور انہوں نے ہاؤسا باشندوں کے بہت سے رسوم ورواج نیز ان کی زبان بھی اپنالی ہے۔

فلانیوں کی ابتداء کے بارے میں کوئی پکی بات نہیں کہی جاسکتی لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ ساتویں صدی میں دریائے سینیگال کے کناروں پر آباد ایک قبیلے تو کولر کے افراد کی اولاد ہیں۔ یہ لوگ گیارہویں صدی میں حلقہ اسلام میں داخل ہوئے اور بعد میں انہوں نے اس دین کو مغربی افریقہ کے مختلف حصوں تک پہنچایا۔ مورخین کا خیال ہے کہ انہوں نے چودھویں صدی کے لگ بھگ کسی وقت مشرق کی طرف نقل مکانی اختیار کی اور سولہویں صدی تک وہ اپنی اس موجودہ سر زمین میں آباد ہو چکے تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں فرانسیسی نوآبادکاروں کے ہاتھوں زیر ہونے سے قبل انہیں مشرقی سینیگال وادی کے بیشتر حصے پر غلبہ حاصل تھا۔ اگرچہ بہت سے فلانیوں نے اپنی چراگاہوں کی بود و باش ہی اپنائے رکھی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں سے کئی نے شہری علاقوں کا رخ اختیار کرلیا اور نئے ڈھب کے پیشے اپنا لئے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

فلانی اپنے جانوروں کے دودھ اور اس سے بنی دوسری مصنوعات اپنے اردگرد بسنے والے قبائل کو دیتے ہیں اور انکے بدلے میں ان سے مختلف زرعی اجناس حاصل کرتے ہیں۔ تاہم بہت سے علاقوں میں فلانیوں نے اپنے گلوں میں تخفیف کے باعث اپنی گزراوقات کیلئے زرعی زندگی اختیار کر لی ہے اور ان میں سے کئی ایسے ہیں جو خانہ بدوشی کی زندگی ترک کر کے مستقل سکونت کی روش اپنا چکے ہیں۔

فلسطین

مشرقی بحر روم کا ساحلی علاقہ۔ فلسطین میں تقریباً 3500 ق م سے سامی باشندے آباد چلے آتے ہیں اور 100 ق م تک اسے مصری، یونانی، یہودی، سلجوقی اور دیگر قومیں تاراج کر چکی تھیں۔ 638ء میں مسلمانوں نے یروشلم کو فتح کر کے اس کے مکینوں کو تحفظ دیا اور وہ اس کے بعد 1300 سال تک یہاں حکومت کرتے رہے۔ گیارہویں اور تیرہویں صدی کے درمیانی عرصہ میں لڑی جانے والی صلیبی جنگوں کے دوران اہل یورپ نے اس خطے پر تسلط جمانے کی بڑی کوشش کی جو بعض دفعہ کامیاب بھی رہی۔

یروشلم کو ایک عرصے سے فلسطین کے بڑے شہروں میں شمار کیا جاتا رہا ہے اور یہ تینوں بڑے مذہب یعنی یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے ماننے والوں کیلئے ایک مقدس مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمان شروع شروع میں یروشلم کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے تھے۔ اس شہر کو واقعہ معراج کے حوالے سے بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ اسی شہر سے عالم بالا تشریف لے گئے تھے۔ اس سے قبل تمام انبیاء کرام نے اسی شہر میں واقع بیت المقدس میں آنحضورؐ کے پیچھے نماز ادا کی تھی۔ چنانچہ یروشلم سے متعلق یہودی و عیسائی روایات اسلام کو ورثے میں ملیں اور جب یہ شہر مسلمانوں کے قبضے میں آیا تو انہوں نے وہاں بیت المقدس تعمیر کروایا جس میں مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرا بنوایا۔ بیت المقدس کو اسلام میں تیسرے مقدس ترین مقام کی حیثیت حاصل ہے۔

بیسویں صدی میں فلسطین میں یورپی مداخلت بہت ہلاکت آفرین ثابت ہوئی۔ جنگ عظیم اول میں فلسطین کے عثمانی فرمانروا جو کہ جرمنی کی طرف داری کر رہے تھے اسے جنگ میں گھسیٹ لائے۔ برطانیہ نے 1915ء میں طے پانے والے حسین مکماہون معاہدے کی رو سے عرب رہنماؤں کی حمایت اس شرط پر حاصل کر لی کہ جنگ کے خاتمے پر فلسطین کو آزادی دے دی جائے گی۔ تاہم 1917ء میں برطانوی سفارت کار لارڈ بالفور نے فلسطین میں یورپی یہودیوں کے

http://muftbooks.blogspot.com/

لیے ایک ریاست کی تشکیل کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اس پر یورپ سے سے نقل مکانی کر کے برطانیہ کے زیر تسلط فلسطینی علاقے میں جانے والے یہودیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ برطانیہ نے فلسطین کے لوگوں کی اکثریت کی آواز کو دباتے ہوئے اقوام متحدہ کو مجبور کیا کہ وہ فلسطین کو تقسیم کرے۔ اس طرح یہ علاقہ 1948ء میں براہ راست یہودی افواج کے قبضے میں چلا گیا۔

فلسطینی علاقوں پر اسرائیلی قبضے کے وقت سے فلسطینی مسلسل پر امن اور متشدد مزاحمتی طریقے استعمال کرتے ہوئے اقوام عالم کی توجہ اپنی حالت زار کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ 15 نومبر 1988ء کو فلسطین کی حکمران نیشنل کونسل نے فلسطین کی ایک خود مختار لیکن بلا اراضی ریاست کا اعلان کیا اور اس ریاست کے سربراہ کے طور پر پیپلز لبریشن آرگنائزیشن کے قائد یاسر عرفات کا انتخاب میں عمل میں آیا۔ 1994ء میں فلسطینیوں کو غزہ کی پٹی اور مغربی کنارے پر خود مختار حکومت کی اجازت دے دی گئی۔ اس وقت سے لے کر آج تک امن معاہدوں کیلئے کئی کوششیں منظر عام پر آ چکی ہیں لیکن فلسطینیوں اور اسرائیلیوں دونوں میں موجود انتہا پسند عناصر کی طرف سے کی گئی امن مخالف کوششوں اور خراب معاشی حالات کی وجہ سے ان کوششوں کو نقصان پہنچتا رہا ہے۔ 1995ء میں اسرائیلی وزیر اعظم رابن کو قتل کر دیا گیا جس کے بعد انتہا پسند لیکوڈ پارٹی برسر اقتدار آ گئی اور امن کی منزل مزید دور ہوتی چلی گئی۔ اب ممتاز فلسطینی قائد یاسر عرفات کی وفات کے بعد محمود عباس فلسطین کے صدر کے طور پر خدمات سر انجام دے رہے ہیں لیکن فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کے درمیان سر پھٹول بدستور جاری ہے۔

فلوبیئر، گستاو

فرانسیسی ناول نگار۔ وہ فرانس کے ایک مقام روئین پر ایک سرجن کے گھر پیدا ہوا اور اس نے وہیں پرورش پائی۔ اس کے دل میں بچپن سے ادب کی طرف جانے کا رجحان موجود تھا لیکن ہوا کچھ ایسے کہ اس نے اکیس کی عمر میں پیرس میں قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی تاہم پھر وہ اسے ادھورا چھوڑ کر واپس روئیں چلا آیا جہاں اس نے خود کو مکمل طور پر ادب کے لیے وقف کر دیا۔

فلوبیئر نے 1851ء میں ''مادام بوواری'' لکھنا شروع کیا جو 1856ء تک مکمل نہیں ہو پایا تھا۔ اس ناول میں جسے کہ عوام میں بہت جلد مقبولیت حاصل ہوئی، ایک دیہاتی ڈاکٹر کی جنسی طور پر ناآسودہ بیوی کا کردار پیش کیا گیا ہے جو اپنے جذبات کی تسکین کے لیے یکے بعد دیگرے کئی

افراد سے رومانوی تعلقات استوار کرتی ہے۔اس تخلیق کو فرانسیسی ادب میں اب بھی ایک کلاسیک کا درجہ حاصل ہے Salammbo (1862ء) میں جو کہ اس کے تیونس کے سفر و سیاحت کے تجربات کا حاصل تھا، وہ ہمیں فطرت انسانی کے کرخت پہلو پر توجہ مرکوز کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس نے کارتھیج کی ایک پادری کی زندگی کی تصویر کشی کی ہے جسے معبد کے ایک مقدس نقاب کو واپس لینے کے لیے پہلی پیونک وار میں کارتھیج پر حملہ کرنے والی فوج کے سالار میتھیو کے ساتھ جبری جنسی تعلقات پر مجبور کیا جاتا ہے۔حقائق اور ان کے بیان پر فلوبیئر کے شدید زور کے سبب بعض نقاد اسے حقیقت پسند یا فطرت پسند ادیب قرار دیتے ہیں تاہم فلابیئر خود اپنے لیے اس نوع کے القابات پسند نہیں کرتا تھا۔فلوبیئر کا تیسرا ناول ''جذباتی تعلیم'' (1869ء) تھا جو اس کے لیے سب سے زیادہ شہرت کا سبب بنا۔ یہ ایک تاریخی ناول ہے جو 1840ء کے عشرے کے پیرس کے حالات کی عکاسی کرتا ہے۔اس سے ہمیں اس کی زندگی خصوصاً اس کے لڑکپن اور اس کے مادام شلیسنگر سے عشق کے بارے میں بہت سی باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ان تین ناولوں کے علاوہ بھی فلوبیئر نے بہت سی نگارشات قلمبند کیں تاہم انھیں اس کی سب سے اہم تحاریر خیال کیا جاتا ہے۔ اگر اسے انیسویں صدی کے بہترین فرانسیسی ادیبوں میں شمار کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

فوسٹر، ایڈورڈ مورگن (1879ء۔1970ء)

انگریز ناول نگار، افسانہ نگار اور مضمون نویس۔اس نے لندن میں پرورش پائی جہاں اس کی ماں 1945ء میں اپنی وفات تک مسلسل اس کے ساتھ رہی۔ کیمبرج میں اس کی ملاقات جی۔ایل۔ڈکنسن سے ہوئی جو 1911ء میں فوسٹر کے پہلی ہند یاترا کے دوران اس کے ہمراہ تھا۔وہ کیمبرج میں اپنے قیام کے دوران بلومزبری گروپ میں بھی شامل ہو گیا تھا جس میں کا روح رواں اس دور کا نامور برطانوی جوڑا لیونارڈ اور ورجینیا وولف تھا۔اس حلقے کے اراکین کی قدر مشترک ہم جنسیت اور اشتراکیتِ جیسے غیر روایتی عقائد اور دل چسپیاں تھیں۔فوسٹر خود بھی ایک بے چین قسم کا ہم جنس پرست تھا۔اس نے 1913ء میں ''مارس'' کے نام سے جو ناول لکھا وہ بھی پورے کا پورا ہم جنس پرستانہ تصورات کے رنگ میں ڈوبا نظر آتا ہے۔اس ناول کو فوسٹر کی وصیت کے مطابق اس کے انتقال کے ایک سال بعد شائع کیا گیا۔اس کے پہلے چار ناول حسب ذیل ہیں:

Where Angels Fear to Tread (1905)
Longest Journey (1907)
A Room with a View (1908)
Howard's End (1910)

اس کے بعد اس نے ہندوستان کی سیاحت شروع کردی جس کے دوران وہ چھ ماہ تک مہاراجہ دیواس کا سیکرٹری بھی رہا۔ اس سفر کی تکمیل کے بعد اس نے اپنا مشہور ومعروف ناول A Passage to India (1924ء) لکھا جس میں اس نے ہندوستان میں برطانوی استعمار سے پیدا ہونے والے مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد بھی اس نے اپنا تخلیقی وتنقیدی سفر جاری رکھا۔ تنقید پر اس کی گرانقدر اہمیت کی حامل کتاب Aspects of Novel 1928ء میں چھپی۔ Two Cheers for Democracy جو اس کے مضامین، انٹرویوز اور ریڈیو سکرپٹوں پر مشتمل تھی 1951ء میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ اس نے 1956ء میں Marianne Thornton کے عنوان سے اپنے خاندان کی ایک بزرگ خاتون کی سوانح عمری بھی تحریر کی۔

فینن، فرانز [عمر] (1925ء۔1961ء)

تحلیل نفسی کا ماہر اور ایک معاشرتی فلسفی جس کا تعلق جزائر عرب الہند سے تھا۔ وہ مارٹینیک میں پیدا ہوا اور اس نے وہاں اور فرانس سے تعلیم حاصل کی۔ اس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران آزاد فرانسیسی فوج کے ساتھ شمالی افریقہ اور یورپ میں خدمات سرانجام دینے کے بعد 1947ء سے 1951ء تک لیون یونیورسٹی سے طب اور نفسی معالجے کی تربیت حاصل کی۔ اسے 1953ء میں الجیریا (جو اس وقت فرانس کا حصہ تھا) کے ایک ہسپتال کے نفسیاتی علاج کے شعبے کا سربراہ مقرر کردیا گیا۔ اس نے 1954ء میں الجیریا کی تحریک آزادی میں شمولیت اختیار کرکے دو سال بعد اس کے زیرزمین پرچے ''المجاہد'' کے لیے کام کرنا شروع کردیا۔ اس نے 1956ء میں پیرس میں منعقد ہونے والی سیاہ فام ادیبوں اور اہل فن کی پہلی کانگرس اور 1958ء میں عکرہ میں منعقد ہونے والی آل ایفریقن پیپلز کانفرس میں ایک مندوب کی حیثیت سے شرکت کی۔ اسے اس کی سیاسی سرگرمیوں کی پاداش میں ہسپتال کی نوکری سے نکال دیا گیا جس کے بعد اس نے 1957ء سے 1959ء تک تیونس میں ایک نفسیاتی معالج کی حیثیت سے کام کیا۔

1960ء میں اسے الجیریا کی عبوری حکومت کی طرف سے گھانا میں سفیر مقرر کیا گیا۔ فینن ژاں پال سارتر اور ایمے سیزر سے بہت متاثر تھا اور اس نے زیادہ نسل پرستی اور انقلاب کے موضوعات پر تحریریں قلمبند کیں۔ اس استعماریت سے نفرت تھی اور اس کا خیال تھا کہ تیسری دنیا کے ممالک کو ضرور بالضرور آزادی حاصل کرنی چاہیے خواہ اس کے لیے انھیں کوئی سا طریقہ بھی اختیار کرنا پڑے۔ مارکس کے برعکس اس کا خیال تھا کہ انقلاب دانشوروں یا محنت کش طبقے سے

نہیں بلکہ کسانوں کے زور پر آئے گا۔اس کا خیال تھا کہ غربا آخر کار تشدد پر اتر آئیں گے کیونکہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں جس کے چھننے کا انھیں خوف ہو اور اس تشدد سے انھیں ایک شافی نفسیاتی قوت حاصل ہوگی۔1952ء کی اپنی کتاب ''کالی چمڑی۔سفید نقاب'' میں اس نے نسل پرستی کے متعلق اپنے ذاتی تجربات اور نوآبادیاتی نظام کے بارے میں لکھا ہے جو سیاہ فام لوگوں کو سفید نقابوں کے پیچھے چھپنا سکھاتا ہے۔''دم توڑتی استعماریت'' (1959ء) میں اس نے نوآبادیت کی نفسیات وعمرانیات پر مزید تحقیق کی ہے۔اس نے سرطان خون سے اپنی موت واقع ہونے سے کچھ عرصہ پیشتر شائع ہونے والی اپنی کتاب ''اس زمین کے ذلیل باسی'' (1961ء) میں ظلم کی چکی میں پسے لوگوں کو اجتماعی کتھارسس پر ابھارا اور انھیں ایک پرتشدد انقلاب بپا کرنے کی دعوت دی۔اس کی تصنیف ''افریقی انقلاب کے لیے'' اس کے انتقال کے بعد 1964ء میں شائع ہوئی۔اس نے طاقت اور تشدد کی شفا بخش قوت کی جو تعبیر کی اس نے 1960ء کے عشرے کے اس کے معاصرین خصوصاً بلیک پینتھرز کے اراکین کو بہت متاثر کیا۔

ق

قانون امتناع کارکنان چین

امریکی امیگریشن پالیسی۔1849ء کے گولڈرش اور مرکزی بحرالکاہل روڈ کی تعمیر کے دوران بہت سے چینی تارکین وطن، جن میں زیادہ تعداد کوانتنگ صوبے کے مردوں کی تھی، امریکہ اور کینیڈا دونوں ملکوں کے غربی ساحل کے ساتھ ساتھ کے علاقے میں سستی مزدوری فراہم کرتے رہے۔برلنگیم معاہدے (1868ء) کے تحت امریکہ میں چینیوں کے دخول کو منضبط کرنے کا فیصلہ کیا گیا لیکن اس کے کچھ ہی عرصہ بعد تعصب اور بدلتی ہوئی معاشی صورت حال کی وجہ سے چینیوں کی آمد پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کردی گئیں۔1870ء کے عشرے میں پیدا ہونے والے معاشی بحران نے سستی مزدوری کی طلب کم کردی اور جلد ہی گورے کام کے حصول کے لیے چین تارکین وطن کے مقابلے پر اتر آئے۔چینیوں کے خلاف ناپسندیدگی کے جذبات تو امریکیوں کے اندر پہلے ہی سلگنا شروع ہوگئے تھے، 1860ء اور 1870ء کے عشروں میں ڈینس کرنی کی مزدور پارٹی کے احتجاجی مظاہروں نے انھیں اور ہوا دے دی اور چینی مخالف رویہ کیلیفورنیا کی سیاست میں بہت اہمیت اختیار کر گیا۔1877ء میں سان فرانسسکو میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔

سان فرانسسکو کے علاقے میں بپا ہونے والی ٹریڈ یونین تحریک جزوی طور پر ایک چینی مخالف تحریک تھی۔ ہر مصنوعات پر چسپاں کیے جانے والے یونین لیبلوں نے صارفین کو مزید شہہ دی کہ وہ گوروں اور خارجیوں کی بنائی ہوئی چیزوں کے متعلق امتیازی رویہ اختیار کریں۔

1879ء میں امریکی سینٹ کی ایک کمیٹی نے برلنگیم معاہدے میں ترمیم کر کے کانگرس کے سامنے ایک نیا قانون منظوری کے لیے پیش کیا جسے ''پندرہ مسافر ایکٹ'' کا نام دیا گیا۔ صدر رُدر فورڈ نے اس قانون کو ویٹو کر دیا لیکن اس کے بعد چینی تارکین وطن کی آمد پر پابندیاں لگانے کے لیے برلنگیم معاہدے (جو نسبتاً نرم تھا) کی جگہ ایک نیا قانون تشکیل دے دیا گیا۔ اس معاہدے، جس میں معلمین، سیاحوں اور سوداگروں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا، کے بعد ایک سے ایک بڑھ کر سخت قانون پاس ہونے لگا جن میں سب پہلا قانون 1882ء میں منظر عام پر آنے والا قانون امتناع کارکنان چین تھا جس کے ذریعے چینی کارکنوں کی آمد پر پابندی لگا دی گئی۔ چینیوں کے داخلے پر یہ پابندی 1943ء تک برقرار رہی۔ چین امریکہ کے فوجی اتحادیوں میں شامل ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود امریکی قانون کی نسل پرستی کا یہ عالم تھا کہ چین کے لیے صرف 105 کارکنوں کا کوٹہ مقرر کیا گیا۔ یہ کوٹا سسٹم دو عشروں تک یونہی چلتا رہا لیکن 1965ء میں ایک ترمیم کے ذریعے امیگریشن پالیسی سے نسلی امتیاز کے عنصر کو خارج کر دیا گیا۔

قبالہ

بائبل کی تفسیر کا ایک باطنی نظام جسے اکثر یہودی تصوف سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کے ماخذ کے بارے میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے تاہم بعض محققین کا قیاس ہے کہ یہ ایک عبرانی لفظ سے ماخوذ ہے جس کا مفہوم روایت ہے۔ ایک اندازے کے مطابق قبالہ تحریک گیارہویں صدی میں فرانس سے شروع ہوئی اور پھر بعض دوسرے خطوں جن میں سپین خاص طور پر قابل ذکر ہے، تک پھیل گئی۔ اس فلسفے کے عناصر اس یہودی فلسفہ ادرائیت میں اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں جس کی جڑیں عیسائیت کے ابتدائی عہد میں ملتی ہیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ اس میں نوفلاطونی اثرات کی جھلک موجود ہے۔ پندرہویں صدی کے اواخر اور سولہویں میں عیسائیوں میں بھی قبالہ تحریک دیکھنے میں آئی۔ اس تحریک کی تہہ میں یہ نظریہ کارفرما تھا کہ عہد نامہ عتیق (توریت اور دیگر عبرانی صحائف کا مجموعہ) کے ہر حرف، لفظ، عدد بلکہ اس کے زیر و بم میں بھی پوشیدہ معانی موجود ہیں جن کا مطلب صرف اہل نظر حضرات ہی صحیح طور پر بتا سکتے ہیں۔ اس فکر کے مقلدین کے مطابق اسمائے الٰہیہ معجزانہ طاقت کے حامل ہیں اور خدا کے نام کا ہر حرف قوت سے متصف ہوتا

http://muftbooks.blogspot.com/

ہے۔قبالہ کے دو بڑے مآخذ سفر یزیرہ (کتاب تخلیق) اور ظہر (کتاب تابندگی) ہیں۔ان میں سے اول الذکر تصنیف غالباً تیسری صدی میں لکھی گئی۔موخر الذکر کتاب توریت پر ایک متصوفانہ تبصرہ ہے جو موسیٰ ڈی لیون (وفات 1305ء) نے تحریک کیا اور جس کا انتساب اس نے دوسری صدی کے ایک عظیم عالم سائمن بن یوحی کے نام کیا۔

1492ء میں یہودیوں کی سپین سے جلاوطنی کے بعد قبالہ کے اصرار میں Messianic رنگ غالب آ گیا جو کہ صفد، فلسطین کے حلقہ متصوفین کی فکر کا نتیجہ تھا۔اس شکل میں اسے بہت قبولیت ملی اور اس نے حسیدی تحریک کی نشوونما میں بہت اہم کردار ادا کیا۔اگرچہ عہد تنویر (Enlightenment) میں آ کر قبالہ میں لوگوں کی دلچسپی کم ہونا شروع ہوگئی تھی، بیسویں صدی کے اول نصف میں سری متصوفانہ فلسفوں نے پھر زور پکڑنا شروع کر دیا جس سے کئی قابل ذکر مفکرین پھر قبالہ کی طرف راغب ہوگئے اور انہوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ اس فلسفے کی معاصر فکر کے ساتھ کیا نسبت ہوسکتی ہے۔گرشوم شولم نے قبالہ تحاریر کی کئی اہم تفاسیر اور مجموعے شائع کئے ۔والٹر بینجمن کے تاریخ، معنی اور امید کے متعلق افکار میں بھی قبالہ فلسفے کے اثرات کی جھلک نظر آتی ہے۔

قبۃ الصخرا

یروشلم کی ایک مقدس پہاڑی کے قریب واقع ایک مسجد جسے ساتویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا گیا۔یہ مقام یہودیوں اور مسلمانوں دونوں کے لیے محترم ہے۔یہ وہی جگہ ہے جہاں خدائے لم یزل نے اپنے نبی حضرت ابراہیمؑ کو اپنے فرزند کی قربانی نذر کرنے کا حکم دیا تھا۔ہیکل سلیمان بھی اس کے قریب ہی واقع ہے۔

اسلامی روایت کے مطابق معراج کی شب حضرت جبرئیلؑ حضرت محمدؐ کو مکہ سے مسجد اقصیٰ لے گئے تھے جہاں انھوں نے دیگر انبیاء مثلاً حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی معیت میں نماز ادا کی تھی اور پھر عرش بریں پر حاضری کے لیے آسمانوں پر تشریف لے گئے تھے۔

اس مسجد اور اس کے مشہور گنبد کی تعمیر کا حکم خلیفہ عبدالمالک ابن مروان نے دیا تھا۔صلیبی جنگوں کے دوران نائٹ ٹیمپلر اسے اپنے ہیڈ کوارٹر کے طور پر بھی استعمال کرتے رہے۔

قبلائی خان (1215ء۔1294ء)

http://muftbooks.blogspot.com/

چین کے یوآن یا منگول عہد (1271ء۔1368ء) کا پہلا شہنشاہ۔ قبلائی خان نے جنوبی چین میں زوال پذیر سونگ خاندان کو تسخیر کر کے انڈوچائنہ اور جاپان، ملاکا، برما اور جاوا جیسے دیگر ملکوں کو فوجی مہمیں روانہ کیں۔ اس دور میں قبلائی خان کی اس سلطنت کو دنیا کا مرکز تصور کیا جاتا تھا۔ اس کے پایہ تخت کا نام دادو تھا جس کا مطلب ''عظیم دارالحکومت'' ہے۔ یہ وہی دادو ہے جو آج کل بیجنگ کے نام سے معروف ہے اور مشہور اطالوی سیاح مارکو پولو (1254ء۔1324ء) کی قبلائی خان سے ملاقات یہیں ہوئی تھی۔ اس نے قبلائی خان کے دربار میں 1275ء سے 1292ء تک ملازمت کی۔ چین سے واپس جانے کے بعد مارکو پولو نے ایک کتاب ''مارکو پولو کے سفر'' تحریر کی جس نے مغرب کو چونکا کے رکھ دیا اور دنیا بھر کے کئی حکمرانوں اور کولمبس (1451ء۔ 1506ء) جیسے متعدد سیاحوں اور مہم جوؤں کے تخیل کو مہمیز دی۔

اس عظیم شہنشاہ کی یاد نامور انگریزی شاعر کولرج (1772ء۔1934ء) کی ایک نظم میں تازہ کی گئی ہے جس کا عنوان ''قبلا خان'' ہے۔ شاعر افیون کے نشے میں اس عالیشان بادشاہ اور اس کے شاہی محل کو خواب میں دیکھتا ہے۔ اس نامکمل نظم کا شمار کولرج کی معروف ترین تخلیقات میں ہوتا ہے۔

قرآن

حضور اکرم ﷺ پر نازل کی گئی اللہ کی آخری کتاب۔ مسلم عقیدے کے مطابق قرآن پاک خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ پر وقفے وقفے سے نازل ہونیوالی وحی کی کتابی شکل ہے۔ چنانچہ اسلامی نظام تدریس وعبادات میں اس الہامی کتاب کے حفظ وقرات پر بہت زور دیا جاتا ہے۔

قرآن پاک 114 سورتوں پر مشتمل ہے۔ ہر سورت آگے مزید چھوٹی اکائیوں یعنی آیات میں منقسم ہے۔ قرآن کریم بنیادی طور پر نثر میں ہے لیکن اس کی بیشتر آیات ہم ردیف ہیں۔ قرآن کا اکثر حصہ چند بنیادی اور مرکزی موضوعات کے ایک سلسلے سے متعلق ہے۔ اس میں اولاً تو ایک ایسے واحد لاشریک خدا کی بات کی گئی ہے جو قادر مطلق بھی ہے اور ہر جا حاضر وناظر بھی اور اس کے ساتھ ساتھ نہایت رحمٰن، رحیم اور انصاف کرنے والا بھی۔ اس کے علاوہ وحی، شریعت، احکامات خداوندی، توحید اور نبوت کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں اور ان سزاؤں اور انعامات کا تذکرہ کیا گیا ہے جو انسانوں کو ان کے نیک وبد اعمال کے صلے میں آخرت میں دیئے جائیں گے۔

قضیۂ ڈریفس

http://muftbooks.blogspot.com/

فرانس کا سیاسی تنازعہ۔ فرانسیسی فوج کے ایک یہودی افسر کیپٹن الفریڈ ڈریفس کے کردار کے گرد گردش کرنے والے اس قضیے نے دنیا پر منکشف کر دیا تھا کہ فرانسیسی جمہوریہ میں یہود دشمنی کی جڑیں کسی قدر گہری ہیں۔ ڈریفس ایک صاحب ثروت السیشئن کپڑے کے صنعت کار کا بیٹا تھا جس نے پیرس کے ایک پولی ٹیکنیک سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد فوج میں جانے کا ارادہ کر لیا۔ پھر اسے اکتوبر 1894ء میں جرمنوں کو فوجی راز فروخت کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ فرانس میں جو ابھی 1871ء کی فرینکو پرشین جنگ میں شکست کھانے کے بعد پوری طرح سنبھل نہ پایا تھا، اس مقدمے نے جذبات کو خوب متشعل کیا۔ لہٰذا ڈریفس پر بغیر کسی شہادت کے فرد جرم عائد کر کے اسے عمر قید کی سزا کے لیے جزیرہ شیطان بھیج دیا گیا۔

ڈریفس کے گھر والے برسوں تک دنیا کو اس کی بے گناہی باور کرانے کی کوشش اور مقدمے پر نظر ثانی کرنے کا مطالبہ دہراتے رہے لیکن کسی نے ان پر توجہ نہ دی۔ فرانسیسی اخبارات جن میں ایڈورڈ دروموں کا La Libre Parole سب سے بڑھ کر تھا، نے ڈریفس کو مجرم گردانا اور عوامی جذبات کو اس کے خلاف بھڑکانا جاری رکھا۔ جب آہستہ آہستہ ڈریفس کے حق میں شہادتیں منظر عام پر آنا شروع ہوئیں تو سرکردہ افراد نے اس کی حمایت میں بولنا شروع کر دیا۔ مشہور ناول نگار ایمیلی زولا نے بھی اس دوران اپنا مشہور کھلا خط لکھا، جو اخبار میں ''میرا الزام ہے'' کی سرخی کے ساتھ چھپا۔ زولا اپنے اس خط، جس میں اس نے فوج پر حقائق چھپانے کا الزام عائد کیا تھا، کی وجہ سے ہتک عزت کے الزام میں جیل جاتے جاتے بچا۔ اس کے بعد زولا فرار ہو کر انگلینڈ چلا گیا۔

ڈریفس کے مسئلے پر فرانسیسی دو دھڑوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ ایک طرف اس کے حمایتی تھے تو دوسری طرف مخالفین۔ 1898ء میں کیا ہوا کہ ڈریفس کے ایک بڑے گواہ نے دروغ گوئی کا اعتراف کر کے خودکشی کر لی۔ اگلے برس ایک اور سازشی یہ محسوس کرتے ہوئے انگلینڈ بھاگ گیا کہ سچائی پر سے اب پردہ اٹھا چاہتا ہے۔ پھر 1899ء میں رینے روسو کو سرکردگی میں ایک نئی وزارت نے منصب سنبھالا اور اسی برس ڈریفس کو دوبارہ مقدمہ چلانے کے لیے فرانس لایا گیا۔ اس پر ایک مرتبہ پھر جرم ثابت ہو گیا لیکن نئی حکومت نے اسے معاف کر دیا۔ 1906ء میں بالآخر ڈریفس نے اپنی بے گناہی ثابت کر دی اور اسے پارلیمان کے ایک خصوصی قانون کے توسط فوج میں اس کے عہدے پر بحال کر دیا گیا۔

مڑ کے دیکھیں تو ڈریفس کے مسئلے کو فرانس کی تاریخ میں ایک بڑے اہم واقعے کی حیثیت

حاصل ہے جس نے سیاسی وسماجی دھڑوں کے درمیان صف بندی کی حوصلہ افزائی کی اور 1905ء میں چرچ اور ریاست میں ہونے والی علیحدگی اور دائیں بازو کے قوم پرستوں اور بائیں بازو کے عسکریت دشمنوں کے درمیان اس تقسیم کی راہ ہموار کی جس نے پہلی ساری عالمی جنگ کے دوران فرانسیسی معاشرے کو متاثر کیا۔

قلوپطرہ

ملکۂ مصر۔ اپنے والد کی 51 ق م میں وفات پر قلوپطرہ نے سترہ برس کی عمر میں اپنے بھیا بطلیموس ہشتم سے جس کی عمر دس برس تھی، شادی کر لی اور فرعونی روایت کے مطابق وہ دونوں مشترکہ طور پر تخت نشین ہوئے۔ جب اس کے باپ کے وزراء نے جو بطلیموس کو ایک کٹھ پتلی بنانے کے درپے تھے، قلوپطرہ کو معزول کیا تو وہ فرار ہو کر شام آ گئی اور وہاں اس نے ایک فوج جمع کرنا شروع کر دی۔ اس پر جولیئس سیزر مصر کے رومن حکام کے نمائندے کی حیثیت سے بیچ بچاؤ کرانے آیا۔

قلوپطرہ نے اپنا موقف اس دلالت سے پیش کیا کہ سیزر نے اسے دوبارہ تخت پر بٹھا دیا۔ جب بطلیموس جنگ میں ہلاک ہوا تو سیزر نے تجویز پیش کی کہ قلوپطرہ اپنے چھوٹے بھائی جس کی عمر گیارہ برس تھی سے شادی کر لے تا کہ وہ ملکہ بنی رہی۔ سیزر مصر میں ہی ٹکا رہا اور اس اثناء میں وہ قلوپطرہ پر ریجھ گیا۔ ان دونوں سے ایک لڑکا ہوا جس کا نام سیزیرین رکھا گیا۔ بعض افراد کا خیال ہے کہ سیزر کے قتل کے پیچھے کس حد تک اہل روم کا سیزر کے قلوپطرہ سے ناجائز تعلقات کا غصہ اور یہ خوف بھی کارفرما تھا کہ وہ قلوپطرہ کو روم کی ملکہ بنا دے گا۔

43 ق م میں قلوپطرہ کا شوہر زہر سے ہلاک ہو گیا جس کے لیے بہت سے لوگ قلوپطرہ کو ہی مؤرد الزام ٹھہراتے ہیں۔ وہ مصر کو نئے آمر مارک انتھونی کے تحت ایک رومن صوبہ بننے سے بچانا چاہتی تھی۔ اس موقعہ پر اس نے وینس دیوی کا لباس پہنا اور کشتی پر بیٹھ کر انتھونی سے ملنے طرطوس چلی گئی۔ انتھونی نہ صرف اس سے اپنی مکمل حمایت کا وعدہ کیا بلکہ وہ اس پر عاشق بھی ہو گیا۔ دونوں نے مل کر تین بچوں کو جنم دیا۔

قلوپطرہ نے انتھونی کی اس کی فوجی مہمات میں مدد کی جس کے صلے میں اس نے روم کے مشرقی صوبے مصر کو دے دیے۔ رومن سالار اوکٹیوئیس نے ان دونوں کے اتحاد کی مذمت کرتے ہوئے ان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور انھیں 31 ق م میں زبردست شکست سے دوچار کر دیا۔ انتھونی نے تو اس صدمے سے دلبرداشتہ ہو کر خودکشی کر لی لیکن قلوپطرہ نے یہ کوشش شروع کی وہ

اوکٹیوئیس سے مذاکرات کر کے کسی طرح مصر کی آزادی بچالے مگر جب اسے یہ پتہ چلا کہ مصر کو رومن صوبہ بنایا جارہا ہے اور اسے قیدی بنا کر روم بھیج دیا جائے گا تو اس نے بھی ایک سانپ سے ڈسوا کر خود کو ختم کرلیا۔

قطب مینار

خاندان غلاماں کے عہد میں دہلی میں تعمیر کیا گیا ایک مشہور مینار۔ اسے 1190ء میں سلطان التتمش کے حکم سے تیار کیا گیا۔ یہ مینار جس کی بلندی 288 فٹ ہے، مسجد قوت الاسلام کی بیرونی جانب واقع ہے۔ یہ مسجد اور قطب مینار ہندوستان میں مسلمانوں کے ابتدائی دور کے فن تعمیر کی وہ یادگاریں ہیں جو ابھی تک سلامت ہیں۔ اس یادگار کے نام کے بارے میں دو تاویلیں مشہور ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ مینار ان ولی اللہ کے نام سے موسوم ہے جو کہ اس میں مدفون ہیں جبکہ بعض کا کہنا ہے کہ یہ سلطان قطب الدین کے نام پر ہے جنہوں نے اس کا زیریں حصہ تعمیر کرایا تھا۔

ک

کارنیوال

رومن کیتھولک عیسائیوں کا ایک تہوار جس کے دوران وہ روزے رکھتے ہیں اور خوشی مناتے ہیں۔ یہ روایتی مسیحی تقویم میں لینٹ سے قبل کے ہفتے میں منایا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا غالباً عیسائیت سے قبل کے دور میں قدیم بابلیہ، یونان، روم اور مصر میں منائے جانے والے بہار کے تہواروں سے ہوئی۔ قدیم دور کے روم میں فصلوں اور کٹائیوں کے دیوتا سیٹرن کے نام پر ایک تہوار سیٹرنیلیا منایا جاتا تھا۔ اس موقع پر سماجی مقام و رتبہ کو وقتی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا تھا، آقا و غلام سب مل بیٹھ کر کھانا نوش کرتے تھے اور جوش و مستی کی وفضا میں ایک دوسرے سے تحائف کا تبادلہ کرتے تھے۔ یہ تہوار کئی دیگر قدیم میلوں ٹھیلوں سے ملتا جلتا تھا اور ان روایات سے وابستہ بہت سی چیزوں کا مشاہدہ آج کے کارنیوالوں میں کیا جاسکتا ہے۔

اگرچہ اٹلی، سپین، پرتگال اور فرانس جیسے یورپی ممالک میں کارنیوال اب بھی منایا جاتا ہے، اس نے جنوبی امریکہ اور جزائر غرب الہند اور اس کے گردونواح کے علاقوں میں خاص طور پر بہت

مقبولیت حاصل کی ہے جہاں یورپی اور افریقی لوگوں اور ثقافتوں کے امتزاج سے کارنیوال کی تقریبات کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ان علاقوں میں یورپی کارنیوال میں سولھویں صدی میں افریقہ سے آنے والے افریقیوں کی روایات کی آمیزش نے ایک انوکھا رنگ پیدا کر دیا ہے۔ جزائر غرب الہند اور متعدد جنوب امریکی معاشروں میں بہت سے غلاموں کے لیے سالانہ منائے جانے والے یہ تیوہار ہی خوشی وتفریح کے واحد مواقع تھے۔ ترینیداد میں منایا جانے والا کارنیوال آج کل دنیا کے سب سے بڑے اور مشہور ترین کارنیوالوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں لوگ طرح طرح کے لباس اور عجیب وغریب ماسک پہن کر شرکت کرتے ہیں اور رنگ برنگے فلوٹ سجاتے ہیں۔ ترینیداد میں بڑا کارنیوال تو لگتا ہی ہے جزائر غرب الہند کے پردیس رہنے والے افراد لندن، نیویارک اور ٹورنٹو جیسے شہروں میں بھی اس روایت کے مطابق چھوٹے چھوٹے کارنیوالوں کا انعقاد کرتے ہیں۔ ریوڈی جنیرو کے ساحلی شہر میں منعقد ہونے والا برازیلی کارنیوال بھی شہرت میں کم نہیں۔ اسے بڑے اہتمام اور منصوبہ بندی سے منایا جاتا ہے اور سماج کے ہر طبقے کے افراد اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ نیو اورلینز لوئزیانہ میں بھی کارنیوال بڑے تزک واحتشام سے منایا جاتا ہے جہاں فرانسیسی، کریول اور افریقی روایات نے باہمی اختلاط سے موسیقی، خوش خوراکی اور ثقافت کی نئی نئی اصناف کو جنم دیا ہے۔ بہت سے ماہرین عمرانیات یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ کارنیوال غریب اور بے کس افراد کو وقتی طور پر اپنی جذباتی گھٹن دور کرنے اور اپنے روزمرہ کے غم وفکر کو بھلانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ دیگر حضرات کارنیوال کو قومی اور ثقافتی وحدت کے فروغ کا ایک وسیلہ قرار دیتے ہیں۔

کاسترو، فیدل (پیدائش 1926ء)

کیوبا کے سیاسی وانقلابی رہنما۔ انھوں نے 1959ء میں کیوبا کے صدر کا عہدہ سنبھالا اور وہ لاطینی امریکہ اور تیسری دنیا میں کمیونزم کی علامت کی حیثیت اختیار کر گئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم عیسائی پادریوں سے حاصل کی اور پھر یونیورسٹی آف ہوانا میں قانون پڑھتے رہے۔ یہاں رہتے ہوئے انھوں نے لاطینی امریکہ کی انقلابی سیاست میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا۔ 1950ء میں انھوں نے ایک وکیل کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا۔ 1959ء میں پارٹیڈو اورتوڈوکسو کے ساتھ کانگریس کے امیدوار کے طور پر کھڑے ہوئے لیکن بتیستا کے ایک فوجی بغاوت میں صدر کارلوس کا تختہ الٹنے پر انتخابات منسوخ کر دیے گئے۔

اس پر کاسترو بہت برانگیختہ ہوئے اور بتیستا حکومت کی کھلم کھلا مخالفت کرنے لگے۔ انھوں

http://muftbooks.blogspot.com/

نے خفیہ طور پر اپنے ساتھیوں کو منظم کرنا شروع کیا اور 26 جولائی 1953ء میں ایک فوجی بیرک پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہے اور اپنی زندگی سے ہاتھ دھوتے دھوتے بچے۔ انھوں نے کئی ماہ قید میں گزار دیے اور اپنا مقدمہ خود لڑا۔ اسی مقدمے کے دوران انھوں نے پانچ گھنٹے طویل اپنی وہ تقریر کی جس میں انھوں نے ظلم و جبر کے خلاف بغاوت کے اپنے تاریخی حق کا دفاع کیا اور اپنی انقلابی اصلاحات کا لائحہ عمل پیش کیا۔ بعدازاں انھیں عام معافی کے موقع پر رہا کر دیا گیا۔ رہائی ملنے پر وہ 26 جولائی 1955ء میں میکسیکو چلے گئے اور وہاں بیتستا کی حکومت گرانے کے لیے ایک جماعت انقلابی تحریک کی بنیاد رکھی۔ میکسیکو میں کاسترو کی ملاقات لاطینی امریکہ کے معروف گوریلا لیڈر چی گویرا (1928ء۔ 1967ء) سے ہوئی اور ان دونوں رہنماؤں نے اکیاسی دوسرے مسلح ساتھیوں کے ساتھ مل کر نومبر 1957ء میں اورینٹ صوبے پر حملہ کر دیا۔ ان کے حملے کا وقت صحیح نہیں تھا۔ کیوبا کی فضائی اور بری فوج ان کی گھات میں بیٹھی تھی اور اس چوک کا نتیجہ یہ نکلا کہ حملہ آوروں میں سے بیشتر کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ کاسترو، چی اور کاسترو کا چھوٹا بھائی راؤل سیرا میسترا پہاڑوں میں جا چھپے اور وہاں سے انھوں نے گوریلا جنگ کا آغاز کر دیا۔ 1959ء تک صدر بتیستا کی حکومت بہت غیر مقبول ہو چکی تھی۔ پھر کسانوں نے بھی تحریک شروع کر رکھی تھی۔ کاسترو نے اس ساری صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور بھرپور انقلابی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔ اگرچہ کاسترو کے ساتھیوں کی تعداد ہزار سے بھی کم تھی، انھوں نے بتیستا کی فوج کو بے بس کر دیا۔ بیستتا ملک سے فرار ہو گیا اور کاسترو جنوری 1959ء میں فاتحانہ طور پر ہوانا داخل ہوئے۔

کاسترو کی سربراہی میں ایک حکومتی اتحاد تشکیل پایا لیکن یہ جلد ہی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ کاسترو نے وزیراعظم کا عہدہ سنبھال لیا اور ان کے پیروکاروں نے سکولوں، شہری و پیشہ ورانہ جماعتوں اور عوامی تنظیموں پر قبضہ کر لیا۔ انتخابات منسوخ کر دیئے گئے اور اشتراکیت کی مخالفت کرنے والے چیدہ چیدہ سیاسی قائدین کو دبانے کے لیے کاروائیاں شروع کر دی گئیں۔ 1961ء میں کاسترو نے اپنی جماعت کو کیوبا کی کیمونسٹ پارٹی میں ضم کر دیا اور سرمایہ داریت اور امریکہ کے خلاف اپنی جنگ تیز کر دی۔ ان اقدامات کے نتیجے میں کیوبا کو سوویت یونین کی طرف سے وسیع پیمانے پر امداد ملنا شروع ہو گئی۔

کاسترو کی بیشتر پالیسیوں کو بہت مقبولیت ملی۔ تعلیمی مواقع اور اداروں میں اضافے، دولت کی تقسیم نو، صحت عامہ کی سہولتوں میں بہتری اور روزگار کی فراہمی جیسے اقدامات سے کاسترو کی عوامی

حمایت میں بڑی تیزی سے اضافہ ہونا شروع ہوگیا۔ وسائل کی مسلسل کمیابی اور امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی طرف سے عائد کردہ تجارتی پابندیوں نے معاشی معاملات پر اس کی گرفت کو کسی حد تک کمزور ضرور کیا۔ اس کی حکومت نے شہری آزادیوں میں تخفیف کا عمل شروع کیا اور ملک کی بیشتر صنعت کو سرکاری ملکیت میں لینے کا اعلان کردیا۔ ان حالات کے نتیجے میں کیوبا کے لاکھوں شہریوں نے بھاگ کر امریکہ میں پناہ لینا شروع کردی۔ کاسترو کی حکومت نے تمام ذرائع ابلاغ کو اپنے کنٹرول میں لے لیا اور 1976ء تک ملک میں کوئی انتخابات نہ کرائے گئے اور اگر جمہوری طریق کار کی حوصلہ افزائی کی بھی گئی تو وہ بھی صرف مقامی حکومتوں کی سطح تک۔

کیوبا 1962ء میں امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان جاری سرد جنگ میں اس وقت مرکزی کردار کی حیثیت اختیار کر گیا جب سوویت یونین نے کیوبا میں بیلسٹک میزائل نصب کر کے دنیا میں ایٹمی جنگ چھیڑنے کا خطرہ پیدا کردیا تھا۔

کاسترو فروری 2008ء میں صدارت سے مستعفی ہوگئے تھے۔

کالی داس (اندازاً پانچویں صدی عیسوی)

سنسکرت ڈرامہ نگار اور شاعر۔ اسے سنسکرت شاعری کا امام خیال کیا جاتا ہے۔ ہم اس کے حالات زندگی کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں لیکن اس کے نام کا مطلب بنتا ہے ''کالی دیوی کا خادم'' اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ غالباً وہ فنا کے دیوتا شیو کا ماننے والا تھا، کالی جس کی محبوبہ تھی۔ یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ اس کا تعلق اونچی ذات کے کسی برہمن خاندان سے تھا۔ اس کے صحیح عہد کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ اس کا انتقال کمار داس کے دور حکومت میں ہوا جس نے 517ء میں سری لنکا کا اقتدار سنبھالا لیکن بعض کے مطابق وہ راجہ وکرم دتیہ کے دربار کے نو رتنوں میں شامل تھا۔ وکرم اجین کا فرمانروا تھا اور اسے چندر گپت ثانی (حکومت اندازاً (380ء-415ء) بھی کہا جاتا ہے۔

کالیداس سے منسوب تخلیقات میں ابھیجنان شکنتلا (شکنتلا اور پہچان کی نشانی) شاید سب سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ کہانی ایک پری شکنتلا کے بارے میں ہے جو راجہ دش نیت کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے جو انجانے میں اس پری اور اپنے بچوں دونوں کو دھتکار دیتا ہے اور پھر اوپر سورگ میں جا کر سب کا دوبارہ ملاپ ہوتا ہے۔ اس کھیل کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ راجہ اور شکنتلا کے ملاپ سے پیدا ہونے والے بچے بھارت کو ہندی قوم کا جدامجد تصور کیا جاتا ہے۔

کالیداس کے دوسرے دو ناٹک بھی بہت مسحور کن ہیں گو انہیں وہ شہرت نہیں مل سکی جو شکنتلا

کے حصے میں آئی۔ ان دونوں ناٹکوں میں ایک وکرم اُروسی (اُروسی بہادری کے بل پر جیت گیا) ہے جس میں زمانہ قدیم سے چلی آنے والی ایک انسان اور پری کے درمیان عشق کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ دوسرا کھیل مالا وکا اگنی متر (مالاوکا اور اگنی متر) ہے جس میں عشق ومحبت کی بجائے مزاحیہ رنگ غالب ہے۔ جہاں تک کالیداس کی رزمیہ نظموں کا تعلق ہے۔ رگھو وامسا (رگھو کا خاندان) میں ہندوؤں کے ہیرو رام اور اس کے خاندان کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں جبکہ ''کمارا سامبھوا'' (جنگ کے دیوتا کی پیدائش) میں خواہش کے دیوتا کاما کے ہاتھوں مجبور رام کی بیگم پاربتی اور شیو دیوتا کے عشق کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ ان دونوں کے معاشقے کے نتیجے میں ایک بچہ کمار پیدا ہوتا ہے جس کے نام پر اس رزمیہ کا عنوان رکھا گیا ہے۔ کالیداس سے منسوب ایک اور نظم میگھ دوت (بادل قاصد) ایک عاشق کے اپنی معشوقہ کے نام پیغام پر مشتمل ہے جس میں ہندوستان کے مختلف پہاڑوں، دریاؤں اور جنگلوں کو مخاطب کیا گیا ہے جس سے کالیداس کے حسن فطرت سے لگاؤ کا پتہ چلتا ہے۔

کاما سوترا

عشق ومحبت اور جنسی مسرت سے متعلق معروف ہندوستانی کتاب۔ یہ کتاب ایک درویش واتسیاین سے منسوب کی جاتی ہے جس کا زمانہ چوتھی سے چھٹی صدی عیسوی کے درمیان کا ہے۔ تیرہویں صدی میں یشودھرا نامی ایک مصنف نے اس کتاب پر ایک بصیرت افروز تبصرہ قلمبند کیا جس سے لوگوں کیلئے اس تحریر کو سمجھنا مزید آسان ہو گیا۔ گذشتہ صدیوں میں اس کتاب سے بہت سے قارئین نے استفادہ کیا ہے۔ مغربی دنیا کے حالیہ جنسی انقلاب کے دوران بھی اس کلاسیکی تصنیف کو خاصی اہمیت حاصل رہی ہے۔

کاما کا مطلب خواہشات اور نفسانی بھوک کی تسکین ہے جو ہندی فلسفے کے مطابق انسان کے تین بنیادی اہداف میں شامل ہے۔ دیگر دو اہداف ارتھ یعنی مادی خوشحالی اور معاشی وسیاسی اہداف کی جستجو اور دھرم یعنی انسان کے مرتبے کے مطابق اس پر عائد ہونے والے فرائض ہیں۔ کاما سوترا میں پہلے ہدف کی تکمیل کے طریقے بڑی وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں۔ اس کی کہانی ایک رنگ رنگیلے شخص کی مہمات کے گرد گھومتی ہے اور اس سے ہمیں اس زمانے کی سماجی زندگی کے بارے میں بہت سی باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب میں بنیادی طور پر بوس وکنار، عشق بازی اور مباشرت کے تیر بہدف نسخے بتائے گئے ہیں اور اس میں واتسیاین کا یہ فلسفیانہ اعتقاد جھلکتا نظر آتا ہے کہ محبت میں انسان کو جہاں اور جو بھی اچھا لگے وہ کر سکتا ہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

کامیو، البیغ (1913ء۔1960ء)

فرانسیسی ادیب۔کامیو کی بڑی وجہ شہرت اس کے ناول ہیں۔وہ الجیریا کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا، اس نے یونیورسٹی آف الجیریا سے فلسفے کی تعلیم حاصل کی وہ اپنے تمام تعلیمی اخراجات خود پورے کرتا رہا۔

دوسری جنگ عظیم چھڑنے سے قبل کامیو نے الجیریا اور پیرس میں ایک صحافی کی حیثیت سے کام کیا۔ان ایام (41۔1937ء) کے دوران اس نے اپنی وہ تصنیفات مکمل کیں جنھوں نے اسے صف اول کے ادیبوں میں لا کھڑا کیا:

ایک ناول ''اجنبی'' (1942ء)

مضمون ''حکایت سسی فس'' (1942ء)، اور

ایک ناٹک ''کیلی گولہ'' (1944ء)

کامیو خفیہ طور پر شائع ہونے والے جریدے ''جنگ'' کا بانی اور مدیر تھا اور اس کا شمار پیرس میں فرانسیسی تحریک مزاحمت کے سرکردہ دانشوروں میں ہوتا تھا۔وہ معروف فرانسیسی فلسفی اور ادیب ژاں پال سارتر اور وجودی مکتبہ فکر سے متعلق رہا لیکن بعد میں اس نے سارتر کے روز افزوں اشتراکی رجحانات کی وجہ سے اس سے اپنی راہیں جدا کر لیں۔سارتر نے اپنے جریدے ''ازمنہ نو'' میں کامیو کے خلاف انتہائی شدید مضمون لکھ کر مآل کار اس قطع تعلقی پر آخری مہر بھی ثبت کر دی۔

کامیو کو انسانی زندگی کی بے معنویت کا پورا یقین تھا لیکن اس کے باوجود ہمیں اس کی تخلیقات میں ایک ہیٹلا انسانی عنصر برابر دکھائی دیتا ہے۔جس کا اظہار ہمیں اس کے کرداروں کے برے سے برے حالات میں بھی لڑتے رہنے کے عزم صمیم میں ملتا ہے۔مثلاً ''طاعون'' (1947ء) میں وہ انسان کی ایک خوفناک آفت کے دوران اپنی بقا کے لیے کی گئی جدوجہد کی کہانی سناتا نظر آتا ہے۔اس کے فلسفیانہ خیالات کا اظہار سیاسی فلسفے پر اس کی کتاب ''باغی'' (1951ء) میں زیادہ واضح طور پر ہوتا دکھائی دیتا ہے جس میں انسان کی آزادی کے موضوع پر بحث کی گئی ہے۔

کامیو 1950ء کے عشرے میں تھیٹر کے کام میں بہت سرگرم رہا۔ان ایام میں وہ خود لکھنے کے ساتھ ساتھ امریکی ناول نگار ولیم فالکنر اور روسی ادیب دوستووسکی کی نگارشات سے ماخوذ ڈراموں کی ہدائتکاری بھی کرتا رہا۔اسے ادب کا نوبل انعام ملا لیکن اس کے کچھ ہی عرصہ بعد 1960ء میں وہ سڑک کے ایک حادثے میں مارا گیا۔اس وقت اس کے ہمراہ اس کے ایک نامکمل ناول کا مسودہ بھی تھا جو اس کی موت کے بعد 1994ء میں بعنوان ''پہلا آدمی'' شائع ہوا۔

http://muftbooks.blogspot.com/

کانٹ، عمانوئیل (1724ء۔1804ء)

جرمن فلسفہ دان۔ کانٹ نے اپنی تمام عمر کونگس برگ، پروشیا میں بسر کی۔ انہوں نے یونیورسٹی میں الہیات پڑھنے کیلئے داخلہ لیا تھا لیکن بعد میں ان کا جھکاؤ ریاضیات اور نیوٹن کی طبیعیات کی طرف ہو گیا۔ وہ دور طالب علمی میں ایک گھریلو ٹیوٹر کے طور پر کام کرتے رہے لیکن تکمیل تعلیم کے بعد انہیں یونیورسٹی میں لیکچرار کی ملازمت مل گئی۔ انکی بطور دانشور شہرت میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا اور 1770ء میں انہیں منطق و مابعد الطبیعیات کا پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ اگرچہ ان کی بنیادی تربیت دیکارت اور لیبنز کی کلاسیکی عقلیت کی روایت کے مطابق تھی ان کی فلسفیانہ فکر کو صحیح معنوں میں بیدار کرنے والوں میں جس دانشور کا نام سرفہرست ہے وہ سکاٹ لینڈ کے فلسفی ڈیوڈ ہیوم (1711ء۔1776ء) ہے جن کا مطالعہ کانٹ نے اپنی عمر کے وسطی حصے میں کیا۔ کانٹ ہیوم کی تحاریر میں اٹھائے گئے سوالوں پر کام کرتے رہے جس کے نتیجے میں ان کی درج ذیل تصانیف وجود میں آ گئیں جنہیں کانٹ کی عظیم ترین نگارشات قرار دیا جا سکتا ہے:

تنقید عقل محض (1781ء)

تنقید عقل عملی (1788ء) اور

تنقید انتقاد (1790ء)

نیوٹن کی طبیعیات (جس کا مدار علل و معلولات کے درمیان ضروری اتصالات کی موجودگی پر تھا) کا دفاع کرتے ہوئے کانٹ نے ہیوم کے برعکس یہ دعویٰ کیا کہ فطرت کی سائنس ممکن ہے۔ ایسی سائنس ایسے مسائل پر استوار ہوتی ہے جو تالیفی ہوتے ہیں جن میں محمول (Predicate) منطقی طور پر فاعل میں موجود نہیں ہوتا a priore ہوتا ہے اور اس کا مدار تجربے پر نہیں ہوتا۔ حقیقی دنیا کے متعلق یقین کے ماخذ کا مدار حقیقی دنیا پر نہیں بلکہ دیکھنے والے شخص پر ہوتا ہے۔ کانٹ نے اخلاقی قانون (اصول زریں) کے متعلق بھی نظریات پیش کئے جن کے مطابق فرد خود ایک منزل ہوتا ہے، کسی منزل کے حصول کا وسیلہ نہیں اور اخلاقی فرض بغیر کسی اور طمع کو پیش نظر رکھے بغیر ادا کیا جانا چاہیے۔ اخلاقی قانون کی رو سے بعض اوامر لازم آتے ہیں: آزادی، لافنائیت اور خدا۔ کانٹ نے فرانسیسی دانشور ژاں ژاک روسو (1712ء۔1778ء) کے سیاسی فلسفے کیلئے سائنسی بنیاد فراہم کرتے ہوئے اپنے اخلاقی نظریے کو پھیلا کر ایک مثالی سیاسی نظریے کی شکل دے دی۔

ایک پشت کے عرصے میں جرمن فلسفیوں نے کانٹ کے اخلاق اور علم کی معتدل ثنویت کو ترک کرنا شروع کر دیا تھا لیکن انیسویں صدی کے اواخر کے دانشوروں نے کانٹ کے فلسفے پر

http://muftbooks.blogspot.com/

دوبارہ غور وخوض کرنا شروع کر دیا۔ کانٹ کو اب بھی مغربی دنیا کے اہم ترین مفکرین کی صف میں شامل کیا جاتا ہے۔

کبیر

ہندوستان کے ایک بلند پایہ صوفی شاعر۔ وہ ایک ایسی بے شکل ماورائی الوہی طاقت پر یقین رکھتے تھے جو ساری کائنات میں رواں دواں ہے۔ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بشمول تمام مذاہب کے پیروکاروں کو متحد کرنے کی کوشش کی اور لوگوں کو سب انسانوں کی برابری کا درس دیا۔ وہ ہندو معاشرے میں مروج ذات پات کے نظام کے خلاف تھے اور ان کا نام ہندوستان کے صوفی شعرا میں بہت بلند اور ممتاز مقام کا حامل ہے۔ انکے نظریات نے بہت سے مسالک اور سلسلوں کیلئے بنیاد فراہم کی جن میں کبیر پنتھ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ سکھ مذہب جس کی بنیاد ان کے ایک مرید بابا گورو نانک (1464ء۔1539) نے رکھی، پر بھی انکی تعلیمات کی چھاپ دیکھی جاسکتی ہے۔

کبیر افراتفری اور خلفشار کے دور میں پیدا ہوئے لیکن ہمیں ان کے بچپن کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں۔ غالباً وہ اپنے ابتدائی دور میں مسلمان تھے۔ بعد میں ایک ہندو متصوف رانند نے انہیں ہندومت سے متعارف کرایا۔

بجائے اس کے کہ وہ اس چکر میں پڑتے کہ کس مذہب پر چلا جائے، انہوں نے اپنا ایک مسلک ''سہج یوگا'' (سادہ وصال) وضع کر لیا جو تناسخ اور کرما کے ہندو تصورات اور وحدانیت اور اللہ کے تمام بندوں کی برابری کے اسلامی عقائد کا امتزاج تھا۔ انہوں نے ذات پات اور بت پرستی کے ان ہندو عقیدوں کو مسترد کر دیا جو انہیں اسلام کے نظریہ مساوات اور توحید سے متصادم نظر آئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک ''ہندو اور ترک ایک ہی مٹی کے بنے برتن ہیں اور اللہ اور رام ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں''۔ ان کے مطابق ہر شخص اپنے اندر کی صفائی اور دوسرے انسانوں سے محبت کر کے نجات حاصل کر سکتا ہے۔

کبیر نے اپنے دوہے ہندی زبان میں تحریر کئے جو اپنی سادگی اور خلوص کے طفیل ہر طبقے کے افراد کے دل میں گھر کر گئے۔ ان کا تخلیقی رویہ دیکھیں تو وہ ہمیں اصول وقواعد اور بناؤ سنگھار سے بے نیاز نظر آتے ہیں۔ ان کا مقصد سننے یا پڑھنے والے کو مرعوب کرنا نہیں بلکہ اپنے دل کی بات اس کے دل تک پہنچانا تھا۔ ان کا کلام سکھوں کی مقدس کتاب ''گرنتھ'' اور ان کی منظومات اور مشاہدات کے مجموعی ''بیجک'' میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ انکی چوالیس نظموں کا ایک مجموعہ رابرٹ

http://muftbooks.blogspot.com/

بلائی نے 1977ء میں شائع کیا۔

کہتے ہیں کہ ان کے انتقال پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں تنازعہ پیدا ہو گیا تھا۔ مسلمان انہیں اپنے طریقے کے مطابق دفنانا چاہتے تھے اور ہندو ان کی آخری رسومات اپنے عقائد کے مطابق ادا کرنا چاہتے تھے۔ ابھی جھگڑا جاری ہی تھا کہ اوپر سے ایک آواز آئی کہ کفن اٹھا کر دیکھو اور جو تمہیں نظر آئے اسے آدھا آدھا بانٹ لو۔ وہاں جمع لوگوں نے جب ایسا کیا تو انہیں وہاں میّت کی بجائے پھول پڑے نظر آئے جو دونوں دھڑوں نے آپس میں تقسیم کر لئے۔

کپلنگ، (جوزف) رڈیارڈ (1865ء۔1936ء)

انگریز شاعر، افسانہ نگار اور ناول نویس۔ کپلنگ کو بنیادی طور پر برطانوی سلطنت کے قصیدہ گو کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ کپلنگ کی شہرت پہلے تو ایک بازاری ادیب اور سامراجیت کے ثناخواں کے طور پر بنی تھی اب آ کے ان کے بعض ادبی محاسن ناقدین کی توجہ کا مرکز بننے لگے ہیں جن میں مقبول عام اصناف کا اختراعی استعمال، ان کی تحریروں میں جھلکنے والی مزدور طبقے کی زندگی کی یاس اور برطانیہ کے حکمران طبقے پر تنقید سرفہرست ہیں۔

جوزف رڈیارڈ کپلنگ ہندوستان کے مشہور شہر بمبئے (حال ممبئی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد فن تعمیر کے عالم اور لاہور کے عجائب گھر کے مہتمم تھے۔ انکے گھر ادیبوں، دانشوروں اور فنکاروں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ کپلنگ جب چھ سال کے تھے تو انہیں تعلیم کیلئے انگلستان بھیجا گیا جہاں انہوں نے پانچ انتہائی برے سال ساؤتھ سی کے ایک رضاعی گھرانے میں گزارے۔ اس اثنا میں ان کے والدین بھی انگلستان آ گئے جنہوں نے انھیں ڈیون کے ویسٹ ورڈ ہو! سکول میں داخل کرا دیا جہاں رہ کر انھیں برطانوی معاشرے کی صبر و برداشت کی ریت سے پیار ہو گیا۔ اس دور میں انہوں نے اپنی وہ نظمیں لکھیں جو ان کے پہلے مجموعے ''سکول کے بچے کے گیت'' (1881ء) میں شائع ہوئیں۔

چونکہ کپلنگ کے گھر والے اس قدر امیر نہ تھے کہ انہیں آکسفورڈ یا کیمبرج سے تعلم دلوا سکتے۔ وہ 1882ء میں ہندوستان واپس آ گئے اور بمبئی کے ایک اخبار کے ساتھ صحافی کے طور پر کام کرنے لگے۔ یہاں رہتے ہوئے انہوں نے سات سال کے دوران افسانوں کے چھ اور نظموں کے کئی مجموعے شائع کئے۔ ان کی تخلیقات کو برطانوی اور اینگلو انڈین قارئین میں راتوں رات شہرت ملی اور وہ جب انگلستان گئے تو ان کا ایک بڑے آدمی کے طور پر استقبال کیا گیا۔ ان کے 1896ء میں شائع ہونے والے نظموں کے مجموعے Departmental Ditties میں

ان کے شعری رجحانات سامنے آئے جن میں سے بہت سے برطانوی نقادوں کے جدید ذوق کو ناگوار بھی گزرے۔ کپلنگ کی شاعری بلند آواز سے پڑھنے کیلئے موزوں ہے اور یہ میوزک ہال کی دھنوں اور نغموں کے رنگ کی تقلید کرتی نظر آتی ہے۔ ان کی نظموں میں برطانیہ کے بالائی طبقات کے خلاف جا بجا حقارت کا اظہار ملتا ہے اور یہ محنت کشوں اور فوجیوں کی تعریف کرتی محسوس ہوتی ہیں۔

کپلنگ نے 1892ء میں ایک امریکی خاتون کیرولین بیلسٹیئر سے شادی کی جس کے بعد انہوں نے ورمونٹ میں سکونت اختیار کر لی۔ امریکہ میں قیام کے دوران انہوں نے اپنی طویل افسانوی کہانیاں شائع کیں جن میں جنگل بکس (1894ء۔1895ء) کیپٹن حوصلہ مند (1897ء) اور کم (1901ء) شامل ہیں۔ ان میں سے آخری ناول ''کم'' ہندوستان میں مقیم ایک غریب آئرش یتیم بچے کی مہمات سے متعلق ہے اور ہندوستانی مناظر فطرت اور سماجی ڈھانچے کی تصویر کشی کے سبب اس کا شمار جدید کلاسیکی کتابوں میں ہوتا ہے۔ کپلنگ نے 1902ء میں ایک دفعہ پھر انگلستان کا دورہ کیا۔ جنوبی افریقہ میں اپنی طویل سیاحتوں کے دوران ان کی استعماریت سے وفاداری میں اور بھی اضافہ ہو گیا جس کے طفیل وہ برطانیہ کی روز افزوں آزاد ادبی و سیاسی رائے سے کٹتے چلے گئے۔ اگرچہ وہ 1936ء میں اپنے انتقال کے وقت تک مسلسل لکھتے رہے، ان کے موخر دور کی تحریریں ان کی پہلی نگارشات کے مقابلے میں قدرے کمزور محسوس ہوتی ہیں۔

ان کے جنگجوانہ خیالات، استعماریت کی حمایت اور عریاں نسل پرستی سے کپلنگ کی فنکارانہ شہرت کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ ان کی استعمار پسندی کے پیچھے غالباً ان کا یہ خیال کارفرما تھا کہ برطانیہ کو یہ مشن اوپر سے عطا ہوا ہے کہ وہ ایشیا و افریقہ کی اقوام کو تسخیر کر کے انہیں تہذیب سے بہرہ ور کرے۔

جب کپلنگ 1899ء میں امریکی صدر روز ویلٹ کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ''وہ گوروں کی ذمہ داری کو محسوس کریں'' اور فلپائنی جزائر پر ایک سلطنت قائم کریں تو ان کے رویے سے نسلی تفاخر کی بو آتی محسوس ہوتی ہے اور ان کا یہ یقین جھلکتا محسوس ہوتا ہے کہ استعماریت محکوم قوموں کے فائدے میں ہے۔

کتاب رفتگاں

مصر کی ایک قدیم مذہبی تصنیف۔ کتاب رفتگاں ایک جرمن ماہر مصریات رچرڈ لیپسئس نے مختلف قدیم تحاریر کو مجتمع کر کے ترتیب دی اور انھیں 1842ء میں شائع کیا۔ مختصر عبارات یا ابواب

http://muftbooks.blogspot.com/

کا یہ مجموعہ جادوئی منتروں، تعویذوں، مناجاتوں اور دعاؤں پر مشتمل ہے جن سب کا مقصد مردے کو مرنے کے بعد پیش آنے والی آزمائشوں اور مرحلوں سے کامیابی سے گزرنے میں مدد دینا ہے۔ اس کتاب میں شامل مختلف عبارات ابتداء میں مختصر اور الگ الگ ابواب پر مشتمل تھیں جنھیں کاتبین سرکنڈے سے تیار کردہ کاغذ کے طوماروں پر نقل کرتے تھے، مقابر کی دیواروں پر نقش کرتے تھے اور یا پھر تابوتوں پر تراشتے تھے۔ قدیم مصریوں کا خیال تھا کہ یہ جادوئی منتر مردے کی حفاظت کرتے ہیں اور اس کی رہنمائی کرتے ہیں اور اسے اوسی رس یعنی خدائے پاتال سے بچنے کی تراکیب بتاتے ہیں۔ وہ سوچتے تھے کہ حساب کے وقت یہ جادو حساب کرنے والے کے ذہن پر اثر انداز ہو کر اسے مردے کے برے اعمال دیکھنے سے روک سکتا ہے۔ کتاب رفتگاں میں چار ہزار سال پرانا مواد شامل ہے جو ہمیں قدیم مصر کے مذہبی عقائد اور رسومات کے بارے میں بہت کچھ بتاتا ہے۔

کرائیت

ایک یہودی فرقہ۔ اس کی بنیاد آٹھویں صدی میں عنان بن داؤد نے بابلیہ میں رکھی تھی۔ اس فلسفے کی بنیادی خصوصیت یہودیت کی غیر تحریری شریعت اور تالمود سے انکار اور اس کی بجائے عہد نامہ عتیق کی لفظی تعبیر کو ترجیح دینا تھا۔ اس کے شارحین کا موقف یہ تھا کہ کتاب مقدس ہی واحد مذہبی اتھارٹی ہے۔ اس فرقے کے مقلدین شروع میں اس کے بانی کے نام پر عنانی کہلائے لیکن نویں صدی میں آ کے نہیں کرائی کہا جانے لگا۔ کرائیت اپنے مرکز یعنی بابلیہ اور فارس سے نکل کر بڑی تیزی سے مشرق وسطیٰ (بشمول اسرائیل کے) اور مشرق یورپ میں بسنے والے یہودی گروہوں میں پھیل گئی۔

کرائی بہت زیادہ پرہیز گار اور درویشی پسند تھے۔ وہ سبت کی حدود قیود پر اس سختی سے کاربند تھے کہ گذشتہ دن کی جلائی ہوئی آگ تاپنا بھی گناہ سمجھتے تھے۔ وہ ہانوکہ جیسے تہواروں اور عیدوں کو برا خیال کرتے تھے۔ انہوں نے زہد و تقویٰ کے نام پر خود پر اتنی سختیاں عائد کر لی تھیں کہ جن کا حکم عہد نامہ عتیق میں بھی نہیں ملتا۔ کرائیوں میں آگے ایک ''چھوٹا گروہ'' سوگواران صہیون کا تھا جو تقوے اور پرہیز گاری میں دوسروں سے بھی دو ہاتھ آگے تھے۔ وہ ہیکل کی تباہی کے غم میں اپنی پوری زندگیاں تپسیا اور ریاضت کشی میں بتا دیتے تھے۔ گیارہویں اور بارہویں صدی کا زمانہ کرائیت کا عہد زریں کہلاتا ہے جس دوران اس مسلک کی تصانیف اور نظریاتی تحاریر کو خوب نشو و نما ملی لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد ہی یہ تحریک زوال پذیر ہونا شروع ہو گئی۔ بارہویں صدی

عیسوی میں ربیوں نے اس کے پھیلاؤ کو روکنے کیلئے کرائیوں کا مکمل بائیکاٹ کرنا شروع کر دیا اور یہودیوں کو ان میں شادیاں کرنے سے منع کر دیا (اور کرائیوں پر تو پہلے ہی دوسرے مسالک کے افراد سے شادی کی بندش تھی) لہٰذا باوجود انیسویں صدی میں روسی سلطنت کے بعض علاقوں میں ایک مختصر عرصے کے احیاء کے یہ تحریک مسلسل مانند پڑتی رہی۔ اگر اس مسلک کے آج کل کے حالات پوچھیں تو آپ کو اس کے صرف چند ہزار مقلدین ہی باقی ملیں گے جو اسرائیل کے شہر تل ابیب کے نواح میں آباد ہیں یا پھر ان کی اکا دکا بستیاں اور محلے مشرقی یورپ کے بعض علاقوں میں بھی ملتے ہیں۔

کرد

ایک نسلی ولسانی گروہ جو آج کل کے ترکی، عراق اور ایران کے طورس اور زاغروس پہاڑوں پر ہزاروں برس سے آباد ہے۔ اکثر کرد سنی مسلمان ہیں۔ وہ مغربی ایران کی زبان بولتے ہیں جس کا تعلق فارسی اور پشتو سے ہے۔ کردی زبان آگے کئی بولیوں میں تقسیم ہے۔ کردوں کی روایتی بود و باش چرواہوں کی تھی لیکن اب آ کے ان کے رہن سہن میں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں کیونکہ ایک تو ان میں قبائلی زندگی کے رواج میں کمی پیدا ہو رہی ہے۔ دوسرا وہ شہروں کی طرف آ رہے ہیں اور تیسرا یہ کہ وہ جن ملکوں میں رہتے ہیں انہوں نے ان کی ثقافت میں آمیزش شروع کر دی ہے۔ کردوں کا اپنے اردگرد کی ثقافت خصوصاً موسیقی و ادب میں بڑا حصہ ہے۔

باوجود اس امر کے کہ کرد ایک طویل عرصے سے ایک خاص جغرافیائی خطے پر قابض ہیں، وہ اپنا الگ ملک نہیں بنا سکے۔ لیکن یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں قومی عصبیت کی کوئی کمی ہے۔ پہلی عالمی جنگ میں سلطنت عثمانیہ کی شکست کے بعد کرد ریاست کا قیام عمل میں نہ آنے، معاشی امتیاز اور ایران، ترکی اور عراق کی حکومتوں کی طرف سے علیحدگی پسندوں کے خلاف سخت کارروائی کے نتیجے میں کرد قوم پرست تحریک کو بہت نشو و نما ملی ہے اور وہ زیادہ خود مختاری کیلئے سخت جدوجہد میں مصروف ہیں۔

ترکی، ایران اور عراق میں گذشتہ اور حالیہ ادوار میں کرد بغاوتیں دیکھنے میں آتی رہی ہیں لیکن انہیں کبھی کامیابی کی منزل نہیں مل سکی۔ کردوں کے سیاسی و ثقافتی خود مختاری کے مطالبات علاقے علاقے کے اعتبار سے مختلف ہیں اور سب کردوں کے سیاسی نظریات بھی ایک سے نہیں۔

کرسمس

http://muftbooks.blogspot.com/

عیسائیوں کا ایک تہوار جو عموماً 25 دسمبر کو بنایا جاتا ہے۔ لفظ ''کرسمس'' قدیم انگریزی "Cristes maesse" سے نکلا ہے۔ اس مذہبی موقع پر حضرت مسیحؑ کی ولادت کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔ کرسمس کا قدیم ترین ذکر ان رومن دستاویزات میں ملتا ہے جن کا تعلق چوتھی صدی عیسوی سے ہے۔

ایسٹرن آرتھوڈوکس مسلک کے بعض چرچ کرسمس 6 جنوری کو مناتے ہیں لیکن اکثر دیگر چرچ 25 دسمبر پر متفق ہو چکے ہیں۔ یہ بات واضح نہیں کہ ابتدائی دور کے عیسائیوں میں 25 دسمبر کی تاریخ اتنی مقبول کیوں تھی۔ یہ کرسمس کو سورج دیوتا کی پیدائش کی یاد میں منائے جانے والے قدیم رومن تہوار سے ملانے کی کوشش کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے۔

کرسمس سے منسوب بہت سی چیزیں غیر مسیحی روایات سے ماخوذ ہیں۔ قبل مسیح دور کے رومن 17 دسمبر کو سٹیرنیلیا کے تہوار کے موقع پر ایک دوسرے کو تحفے تحائف دیا کرتے تھے اور یکم جنوری کو اپنے گھروں کو پھولوں اور موم بتیوں سے سجا کر نیا سال منایا کرتے تھے۔ جب جرمینک اور کیلٹک قبائل رومن سلطنت میں داخل ہوئے تو ان کی غیر Camaradleriet یول گیلی، سمور کے درخت اور تبادلہ تحائف کی روایات ان تہواروں میں شامل ہو گئیں۔

کرسمس اب دنیا کے کچھ حصوں میں ایک اہم سیکولر تہوار کی حیثیت اختیار کر گیا ہے جہاں اس نے ایک عائلی جشن کی شکل دھار لی ہے۔ اس میں بچے مرکزی کردار ادا کرتے ہیں جن کا بابا نکولاس (سانتا کلاز) ان کے لیے تحائف لے کر آتا ہے۔

کرشن

ہندو دیوتا۔ ہندو کرشن کو وشنو دیوتا کا آٹھواں اوتار مان کر اس کی پرستش کرتے ہیں۔ تاہم بعض ہندو فرقوں کا عقیدہ یہ ہے کہ کرشن محض اوتار ہی نہیں بلکہ خود ایک دیوتا بھی ہے۔ بہت سے ہندوؤں کے نزدیک کرشن پریم (عشق حقیقی) روپ (حسن مطلق) اور لیلا (الوہیت سے منسوب کھلنڈرا اور بے مقصد عمل) کی علامت ہے۔

ہندوؤں کی مشہور قدیم رزمیہ نظم مہا بھارت میں متھرا کے یادو واسودیو اور دیوکی کے ہاں کرشن کی پیدائش کا ذکر ملتا ہے۔ متھرا کا بدمعاش راجہ کامتا جو دیوکی کا بھائی بھی ہے جب یہ سنتا ہے کہ اس کی تباہی اس کی ہمشیرہ کے بچوں کے ہاتھوں لکھی ہے تو وہ کرشن اور اس کے بہن بھائیوں کو مارنے کے درپے ہو جاتا ہے۔ کرشن کو بچانے کیلئے گوکل پہنچا دیا جاتا ہے جہاں وہ گوالوں کے ہاں پلتا ہے۔ ننھا کرشن اپنی معصوم شرارتوں، کرامات اور کامسا کی بھیجی ہوئی شیطانی روحوں کو مارنے کی

وجہ سے اڑوس پڑوس میں مشہور ہو جاتا ہے اور سب کا لاڈلا بن جاتا ہے بلکہ یہی نہیں بلکہ اپنی بانسری کی مدھر دھنوں سے گاؤں کی گوپیوں کے دل بھی موہنا شروع کر دیتا ہے۔ کرشن اور گوپیوں کے درمیان اس چھیڑ چھاڑ اور دل لگی کو ہندو مت میں آتما (روح) اور پرماتما (خدا) کے باہمی تعلق کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے۔

اس داستان کے مطابق کرشن اور اس کا بھائی متھرا واپس آ کر اپنے ماموں کو مار دیتے ہیں اور بعد میں اپنے یادو قبیلے کے ساتھ مل کر دوارکا میں اپنا دربار سجاتے ہیں۔ کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان جنگ چھڑنے پر کرشن اپنی فوجیں ایک فریق کو دے دیتے ہیں اور خود دوسرے فریق کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ پانڈوؤں کے ساتھ مل کر کرشن ارجن کے ارتھ بان بن جاتے ہیں اور اسے فرض (دھرم) اور دیوتاؤں کے بارے میں تعلیم دیتے ہیں۔ ارجن اور کرشن کے درمیان یہ مکالمہ ہندوؤں کی خوبصورت مقدس نظم بھگوت گیتا میں پڑھا جا سکتا ہے جسے رزمیہ مہا بھارت کا سب سے دلنشین حصہ قرار دیا جاتا ہے۔

جب کرشن اپنے دربار کو لوٹتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ یادو آپس میں ہی لڑ رہے ہیں جس میں بالآخر کرشن کا بھائی اور بیٹا بھی مارا جاتا ہے۔ کرشن اس غم میں جنگل واسی بن جاتے ہیں لیکن جنگل میں کیا ہوتا ہے کہ ایک شکاری مغالطے سے انہیں ہرن سمجھ کر ان پر وار کر دیتا ہے۔ وار ان کی ایڑی پر لگتا ہے اور وہ جان دے دیتے ہیں۔ وار کہیں اور لگتا تو اور بات تھی۔ صرف ایڑی ہی ان کے جسم کا ایک ایسا عضو تھا جسے گھاؤ لگا کر انہیں مارا جا سکتا تھا۔

ہندوستانی ادب اور مصوری میں جس قدر کرشن بھگوان کو دکھایا گیا ہے کسی اور دیوتا کو نہیں دکھایا گیا۔ کرشن کو دونوں قسم کی محبت کی کامل مثال تصور کیا جاتا ہے۔ ان میں سے پہلی محبت واٹ سالیہ یا ''بچھڑے کی محبت'' ہے جو ہمیں ماں کے اپنے بچوں کیلئے شفقت میں ملتی ہے۔ دوسری قسم کی محبت مدھریہ یا ''میٹھی محبت'' ہے جو زیادہ جذباتی ہوتی ہے اور بڑے پریمیوں کو آپس میں ملاتی ہے۔ کرشن کی وہ شبیہیں جن میں انہیں ایک بچے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے محبت کے پہلے تصور کی نمائندگی کرتی ہیں لیکن وہ شبیہیں جن میں انہیں جوانی کے عالم میں دکھایا جاتا ہے وہ کرشن کو نائیک یعنی ایک ''مثالی ہیرو'' کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ جنسی ادب کے بہت سے بڑے کردار اسی شبیہہ کو پیش نظر رکھ کر تخلیق کئے گئے ہیں۔

ان دونوں تصویروں میں ہم کرشن کو ایک چور کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ بچپن میں وہ ماکھن چور کے روپ میں سامنے آتے ہیں اور جوان کرشن دوسروں کی بیویاں چراتے ہیں۔ خود سے ملنے والے ہر

http://muftbooks.blogspot.com/

کس وناکس کو اپنی موہ میں گرفتار کر لینے کے حوالے سے انہیں دلوں کا چور بھی تصور کیا جاتا ہے۔

کرما

ہندی فلسفے کی ایک اصطلاح۔ اس اصطلاح کا مفہوم کسی فرد کا وہ عمل یا فعل ہے جس سے اس بات کا تعین ہوتا ہے کہ وہ اگلے جنم میں کیا بنے گا یا اس کا اگلا جیون کیسا گزرے گا۔ درحقیقت کرما سے مراد کسی کا فعل یا عمل بھی ہے اور اس فعل یا عمل کا پھل اور بھگتان بھی۔ کرما کا تصور سب سے پہلے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں یعنی ویدوں کے ساتھ لف اپنشدوں میں ظاہر ہوتا نظر آتا ہے۔ چھندوگیہ اپنشد میں آتا ہے کہ ''جن کے کرم (اعمال) پہلے جنموں میں اچھے ہوتے ہیں انہیں برہمنوں، کشتریوں اور ویشوں کی دلپسند زندگیاں ملتی ہیں اور جن کے کرم برے ہوتے ہیں انہیں اگلے جنم میں چنڈال، کتے اور خنزیر بنا دیا جاتا ہے۔ برھدرنائیک اپنشد کہتی ہے ''اچھے کرموں والا شخص اچھا بنے گا اور برے کرموں والا بد، پاک کاموں سے انسان پاک ہو جاتا ہے اور برے کام کرنے والا برا''۔

کرما کا فلسفہ حقیقت میں اس سے قدرے پیچیدہ ہے۔ جیسا کہ وہ اپنشدوں کی ان مرقومہ بالا سطور سے ظاہر ہوتا ہے، اس نظریے کی جڑیں ہندو عقیدہ تناسخ یعنی اس تصور میں ہیں کہ زندگی ایک سلسلہ مرگ سے بار بار گزرنے کا نام ہے اور کسی فرد کی اس زندگی میں حیثیت اس کی سابق زندگی کے کرموں سے متعین ہوتی ہے۔ کرما کو غالباً سماج کے مختلف افراد کے درمیان ناہمواری اور عدم مساوات کی توجیہ کیلئے استعمال کیا جاتا ہے اور یہ اس امر کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ ایک اخلاقی عمل سے پیدا ہونے والی توانائی فنا نہیں ہوتی بلکہ یہ فرد کے اگلے جنم میں منتقل ہو کر اس کی سماجی حیثیت، مزاج، طبع اور کردار کا تعین کرتی ہے۔ بعض پیشے اور منصب بعض خاص کرموں سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ برہمن پروہت کا کرما قربانی، سپاہی کا جنگ، کسان کا کھیتی باڑی اور نوکر کا کرما خدمت خیال کیا جاتا ہے۔

اس نظریے میں یہ عقیدہ مضمر ہے کہ آتما (روح)، خواہ یہ آدمی کی ہو، کسی جانور کی یا دیوتا کی، بغیر کسی ابتداء کے ہمیشہ سے موجود ہے جو مختلف تجربات سے گزرتی رہتی ہے اور مختلف افعال سرانجام دیتی رہتی ہے۔ کسی بھی ایسے شخص کا کیا ہوا کوئی عمل کہ جو کرما کے عقیدے کو جانتا ہے اور اس عمل کو ایک بے لاگ اور بے غرض انداز سے انجام دیتا ہے، ایسے اثرات پیدا کرتا ہے جو اس شخص کی ذات کے ساتھ رہتے ہیں۔ جب آتما مرتی ہے تو یہ کچھ عرصے کیلئے جنت یا دوزخ میں قیام کرتی ہے تو پچھلے جنم کے کرموں کے پیدہ کردہ اثرات عمل میں آجاتے ہیں۔ پہلا پہلو پیدائش

کا ہے کہ مرنے والا فرد آئندہ زندگی میں انسان کی شکل میں پیدا ہوگا، حیوان کی شکل میں یا کہ دیوتا کے روپ میں۔ دوسرا پہلو عمر کا ہے کہ آئندہ جنم میں اس کی عمر کتنی ہوگی اور تیسری شے وہ تجربات ہیں جن میں سے یہ فرد آئندہ جنم میں گزرے گا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی فرد پچھلے کرموں کے مطابق نئی زندگی اور نئی صورت اختیار کر لیتا ہے تو پھر یہ پچھلے کرم کہاں جاتے ہیں؟ ہندو کہتے ہیں کہ پیدائش نو کے اس عمل کے مکمل ہونے پر یہ پرانے کرم مکمل طور پر جل جاتے ہیں اور جوں جوں آتما نیا جنم اختیار کر کے نئے کرم پیدا کرتی ہے، ان نئے کرموں کے اثرات بتدریج پرانے کرموں کی جگہ لیتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی بھی فرد اپنی زندگی کے دوران اپنا مرتبہ یا حیثیت تبدیل نہیں کر سکتا۔ اپنی حیثیت بہتر بنانے کیلئے اسے موت کے مرحلے سے گزر کر نیا جنم اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی فرد ہر جنم میں نیک عمل کرتا چلا جاتا ہے تو وہ سلسلہ در سلسلہ مختلف زندگیوں سے گزر کر خود کو کامل سے کامل تر بناتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ اسے خود برہما دیوتا کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے اور وہ جنم مرن اور پھر جنم کے چکر سے آزاد ہو جاتا ہے۔ یا پھر دوسری صورت میں وہ خود کو اس قدر پستی میں گراتا چلا جاتا ہے کہ وہ کسی جانور کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔

بدھ مت اور جین مت میں بھی یہ فلسفہ موجود ہے لیکن بدھی اس کی تعبیر علت و معلول کے ایک عمل کے طور پر کرتے ہیں جبکہ جین مت کے پیرو کرما کو ایک ایسے مادے کے طور پر بھی دیکھتے ہیں جو کہ زندگی و موت کے چکر کو تخلیق کرتا ہے۔

کنفیوشس، حکیم (551-479ق م)

چینی مفکر اور معلم۔ کنفیوشس جس علاقے میں پیدا ہوا وہ آجکل صوبہ شاندونگ میں واقع ہے اور اس کا تعلق نام نہاد عہد بہار و خزاں کے آخری حصہ سے تھا جو بہت زیادہ سیاسی بے چینی اور بدامنی کا دور تھا۔ متحارب چینی ریاستوں کے درمیان بپا رہنے والے مسلسل جنگ و جدل سے بددل ہو کر کنفیوشس نے ایک اپنا سیاسی فلسفہ تشکیل دیا اور پھر اسے اپنے تین ہزار شاگردوں اور بہتر حواریوں تک پہنچایا۔ تاہم وہ اپنی زندگی میں زیادہ شہرت حاصل نہ کر سکا۔ اس کے فلسفے کو چینی معاشرے میں مروج کرنے میں زیادہ ہاتھ اس کے چیلوں خصوصاً مینگزے کا ہے۔ کنفیوشس سماجی رویے کے مروجہ معیارات کی شکست و ریخت سے بہت پریشان تھا۔ اس نے جین ..... محبت، انسانیت اور اچھائی ..... کے تصور پر زور دیا جسے وہ انسان کا سب سے اعلیٰ اخلاقی وصف قرار دیتا ہے۔ ان خواص کے حامل شخص کو اس نے جُنزی (باصفا مرد کامل) کا نام دیا جو لی (صحیح رسوماتی آداب) پر عمل کرتا ہے اور اپنی اس حقیقی فطرت (جونگ) سے وفادار رہتا ہے جو اسے اوپر سے

http://muftbooks.blogspot.com/

ودیعت ہوتی ہے۔اس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے سے کم دانا افراد کی رہنمائی کرے اور اپنے عائلی فرائض (شیاؤ) کی بجا آوری کرے۔کنفیوشس کا اعتقاد تھا کہ اگر کسی قوم کا حکمران ان مرقومہ بالا اصولوں پر چلتا ہے تو اس کی مثال اس کی رعایا کے لوگوں میں بھی نیک زندگی بسر کرنے کا جذبہ پیدا کرے گی اور اس طرح کا عمل قانون وسزا کے نظاموں سے کہیں زیادہ موثر ثابت ہوسکتا ہے۔ اصلاح،اس کا کہنا تھا،حکمرانوں سے شروع ہونی چاہیے۔

اس کی تعلیمات آئندہ نسلوں تک اس کے مجموعہ اقوال کے ذریعے پہنچیں جسے اس کے چیلوں نے مرتب کیا تھا۔اس مجموعہ اقوال کے علاوہ کنفیوشس مت کی دیگر بڑی مستندات چُن چیو (بہاروخزاں)، داکشیو (اعلیٰ علم)، جونگ یونگ (وسطی راستے کا اصول)، لیجی (مجموعہ ہائے رسوم) اور یی جنگ (کتاب تغیرات) ہیں۔

کنفیوشس مت

چینی عقائد کا نظام۔کنفیوشس مت کیفیوشس (551-479 ق م) کا بنایا ہوا ضابطۂ حیات ہے اور اس نے 2000 برس سے زائد عرصے تک چینیوں کی زندگیوں کو متاثر کیا ہے۔ مغربی مفکرین اسے ایک مذہب بھی گردانتے ہیں اور فلسفہ بھی۔کنفیوشس مت اخلاقی اصول دیتا ہے اور یہ چینی فکر کا مخزن بھی تصور کیا جاتا ہے۔

کنفیوشس کا زمانہ چین میں بڑی بے چینی اور بدامنی کا زمانہ تھا اور اس نے خود کو معاشرے کو دوبارہ استحکام دینے کی خاطر فکر وعمل کے ضوابط وضع کرنے کے لیے وقف کر دیا تھا۔وہ قدیم بادشاہوں کے راستے پر چلنے کی تلقین کرتا تھا اور خود کو ان کی تعلیمات کا صرف ایک پیامبر قرار دیتا تھا۔کنفیوشس کا عقیدہ تھا کہ ہر انسان کے اندر کمال حاصل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے لیکن ہماری زندگی اس امکان کو فنا کر دیتی ہے۔دین یعنی نیکی کا تصور کنفیوشس مت کے ایک لازمی جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔یہ تصور اس قدر لازمی ہے کہ کنفیوشس مت کے پیرو اس کی حفاظت کو اپنی زندگی کی حفاظت سے زیادہ اہم تصور کرتے تھے۔دین کا مطلب اپنی فطرت (جونگ)، اصول زریں (شو)، شائستگی (ی)، خاندانی وفاشعاری (شیاؤ) اور سماجی رسوم (لی) کا مکمل طور پر خیال رکھنا تھا۔ان خواص کے حامل شخص کو ایک مثالی اور کامل شخص (جنزی) کہا جاتا تھا اور وہ حکمرانی کے منصب کے لیے موزوں خیال کیا جاتا تھا۔کنفیوشس کے فلسفے کو اس کے شاگردوں نے ایک کتاب کی صورت میں جمع کیا۔کنفیوشس سے منسوب مشہور ترین مقولوں میں سے ایک وہ ہے جس میں وہ علم کی تعریف کرتا ہے ''اگر آپ کسی شے کو جانتے ہیں تو کہیں کہ آپ اسے جانتے ہیں،

http://muftbooks.blogspot.com/

اگر آپ کسی شئے کو نہیں جانتے تو مانیں کہ آپ اسے نہیں جانتے۔ اسے کہتے ہیں علم''۔ اس کتاب میں کنفیوشس کا حکومت کے بارے میں بیان بھی شامل ہے جو ایک ایسے سیاسی آئیڈیل سے ماخوذ ہے جس کے مطابق وزیر اپنے کردار اور صلاحیت کی بنا پر منتخب کیے جاتے ہیں نہ کہ اپنے سماجی مقام کی بنا پر۔ اگرچہ کنفیوشس نے مذہب کی بات بھی کی لیکن اس نے خود کو خدا کے پیغمبر کے طور پر پیش نہیں کیا۔ اس نے جنت کے تصور کا بھی ذکر کیا لیکن اپنے عقائد کو کسی باقاعدہ مذہب سے منسوب نہیں کیا۔

کنفیوشس کے دور میں بعض دوسرے اہم مکاتیب فکر بھی تھے جن کی اپنی تعلیمات تھیں۔ کنفیوشس مت کو سرکاری حیثیت ہان عہد (206 ق م۔220ء) میں آ کر ملی۔ کنفیوشس مت نے چینی معاشرے میں اس قدر اہم مقام حاصل کر لیا کہ اس کے مفصل علم کو بیسویں صدی کے شروع میں جنگ خاندان کے زوال تک چینی سول سروس کے امتحان میں مرکزی کی حیثیت حاصل رہی۔

مینگرے نے (اندازاً 371۔289 ق م) جسے کنفیوشس مت کا ''دانائے ثانی'' کہا جاتا ہے، کنفیوشس کے اصولوں کو مزید نشوونما دی۔ اس کا کہنا تھا کہ کاملیت کے ساتھ ساتھ انسانوں کو خدا نے خلقی طور پر اچھی فطرت سے بھی نوازا ہے اور اس فطری اچھائی کی اعلیٰ ترین مثالیں کنفیوشس کے مسلک کے وہ بزرگ ہیں جو ''شاہی راہ'' (وانگ تاؤ) کو جہالت اور بدکاری سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اس نے دین کے تصور پر مبنی اور ظلم پر مبنی حکومتوں کے درمیان خط امتیاز بھی کھینچا اور مؤخر الذکر حکومت کے خلاف رعایا کے حق بغاوت کی حمایت کی۔ اس نے دلیل پیش کی کہ اگر فطرت انسانی خلقاً اچھی ہے تو شر نفس انسانی اور اس کے ''بچوں جیسے دل'' کے لیے ایک پھٹکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاہم شُنزی (اندازاً 298۔230 ق م) نے آ کے موزے کے عقائد کا بطلان کیا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان خلقی طور پر اچھا نہیں ہوتا بلکہ اسے اچھائی بذریعہ تربیت سکھانی پڑتی ہے۔

روایتی کنفیوشس مت نے چینی ثقافت پر اپنی نظریاتی گرفت ہان عہد کے زوال (220ء) سے لے کر سونگ عہد کے قیام (960ء) تک برقرار رکھی۔ تاہم تیسری اور آٹھویں صدی عیسوی کے درمیانی عرصے میں بدھ مت اور تاؤ مت کی مقبولیت میں اضافہ ہو گیا۔ آئی چنگ جیسی متصوفانہ روایات کا آغاز یا پھر یہ کہیں کہ احیاء ہوا اور فلسفیانہ فکر نے اپنا رخ تاؤ جیسے ازلی اصول کے تصورات کی طرف کر لیا اور روایتی اخلاقیات کا جواز مابعد الطبیعاتی عوامل کے ذریعے پیش کرنا

http://muftbooks.blogspot.com/

شروع کر دیا۔ ''جدید کنفیوشس مت'' نے کنفیوشسی فکر کا غلبہ بحال کرنے کی کوشش کی لیکن اس دور کے کنفیوشس مت میں بوجودان نئے عقیدوں کی اعلانیہ مخالفت کے بدھ مت اور تاؤ مت کے متعدد عناصر شامل ہو چکے تھے۔

جدید دور میں چین کے مغربی دنیا کے ساتھ بڑھتے ہوئے تعلق کے سبب روایتی چینی فکر اور طرز زندگی میں بھی کئی تغیرات مشاہدے میں آئے۔ 1905ء میں سرکاری سطح پر منعقد کیے جانے والے امتحانات ختم کر دیے گئے اور 1911ء میں جمہوری دور کے آغاز سے کنفیوشس مت وہ سرکاری سرپرستی ہی کھو بیٹھا جو اسے ہان عہد سے میسر چلی آتی تھی۔ عوامی جمہوریہ چین کے نئے حکمران کئی بار کنفیوشس اقدار کو برا بھلا کہتے بھی سنے گئے اور گو ان اقدار کی چینی معاشرے میں جڑیں اب بھی بہت گہری ہیں، یہ فلسفہ ایک رسمی مکتبہ فکر کے اعتبار سے اب ناپید ہو چکا ہے۔

کنکوستادور

ہسپانوی زبان کے اس لفظ کا مطلب فاتح ہے اور اس سے مراد جنوبی امریکہ اور جزائر غرب الہند میں ہسپانوی فتوحات کے سالار ہیں۔ ان فاتحین کو ہسپانوی دربار کی طرف سے یہ اختیار ودیعت کیا جاتا تھا کہ وہ انڈین باشندوں کی سرکوبی کریں انھیں عیسائی بنائیں، نئی آبادیاں قائم کریں اور ان پر حکومت کریں۔ تاہم ان افراد کو حکمرانی سے زیادہ دل چسپی سونے کی تلاش اور تہذیبوں کی تسخیر سے تھی اور ان کی جگہ جلد ہی ہسپانوی منتظمین اور آبادکاروں نے لے لی۔ اس ''نئی دنیا'' میں بڑی انڈین آبادیوں کی تسخیر میں پچاس سال کا عرصہ صرف ہوا۔ ایزٹیک باشندوں کو 1521ء میں ہرمن کورٹینز نے شکست دی۔ مایا کو 1525ء میں ڈیگوڈی الماگرو نے، انکازکو 1535ء میں فرانسسکو پزارو نے اور چبچازکو 1538ء میں گونزالو جمیز ڈی کیساڈا نے تسخیر کیا۔

کونکوستادور اپنی بہادری، عزم، حرص اور بے رحمی کے لیے مشہور تھے۔ ان کے عسکری کارناموں کی تاریخ میں مثال ملنا مشکل ہے۔ کورٹینز نے ایزٹیک دارالحکومت پر صرف 1300 سپاہیوں کی مدد سے قبضہ کیا۔ پزارو نے اپنی جنگی مہم 168 افراد کی معیت میں شروع کی۔ گو جب اس نے انجام کار کامیابی حاصل کی تو اس کے لشکر کی تعداد 1200 تک پہنچ چکی تھی۔ کیساڈا نے چبچازکو 166 ہسپانوی سپاہیوں کی مدد سے فتح کیا اور الماگرو کے ساتھ فقط 420 کی نفری تھی۔ کونکو ستادوروں کی فقید المثال کامیابیوں کی وجوہات مختلف ہیں جن میں انڈین قبائل کا تعاون، اعلیٰ عسکری ٹیکنالوجی، گھوڑے کا استعمال جس سے انڈین باشندے ڈر جاتے تھے، اور ان کی انڈین حکایات اور ان کی داخلی خلفشار سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت تھی۔ مثلاً کورٹینز کو انڈین باشندوں

http://muftbooks.blogspot.com/

نے غلطی سے سفید بالوں والا وہ دیوتا سمجھ لیا جس نے سمندر سے لوٹنے کا وعدہ کیا تھا اور پزارو نے اس خانہ جنگی کا فائدہ اٹھایا جس نے انکا سلطنت کو کمزور کر دیا تھا۔ کونکوستادوروں نے بیس ملین سے زائد انڈین پکڑے اور وسیع وعریض علاقوں کو فتح کیا جن پر ہسپانوی لوگوں نے آبادکاری کی اور جنھیں وہ آئندہ تین سو برس تک لوٹتے رہے۔ مقامی انڈین باشندوں کی تعداد 1500ء میں بیس سے پچیس ملین کے لگ بھگ تھی جو 1600ء میں مشقت کی زیادتی، بیماری، قتل وغارت، غذائی قلت اور ان کی اکھاڑ پچھاڑ کی وجہ سے آدھی باقی رہ گئی تھی۔

کنعانی

بلادشام میں آباد ایک قدیمی قبیلہ۔ کنعانی تین ہزار یہ قبل مسیح سے چوتھی صدی قبل میں یونانی عہد کے آغاز تک اس خطے میں آباد تھے جہاں آج کل جدید اسرائیل، اردن اور شام کی ریاستیں ہیں۔ محققین کے درمیان کنعانیوں کی اس خطے میں آمد کے زمانے کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ بہ اعتبار نسل سامی تھے اور جزیرہ عرب اور خلیج فارس کے علاقے سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ بہت سے محققین اس نقل مکانی کی بہ جانب شمال پہلی رو کے ڈانڈے کوئی 2350 ق م کے لگ بھگ میسوپوٹیمیا کے خطے میں اکادیوں کے عروج سے جوڑتے ہیں۔ اکادی میسوپوٹیمیا کی ایک قدیم سامی زبان کا نام تھا۔ اس کے علاوہ 2000 ق م سے قبل میسوپوٹیمیا کے خطے میں آباد باشندوں کو بھی اکادی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ ان تاریخوں کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے، مکتوبات امرنہ اور دیگر قدیم دستاویزات کی دریافت سے یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ اس خطے اور اس میں آباد لوگوں کو چودھویں صدی قبل مسیح تک اکادی زبان میں ''کناہو'' یا ''کنانو'' کہا جانے لگا تھا۔

انیسویں صدی سے قبل تک بائبل کی مانند معدودے چند ذرائع ہی ایسے تھے جن سے کنعانیوں کے بارے میں کوئی معلومات اخذ کی جاسکتی تھیں۔ تاہم اب اس بات کو تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ عہد نامہ عتیق میں کنعانیوں کے عبرانی تذکرے متنازعہ فیہ ہیں لہٰذا ان پر اکتفا یا بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ کنعانی ثقافت کے بارے میں اس سے زیادہ مکمل اور قابل اعتماد وہ قدیم تحاریر خصوصاً تحاریر کا وہ مجموعہ ہے جنھیں الہامی صحائف پر محمول کیا جاتا ہے۔ یا پھر مکتوبات امرنہ یعنی فراعنہ مصر ایمنو منس سوم (اقتدار 53-1390 ق م) اور چہارم (دور حکومت 36-1353 ق م) کے درمیان ہونے والی وہ سفارتی خط وکتابت ہے جس کے شواہد موجودہ مصری دارالحکومت قاہرہ کے جنوب میں واقع ایک مقام تل الامرنہ سے دریافت ہوئے اور یا پھر راس الشمرۃ (قدیم

http://muftbooks.blogspot.com/

اگارت) اور راس ابن ہانی (یہ دونوں موجودہ ریاست شام میں ہیں) سے ملنے والے آثار ہیں۔ ان تینوں ذرائع میں سے اگارت سے ملنے والے شواہد کو سب سے زیادہ اہم تصور کیا جاتا ہے کیونکہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قدیمی شہر کے میسوپوٹیمیا، ایجیا اور مصر میں بسنے والے دیگر بہت سی نسلوں کے لوگوں سے بھی تعلقات تھے۔

عہد نامہ عتیق میں اہل کنعان کا ذکر بار بار آیا ہے اور ان کے مذہب، خصوصاً ان کی شہوانی رسوم اور بعل دیوتا کی پرستش کا تذکرہ بالخصوص کیا گیا ہے۔ اہل کنعان کو اس سے بھی زیادہ اہمیت اس بات کی وجہ سے حاصل ہے کہ وہ انسانی تاریخ کی ایک اہم ترین پیش رفت یعنی حروف ابجد کی ایجاد کا موجب بنے۔ کنعانی ابجد جو دوسرے ہزاریہ قبل مسیح کے وسط میں منظر عام پر آئی، اس فنیقی رسم الخط کا ماخذ ہے جس نے بعد ازاں یونانی اور لاطینی ابجد کی تشکیل میں ایک بہت اہم کردار ادا کیا۔

کمونو

جاپان کا ایک روایتی لبادہ۔ کمونو چوڑے مستطیلی بازوؤں پر مشتمل ایک لمبے چوغے کی طرز کا ہوتا ہے جسے مرد اور عورت دونوں استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ کپڑے کی تقریباً یکساں آٹھ عمودی پٹیوں کو آپس میں سی کر تیار کیا جاتا ہے جسے ایک آرائشی پٹی کی مدد سے باندھا جاتا ہے جسے اوبی کہتے ہیں۔ اس کیلئے استعمال ہونے والے کپڑے کو نور باف اور رنگریز طرح طرح کے نقش و نگار اور پھول بوٹوں سے مزین کرتے ہیں۔ مرد جو کمونو روایتاً استعمال کرتے ہیں وہ سیاہ ریشم سے بنتا ہے جس پر سفید رنگ میں خاندانی طرہ سجا ہوتا ہے اس کے اوپر ایک جیکٹ (ہاؤری) اور نیچے بہت سے پلیٹوں والا پاجامہ یا سکرٹ (یا کاما) پہنی جاتی ہے۔ زنانہ کمونو موقع کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ شادی کے موقع پر پہنا جانے والا کمونو ایک انتہائی سجے سنورے بیرونی چوغے اور دو داخلی سفید چوغوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ دوسرے مواقع پر بھی اسی طرح اس سے تھوڑا کم یا زیادہ سجا بنا کمونو پہنا جاتا ہے۔ چوغے کی تہیں جمانے اور اوبی باندھنے کے روایتی طریقے پہلے ماں سے بیٹی تک سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے تھے لیکن اب بعض خواتین کمونو پہننے کے صحیح طریقے کی تعلیم کیلئے باقاعدہ درس بھی لیتی ہیں۔ جاپان میں میجی دور (1868ء۔1912ء) سے مغربی لباس بہت رواج پا چکے ہیں اور اب کمونو صرف خاص خاص موقعوں پر ہی زیب تن کیا جاتا ہے۔

کوپرنیکس، نکولاس (1473ء۔1543ء)

http://muftbooks.blogspot.com/

پولینڈ سے تعلق رکھنے والا ایک ماہر فلکیات۔ کوپرنیکس وہ جدید فلکیات دان ہے جس نے سورج کے نظام شمسی کے مرکز میں ہونے کا نظریہ پیش کیا تھا۔ وہ وسطی پولینڈ کے شہر ٹرن میں پیدا ہوا اور کراکو یونیورسٹی سے تحصیل علم کے بعد وہ اٹلی چلا آیا جہاں اس نے طب اور قانون کی تعلیم حاصل کی۔ 1479ء میں یعنی جس برس وہ اٹلی کے لیے روانہ ہوا تھا اسے وارمیہ میں فران برگ کے کیتھیڈرل کا کینسن منتخب کیا گیا جس کی حیثیت شمالی پولینڈ کے diocese کی تھی۔ اس نے 1503ء میں اٹلی سے واپسی پر اس منصب پر کام کرنا شروع کر دیا۔

کوپرنیکس فران برگ فلکیات پر کام کرنے کے جذبے کے ساتھ آیا تھا اور اس نے 1510ء تک اس نے ایک ایسے نظام شمسی کا نقشہ تیار کر لیا تھا جو سیاروں کے محوروں کا تعین زمین کی بجائے سورج کے مقام کے حوالے سے کرتا تھا۔ یہ اس مروجہ نظام شمسی سے ایک بالکل الٹ بات تھی جس کا تصور دوسری صدی عیسوی میں مشہور یونانی ماہر فلکیات بطلیموس نے دیا تھا اور جو سیاروں کی گردش کی تشریح زمین کو مرکز مان کر کرتا تھا۔ کوپرنیکس نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے اپنے غیر روایتی نظریات کی زیادہ مشہوری کرنے کی کوشش نہ کی۔ اس 1510ء اور 1514ء کے درمیانی عرصے میں ''کومینٹاریولس'' کا مسودہ اپنے دوستوں کو پڑھانا شروع کیا جس میں اس نظریے کی ابتدائی شکل کا خلاصہ بیان کیا گیا تھا۔ مکمل نظریہ اس نے کہیں 1540ء میں جا کر شائع کیا۔ اسے بھی ہم مکمل نظریہ نہیں بلکہ اس کا محض ابتدائیہ ہی کہہ سکتے ہیں۔ اس نظریے کی مکمل تفصیلات اس کی موت کے دن ایک تحریر کی صورت میں منظر عام پر آئیں جو ''فلکی کرہ جات کی گردشوں کا بیان'' کے نام سے معروف ہے۔

اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ سیاروں کے متعلق معلومات اکٹھی کر کے اپنے نظریے کو تقویت دینے میں بتا دیا۔ اس دور جہد میں اس نے بشپ بننے کا ایک موقع بھی گنوایا کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ اس سے اس کا تحقیقی کام متاثر ہوگا۔ اپنی تحقیق کے تجربی پہلو پر اس قدر زور دینے کے باوجود اس نے اپنا نظریہ اس محتاط طریقے سے پیش کیا کہ اس کی تعمیر سیاروں کی گردش کے محض ایک خوبصورت مفروضاتی ماڈل کے طور پر کی جا سکے۔ اس کی پیش بینی اور علمی جرأت دنیا پر صحیح معانوں میں گلیلیو کی دریافتوں کے بعد جا کر کھلی۔

کوسیک

بحیرہ اسود اور بحیرہ کیپٹن کے شمالی ساحلوں پر آباد بستیوں کا باشندہ۔ کوسیک کا لفظ ترکی ''قزاق'' (مرد آزاد) سے ماخوذ ہے جس سے مراد ایسا شخص ہے جسے اپنے لیے معاشرے میں کوئی

http://muftbooks.blogspot.com/

مناسب جگہ نہ مل سکی اور وہ چراگاہوں میں چلا آیا جہاں اسے کسی قانون یا عقیدے کی پرواہ نہ تھی۔ یورپی کتب میں یہ اصطلاح تیرھویں صدی کے وسط میں نمودار ہوئی۔ پندرھویں صدی کے آخر تک یہ اصطلاح روس اور یوکرائن کے ان کسانوں کے لیے استعمال کی جانے لگی جو پولینڈ، لتھوینیا اور مسکووی میں غلامی سے بھاگ کر ڈینیپر اور ڈان کے علاقوں میں آ گئے جہاں انھوں نے اپنی آزاد و خودمختار عسکری آبادیاں قائم کر لیں۔

سولھویں صدی کے اوائل میں پولینڈ کے بادشاہوں نے اپنے ملک کی سرحدوں کو محفوظ بنانے کے لیے زیپوروزین (یوکرائنی) کوسیک بستیوں کو فوجی نو آبادیوں کی شکل میں منظّم کرنا شروع کر دیا۔ پوری سولھویں صدی اور سترھویں صدی کے اول نصف میں ان آبادیوں نے اپنی سیاسی خودمختاری قائم رکھی اور ایک مختصر عرصے کے لیے بوہدان حمیل نتکی کی حکمرانی میں ایک نیم خودمختار ریاست بھی قائم کی لیکن پولینڈ کے تسلط کے خدشے کے پیش نظر انھوں نے 1654ء میں ایک معاہدے کو قبول کر لیا جس کی رو سے انھوں نے اس شرط کے ساتھ کہ ان کی خودمختاری کا احترام کیا جائے گا، روسی حاکمیت کو تسلیم کر لیا۔ روسیوں نے بھی انھیں پہلے تو اپنی سرحد کے محافظوں کے طور پر اور بعد میں روسی سلطنت کی سائبیریا اور مشرق بعید میں توسیع کے لیے ہراول فوج کے طور پر استعمال کیا۔ اگرچہ پہلے انھیں پولینڈ کے مقابلے میں روس کے تحت زیادہ آزادی میسر تھی، روس نے جلد ہی ان پر تسلط جمانا شروع کر دیا۔

جب کوسیک باشندوں کو اپنے حقوق خطرے میں پڑتے نظر آئے تو انھوں نے سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں سٹینکا رازن، کوندراتی بلاون اور ایمیلیان یگاچوف جیسے مشہور رہنماؤں کی سرکردگی میں علم بغاوت بلند کر دیا۔ تاہم انھیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ زیپوروزین کوسیک اٹھارہویں صدی کے اواخر میں اپنی آزادی مکمل طور پر کھو بیٹھے جبکہ دوسرے گروہ بہت محدود سے پیمانے کی خودمختاری باقی رکھ سکے۔ انیسویں صدی اور بیسیوں صدی کے اوائل میں روسی حکومت نے انقلابی سرگرمیاں کچلنے کے لیے کوسیک باشندوں کو بہت زیادہ استعمال کیا۔ 20-1918ء کی روسی خانہ جنگی کے دوران کوسیک باشندے منقسم ہو گئے اور ان میں سے بہت سے باہر چلے گئے۔ سوویت حکومت کے تحت خصوصاً 1929ء کی جبری اجتماعیت کے بعد کوسیک آبادیوں سے انتظامی وحدتوں کا منصب چھن گیا۔

کوکا

زیادہ تر دو سو میٹر سے زائد کی بلندی پر واقع اینڈین علاقوں میں پایا جانے والا ایک پودا۔

اس کے پتے کوکین بنانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان کے طبی وتحریکی اثرات انکا سلطنت کے قیام سے قبل معلوم ہوئے۔ شروع میں ان کی کاشت بہت چھوٹے پیمانے پر کی جاتی تھی۔ انکا دور میں اس کا استعمال صرف شرفا تک ہی محدود تھا یا پھر اس کے پتے سپاہیوں اور کوئی نمایاں خدمات سرانجام دینے والے افراد کو انعام کے طور پر دیے جاتے تھے۔ قربانیوں میں اسے آباء کی ارواح سے بچنے اور سفر میں حفاظت کے لیے بطور نذر بھی دیا جاتا تھا۔ 1532ء میں سپین نے جب ان علاقوں کو فتح کیا تو اہل سپین کی کوکا کے بارے میں رائے ایک طرح کی نہ تھی۔ بعض سپین والوں کے تحفظات کے باوجود اکثر وبیشتر کوکا انڈین کارکنوں کو ان کی کام کی استعداد بڑھانے کے لیے دیا جاتا تھا۔ بعض علاقوں میں بھوک اور تھکن کم کرنے کے لیے کوکا کے پتوں کو چبانے یا چوسنے کا رواج آج بھی موجود ہے۔ اسے مذہبی اور جادوئی رسومات میں بھی استعمال کیا جاتا ہے اور اینڈین اسے پیشین گوئی کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ کوکا کے پتے استعمال کرنے والے اکثر انڈین اسے بہت محتاط طریقے سے صرف کرتے ہیں۔

کولمبس

اطالوی سیاح۔ کولمبس کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ وہ پہلا یورپی شخص تھا جو امریکہ کے مقامی باشندوں سے ملا جنھیں وہ غلطی سے ''انڈین'' سمجھتا رہا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ مغرب کی طرف سفر کر کے مشرقی ایشیا پہنچنے کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہے۔

کولمبس کو اس کی مہمات کے لیے پیسہ 1492ء میں سپین کے بادشاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازابیلا نے دیا اور اسے اپنا مشن پورا کرنے کے لیے تین بحری جہاز نینا، پنٹا اور سانتا ماریا فراہم کیے گئے۔ اس نے اپنا پہلا سفر 3 اگست کو شروع کیا اور 12 اکتوبر کو اس نے اس علاقے کا ساحل دیکھا جسے آج کل ہم جزائر عرب الہند کہتے ہیں۔ اس کا دوسرا سفر (96-1493ء) زیادہ دشوار ثابت ہوا۔ اسی سفر کے دوران ''نئی دنیا'' میں پہلے یورپی شہر ازابیلا کی بنیاد رکھی گئی۔ وہ جنوبی امریکہ اپنے تیسرے سفر (1498ء-1500ء) میں پہنچا لیکن اس کی ناکام انتظامی کارکردگی کی بنا پر اسے وائسرائے آف انڈیز کے عہدے سے استعفیٰ دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کے باوجود اس نے 1502ء سے 1504ء کے درمیانی عرصے میں اپنا آخری مشن بھی مکمل کر لیا۔ اس آخری مشن کے دوران کولمبس بیمار پڑ گیا اور پھر اس کی صحت مکمل طور پر کبھی بھی بحال نہ ہو سکی اور اس کے دو برس بعد وہ انتقال کر گیا۔ اسے سپین کے شہر اشبیلیہ میں دفن کیا گیا۔ 1542ء میں اس کی باقیات نکال کر ہسپانیولہ کے کیتھیڈرل آف سانتو ڈومنگو میں رکھ دی گئیں۔

''امریکہ کی دریافت'' کا سہرا کولمبس کے سر باندھا جاتا ہے اور گورے اسے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن موجودہ دور میں اس کی شخصیت بہت متنازعہ ہوگئی ہے۔ امریکی انڈین گروپ اور کئی تاریخ دان اسے امریکہ میں یورپی نوآبادیت اور انڈین باشندوں کے استحصال کا بانی کہہ کر اس کی مذمت کرتے ہیں۔

کونریڈ، جوزف (1857ء۔1924ء)

پولینڈ میں پیدا ہونے والا انگریزی ناول نگار۔ اس کی پیدائش کے وقت اس کا نام Teodor Josef Konrad Nalecz Korzeniowski رکھا گیا تھا۔ کونریڈ نے تحریر کے لیے صرف انگریزی زبان استعمال کی۔ اگرچہ وہ اپنی زندگی میں زیادہ تر سمندری مہمات سے متعلقہ کہانیوں کی وجہ سے مشہور ہوا، بعد میں اس کے ناولوں کی اخلاقی پیچیدگی نقادوں کی توجہ کا مرکز بن گئی جن میں انسانی بدطینتی اور خیر و شر کی داخلی کشمکش کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس کا شمار انگریزی میں لکھنے والے عظیم ترین ادیبوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک وجودی ادیب تھا جس کی نظر انسانی صورت حاصل پر بہت گہری تھی۔

کونریڈ کا پولینڈ سے انگلینڈ تک کا سفر بہت طویل اور صبر آزما تھا۔ وہ پولینڈ کے ایک قوم پرست گھرانے میں پیدا ہوا۔ چار برس کی عمر میں اس نے اپنے والدین کے ہمراہ شمالی روس کا سفر کیا جہاں اس کے والد کی ایک پولش بغاوت میں شرکت کی وجہ سے انھیں ملک بدر کر دیا گیا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد اس کی والدہ کا تپ دق سے انتقال ہوگیا اور کونریڈ اپنے باپ کے ساتھ تنہا زندگی بسر کرنے لگا اور شیکسپیئر کے تراجم پڑھ پڑھ کر انگریزی کی شدھ بدھ حاصل کرنے لگا۔ 1869ء میں کونریڈ کا باپ بھی تپ دق کے ہاتھوں چل بسا اور وہ کراکو میں اپنے ایک چچا کی نگہداشت میں آ گیا۔ کونونریڈ کے دل میں بس ایک ہی لگن تھی کہ وہ سمندری جہاز میں بیٹھ کر ساری دنیا کی سیر کرے۔ آخر اس کی امید 1874ء میں اس وقت بر آئی جب وہ فرانسیسی تجارتی جہازوں کے ہمراہ سفر کے لیے مارسے سے روانہ ہوا۔ تاہم اس کی زندگی کا یہ دور کوئی زیادہ خوشگوار ثابت نہ ہوا۔ وہ بار بار کے قرضوں کے بوجھ تلے دبا رہا اور ایک مرتبہ تو اس نے خود کو ختم کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ ان بحری سفروں کی بدولت کونریڈ کو جنوبی امریکہ اور مشرق بعید کی سیاحت کا موقع ملا جس نے اسے اس کے ناولوں اور افسانوں کے لیے مواد فراہم کیا۔ وہ 1878ء میں برطانیہ کی مرچنٹ نیوی میں شامل ہوا اور باوجود اس کے کہ اسے بہت کم انگریزی بولنا آتی تھی وہ کیپٹن کے عہدے تک ترقی کر گیا۔ 1889ء میں اس کے بچپن کا ایک خواب پورا ہوا اور اسے ایک مہم پر افریقہ کے

http://muftbooks.blogspot.com/

دریائے کانگو کے سفر کا موقع مل گیا۔اس نے کانگو میں مجموعی طور پر چار ماہ گزارے۔ یہ ایک انتہائی دشوار اور جان لیوا سفر تھا جس کی روداد اس نے اپنے شہرہ آفاق ناول ''قلب تاریکی'' (1902ء) میں لکھی ہے۔اس سفر کے دوران اسے میعادی بخار اور نقرس کے امراض نے بھی آن لیا جو بقیہ تمام عمر اس کے پیچھے لگے رہے۔

اس نے کانگو کی سیاحت کے چند برس بعد اپنے بحری سفر بند کر دیے اور 1895ء میں اپنا پہلا ناول Almayer's Folly کے نام سے شائع کیا۔اس دوران اس نے انگلینڈ میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا، ایک خاتون جیسی جارج سے شادی کر لی اور دو بیٹوں کا باپ بنا۔اگرچہ اس کے بلند پایہ ناولوں اور افسانوں مثلاً لارڈ جم (1900ء)۔''ہارٹ آف ڈارک نیس'' (1902ء)''نوسٹرومو'' (1904ء)،سیکرٹ ایجنٹ''(1907ء) اور انڈر ویسٹرن آئیز نے بہت مقبولیت حاصل کی۔کونریڈ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تنگدستی میں گزارا۔اسے مالی تحفظ تب کہیں جا کر حاصل ہوا جب 1910ء میں اسے سول لسٹ پینشن ملی اور ایک امریکی قدردان جان کون نے اس کی نگارشات خریدنا شروع کیں۔بہت سے ناول لکھنے کے علاوہ کونریڈ نے آئینۂ بحر (1906ء) اور'' کچھ یادیں'' (1912ء) کے نام سے دو آپ بیتیاں بھی شائع کیں۔مؤخر الذکر کا نام بعد میں بدل کر''ایک ذاتی سرگزشت'' رکھ دیا گیا۔اس نے 1924ء میں برطانوی مدبر رمزے میکڈونلڈ کی طرف سے سر کے خطاب کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اس نے اس دنیا سے بھی منہ موڑ لیا۔

کیرکگارڈ، سیرن (1813ء۔1855ء)

ڈنمارک کے ایک معروف مذہبی فلاسفر۔وہ کوپن ہیگن میں پیدا ہوئے۔ان کے والد پہلے تو ایک غریب کسان تھے لیکن پھر ترقی کر کے ایک کامیاب تاجر بن گئے اور سیرن کی پرورش ناز و نعم میں ہونے لگی۔سیرن کے ابا جو کہ لوتھر کے مقلد تھے، نے ان کی ذہنی نشو و نما پر بہت اثر ڈالا۔وہ جب کسان تھا تو اپنی مفلسی سے اُکتا کر رب کو برا بھلا کہا کرتا تھا۔وقت گزرنے کے ساتھ اس کے دن تو پھر گئے لیکن رب کو وہ پھر بھی برا بھلا کہتا رہا خصوصاً جب بچپن میں سیرن کی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی اور اس کے پانچ بہن بھائی بھی لقمہ اجل بن گئے۔فلسفی بن کر سیرن نے ٹھانی کہ کیوں نہ اس رب کے بارے میں ہی جانچ پڑتال شروع کی جائے جسے ابا اس قدر کوستا رہتا ہے۔

کیرکگارڈ نے اول تو یونیورسٹی آف کوپن ہیگن سے فلسفے کی تعلیم حاصل کی لیکن پھر 1838ء میں والد کی وفات کے بعد حیاتیات پڑھنے لگے۔ان کے والد کی وفات کے بعد ایک لڑکی ریگائن

http://muftbooks.blogspot.com/

اولسن نے انہیں بہت دلاسہ دیا اور پھر کیرکگارڈ کو اس لڑکی سے عشق ہو گیا۔ عشق تو ہو گیا لیکن جب انہیں ریگائن کی عمر اور اس کی سادہ لوحی کا احساس ہوا تو ان کا دل بھر گیا اور وہ منگنی توڑنے پر آ گئے۔ منگنی توڑ کر برلن چلے آئے اور وہاں رہ کر لکھنا لکھانا شروع کر دیا۔ انہوں نے اخلاقیات اور جمالیات پر بہت سی تصانیف قلمبند کیں جن میں سے پہلی تصنیف ''یا یہ یا وہ: یک پارہ حیات'' 1843ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ریگائن کیلئے ان کے رمزیہ پیغامات سے بھری ہے جن میں وہ اس سے اپنے معاملے کی وضاحتیں پیش کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ وہ بقیہ تمام عمر اس جتن میں مصروف رہے کہ کسی طرح ریگائن پھر دوست بن کر ان کی طرف لوٹ آئے۔ یا کم از کم وہ اگر ان کی نہیں بنتی تو کسی اور کی بھی نہ بنے۔

کیرکگارڈ اپنی اگلی تحریروں میں ایمان اور قربانی کے موضوع پر سوچ بچار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ 1843ء میں شائع ہونے والی ''خوف اور کپکپی'' اور ''اعادہ'' میں انہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ مذہب داخلی طور پر ایک متناقض شے ہے۔ ان کتب میں انہوں نے یہ امکان پیش کیا ہے کہ مسیحی نظام فکر میں انسانی اختیار کو حصول ایمان کے ایک ضروری عنصر کے طور پر مان لیا جانا چاہیے۔ اپنی اگلی کتاب ''تصور دہشت'' (1844ء) میں کیرکگارڈ نے اندیشے، دہشت (بے شکل، بے لاگ خوف) اور معروضی خوف کے درمیان خط امتیاز کھینچنے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آزادی کی منطقی انداز سے تعریف کرنا ناممکن ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ علم نفسیات میں وہ سکت نہیں کہ وہ آزادی کی مکمل تعریف کر سکے لیکن اسے کم از کم یہ تو بتانا چاہیے کہ ذہنی آزادی کس طرح ممکن ہے۔ ان کے مطابق آزادی کیلئے موزوں ترین ذہنی کیفیت دہشت کی کیفیت ہے جسے گناہ کی پیش رو کہا جا سکتا ہے یعنی جب کوئی شخص دہشت کا تجربہ کرتا ہے تو وہ معصومیت سے معصیت کی طرف اور پھر معصیت سے کفارے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ کیرکگارڈ نے 1845ء میں ''شارع حیات کے مراحل'' لکھی جس میں انہوں نے مذہب کو صرف جمالیات سے ہی نہیں بلکہ اخلاقیات سے بھی نکھیڑ دیا۔ شروع شروع میں تو جمالیات ان کی توجہ کا مرکز رہا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان کے قلم کا رخ پھر گیا اور انہوں نے جارج ہیگل (1770ء۔1831ء) کے نظریات پر تنقید شروع کر دی۔ ان کا کہنا تھا کہ سچ تک رسائی صرف داخلی طور پر حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ ہیگل کے اس نظریے کی سراسر نفی تھی جس میں وہ کہتا ہے کہ علم کو محض معروضی طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کیرکگارڈ کا موقف تھا کہ ہیگل کے مقالے میں ایمان کی اہمیت کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ کیرکگارڈ ہی جس نے ہیگلیت پر انتقاد کے توسط جدید وجودیت کی بنیادیں استوار کیں۔

http://muftbooks.blogspot.com/

کیرکگارڈ نے عیسائیت کی حمایت نہیں کی اور نہ ہی خود اس کی اپنے بارے میں یہ رائے ہے تاہم وہ اس دین کی صحیح تصویر کشی کو اپنا فرض خیال کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی آخری کتاب ''عیسائیت کی تربیت'' (1850ء) میں خود کو عیسائی کہلانے والے شخص کیلئے بہت بلند اخلاقی معیارات مقرر کئے ہیں۔ قارئین کی ایک کثیر تعداد نے اس تصنیف کو ڈینش چرچ کے سربراہ کیلئے ایکتھیپڑا قرار دیا۔

کیرکگارڈ کی تحریروں پر پہلی عالمی جنگ میں جا کے زیادہ توجہ دی گئی۔ اس سے پہلے تک وہ صرف محدود حلقوں تک ہی محدود رہے۔ ان کے کام کو پذیرائی اس وقت ملی جب وجودی تحریک نے کارل بارتھ اور مارٹن ہائیدیگر جیسے اہم مفکرین کی بدولت زور پکڑا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد کیرکگارڈ کی نگارشات کو نئے قارئین میسر آ گئے۔ جنہیں آزادی اور دکھ پر ان کی گہری تحقیقات پڑھنے کا بہت اشتیاق تھا۔

کینیڈی، جان فٹز جیرلڈ (1917ء-1963ء)

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے پینتیسویں صدر۔ کینیڈی امریکی ریاست میساچوسٹس میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک مشہور سیاسی گھرانے سے تھا۔ کینیڈی کے دادا اور نانا دونوں بوسٹن کے ممتاز سیاستدان تھے اور ان کے ابا جوزف پیٹرک کینیڈی سیکوریٹیز اور ایکسچینج کمیشن کے چیئرمین اور روزویلٹ کے دور (45-1933ء) میں برطانیہ میں امریکی سفیر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ نیز وہ ایک متمول تاجر بھی تھے۔ جان کینیڈی چوایٹ اور ہارورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ وہ ایک متوسط درجے کے طالب علم تھے اور انہوں نے بی ایس کی ڈگری 1940ء میں حاصل کی۔ اس برس برطانیہ میں عسکری تیاری کے فقدان پر ان کا مقالہ ایک بیسٹ سیلر کتاب ''انگلستان کیوں سویا رہا'' کے طور پر مقبول ہوا۔ انہوں نے امریکہ کی دوسری عالمی جنگ میں شمولیت سے دو ماہ قبل بحریہ میں شمولیت اختیار کی اور انہیں 1943ء میں جنوبی بحرالکاہل میں ایک پی ٹی بوٹ کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ جب ان کا سفینہ جاپانی بمباری سے تباہ ہو گیا تو وہ مسلسل کئی دن تک ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے تک تیرتے رہے اور پھر انہیں اور ان کے عملے کو زندہ بچا لیا گیا۔ انہیں ان کی شجاعت کے اعتراف میں پرپل ہارٹ اور نیوی اینڈ میرین کور میڈل سے نوازا گیا، تاہم اس مہم میں انہیں جو زخم لگے وہ انہیں ساری عمر تنگ کرتے رہے۔

کینیڈی نے سیاست میں آنے کا فیصلہ اپنے بڑے بھیا جوزف جونیئر کے انتقال کے بعد کیا۔ انہوں نے 1946ء میں ایوان نمائندگان کیلئے ایک ڈیموکریٹ امیدوار کی حیثیت سے مہم

http://muftbooks.blogspot.com/

چلائی۔ وہ انتخابات میں زبردست کامیابی سے ہمکنار ہوئے اور انتیس برس کی عمر میں انہوں نے اپنا عہدہ سنبھال لیا۔1952ء میں انہوں نے ہیری کیبٹ لاج کو چیلنج کیا اور سینٹ کی نشست حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اگلے ہی برس انہوں نے جیکولین لی بوائیر سے بیاہ کر لیا۔ 1958ء میں انہوں نے ایک بار پھر ریکارڈ فرق سے کامیابی حاصل کی۔ سینیٹر کی حیثیت سے داخلی امور پر کینیڈی کا جھکاؤ بائیں جانب اور خارجی پالیسی پر دائیں طرف رہا۔ انہوں نے سماجی بہبود کے منصوبوں کی بہت حمایت کی لیکن اشتراکیت کی دل کھول کی مخالفت کرتے رہے۔ شہری حقوق کے معاملے میں ان کا رویہ اعتدال پسندانہ رہا۔ تاہم انہوں نے اشتراکیوں کے خلاف سینیٹر جوزف مکارتھی کی مہم کے معاملے میں کوئی واضح موقف اختیار کرنے سے احتراز کیا۔

کینیڈی کو کانگریس میں خاصا اثر و رسوخ حاصل تھا۔ انہوں نے ''شجاعت کی تصویریں'' 1956ء میں اس وقت تحریر کی جب وہ اپنی کمر کی جراحت سے صحت یاب ہو رہے تھے۔ انہیں اس کتاب پر پلٹزر پرائز دیا گیا۔ انہیں ایک سیاستدان کے طور پر قومی سطح پر مقبولیت 1956ء کے ڈیموکریٹک نیشنل کنونشن کے موقع پر ملی جس میں انہوں نے نائب صدر کی نامزدگی کے امیدوار کے طور پر شرکت کی۔ تاہم کنونشن میں کامیابی ان کی بجائے دوسرے امیدوار کو ملی تاہم 1960ء میں کنونشن نے انہیں نامزد کر دیا۔ انتخابات میں ان کے مدمقابل ریپبلکن امیدوار اور اس وقت کے نائب صدر رچرڈ نکسن (1913ء۔1994ء) تھے جو ہر دلعزیز آئزن ہاور انتظامیہ کے وارث تھے۔ ان دنوں سیاسی امیدواروں کے درمیان ٹی وی مناظروں کا رواج پہلی بار شروع ہوا تھا۔ وہ ایک کیتھولک تھے اور نسبتاً نوعمر بھی اور اس دور یا اس سے پہلے کے دور کے امریکی صدور میں یہ باتیں کم ہی دیکھنے کو ملی تھیں لیکن یہ کینیڈی کی طلسماتی شخصیت کا کمال تھا کہ وہ تینتالیس سال کی عمر میں گو تھوڑے سے فرق سے الیکشن جیت گئے۔ ان کے ''نیو فرنٹیئر ایجنڈے'' میں امن دستے، کم از کم اجرت میں اضافے، سماجی تحفظ کی سہولیات میں بڑھوتری، رہائشی اور جاب ٹریننگ بلوں اور خلائی پروگرام میں توسیع کے سمیت متعدد سماجی منصوبے شامل تھے۔

کینیڈی انتظامیہ کی جس اہم پالیسی کو سب سے زیادہ تنقید کا سامنا کرنا پڑا وہ 1961ء کا خلیج پگز بر پرنا کام حملہ تھا جس میں امریکہ نے کیوبی جلاوطنوں کو شہہ دے کر کیوبا کے صدر فیدل کاسترو کا تختہ الٹوانے کی کوشش کی۔ تاہم 1962ء کے کیوبن میزائلی بحران کو کینیڈی کے کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ انہوں نے سوویت سربراہ نکتیا خروشیف (1958ء۔1964ء) کو کیوبا سے میزائل ہٹانے پر مجبور کر دیا تھا۔ انہوں نے 1963ء میں سوویت یونین اور برطانیہ سے نیو

کلیائی ہتھیاروں کے تجربات پر پابندی کے ایک معاہدے پر بھی دستخط کیے۔

جان ایف کینیڈی کو 22 نومبر 1963ء کو ڈلاس، ٹیکساس میں اس وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا جب وہ آئندہ برس منعقد ہونے والے انتخابات کی تیاری میں موٹر کاروں کے ایک جلوس کے ساتھ ملک کے دورے میں مصروف تھے۔ اس قتل کا الزام ایک شخص لی ہاروے اوسوالڈ پر عائد کیا گیا لیکن صرف دو دن بعد جبکہ وہ پولیس کی حراست میں تھا، اسے بھی ڈلاس کی ایک نائٹ کلب کے مالک جیک روبی نے ہلاک کر دیا۔ کینیڈی کے قتل کی تحقیقات کے لئے عدالت عظمیٰ کے ایک جج ارل وارن کی سرگردگی میں ایک کمیشن قائم کیا گیا جس کی رپورٹ کے مطابق یہ افسوسناک واقعہ کسی سازش کا نتیجہ نہیں تھا۔ تاہم اس واردات کے کئی برس بعد تک لوگوں میں اس طرح کی کہانیاں گردش کرتی رہیں کہ فلاں نے سازش کی تھی یا سازش کروائی تھی۔

کیوری، میری (1867ء۔1934ء)

پولینڈ میں پیدا ہونے والی فرانسیسی ماہر طبیعات۔ اسے دو بار نوبل پرائز ملا اور وہ تابکاری پر اپنی تحقیق کی وجہ سے مشہور ہوئی۔ کیوری کی سائنسی تحقیق نے جدید نیوکلیائی فزکس اور کیمسٹری کی نشوونما پر بڑے اہم اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس کا اصل نام مانیہ سکلو ڈوسکا تھا۔ اس کے ماں باپ اس قدر مالی مشکلات کا شکار تھے کہ اسے پہلے ایک معلّمہ اور پھر ایک روسی ادارے سے ثانوی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک آیا کے طور پر ملازمت کرنا پڑی۔ وہ مؤخرالذکر ملازمت سے حاصل ہونے والی آمدنی سے اپنی بہن کو پیرس میں طب کی تعلیم دلواتی رہی۔ بعدازاں کیوری خود بھی پیرس چلی گئی اور وہاں جا کر اس نے سوربون کے معروف طبیعاتی سائنسدانوں کے ایک گروپ میں شمولیت اختیار کر لی۔ 1894ء میں اس کی ملاقات اپنے ہونے والے شوہر، پیئر کیوری سے ہوئی۔ 1895ء میں دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے اور ان کی ایک بھرپور اور ثمر بار شراکت کا آغاز ہو گیا۔ کیوری نے 1898ء میں دھاتی عناصر پولونیم اور ریڈیم دریافت کیے اور اپنے خاوند سے مل کر خود کو خالص ریڈیم الگ کرنے اور تابکاری کے اثرات کا مطالعہ کرنے کے لیے وقف کر دیا۔ اسے کام پر اس 1903ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ پھر اس نے اسی سال پیئر کے ساتھ مل کر رائل سوسائٹی کا ڈیوی میڈل اور فزکس کا نوبل انعام بھی حاصل کیا۔ اس نے اپنی دو بچیوں آئرین (1897ء) اور ایو (1904ء) کی پیدائش کو اپنے تحقیقی کام پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہونے دیا اور 1906ء میں خاوند کی اچانک موت نے تو اس کام کی تکمیل کیے لیے اس کے عزم کو اور بھی مضبوط کر دیا جسے اس نے اور پیئر نے اکٹھے شروع کیا تھا۔ کیوری کو بعدازاں

http://muftbooks.blogspot.com/

سوربون کے لیے پروفیسر منتخب کرلیا گیا اور اس طرح وہ اس عظیم دانشگاہ میں تدریسی فرائض سرانجام دینے والی پہلی خاتون بن گئی۔1911ء میں اسے ایک بار پھر نوبل پرائز دیا گیا۔اس بار اسے یہ عالمی انعام کیمسٹری کے شعبے میں ریڈیم کو کامیابی سے علیحدہ کرنے پر ملا۔1918ء میں ریڈیم انسٹیٹیوٹ بھی مکمل ہوگیا جو اس کی اور اس کی بیٹی آئرین کی کوششوں سے نیوکلیئر فزکس اور کمیسٹری کی تحقیق کے ایک عالمی مرکز کی شکل اختیار کر گیا۔

1922ء میں کیوری کی تقرری اکیڈیمی آف میڈیسن میں کردی گئی جہاں اس نے اپنی تحقیق تابکار مادوں کے طبی استعمالات پر مرکوز کردی۔اس نے دنیا کے مختلف ملکوں میں لیکچر دیے۔اس کے امریکہ میں ایک لیکچر پر امریکی صدر ہارڈنگ نے اس کے تابندہ کارناموں کے اعتراف میں اسے ایک گرام ریڈیم پیش کیا۔بعدازاں کیوری نے اپنے ملک پولینڈ میں بھی ایک ریڈیم انسٹیٹیوٹ قائم کیا۔اس کا انتقال سرطان خون سے ہوا جو اسے تابکاری پر تحقیقی کے دوران لاحق ہوا تھا۔یہ کیوری کے کام کا ہی ثمر تھا کہ بعد میں سر جیمز چیڈوک نیوٹران دریافت کرنے اور آئرین کیوری اور اس کا شوہر فریڈرک جولیٹ مصنوعی تابکاری دریافت کرنے میں کامیاب ہوئے۔

گ

گارسیا لورکا، فیڈریکو (1898ء تا 1936ء)

سپین کا قادالکلام شاعر اور ڈرامہ نگار، لورکا کو سپین کا بیسویں صدی کا ایک بڑا ادیب تسلیم کیا جاتا ہے۔انہوں نے مکعبیت اور سررئیلزم میں تجربے کر کے ہسپانوی ادب میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔

لورکا نے اپنی ابتدائی زندگی سپین کے علاقے اندلسیہ کے مختلف قصبوں میں بسر کی۔انکے والد ایک متمول زمیندار تھے۔انہیں بچپن ہی سے فطری خوبصورتی سے مالا مال ماحول میں زندگی گزارنے کا موقع ملا جس کی چھاپ ان کی نظموں میں بھی نمایاں ہے۔

بعد میں ان کا خاندان اندلسیہ کے مشہور شہر غرناطہ میں منتقل ہوگیا جہاں آکر لوکا کی ادب اور فنون میں دلچسپی میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔1919ء سے انہوں نے سال کا کچھ حصہ سپین کے دارالحکومت میڈرڈ میں گزارنا شروع کر دیا جہاں انہیں اس دور کے بعض بڑے ادیبوں اور

http://muftbooks.blogspot.com/

فنکاروں سے ملنے کا موقع ملا جن میں بلند پایہ مصور سالواڈور ڈالی، فلم ساز لوئی بنیل اور معروف شاعر رافیل البرٹی جیسے لوگ شامل تھے۔ اس دوان وہ اپنی قانون کی تعلیم مکمل کرنے کی کوشش بھی کرتے رہے گو انہیں اس شعبے سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ انہی دنوں انہوں نے ایک کھیل ''تتلی کا سفلی طلسم'' (1920ء) تحریر کیا جو ناکام رہا۔ 1921ء میں انہوں نے اپنی کچھ نظمیں ''مجلّہ منظومات'' میں شائع کیں۔

اس کے بعد انہوں نے جو شاعری کی اس نے انہیں شہرت کے بام عروج پر پہنچا دیا۔ ان کی اس عہد کی تخلیقات میں ''گہرے گیت کی نظم'' (1933ء) اور ''خانہ بدوش کے گیت'' (1929ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان کی ان نگارشات میں فطرتی مناظر سے پیار اور اندلسیہ کے لوک ادب کا رنگ نمایاں ہے۔ انہوں نے اندلسیہ کی روایتی شاعری میں نئی نئی تشبیہات اور استعارے شامل کر کے ہسپانوی ادب میں نئی راہیں متعارف کرائیں۔ ان کے کیوبا اور امریکہ کی سیاحت کے تجربے کا نچوڑ ہمیں ان کی کتاب ''شاعر نیویارک'' (1940ء) میں ملتا ہے۔ اس کتاب میں وہ ہمیں بڑے شہر کی مشینی اور انسانی جذبات سے عاری زندگی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بیگانگی کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان نظموں میں مشکل تشبیہ استعارے اور قدرے مانوس اسلوب استعمال کیا گیا ہے۔ ان نگارشات خصوصا والٹ وٹمین سے منسوب نظم میں ہم جنسیت کے بارے میں ان کے افکار و احساسات بھی پہلی دفعہ کھل کر قارئین کے سامنے آئے۔

شاعری کی طرح لورکا کے ڈراموں نے بھی بہت زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ تین کھیلوں یعنی ''خونی شادی'' (1933ء)، یرما (1933ء) اور ''برنارڈا ایلبا کا گھر'' (1936ء) پر مشتمل ان کی ڈرامائی تخلیق خاص طور پر مقبول ہوئی۔ ان ڈراموں میں انہوں نے اندلسیہ کی پر تحیر اور زندگی کے رنگوں سے معمور فطری مناظر کی بڑی شاندار تصویر کشی کی ہے۔ ان کے اس آخری دور میں لکھی گئی تحریروں میں ''ایک بل فائٹر کی موت کا نوحہ'' (1935ء) بھی بہت اہم ہے۔

لورکا کی بھرپور ادبی زندگی کا اختتام سپین کی خانہ جنگی کے دنوں میں ہوا۔ وہ پروٹو فاشسٹ قوم پرست جنہوں نے جولائی 1936ء میں غرناطہ اور اس کے نواحی علاقوں کا کنٹرول سنبھالا، لورکا کی لبرل سیاست، اس کے دانشورانہ مقام اور اس کی ہم جنس پرستی کے بہت خلاف تھے۔ لہٰذا انہوں نے لورکا کو پکڑ کر غرناطہ کے ایک قصبے وزنار میں موت کے گھاٹ اتار دیا اور اسے کسی ایسی جگہ دفن کر دیا جس کا بعد میں کوئی پتہ نہ چل سکا۔

گاندھی، اندرا (پریادرشنی) (1917ء تا 1984ء)

http://muftbooks.blogspot.com/

بھارتی وزیراعظم، آزادی حاصل کرنے کے بعد بھارت کے پہلے وزیراعظم بننے والے سیاسی رہنما جواہر لعل نہرو کی اکلوتی اولاد۔ انہوں نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں صبح و شام سیاست کے ہی تذکرے چلتے تھے۔ انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے 1931ء میں منعقد ہونے والے اجلاس میں اس وقت شرکت کی جب ان کی عمر صرف چودہ برس تھی بلکہ سیاست کا آغاز تو انہوں نے اس سے بھی قبل بارہ سال کی عمر میں اس وقت کر دیا تھا جب وہ موہن داس گاندھی کی سول نافرمانی کی تحریک کے دوران نوجوانوں کی جماعتی شاخیں منظّم کیا کرتی تھیں۔ اندرا نے مغربی بنگال کی وشوا بھارتی یونیورسٹی اور انگلستان کی آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد کانگریس کی ایک رکن کے طور پر سیاسی خدمات سرانجام دینا شروع کیں۔ ان کی اپنے خاوند فیروز گاندھی (وفات 1960ء) سے ملاقات انہی دنوں ہوئی۔

اندرا کو 1959ء میں بھارت کی برسراقتدار کانگریس پارٹی کا اعزازی صدر منتخب کر لیا گیا۔ 1964ء میں نہرو کے جانشین وزیراعظم لال بہادر شاستری نے انہیں وزیر اطلاعات ونشر و اشاعت مقرر کر دیا اور جنوری 1966ء میں شاستری کی اچانک موت پر انہوں نے کانگریس کی صدارت اور ملک کی وزیراعظم کا عہدہ سنبھال لیا کیونکہ وہ کانگریس کے سبھی دھڑوں کیلئے قابل قبول امیدوار تھیں۔ تاہم پارٹی کے دائیں بازو کے قائد اور سابق وزیر مالیات مرار جی ڈیسائی نے ان کی اتھارٹی کو چیلنج کرنے کا فیصلہ کیا جس کی وجہ سے اندرا کو 1967ء میں بہت سے ووٹوں کا نقصان بھگتنا پڑا اور ڈیسائی کو اپنا نائب وزیراعظم بنانے پر مجبور ہونا پڑا۔ تاہم 1971ء کے انتخابات تک اندرا نے ملک کی سیاسی صورتحال پر پوری طرح غلبہ حاصل کر لیا اور پارلیمان میں قدامت پسندوں پر دوتہائی اکثریت حاصل کر لی۔

اگرچہ اندرا اپنے باپ کی نیم اشتراکی پالیسیوں پر ہی عمل پیرا رہیں۔ وہ حزب اختلاف کو دبانے اور اپنی حاکمیت میں اضافہ کرنے کے معاملے میں نہرو سے کئی گناہ زیادہ جابر ثابت ہوئیں۔ انہوں نے آزاد ذہن رکھنے والے وزراء کو ایک ایک کر کے ہٹا دیا اور ان کی جگہ اپنے حامی بٹھا دیئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے اقتدار کو ریاستوں تک وسیع کرنے کیلئے پولیس اور خفیہ ایجنسیوں کا بے دریغ استعمال کیا جن کے کارندے مقامی سیاستدانوں کی نگرانی کرتے تھے اور ان کی سیاسی سرگرمیوں کو سبوتاژ کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ان کا اپنے خاندان کے قابل بھروسہ افراد خصوصا اپنے بیٹے سنجے پر انحصار بڑھتا چلا گیا۔ خارجی محاذ پر انہوں نے مشرقی پاکستان میں کھلم کھلا مداخلت کی، بھارتی فوج کو بنگالیوں کے ساتھ مل کر لڑنے کیلئے بھیجا اور اس طرح پاکستان کو دولخت

http://muftbooks.blogspot.com/

کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے پاکستان کے خلاف دیرینہ تنازعے میں سوویت یونین کی امداد حاصل کرنے میں بھی بہت ہوشیاری کا ثبوت دیا۔

1972ء کے چناؤ میں ان کی نیو کانگریس پارٹی نے واضح کامیابی حاصل کی، تاہم متعدد عوامل نے جن میں غذائی قلت اور بڑھتی ہوئی مہنگائی بھی شامل تھی، ان کے مخالفین کے حوصلے بڑھا دیئے۔ ان پر انتخابی قوانین کی خلاف ورزی کا الزام لگایا گیا اور الہ آباد ہائیکورٹ نے انہیں مجرم قرار دے کر وزارت عظمیٰ کے عہدے سے برطرف کر دیا اور ان پر چھ سال کیلئے سیاست میں حصہ لینے پر پابندی بھی عائد کر دی۔ اندرا نے اس پر 26 جون 1975ء کو ملک میں ایمرجنسی کے نفاذ کا اعلان کر دیا۔ یہ ایمرجنسی دو سال تک برقرار رہی جس کے دوران کے سیاسی مخالفین کو پکڑ پکڑ کر جیلوں میں ٹھونسا گیا۔ آزادی اظہار پر پابندیاں لگائی گئیں۔ کچی آبادیوں کو زبردستی مسمار کیا گیا اور ملک کی آبادی پر قابو پانے کیلئے غریب طبقے کے لوگوں کو جبراً نس بندی کے ٹیکے لگائے گئے۔ 1977ء میں اندرا نے اپنے اقدامات پر بھروسے کی بنا پر ملک سے ایمرجنسی اٹھا لی اور قومی انتخابات کا اعلان کر دیا لیکن اس الیکشن میں انہیں اور ان کی جماعت کو زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اس دوران وہ کچھ عرصے کیلئے بدعنوانی کے الزامات کے تحت جیل میں بھی رہیں لیکن انہوں نے اپنا سیاسی کام بدستور جاری رکھا۔ 1978ء میں ان کے حامیوں نے کانگریس سے الگ ہو کر ایک اور جماعت کانگریس آئی قائم کر لی۔ اگرچہ حکمران جنتا پارٹی بھارتی معاشرے کو معمول پر لانے میں کافی حد تک کامیاب ہو چکی تھی، داخلی اختلافات کی وجہ سے اسے 1970ء میں اقتدار چھوڑنا پڑا جس سے 1980ء کے انتخابات میں اندرا کی واپسی کا راستہ ہموار ہو گیا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد اندرا خاندان کے خلاف تمام عدالتی مقدمات ختم کر دیئے گئے۔

1980ء کے عشرے تک یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اندرا نے نیو کانگریس پارٹی کو ایک وسیع البنیاد خود مختار سیاسی جماعت سے اپنے اور اپنے جانشینوں کے عزائم کے حصول کے ایک آلہ کار میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے، صاف لگ رہا تھا کہ اندرا نے اپنے بڑے بیٹے سنجے کو اپنی جانشینی کیلئے منتخب کر رکھا ہے لیکن 1980ء میں سنجے کی ایک ہوائی حادثے میں اچانک موت کے بعد اندرا نے اپنے دوسرے بیٹے راجیو کی طرف دیکھنا شروع کر دیا لیکن اسی دوران میں سکھوں کی علیحدگی پسند تحریک نے شدت اختیار کر لی۔ اندرا نے جابرانہ ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے امرتسر میں واقع سکھوں کے مقدس گوردوارے، گولڈن ٹیمپل پر حملہ کر دیا جس میں 450 سے زائد افراد مارے

گئے۔اب سکھوں کی باری تھی۔ پنجاب میں فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک اٹھی اور اندرا گاندھی کے اپنے باڈی گارڈوں نے جو کہ سکھ تھا، انہیں ان کے اپنے باغیچے میں گولیوں سے بھون ڈالا۔ اندرا کی ہلاکت کے فوری بعد راجیو نے کانگریس کی قیادت سنبھال لی اور ملک کا وزیراعظم بن گیا۔ وہ 1989ء تک اس عہدے پر کام کرتا رہا لیکن دو سال بعد اسے بھی ایک خودکش دھماکے میں ہلاک کر دیا گیا۔

گاندھی، موہن داس [کرم چند] (1869ء تا 1948ء)

ہندوستان کے ایک سماجی اور سیاسی رہنما، وہ انگریزوں کے خلاف چلائی گئی تحریک آزادی کے ایک ممتاز قائد اور ایک سماجی مصلح بھی تھے۔ گاندھی کے پیروانہیں مہاتما یعنی ''عظیم روح'' کہہ کر بلاتے تھے۔انہوں نے اپنی عدم تشدد پر مبنی سول نافرمانی کی تحریک سے بہت نام کمایا۔

وہ مغربی ہند کے ایک شہر پور بندر میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے والد کی چوتھی شادی میں سے ہونے والے چوتھے فرزند تھے۔ان کی والدہ ایک راسخ العقیدہ ہندو خاتون تھیں جنہوں نے گاندھی کو بچپن ہی سے امن پسندی، گوشت سے اجتناب اور سب ذی روحوں کے احترام کی تعلیم دینا شروع کر دی تھی۔ گاندھی صرف تیرہ برس کے تھے کہ ان کی شادی ایک مقامی تاجر کی بیٹی کستورا بائی سے ہوگئی۔ان کے پہلے بچے کی پیدائش پانچ برس بعد ہوئی۔اس بچے کی عمر بمشکل ایک سال ہوئی ہوگی کہ گاندھی قانون کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے انگلستان چلے گئے (91-1888ء)۔انگلستان قیام کے دوران ان کی ملاقات انگریز ڈرامہ نگار جارج برنارڈ شا اور تھیوسوفسٹ اینی بیسنٹ سے ہوئی جنہوں نے ان کی توجہ بائبل اور مشہور ہندو فلسفیانہ اور رزمیہ نظم بھگوت گیتا کی طرف مبذول کرائی جسے انہوں نے پہلے سر ایڈون آرنلڈ کے ترجمے کی صورت میں پڑھا۔ برنارڈ شا جیسے لوگوں کی بدولت گاندھی کا تعارف اشتراکی نظریات سے بھی ہو گیا جنہوں نے ہندوستان کیے مستقبل کے بارے میں گاندھی کے خوابوں کو تشکیل دینے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

گاندھی نے انگلستان سے واپسی پر پہلے ہندوستان میں وکالت کی پریکٹس کرنے کی کوشش کی لیکن وہ زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔اس پر وہ 1893ء میں جنوبی افریقہ چلے گئے۔ وہاں انہیں نسلی امتیاز کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ گاندھی کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے والا ایک واقعہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ وہ بذریعہ ریل ڈربن سے پریٹوریا جا رہے تھے اور اگرچہ وہ فرسٹ کلاس ٹکٹ پر سفر کر رہے تھے ہوا کیا کہ دوران سفر ایک گورا گاڑی میں آیا اور اس نے مقامی پولیس کی مدد سے گاندھی کو فرسٹ کلاس ڈبے سے نکالنے کی کوشش کی۔ اس واقعے سے گاندھی کا دل

بہت مجروح ہوا۔ انہوں نے نا انصافی کے خلاف لڑنے کا تہیہ کر لیا اور وہ جنوبی افریقہ میں بسنے والے ہندوستانیوں کے ترجمان بن گئے۔ انہوں نے اپنے ہم وطنوں کے شہری حقوق کے لئے کام کرتے ہوئے اکیس سال کا عرصہ جنوبی افریقہ میں گزارا جس کے دوران انہیں کئی بار جیل بھی جانا پڑا۔ اس سارے وقت میں انہوں نے خاموش بغاوت کا وتیرہ اپنائے رکھا۔ گاندھی اتنے بڑے سماجی رہنما تھے کہ انہوں نے اپنی ملازمت اور اپنے پیشے کی بھی پروانہ کی اور لوگوں کی خدمت میں لگے رہے۔ انہوں نے 1904ء میں ڈربن کے قریب ایک مقام فینکس پر ایک کمیونل فارم قائم کیا اور 1906ء میں سیکس سے کنارہ کشی کا اعلان کر دیا۔ وہ معروف روسی فلسفی لیوٹالسٹائی کے روحانی نظریات کے بہت معترف تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے درمیان 1828ء سے 1910ء تک کے عرصے میں خط و کتابت بھی چلتی رہی۔ اہنسا یا غیر متشدد مزاحمت کے بیج جنوبی افریقہ میں ہی بوئے گئے تھے۔ گاندھی نے جن قوانین کے خلاف جدوجہد کی تھی ان میں سے بہت سے قوانین جنوبی افریقہ کی حکومت نے 1914ء تک منسوخ کر دیئے تھے اور اب گاندھی ایک مطمئن دل کے ساتھ اپنے وطن واپس لوٹ سکتے تھے۔

واپسی پر وہ بڑی تیزی سے ہندوستان کے سیاسی افق پر چھا چکے تھے۔ انہوں نے کانگریس کی قیادت سنبھال کر اسے ایک زبردست سیاسی قوت میں بدل دیا اور وسیع پیمانے پر غیر متشدد مزاحمت کی تحریک کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے تحریک خلافت، رولٹ ایکٹ کے خلاف چلائی گئی مہم اور جلیانوالہ باغ فائرنگ کے ردعمل میں ہونے والے مظاہروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ گاندھی نے ہندوستان کے عوام کو متحرک کرنے میں بہت بڑا کردار ادا کیا لیکن تشدد و فساد کی فضا میں غیر معمولی اضافے پر 1922ء میں ان کی تحریک عدم تعاون بند کر دی گئی۔ اس مرحلے پر انہیں قید بھی کیا گیا لیکن انہوں نے اپنی جدوجہد میں کوئی کمی نہ آنے دی اور وہ 1930ء میں نمک ٹیکس کے خلاف چلائی گئی تحریک اور 1942ء میں ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک میں اپنے لوگوں کی بھرپور قیادت کرتے رہے۔ ان کا بڑا مقصد اہل ہند کی اخلاقی اصلاح اور انہیں سامراجی طاقت کے چنگل سے آزادی دلانا تھا۔

گاندھی صرف سیاسی محاذ پر ہی نہیں لڑ رہے تھے۔ وہ ہندوستان میں ایک معاشرتی انقلاب بھی لانا چاہتے تھے۔ وہ نظام تعلیم میں بہتری اور گھریلو صنعت کے فروغ سے ہندوستان کے دیہی علاقوں کی تقدیر بدلنا چاہتے تھے جس کیلئے گاندھی اور ان کے ساتھیوں نے ایک منظم ''تعمیری پروگرام'' کا آغاز کیا۔ وہ ہندو مسلم اتحاد اور اچھوت جاتیوں کی شہری آزادیوں کے بھی بہت بڑے

حامی تھے۔ بالآخر برطانوی حکومت کو ہندوستان میں گاندھی کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو تسلیم کرنا پڑا اور انہیں 1932ء میں لندن میں منعقد ہونے والی دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس میں انڈین نیشنل کانگریس کے مرکزی نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی دعوت دے دی گئی۔ تاہم گاندھی کو ان مذاکرات سے بہت مایوسی ہوئی اور انہوں نے واپس آ کر برت رکھنے شروع کر دیئے اور وسیع پیمانے پر سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ گاندھی کیلئے سول نافرمانی ایک فلسفے کی حیثیت رکھتی تھی اور وہ اسے ستیہ گرہ (سچی طاقت) کا نام دیتے تھے۔

گاندھی نے جنگ عظیم دوم کا بیشتر زمانہ کانگریس کے دیگر قائدین کے ساتھ جیل میں گزارا۔ ان کی بیگم اور زندگی بھر کی معتمد رفیق کو بھی گرفتار کیا گیا جن کا انتقال 1944ء میں قید کے دوران ہی ہوا۔

اگست 1947ء میں گاندھی کے انگریزوں سے مذاکرات کامیاب رہے جس کے نتیجے میں ہندوستان میں مقامی حکومت کا نفاذ ہوا اور اسے ایک آزاد جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔ لیکن ہندوستان کے آزاد ہوتے ہی اس میں تشدد اور افراتفری نے شدت اختیار کر لی۔ بہت سے بھارتی رہنما ملک میں ایک مرکزی اور جدید حکومت کے قیام کے خواہاں تھے لیکن گاندھی مرکزیت کے کوئی اتنے قائل نہیں تھے اور وہ ہندوستان کو ایک صنعتی ملک کی بجائے ایک زرعی ملک بنانا چاہتے تھے۔ جب دہلی کے نواحی علاقوں میں فسادات میں اضافہ ہوا تو انہوں نے مرن برت رکھنے کا اعلان کر دیا اور کہا کہ وہ اسی وقت کچھ کھائیں گے جب حالات صحیح رخ اختیار کریں گے۔ ان کا یہ اعلان کامیاب رہا، کشیدگی میں کمی واقع ہوئی اور فریقین نے مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کی حامی بھر لی۔ افسوس کی بات ہے کہ گاندھی کو آزاد ہندوستان میں زیادہ دیر زندگی بسر کرنے کا موقع نہ مل سکا اور ایک انتہا پسند ہندو ناتھورام گاڈسے نے انہیں اس وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا جب وہ دہلی میں واقع اپنے آشرم میں اپنے معتقدین کے ساتھ ایک اجتماع میں شریک تھے۔ ان کی آخری رسومات میں لگ بھگ بیس لاکھ افراد نے شرکت کی۔

گھانا، قدیم

مغربی سوڈان کی ایک عظیم سلطنت، اسے نویں صدی عیسوی میں بہت اہمیت حاصل تھی۔ اس دور میں یہ بالائی نیل اور دریائے سینیگال کے درمیان واقع علاقے ''ونگارہ'' تک پھیل چکی تھی جو سونے کی پیداوار کیلئے پورے افریقہ میں مشہور تھا۔ اس خطے کے لوگ سونے کے بدلے میں غلاموں کا لین دین کرتے تھے اور اس کے علاوہ صحرائے تغازہ کا نمک اور شمالی افریقہ سے کپڑا بھی

http://muftbooks.blogspot.com/

حاصل کرتے تھے۔

گیارہویں صدی کی گھانا کی اس سلطنت کا حال ہمیں مسلم مورخ (البکری) (اندازاً1000) کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے۔البکری جو کہ اندلسیہ میں پلا بڑھا، نے اس عہد کی مغربی افریقہ کی ریاستوں اور بادشاہتوں کے بارے میں عربی زبان میں لکھا ہے لیکن ہم انہیں قریبی مشاہدات قرار نہیں دے سکتے۔اس نے کبھی صحرائے اعظم کے جنوب کی طرف کا سفر نہ کیا تھا اور لگتا ہے کہ اس کا زیادہ انحصار صحرائے اعظم کے مختلف مقامات تک مال لانے اور لے جانے والے سوداگروں اور سوڈان کے مہم جوؤں کی روداد وں پر تھا۔تاہم البکری کے دنوں میں سلطنت گھانا کا خوب چرچا تھا۔یہ پتہ ہمیں اسی کی تحریروں سے چلتا ہے کہ اس دور کے گھانا میں سونے کی اس قدر افراط تھی کہ لوگ اپنے کتوں کو پٹے بھی سونے کے پہناتے تھے اور اس کا فرمانروا ''شہنشاہ زر'' کہلاتا تھا۔

آج کے دور کا مالی اور جنوب مشرقی موریطانیہ بھی اس سلطنت کا حصہ تھے اور اس کا کل رقبہ غالباً موجودہ عہد کے نائیجیریا سے بھی زائد تھا۔اس سلطنت کی حکومت بہت مضبوط تھی اور اس کا دارالحکومت دو حصوں میں منقسم تھا۔ایک حصے میں روایتی حکمران رہتے تھے جو غیر مسلم تھے اور دوسرا حصہ سوداگروں کیلئے تھا جن کی اکثریت مسلمان تھی۔مورخین کا خیال ہے کہ گھانا قدیم کے آخری عہد میں کوبی صالح کا قصبہ (جو کہ آج کل کے ماریطانیہ میں واقع ہے) اس سلطنت کا دارالحکومت ہوا کرتا تھا۔

سونے کی تجارت میں دیگر ملکوں کے مقابلے پر اتر آنے کی وجہ سے گھانا کی طاقت بتدریج کم ہوتی چلی گئی۔1076ء کے لگ بھگ مراکش کے المواوی حکمرانوں نے کوبی صالح پر حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تاہم گھانا والوں نے ان حملہ آوروں کو بالآخر واپس جانے پر مجبور کر کے اپنا ملک ایک مرتبہ پھر آزاد کروالیا۔1203ء میں اسے ایک بار پھر شکست کا سامنا سومان گرو کی فوج کے ہاتھوں کرنا پڑا جو کہ تکرور اور اس کے مغربی جانب آباد علاقوں کے قبائل کا سردار تھا۔سومان گرو نے کوبی صالح کو تاراج کیا لیکن کچھ عرصہ بعد یہ شہر اس کے ہاتھ سے بھی جاتا رہا۔اسے ماندے زبان بولنے والے باشندوں کے لشکر نے شکست دی۔تیرہویں صدی کے آخر تک ریاست گھانا کے بچے کھچے علاقے قدیم سلطنت مالی کا حصہ بن چکے تھے۔گھانا کو 1957ء میں آزادی ملی اور یہ صحرائے اعظم کے ذیلی علاقوں کی برطانوی نوآبادیوں میں خودمختاری حاصل کرنے والا پہلا ملک تھا۔گھانا کے وزیراعظم (1952ء۔1960ء) اور اس کے پہلے صدر (1960ء۔1966ء)

http://muftbooks.blogspot.com/

کوامے نکرومہ نے آزادی ملنے پر اس پرانی عظیم سلطنت کی یاد میں ملک کا نام بدلا انگریزوں نے اس کا نام گولڈ گوسٹ رکھ دیا تھا۔

گلگامش، رزمیہ

قدیم بابلیہ اور شام کی اکادی زبان میں لکھی گئی ایک رزمیہ نظم، اس کے مطابق گلگامش ریاست ارک کا بادشاہ تھا۔ اس نے جومعر کے سر کئے انہوں نے اسے خدائی کے درجے پر فائز کر دیا اور انہی کے طفیل نسل در نسل صدیوں تک چلتی رہنے والی یہ نظم تخلیق ہوئی۔ اگر اس رزمیہ کے ماخذ کی بات کی جائے تو اس کے بعض حصے تو ایسے ہیں جو کسی نہ کسی صورت میں 2100 ق م سے 2000 ق م کے درمیانی عرصے میں بھی سمیری زبان میں موجود تھے۔ اکادی زبان میں یہ رزمیہ بہت بعد بابلی عہد (1750۔1600 ق م) میں منظر عام پر آئی۔ اس کی بعض وسط بابلی (اندازاً 1250 ق م) اور نو آشوری (750 تا 612 ق م) شکلیں بھی سامنے آئی ہیں۔

اس رزمیہ کی عبارت میں مسلسل کاٹ چھانٹ ہوتی رہی اور اس کا کوئی بھی نسخہ اس وقت دستیاب نہیں۔ اس نظم کا جو ترجمہ ہم آج کل کے قاری پڑھتے ہیں وہ ان سب مختلف مآخذ کا مغوبہ ہے۔ اس داستان کی سمیری اور موخر بابلی شکل میں گلگامش کی بقائے دوام حاصل کرنے کی ناکام جستجو اور ان انسانی مجبوریوں کی بات کی گئی ہے جس کا ادراک انجام کار اسے حاصل ہوا۔ اقدار بنانے اور موت کو تسلیم کرنے کی انسانی صلاحیت اس کے نظم کے مرکزی خیال ہیں۔

بابلی حکایت میں گلگامش کو ارک کے ایک بہت طاقتور اور نیم لافانی بادشاہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو اپنی رعایا سے بڑی سختی سے پیش آتا ہے۔ آسمانی دیوتا کو لوگوں کے حال پر رحم آتا ہے اور وہ ارورو دیوی کو حکم دیتا ہے کہ وہ مٹی سے ایک جنگلی انسان تیار کرے تا کہ وہ بادشاہ کی توجہ بٹا سکے۔ یہ شخص جس کا نام اینکڈو لکھا ہے۔ وہ گلگامش کی طاقت کو للکارتا ہے لیکن اس سے شکست کھا کے اس کا بہت گاڑھا دوست بن جاتا ہے اور پھر دونوں مل کر بہت سی مہمات سر کرتے ہیں۔ ایک مہم کے دوران انہوں نے ایک مقدس جنگل میں اگے دیودار کے ایک درخت کو گرانا ہوتا ہے جس کی حفاظت ایک عفریت ہمبابا کے ذمے ہوتی ہے۔ وہ سورج دیوتا کی مدد سے درخت کو کاٹنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ہمبابا کو ہلاک کر دیتے ہیں لیکن ہوتا کیا ہے کہ اس کامیابی سے ان میں غرور آجاتا ہے اور وہ آسمانی بیل کو مار کر خدائے اشتر کو اپنا دشمن بنا لیتے ہیں جو اینکڈو کو ہلاک کر دیتا ہے۔ گلگامش اپنے یار کی جدائی سے بہت دلبرداشتہ ہوتا ہے اور بقائے دوام کی تلاش میں نکل کھڑا

http://muftbooks.blogspot.com/

ہوتا ہے۔ یہ تو اسے نہیں ملتی لیکن مآل کار عقل اس کے ہاتھ ضرور آجاتی ہے۔

اگرچہ بابلی گلگامش نے کئی سمیری حکایات سے اکتساب کیا ہے، دونوں مآخذ میں کئی بڑے اختلافات بھی موجود ہیں۔ سمیری حکایات میں اینکڈو گلگامش کا نوکر دکھایا گیا ہے۔ جنگلی انسان یا اس کا یار نہیں۔ تاہم اس داستان کو سات دن اور سات رات پر مشتمل چھ ادوار میں تقسیم کرنے کی ذمہ دار بابلی حکایت ہے۔ ان سب ادوار میں گلگامش کی شخصیت ایک نئی تبدیلی سے گزرتے نظر آتی ہے۔

گیٹو

یہودیوں کے لیے مختص وہ شہری علاقہ جس کے گرد عموماً ایک دیوار مع ایک دروازہ چن دی جاتی تھی۔ اگرچہ یہ اصطلاح پہلی مرتبہ سولہویں صدی کے وینس کے یہودی علاقے کیلئے استعمال کی گئی، اس نوع کی بستیوں کا وجود زمانہ قدیم سے ہی چلا آتا ہے۔ مشرق وسطیٰ کی شیعہ ریاستوں میں یہودیوں کو قرنطینہ میں رکھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس سنی شہروں میں گیٹو موجود نہیں تھے۔

بیسویں صدی میں آکر لفظ ''گیٹو'' کے کئی معانی پیدا ہو گئے۔ نازی دور میں گیٹو کی حیثیت عقوبتی کیمپ یا گیس چیمبر سے قبل کے برزخ کی سی تھی۔ چونکہ انہیں اپنی حتمی منزل سے آگاہی نہ ہوتی تھی اکثر یہودی وارسا، لوذ اور لبلن جیسے شہروں میں پہلے ہی کھچا کھچ بھرے یہودی واڑوں میں منتقل ہونے کے احکامات کو لیتے تھے۔ ان یہودی واڑوں کا ماحول ناگفتہ بہ تھا اور نازیوں کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ ان کے باشندوں کی بڑی تعداد فاقے اور بیماری جیسے ''طبعی'' اسباب سے ہی دم توڑ دے۔

جب تک نازی کسی ''حتمی حل'' کا منصوبہ سوچنے میں مصروف تھے، انہوں نے ان یہودی محلوں کو کسی حد تک خودمختاری دے رکھی تھی۔ جرمن حکام گیٹوں میں رہنے والے یہودی عمائدین کے جرگے پر دباؤ رکھتے تھے کہ وہ نظم وضبط برقرار رکھیں اور تعاون کو یقینی بنائیں۔ اس ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی نے یہود کی داخلی کشیدگیوں میں اضافہ کر دیا تھا جس کی وجہ سے کسی طرح کی موثر مزاحمت بہت مشکل ہو گئی تھی۔ عمائدین کے ملنے والے اختیارات سے ان یہودی محلوں میں بسنے والے بہت سے باسیوں کو یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ اگر وہ خاموش رہے تو انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا لیکن جب نازیوں نے ان یہودی محلوں کا صفایا کر کے ان کے باسیوں کو تشدد خانوں میں بھیجنا شروع کیا تو تب تلک بہت دیر ہو چکی تھی۔

وارسا کے یہودی واڑے کا معاملہ دوسروں سے مختلف رہا۔ اس کے باسیوں نے گو صرف

http://muftbooks.blogspot.com/

چند ہفتوں کیلئے، ایک حیران کن حد تک کامیاب مزاحمتی مہم چلائی۔ یہاں یہودیوں نے انتہائی کم ہتھیاروں اور سامان رسد جو کہ انہوں نے پولینڈ کے حریت پسندوں سے خریدا تھا، نازیوں کو اس وقت تک اپنی آبادی سے دور رکھے رکھا جب تک کہ کمک آنے پر یہودی واڑے کو مسمار نہیں کر دیا گیا۔ اس یہودی واڑے اور اس کیلئے لڑنے والے حریت پسندوں کی یاد میں اب وہاں ایک یادگار تعمیر کی گئی ہے۔ اس طرح کی ایک یادگار اسرائیل میں بھی قائم ہے۔

گورکی، میکسم (1868ء تا 1936ء)

روسی ڈرامہ نگار، افسانہ نگار اور ناول نویس، میکسم گورکی کا اصل نام الیکسی میکسی موویچ پیشکوف تھا۔ انہیں مزدور طبقے سے ابھرنے والا پہلا بڑا روسی ادیب قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے والد کی وفات کے بعد ان کی والدہ انہیں بچپن میں ہی چھوڑ کر چلی گئی تھی اور انہوں نے گیارہ کے سن سے ہی اپنی زندگی بنا کسی سہارے خود جینا شروع کر دی تھی جس کے دوران وہ کبھی مچھیرے کا کام کرتے رہے اور کبھی کلرک کا، کبھی انہیں بیکری کی دکان پر کام کرنا پڑا اور کبھی برتن دھونے کا۔ لیکن کافی عرصہ تک یہ چھوٹے موٹے کام کرنے کے بعد بالآخر وہ ادیب بن کر روسی ثقافت کے افق پر جگمگانے لگے۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں مشقت اور مزدوری کی زندگی کو موضوع بنایا جو لوگوں کی توجہ پا کر جلد ہی سینٹ پیٹرز برگ میں شائع ہونے لگیں۔ انہوں نے 1898ء میں افسانوں کے دو مجموعے اور 1899ء میں ایک ناول ''فاما گوردایوف'' شائع کیا اور ان دونوں تصانیف سے حاصل ہونے والی آمدنی سے انہوں نے اپنا ایک نجی اشاعتی ادارہ قائم کر لیا۔ اس کے ساتھ انہوں نے سوشل ڈیموکریٹک پارٹی میں بھی شمولیت اختیار کر لی اور اپنی آمدن کا بیشتر حصہ اشتراکی جدوجہد کی نذر کرنے لگے۔ ان کے انقلابی افکار نے ''نچلے پاتال'' (1902ء) اور ''حقیر بورژوا'' (1901ء) جیسے ڈراموں میں اظہار پایا۔ اس پر روسی اور سرکار انہیں دبانے کے درپے ہو گئی اور انہیں روسی ادیبوں اور فنکاروں کی اعزازی تنظیم اکیڈمی سے دور رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

گورکی کو 1905ء میں حکومت وقت کے خلاف تنقیدی مواد چھاپنے پر گرفتار کر لیا گیا لیکن جب عوام نے احتجاجاً سڑکوں کا رخ اختیار کرنا شروع کیا تو انہیں چھوڑ دیا گیا لیکن وہ اس سے اس قدر بددل ہوئے کہ انہوں نے امریکہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ امریکہ قیام کے دوران انہوں نے اپنا معروف ناول ''ماں'' (1906ء) تحریر کیا جس میں انقلابی تحریک کی روداد ناصحانہ رنگ میں بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد وہ اٹلی چلے گئے جہاں رہتے ہوئے انہوں نے اپنی تین حصوں پر مشتمل

http://muftbooks.blogspot.com/

آب بیتی ''بچپن'' (1913ء)، ''دنیا میں'' (1916ی) اور ''میری یونیورسٹیاں'' (1922ء) تحریر کی۔ ان تصانیف کو بہت سے ناقدین گورکی کا سب سے بڑا تخلیقی کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ وہ 1923ء میں وطن واپس لوٹے لیکن اس وقت تک ان کے دل میں بالشویک ثقافتی سیاست کے متعلق شکوک وشبہات جنم لے چکے تھے جن کی جھلک ہمیں ''بے وقتے خیالات'' (1917ء) میں بھی دکھائی دیتی ہے۔

1917ء کے روس انقلاب کے بعد گورکی نادار ادیبوں کی مدد کیلئے ایک اشاعتی منصوبے میں مصروف ہو گئے تا کہ کسمپرسی کے شکار ان لکھنے والوں کو روٹی، کپڑا، مکان اور قلم وقرطاس مہیا کیا جا سکے۔ کمیونسٹ روسی رہنما ولادی میر لینن (1870ء۔1929ء) کے ساتھ ان کے دیرینہ مراسم تھے۔ انہوں نے ان مراسم کو استعمال کر کے روسی دانشوروں کو جتنا وہ پہنچا سکتے تھے، فائدہ پہنچانے کی کوشش کی۔ اس دوران وہ ناول، ڈرامے اور افسانے بھی لکھتے رہے لیکن پھر وہ انقلابی سرگرمیوں کو چھوڑ چھاڑ کر پورے آٹھ سال کیلئے ملک سے باہر چلے گئے۔

انہوں نے 1928ء اور 1929ء میں روس کے مختصر دورے کیے اور پھر 1932ء میں مستقل طور پر واپس آ گئے۔ روسی سرکار نے انہیں بہت سے انعامات واعزازات سے نوازا اور ان کے آبائی قصبے اور ماسکو کی سب سے بڑی شاہراہ کا نام بدل کر ان کے نام پر رکھ دیا گیا۔ انہوں نے سوویت ادیبوں کی یونین کی تشکیل میں بھی بڑی مدد دی اور 1934ء میں اس یونین کے پہلے اجلاس میں انہیں اس تنظیم کا صدر نشین منتخب کرا لیا گیا۔ اس حیثیت میں انہوں نے اشترا کی حقیقت نگاری کے ادبی اصولوں کی توضیع وتشکیل کیلئے بڑا کام کیا جس میں سے گورکی کی ''انقلابی رومانویت'' کا بہت جلد صفایا کر دیا گیا۔ اس اشترا کی حقیقت نگاری نے اشترا کی ممالک اور کمیونسٹ جماعتوں کی پابند گھوٹو ثقافتی پالیسی کا روپ اختیار کر لیا۔ اسے قدرت کی ستم ظریفی ہی کہا جا سکتا ہے کہ گورکی کہ جو آرٹ کے ریاستی کنٹرول سے کبھی بھی مطمئن نہیں رہا تھا، کا نام وہ پالیسیاں وضع کرنے والوں میں شامل ہے جن کا شمار بیسویں صدی کی سب سے جابرانہ ثقافتی پالیسیوں میں ہوتا ہے۔

گورکھے

ایک مشہور نیپالی قبیلے کے لوگ، گورکھوں کا اصل وطن ہندوستان تھا اور وہ مسلم فاتحین کی آمد کے وقت بھاگ کر وسطی نیپال آ بسے تھے۔ اس قبیلے کو نیپال کا سب سے جنگجو اور زبردست قبیلہ تصور کیا جاتا ہے۔ گورکھوں کو پرتھوی نارائن شاہ کے دور میں عروج حاصل ہوا جو کہ گورکھا نام کی

http://muftbooks.blogspot.com/

ایک پہاڑی ریاست کا راجہ تھا۔ گورکھوں نے 1769ء میں وادی گھٹمنڈو فتح کی اور اپنی زبان گوکھالی کو جو ہندی زبان سے کافی ملتی جلتی ہے، نیپال کی قومی زبان کا درجہ دینے کا اعلان کیا۔

گورکھوں کے مذہب کو بدھ مت، ہندو مت اور تانترا مت کا ملغوبہ کہا جا سکتا ہے۔ تانترا مت میں ازواج کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے مختلف رسمیں ادا کی جاتی ہیں اور جانوروں کی قربانی دی جاتی ہے۔ اگرچہ اکثر گورکھے زراعت پیشہ ہیں ان کی غذائی فہرست بہت مختصر ہے کیونکہ ایک تو نیپال کی زمین بہت زیادہ بردگی کا شکار ہے اور دوسرا وہ اپنے مذہبی عقیدے کی بنا پر گوشت نہیں کھاتے۔ گوان کی اکثریت بہت غریب ہے، وہ اپنے مذہبی تہوار بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ مرد اپنی مالی حیثیت کے مطابق ایک سے زیادہ شادیاں کر سکتا ہے لیکن بیویاں خود مختار ہوتی ہیں اور وہ جب چاہیں اپنے خاوندوں کو چھوڑ سکتی ہیں۔ عورتیں خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہتی ہیں، اس لئے وہاں طلاق بہت عام ہے۔

انگریزوں کو گورکھوں میں دلچسپی 1815ء میں گورکھا ریاست سے جنگ کے وقت پیدا ہوئی۔ انگریزوں کو گورکھے اس قدر جنگجو اور بہادر لگے کہ انہوں نے گورکھا قیدیوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا۔ نیپال 1816ء کی شکست کے بعد برطانوی تولیت میں آ گیا۔ 1825ء میں انگریزوں نے راج کے خلاف کسی ممکنہ نیپالی عسکری مہم کو ناکام بنانے کیلئے گورکھوں کو برطانوی فوج میں کرائے کے سپاہیوں کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ انگریزوں نے انہیں انیسویں اور بیسوی صدی میں تربیت دے کر مرہٹوں، سکھوں، افغانوں اور برما والوں کے خلاف لڑایا۔ گورکھے پہلی اور دوسری عالمگیر جنگ کے دوران اتحادی فوجوں میں بھی شامل رہے۔ یہ گورکھے ہی تھے جنہوں نے 1944ء میں برما کے محاذ پر جاپانیوں کی شمال مشرقی ہندوستان پر قبضے کی کوششوں کا سدباب کیا۔ 1947ء مین ہندوستان پر برطانوی راج کے خاتمے کے وقت طے پانے والے معاہدے میں ایک شق یہ بھی رکھی گئی تھی کہ برطانیہ اور ہندوستان اگر چاہیں تو وہ اپنی فوج میں گورکھا سپاہی بھرتی کر سکتے ہیں۔ اس موقع پر پہلے سے موجود گورکھا رجمنٹوں کو برطانوی اور ہندوستانی افواج کے درمیان تقسیم کر دیا گیا تھا۔

ل

لارنس، ٹامس ایڈورڈ (1888ء۔1935ء)

http://muftbooks.blogspot.com/

برطانوی ماہر آثار قدیمہ، فوجی ماہر اور ادیب۔ وہ لارنس آف عریبیہ کے نام سے زیادہ معروف ہیں۔ لارنس کی زیادہ شہرت پہلی عالمی جنگ کے دوران عربوں کی ترکوں کے خلاف بغاوت اور ان کی کتاب ''دانائی کے سات ستون'' کے حوالے سے ہے جو ان کی وفات کے بعد 1935ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انہوں نے متذکرہ بالا واقعات کی تفصیلات قلمبند کی ہیں۔

لارنس نے اثریات کے طالب علم کی حیثیت سے مشرق وسطیٰ کے طول وعرض میں سفر و سیاحت کی۔ انہیں عربی زبان وثقافت پر بھی بہت زیادہ عبور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب 1914ء میں پہلی جنگ عظیم چھڑی تو انہیں قاہرہ میں براجمان برطانوی انتظامیہ کے ساتھ کام کرنے پر مامور کر دیا گیا۔ انہوں نے اکتوبر 1916ء میں سر رونالڈ سٹورز کی معیت میں جزیرۃ العرب کا دورہ کیا جہاں شریف مکہ حسین ابن علی نے ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ لارنس زیرک تو تھا ہی انھوں نے افسران بالا کو مشورہ دیا کہ کیوں نہ اس بغاوت میں عربوں کی مدد کر کے جرمنی کے عثمانی خلفاء کو تنگ کیا جائے۔ لارنس نے شریف مکہ کی فوج میں سیاسی اور رابطہ آفیسر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی اور پوری جنگ کے دوران عربوں کے ساتھ مل کر ترکوں کو زک پہنچاتے رہے۔ ان کے گروپ کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ بارود لگا کر پل اور ترکوں کیلئے رسد لانے والی ریل گاڑیوں کو اڑا دیتے تھے اور ترک فوجیوں کو حراست میں لے لیتے تھے تا کہ وہ کہیں اور لڑنے کے قابل نہ رہیں۔

ایسی ہی ایک مہم کے دوران لارنس ترکوں کے ہتھے چڑھ گئے جنہوں نے ان سے بدسلوکی کی (غالباً فعل بد بھی) جس کے بعد وہ ان کی حراست سے بھاگ نکلے۔ اس واقعے نے ان کے ذہن پر ایسے کاری زخم لگائے جو بعد میں شاید کبھی بھی مندمل نہ ہو سکے۔

جنگ کے بعد لارنس نے عربوں کی آزادی اور شام ولبنان کے فرانسیسی تولیت میں دیئے جانے کے خلاف بھاگ دوڑ کی لیکن انہیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ انہوں نے جنگ کی روداد ''دانائی کے سات ستون'' لکھنے پر بھی بہت وقت صرف کیا۔ انہوں نے کچھ عرصہ ونسٹن چرچل کے عرب امور کے مشیر اور قاہرہ میں برطانوی نوآبادیاتی وزیر کے طور پر بھی گزارا لیکن انہیں زیادہ حسرت فوج میں دوبارہ شامل ہونے کی تھی جس کیلئے انہوں نے کئی کوششیں کیں بلکہ بعض اوقات تو انہوں نے نام بدل بدل کر بھی خود کو عسکری خدمات کیلئے پیش کیا۔ انہیں 1935ء میں چھیالیس برس کی عمر میں برطانوی فضائیہ سے سبکدوش کیا گیا۔ وہ ریٹائر ہو کر گھر لوٹ آئے اور اپنے مستقبل کا

http://muftbooks.blogspot.com/

سوچ سوچ کر بہت دلگیر ہوئے کیونکہ اب انہیں سب خالی خالی سا لگنے لگا تھا۔ وہ موٹر سائیکل کے ایک حادثے میں آنے والے زخموں کی تاب نہ لا سکے اور اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

لاک، جان (1632ء۔1704ء)

انگریز فلسفی اور سیاسی اصول دان۔ لاک کو جدید دور کے عظیم ترین تجربی دانشوروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کا انگلستان کے عہد تنویر (EnlighInment) کی داغ بیل ڈالنے میں بڑا ہاتھ ہے۔

لاک ورنگٹسن۔ سمرسیٹ کے ایک پیوریٹن گھرانے میں پیدا ہوئے اور 1660ء میں آکسفورڈ میں یونانی فن بلاغت اور فلسفے کے استاد مقرر ہوئے۔ اس کے سات برس بعد وہ ارل آف شافٹسبری کے سیکرٹری بن گئے اور انھوں نے کونسل آف رائل سوسائٹی میں بھی خدمات سرانجام دیں۔ جب شافٹسبری کو 1675ء میں سیاسی مشکلات کی بنا پر لندن چھوڑ کر فرانس کا رخ اختیار کرنا پڑا تو لاک بھی ان کے پاس پیرس پہنچ گئے۔ وہاں قیام کے دوران لاک نے سائنس اور انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی اور لوئی چہاردہم کے پروٹسٹنٹوں سے برتاؤ کا مشاہدہ کیا۔

لاک چار سال بعد انگلستان لوٹ آئے جہاں سرکار نے ان پر انقلاب پرستی کا الزام تھوپ دیا جس پر وہ بھاگ کر ہالینڈ چلے گئے۔ یہاں انھوں نے چون برس کی عمر میں اپنی پہلی مشہور تصنیف ''فہم انسان پر ایک مقالہ'' 1690ء قلمبند کی۔ اس کتاب میں انسانی ذہن کی نوعیت و ہیئت کا جائزہ لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ انسان کی پیدائش کے وقت اس کا ذہن ایک صاف تختی کی طرح ہوتا ہے جس پر دنیا پانچوں حسوں کے ذریعے اپنے نقوش مرتب کرتی ہے۔ انسان تجربے سے معلومات اکٹھی کرتا ہے اور پھر سوچ بچار کے ذریعے اپنے فہم کی تکمیل کرتا ہے۔ لاک نے اشیاء کی بنیادی خاصیت مثلاً ٹھوس پن، چوڑائی اور مقدار کو ان کی ثانوی خاصیت مثلاً رنگ اور صورت سے ممیّز کیا ہے جو بذریعہ حس پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا مؤقف ہے کہ سائنس کا وجود ممکن ہے کیونکہ بنیادی خواص میکانکی انداز سے حسی اعضاء کو متاثر کرتے ہیں اور ان کی وساطت وہ خیالات پیدا کرتے ہیں جو حقیقت کی ٹھیک ٹھیک نمائندگی کرتے ہیں۔

ایک سیاسی مفکر کے طور پر انھیں اس وقت شہرت ملی جب انھوں نے ٹامس ہابس کے اس نظریے کو چیلنج کیا کہ انسان کو فطری حالت میں ان انفرادی اور بقاء جو جو داعیات پر زندگی گزارنی چاہیے جن کے ساتھ انسان پیدا ہوتا ہے۔ اپنی تحریر ''حکومت پر دو مقالے'' (1690ء) میں انھوں نے لکھا ہے کہ انسانی فطرت میں موجود فرزانگی و تحمل کی صلاحیت کو غیر منطقی رجحانات پر

http://muftbooks.blogspot.com/

فوقیت حاصل ہے اور فطرت کی اصلی حالت لازماً منظم ہے۔ یہ حالت خودمختاری ومساوات سے متصف ہوتی ہے اور یہ معاشرے میں معاہدہ عمرانی کے توسط سے حاصل ہوتی ہے جو اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ افراد سب لوگوں کی بہبود عامہ کی خاطر اپنے بعض حقوق سے دستبردار ہو جائیں گے۔ اس ضمن میں ملکیتی حقوق لازمی ہیں کیونکہ ہر شخص کو اس کی محنت کا پھل ملنا چاہیے۔ اس طرح لاک کا یہ تصور محنت کے نظریۂ قدر کا پیش خیمہ بنا۔ انھوں نے چیک اینڈ بیلنس کا وہ نظام بھی تشکیل دیا جس کی بنیاد پر امریکی دستور استوار ہے۔

یہ تصور بھی انھی کا دیا ہوا ہے کہ انقلاب بعض صورتوں میں ایک حق ہی نہیں بلکہ ایک فرض کی حیثیت بھی اختیار کر لیتا ہے۔ ان کا یہ عقیدہ جدید جمہوریت کے ایک مرکزی رکن کی حیثیت رکھتا ہے کہ انسان کی خوشی کی جستجو اگر منطقی انداز سے عمل میں لائی جائے تو یہ تعاون پر منتج ہو سکتی ہے اور گروہ کے مشترکہ مفاد سے مطابق اختیار کر سکتی ہے۔ ان کی آخری قابل ذکر تحریر ''عیسائیت کی معقولیت'' (1695ء) میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ عیسائیت کے اخلاقی پہلو کو عقیدے سے زیادہ وزن دیا جانا چاہیے۔ اس میں اور اس طرح کی دیگر تجاویز میں لاک نے مذہبی آزادی اور انسان کے شخصی آزادی کے حق میں ایک زیادہ عمومی اعتقاد کا تصور پیش کیا ہے۔ لاک کے فلسفے اور ان کی سیاسی فکر نے جدید معاشروں پر جس قدر زیادہ اثرات مرتب کیے ہیں ان کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

لوتھر، مارٹن (1483ء۔1546ء)

جرمن مذہبی مصلح اور پروٹسٹنٹ تحریک کے قائد۔ لوتھر جب ارفرٹ یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہے تھے تو شدید گرج چمک کے دوران ان پر آسمانی بجلی گری جس سے ان کی روحانی بیداری کو بہت مہمیز ملی اور انہوں نے درویشوں کے اگسطسی سلسلے میں شمولیت اختیار کر لی۔ بعد ازاں انہوں نے الٰہیات میں ڈاکٹریٹ کیا اور وٹن برگ یونیورسٹی میں بائبلی تفسیر کے پروفیسر بن گئے۔ انہوں نے 1510ء میں جب روم کا دورہ کیا تو انہیں کیتھولک چرچ کی ''روحانی غفلت'' دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ پادریوں کی سزا سے بریت کا رواج تو انہیں بہت ہی برا لگا۔ لوتھر نے 1517ء میں کیتھولک چرچ کے خلاف اپنے مشہور پچانوے نکات لکھے اور پھر اس انتہائی زہریلی تحریر کو وٹن برگ کاسل چرچ کے دروازے پر لگا دیا۔

لوتھر نے کیتھولک مسلک کے بارے میں جو کچھ کہا اس کی مرکزی بات اس کا یہ اعتقاد تھا کہ نجات کیلئے صرف ایمان ہی کافی ہے اور اس کیلئے ایمان اور اچھے اعمال دونوں کا ہونا ضروری

http://muftbooks.blogspot.com/

نہیں۔لوتھر نے نہ صرف پادریوں کی سزا سے بریت کی مخالفت کی بلکہ اس نے جرمن گرجوں پر جرمن کنٹرول کی حمایت کر کے پوپ کی حاکمیت کو بھی چیلنج کر دیا تھا۔اس پر رومن کی مقدس سلطنت نے ان پر پابندی عائد کر دی اور انہوں نے جرمنی کے شہر وارٹ برگ میں ڈیرہ لگا لیا جہاں انہوں نے کیتھولک مسلک کے خلاف تحریر وتقریر اور مظاہروں کا سلسلہ جاری رکھا جس سے جرمنی اور دیگر ممالک کے مذہبی منظر نامے میں ہلچل مچ گئی۔

لوتھر نے بائبل کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا (عہد نامہ جدید 1522ء، عہد نامہ عتیق 1534ء) اور چالیس مناجات (1524ء) تحریر کیں۔1525ء میں انہوں نے ایک سابقہ راہبہ کیتھرینا فان پورا سے شادی کر لی اور ان کے ہاں چھ بچے پیدا ہوئے۔لوتھر کی مذہبی تحاریر نے فلپ میلانچتھن کی تصنیف ''اعتراف آگسبرگ'' جو کہ لوتھرن چرچ کی بنیاد بنی، کیلئے اساس کا کام کیا۔ان کی حیات و آثار کے دور رس اثرات صرف مذہبی قضیات تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ انہوں نے پوری مغربی دنیا کے سیاسی، مذہبی اور معاشی نظام کو بلا واسطہ یا بالواسطہ طور پر متاثر کیا۔ یورپی نشاۃ ثانیہ کے نظریاتی ناک نقشے کی صورت گری میں جتنا بڑا کردار لوتھر کا ہے شاید ان کے کسی اور ہم عصر کا نہیں۔

لیلیٰ و مجنوں

ایک عرب عشقیہ داستان ۔ لیلی مجنوں کی کہانی عربی، کردی، فارسی، اردو، ترکی اور دیگر بہت سی زبانیں بولنے والے مسلمانوں کے تخیل اور عارفانہ ادب میں ایک مرکزی حیثیت کی حامل ہے۔اس کہانی کے مطابق قیس ابن ملوّہ ایک شاعر تھا اور اس کا تعلق عربوں کے ایک قبیلے بنو سے تھا اور اسے اسی قبیلے کے ایک اور خاندان کی ایک لڑکی لیلیٰ سے عشق ہو جاتا ہے۔لیلیٰ بھی قیس سے پیار کرنے لگتی ہے لیکن لیلیٰ کا باپ اپنی بیٹی کا ہاتھ قیس کے ہاتھ میں دینے سے انکار کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قیس پاگل ہو جاتا ہے اور لوگ اسے مجنوں مجنوں کہہ کر پکارنے لگتے ہیں۔اس کے گھر والے اسے کعبۃ اللہ کی زیارت کیلئے لے جاتے ہیں کہ شاید اس سے وہ ٹھیک ہو جائے لیکن جب مجنوں وہاں پہنچتا ہے تو رب سے یہ دعائیں مانگنا شروع کر دیتا ہے کہ اے میرے اللہ میرے دل میں لیلیٰ کا پیار اور بڑھا دے تا کہ میں ہمیشہ لیلیٰ لیلیٰ ہی پکارتا رہوں۔مجنوں کا حال دیکھ کر ایک مقامی سردار نوفل ابن مساحق لیلیٰ کے گھر والوں سے ملتا ہے اور انہیں رشتے پر راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ نہیں مانتے۔لیلیٰ کا باپ کہتا ہے کہ ہم مر جائیں گے لیکن مجنوں کو اپنی بیٹی نہیں دیں گے۔اس پر نوفل یہ سوچ کر پیچھے ہٹ جاتا ہے کہ کہیں اسے بنو قبیلے والوں کے ساتھ

جنگ میں ہی نہ الجھنا پڑ جائے۔ اتنے میں مجنوں صحرا کو نکل پڑتا ہے اور وہاں درندوں کے ساتھ رہنا شروع کر دیتا ہے (گو اس کی جانم کی یاد بھی اس کے ساتھ ساتھ رہتی تھی) دوسری طرف لیلیٰ کے ابا اس کا بیاہ کسی اور سے کر دیتے ہیں لیکن لیلیٰ وفا کی پتلی ہے، وہ اسے اپنا شوہر ماننے سے انکار کر دیتی ہے۔ آخر میں لیلیٰ مر جاتی ہے اور اسی لمحے مجنوں بھی ایک چٹان سے کود کر جان دے دیتا ہے یا پھر جیسا کہ بعض دوسرے حکایت خوان بتاتے ہیں کہ وہ لیلیٰ کی قبر پر ماتھا رگڑ رگڑ کر مر جاتا ہے۔

اب دیکھنے کو یہ ایک عام سی پریم کہانی ہے لیکن بعض اللہ والے مجنوں کی محبت کی تعبیر عشق حقیقی کے استعارے کے طور پر بھی کرتے ہیں۔ وہ مجنوں کو ایک ایسے مجذوب عاشق کے طور پر پیش کرتے ہیں جو اللہ کی محبت میں اپنا سب کچھ بھول جاتا ہے۔ لیلیٰ و مجنوں کے معاشقے پر مبنی متعدد حکایات اس قصے میں مضمر روحانی جہت کی عکاس ہیں۔ اس قصے میں ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جب لیلیٰ مجنوں سے ملنے صحرا میں آتی ہے لیکن مجنون اس کی طرف آنکھ بھر دیکھنے سے انکار کر دیتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ یہاں سے چلی جا۔ اس کی تشریح میں بعض مہربان یہ بھی کہتے ہیں کہ مجنوں کے قلب و ذہن پر اب خود عشق اس قدر غالب ہو چکا ہے کہ اسے یہ خوف لگنے لگا ہے کہ اگر گوشت پوست کی لیلیٰ اس کے سامنے آئی تو اس کے عشق صادق میں بال آ جائے گا۔

یہ قصہ کئی لوگوں نے مختلف انداز سے نظم میں بیان کیا ہے لیکن فارسی شاعر نظامی گنجوی (وفات 1209ء) کے تخلیق کردہ لیلیٰ مجنوں کے قصے کو سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی ہے۔ تاہم ترک شاعر فزولی (وفات 1556ء) کے بیان کردہ قصے کو بھی اس کا ہم پلہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ فارسی کے ایک اور نامور شاعر جامی (وفات 1492ء) نے جب یہ قصہ لکھا تو اس وقت سے اس کے مرکزی کردار ترکی، ایران اور ہندوستان کے صوفیانہ ادب میں بھی آنا شروع ہو گئے۔

لینن، ولادی میر (1870ء-1924ء)

سوویت یونین کے بانی اور اس کے پہلے سربراہ۔ لینن چھ بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھے اور ان کا اصل نام ولادی میر الیانوف تھا۔ ان کا تعلق ایک بورژوا گھرانے سے تھا لیکن انقلابی سیاست سے ان کا واسطہ بچپن میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ ان کے بڑے بھائی الیکساندر کو 1887ء میں زار روس الیگزینڈر سوم (1845ء-1894ء) کے قتل کی سازش میں ملوث ہونے کے الزام میں پھانسی دے دی گئی تھی۔

لینن نے 1887ء میں یونیورسٹی آف فازان میں داخلہ لیا لیکن تین ماہ بعد انہیں طلباء بغاوت میں حصہ لینے کی بنا پر یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔ اس پر انہوں نے قانون اور دیگر مضامین

http://muftbooks.blogspot.com/

اپنے طور پر پڑھنے کی ٹھانی اور یونہی کبھی پڑھتے پڑھاتے ان کی مڈبھیڑ مارکسیت سے ہوگئی۔ 1891ء میں انہیں بہت منت ترلے کے بعد سینٹ پیٹرز برگ یونیورسٹی کے قانون کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت ملی اور جب نتیجے کا اعلان ہوا تو وہ فرسٹ کلاس میں پاس تھے۔ تب سے انہوں نے سینٹ پیٹرز برگ میں ایک وکیل کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا اور اس دوران ان کے مراسم شہر کے انقلابیوں اور مارکسسٹوں سے بن گئے۔ انقلابیوں کا یہ حلقہ گو اس وقت چھوٹا تھا لیکن اس میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ 1895ء میں مغربی یورپ میں مقیم روس کے جلاوطن انقلابی رہنماؤں سے رابطے بڑھانے کی غرض سے بیرون ملک چلے گئے اور واپسی پر انہوں نے سینٹ پیٹرز برگ کے مارکسسٹوں کو جمع کر کے ''اتحاد برائے جدوجہد آزادی محنت کشاں'' تشکیل دے ڈالا۔ اس تنظیم کی وساطت سے لینن اور ان کے ساتھیوں نے سینٹ پیٹرز برگ کے مزدوروں اور محنت کشوں میں طبقاتی شعور اجاگر کرنے کی کوشش کی جس کیلئے انہوں نے کبھی تو اشتعال انگیز کتابچے چھپوا کر بانٹے، کبھی ہڑتالیں کروائیں اور کبھی مزدوروں کو مارکسی تصورات سے روشناس کرانے کیلئے کلاسوں کا اہتمام کیا۔ دسمبر 1895ء میں ایسا ہوا کہ زار حکومت نے لینن کو ایک سال تک قید میں رکھنے کے بعد انہیں ان کی منگیتر نادزیریہ کراپسکائیہ (جو خود بھی اتحاد کی ایک سرگرم رکن تھیں) کے ہمراہ جلاوطن کر کے سائبیریا بھیج دیا۔ ان دونوں نے سائبیریا جا کر شادی کر لی اور بی بی صاحبہ لینن کی تاحیات سیکرٹری اور رفیقہ بن گئیں۔

لینن 1900ء میں اپنی جلاوطنی مکمل کر کے روس سے یورپ چلے گئے جہاں انہیں اپنے اخبارات اور سیاسی پمفلٹوں میں چھپنے والے مارکسی اشتراکیت پر مذاکروں اور مقالوں کی بدولت خوب شہرت اور اثر ورسوخ حاصل ہوا۔ اس دور کی اپنی اہم تصنیف ''کرنا کیا ہے؟'' (1902ء) میں انہوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ پارٹی کو ایک ہراول دستے کا کردار ادا کر کے محنت کش طبقات تک ایسی تحریک بہم پہنچانا چاہیے کہ وہ بھی اشتراکی انقلاب کی جدوجہد میں شامل ہو جائیں۔ 1903ء میں انہیں روسی سماجی جمہوری مزدور پارٹی کے بائیں بازو کے اس دھڑے کا سربراہ چن لیا گیا جو بالشیویکوں کے نام سے بھی معروف ہوا اور جو ان مینشیویکوں سے ٹوٹ کر الگ ہوا تھا جن میں انقلاب کے جراثیم زیادہ نہ تھے۔

لینن 1905ء کے انقلاب کے دوران روس واپس لوٹ آئے اور سینٹ پیٹرز برگ سوویت (انجمن مزدوراں) تشکیل دینے میں مصروف ہو گئے لیکن جب انقلاب ٹھنڈا پڑا تو وہ پھر روس سے فرار ہو کر باہر چلے گئے (1907ء)۔ انہوں نے باہر رہ کر اپنی انقلابی تحریروں اور

http://muftbooks.blogspot.com/

مظاہروں کا سلسلہ جاری رکھا اور جنگ عظیم اول میں روسی مداخلت کی بھرپور مخالفت کی جسے وہ حریف سامراجی قوتوں کے درمیان نظریاتی اعتبار سے ایک دیوالیہ مقابلے سے تعبیر کرتے تھے۔ وہ 1917ء کے انقلاب فروری کے بعد ایک دفعہ پھر روس واپس آئے۔ اس انقلاب کے نتیجے میں زار روس نکولاس ثانی (1868ء۔1918ء) کی جگہ ایک پارلیمانی حکومت نے لے لی تھی جس کے سربراہ ایک انقلابی رہنما الیکساندر کیرنسکی (1881ء۔1970ء) تھے لیکن لینن نے انقلاب اکتوبر برپا کر کے اس حکومت کا تختہ الٹ دیا۔

لینن نے اقتدار میں آ کر بڑے پیمانے پر اراضی کی تقسیم نو کی اور نجی صنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا۔ انہوں نے مارچ 1918ء میں جرمنی سے امن معاہدہ کر لیا جس سے روس کی پہلی عالمگیر جنگ میں شمولیت کا خاتمہ ہو گیا لیکن 1920ء تک روس میں اندرونی خلفشار زوروں پر رہا۔ بالشیویکیوں کو ایک طرف تو اندرونی دشمنوں کا سامنا تھا اور دوسری طرف برطانیہ، فرانس اور امریکہ کی افواج شمالی روس میں دراندازی کر رہی تھیں۔ لینن نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ خانہ جنگی کے دباؤ کی وجہ سے انقلابی اقتصادی اصلاحات کی ان کی کوششوں کو نقصان پہنچ رہا ہے، نئی ریاست کی نشوونما سے متعلق اپنی پالیسیوں کا از سر نو جائزہ لینے کا عمل شروع کیا اور 2-1921ء میں نئی معاشی پالیسی متعارف کرانے کا اعلان کر دیا جس کے مطابق ملک کی ڈوبتی ہوئی معیشت کو سہارا دینے کیلئے ایک محدود سطح پر نجی کاروبار کی اجازت دے دی گئی۔

بعد میں آنے والے روسی رہنما جوزف سٹالن (1879ء۔1953ء) کے برعکس لینن نے اپنی زیادہ توجہ معاشی امور پر ہی مرکوز کیے رکھی اور روس کی ثقافتی زندگی کو کنٹرول کرنے میں زیادہ دلچسپی نہ لی جو کہ انقلاب کے بعد کے ابتدائی دور میں avant-garde کے پھلنے پھولنے کی بڑی وجہ تھی۔ تاہم لینن نے ثقافتی امور میں جس تحمل و رواداری کا مظاہرہ کیا سیاسی میدان میں وہ تحمل و رواداری دیکھنے میں نہ آئی اور انہوں نے 1918ء میں بالشیویکیوں کے نظریاتی دشمنوں کے خلاف استبدادی کارروائیاں شروع کر دیں۔

لینن نے پے در پے دل کے دوروں کی وجہ سے مسلسل خراب ہوتی صحت کے باوجود سوویت اشتراکی جمہوریتوں کے اتحاد کی تشکیل میں بھرپور کردار ادا کیا۔ یہ تنظیم نو کا وہ وفاقی نظام تھا جسے وہ سٹالن کی وحدانی سکیم کے مقابلے میں زیادہ بہتر خیال کرتا تھا۔ اب کے لینن کو دل کا ایک دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ ان کی نعش کو ماسکو کے مشور سرخ چوک میں ایک بہت پرشکوہ مقبرے میں رکھا گیا۔

لیونارڈو ڈاونچی (1452ء۔1519ء)

http://muftbooks.blogspot.com/

ایک شہرہ آفاق اطالوی مصور۔ لیونارڈو کا شمار نشاۃ ثانیہ کی عظیم ترین شخصیات میں ہوتا ہے۔ وہ ایک کثیر الجہتی اور نابغہ روزگار شخصیت کے مالک تھے جن کی جولانی طبع نے کئی شعبوں میں جوہر دکھائے۔ ان میں تحیر اور استفہام کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ہم انہیں کبھی تو بادشاہوں کے درباری مصور کے روپ میں دیکھتے ہیں، کبھی ایک انجینئر کے طور پر اور کبھی ایک ماہر طبیعیات کی حیثیت سے قوانین حرکت پر تحقیقات کرتے۔ ان تمام کاوشوں میں انہیں اپنے طاقتور بصری تخیل سے بہت مدد ملی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ایک تربیت یافتہ ذہن کا جوہر اس چیز کا عرفان ہوتا ہے کہ وہ دیکھے کیسے۔

لیونارڈو کو فن مصوری سے عشق پندرہ سال کی عمر میں اس وقت شروع ہوا جب انہوں نے ایک معروف مصور آندریا ڈیل وروچیو کی شاگردی اختیار کی۔ لیونارڈو نے مصوری اور مجسمہ تراشی کے فن کے ابتدائی سبق انہی سے سیکھے۔ انہوں نے اپنے اس ابتدائی دور میں قلم اور پنسل کی مدد سے میکانکی آلات کے بہت سے خاکے تیار کیے اور انہیں 1472ء میں فلورنس کے مصوروں کے گلڈ میں شامل کر لیا گیا۔

کئی برس فلورنس میں بتانے کے بعد لیونارڈو 1482ء میں میلان چلے گئے جہاں انہوں نے میر میلان کی سرپرستی میں سترہ برس تک کام کیا۔ وہ شاہی گھرانے کے مصور کی حیثیت سے درباری تقاریب کا اہتمام کرتے تھے اور میر میلان کے تعمیراتی منصوبوں کی نگرانی کرتے تھے۔ اگرچہ عام لوگ انہیں محض ایک مصور کے طور پر جانتے ہیں، وہ میلان میں رہ کر صرف چھ عدد تصاویر بنا سکے جن میں ''پہاڑی کی کنواری'' (85-1483ء اور 1494ء۔1508ء) کی دو تصویریں اور ''عشائے آخر'' والی تصویر (97-1495ء) شامل ہے۔

اس دور کا ایک اور یادگار فن پارہ سفروزہ خاندان کے جد امجد فرانسیسکو سفروزہ کا مجسمہ ہے جس میں اسے ایک گھوڑے کی پیٹھ پر سوار دکھایا گیا ہے۔ انہوں نے اس مجسمے پر بارہ برس تک سوچ بچار کی اور گھوڑوں کے خدوخال، حرکات و سکنات پر کئی خاکے تیار کیے۔ پہلے گھوڑے کا مٹی سے بنا ایک نمونہ 1492ء میں نمائش کیلئے رکھا گیا لیکن اصل یادگار اس وقت تیار کی گئی جب جنگ کے بڑھتے ہوئے خدشے کے پیش نظر حکام نے دھات کے تمام ذخیرے کو توپوں کیلئے مختص کرنا شروع کیا۔

لیونارڈو کی سائنس کے شعبے میں دلچسپی میلان میں آ کے سامنے آتی ہے جہاں انہوں نے آرٹ اور سائنس کے باہمی تعلق کے متعلق اپنے نظریات و تجربات کو تحریری شکل دینا شروع کی۔ ان کا اعتقاد تھا کہ تصویر تحریر سے کہیں زیادہ اظہار کی طاقت کی حامل ہوتی ہے لہٰذا ہمیں ان کی تصانیف خاکوں اور تصویروں سے بھری ملتی ہیں۔ لیونارڈو کے ایک اطاعت شعار شاگرد فرانسیسکو مالکسی نے 1540ء سے 1550ء تک کے عرصے میں ان کے تمام شذرات و تبصرات کو جمع

http://muftbooks.blogspot.com/

کر کے انہیں ایک کتاب ''مقالہ دربارۂ مصوری'' کی شکل دے دی۔ اس میں فن مصوری پر ہدایات اور مصور کے کام پر رویا کا بحیثیت رہنما قوت تجربہ شامل ہے۔انہوں نے جیومیٹری کی اہمیت، تناظر اور روشنی اور اس کے مصوری سے تعلق پر بھی اظہار خیال کیا۔

لیونارڈو 1500ء میں فلورنس واپس چلے آئے جہاں انہوں نے اپنے بعض مشہور ترین شاہکار تخلیق کئے۔1503ء میں انہیں پلازو وتیچیو کے ایوان پانصد کیلئے جنگ انغیاری کی یاد میں ایک طغری مصور کرنے کیلئے کہا گیا(06-1503ء)۔

لیونارڈو نے اس طغرے پر تین سال سے زائد عرصہ تک کام کیا اور اجسام کے تناسبات کا انتہائی باریک بینی سے خیال رکھتے ہوئے بہت سی ابتدائی تصاویر تیار کیں۔لڑائی کے میدان میں بھاگتے دوڑتے اور بل کھاتے گھوڑوں کی حرکات وسکنات نے انہیں فن مصوری میں اپنی یکتائی ثابت کرنے کا موقع فراہم کیا۔تاہم یہ طغریٰ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔انہوں نے اپنی شاہکار تصویر مونالیزا(06-1503ء) بھی اسی دور میں تیار کی۔

1506ء میں لیونارڈو کو ایک بار پھر میلان آنے کو کہا گیا۔سیاسی حالات بہت خراب تھے، اس لئے انہیں 1513ء تک وہیں رکنا پڑا۔اس دوران انہوں نے ایک نیا شغل اپنایا اور بدنیات پر تحقیق شروع کر دی۔انہوں نے انسانی جسم کے بارے میں اپنے علم کو بہتر بنانے کیلئے کم از کم تیس انسانی لاشوں کے چیر پھاڑ میں حصہ لیا ہوگا۔ بعد ازاں وہ روم بھی گئے جہاں انہیں پے در پے مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہ گئے اور مائیکل اینجلو اور ڈونیٹو برامانتے جیسے نوجوان مصوروں کی مانگ میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ لیونارڈو نے اپنے آخری برس فرانس میں گزارے جہاں وہ ''مصور اول'' کے درجے پر فائز ہوئے اور انہیں یہ آزادی دی گئی کہ جیسے ان کا من چاہے وہ کام کریں۔لہٰذا انہوں نے اپنا زیادہ وقت فنی اور ریاضیاتی تعلیم وتحقیق کو دینا شروع کر دیا۔

م

مارکس، کارل (1818ء۔1883ء)

جرمن نژاد معاشی اور معاشرتی فلسفی ۔ مارکس پروشیا کے ایک مقام تریوز (تری یر) پر ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ جب وہ چھ سال کی عمر کو پہنچے تو ان کے والد نے پورے خاندان

http://muftbooks.blogspot.com/

سمیت عیسائیت قبول کر کے لوتھر مسلک اختیار کر لیا۔ بون اور برلن کی یونیورسٹیوں میں اپنے زمانہ طالب علمی کے دوران مارکس نے قانون، تاریخ اور فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔ وہ جرمن فلسفی ہیگل (1770ء۔1831ء) کی تحریروں سے بہت متاثر تھے جن کے جدلیاتی تاریخ کے نظریات، خود مارکس نے بھی مستعار لئے۔ انہوں نے 1841ء میں ینا یونیورسٹی سے یونانی فلسفے میں پی ایچ ڈی کی اور پھر صحافت کے شعبے سے منسلک ہو گئے۔ انہوں نے 1842ء میں کولون کے ایک اخبار کے ایڈیٹر کے طور پر کام کیا اور اگلے برس ایک خاتون جینی فان ویسٹ فالن سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ہی ان کا اخبار بند کر دیا گیا اور وہ پیرس ہجرت کر گئے جہاں انہیں فرانسیسی اشتراکیت سے آشنائی ملی اور فلسفی فریڈرک اینگلز (1820ء۔1895ء) سے عمر بھر کا ساتھ بنا۔ ان کی تصنیف ''معاشی اور فلسفیانہ تحریریں'' (1844ء) میں ہمیں ان کے ان بہت سے نظریات و تصورات کے ابتدائی خاکے ملتے ہیں جنہیں بعد میں انہوں نے اپنی موخر تحریروں میں نشوونما دی۔ 1845ء میں مارکس کو فرانس سے نکال دیا گیا جس پر وہ برسلز چلے گئے جہاں ان کے محنت کشوں کی تحریک سے پہلی بار رابطہ استوار ہوا۔ برسلز قیام کے دوران مارکس اور اینگلز نے مل کر ''اشتراکی منشور'' (1848ء) لکھا جس میں انہوں نے مزدوروں کی جدوجہد کی حمایت کی اور لوگوں کو انقلابی عمل شروع کرنے کی دعوت دی۔ 1849ء کے یورپی انقلاب کے دوران مارکس کو برسلز سے نکال دیا گیا جس پر وہ پہلے پیرس منتقل ہوئے اور پھر واپس کولون چلے آئے اور اپنا وہی پہلے والا اخبار دوبارہ نکالنا شروع کر دیا۔ لیکن انہیں بغاوت کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ انہیں اس مقدمے سے رہائی تو ملی لیکن 1849ء میں انہیں پھر جلاوطن کر دیا گیا۔

مارکس نے اپنی بقیہ تمام عمر لندن میں گزاری جہاں وہ ہوریس گریلی کے نیویارک ٹرائبیون کیلئے مضامین لکھتے رہے۔ اس دوران انہوں نے تاریخ نگاری پر اپنی دو شاہکار تصانیف ''فرانس کی طبقاتی کشمکش، 1850ء۔1848ء اور ''لوئی نپولین بونا پارٹ کا اٹھارہواں برمیئر'' (1852ء) لکھیں جس کے دوران انہیں اینگلز کا مسلسل اور بھرپور مالی تعاون حاصل رہا۔

مارکس مستقل غربت، ناسازی طبع اور اپنے تین بچوں کی موت کے باوجود برسوں برٹش میوزم لائبریری میں بیٹھ کر سرمایہ داریت پر اپنی مشہور زمانہ کتاب ''سرمایہ'' کیلئے تحقیق و تصنیف کرتے رہے۔ ان کی زندگی میں اس کتاب کی صرف پہلی جلد (1867ء) شائع ہو سکی۔ بقیہ دو جلدیں ان کے انتقال کے بعد اینگلز نے مدون کیں اور وہ 1885ء اور 1894ء میں منظر عام پر آئیں۔ مارکس نے 1864ء میں محنت کشوں کی عالمی انجمن تشکیل دی (جسے فرسٹ انٹرنیشنل بھی کہا جاتا

http://muftbooks.blogspot.com/

ہے) لیکن 1872ء میں انارکی پسند رہنما میخائل بکونن سے اہداف پر تنازعے کی بنا پر اس تنظیم کو توڑ دیا۔

مارکس کی بہت سی تصانیف انسانی تاریخ وثقافت کو یکجا کر کے دیکھنے کی کوششوں کے نتیجے میں وجود میں آئیں اور انہوں نے فلسفے، معاشیات اور معاشرے کی ایک نئے اور مفصل انداز سے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے روایتی فلسفے پر طبقاتی نسبت کا الزام لگا کر مسترد کر دیا جو ان کے خیال میں حقیقی انسانی تجربے کی جگہ منطق وانصاف کے تخیلاتی تصورات سے پر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی بجائے انہوں نے تاریخی مادیت کا تصور پیش کیا جس کی رو سے معاشی حالات ہی بقیہ تمام چیزوں کو متعین کرتے ہیں اور پیداواری طریقوں سے انسانی زندگی کے ہر پہلو متاثر ہوتا ہے۔ سرمایہ داری نظام میں انسانی محنت کا استحصال کیا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ تبادلہ اشیاء سے آنے والا زیادہ سے زیادہ منافع پیسہ لگانے والے کے حصے میں آئے۔ پہلے کے کاریگروں کے برعکس، صنعتی کارکنوں اور ان کی تیار کردہ مصنوعات کے درمیان فاصلہ پیدا کر دیا جاتا ہے اور انہیں ان کی محنت کے ثمر سے صرف اس قدر دیا جاتا ہے کہ ان کا بس گزارہ چلتا رہے اور وہ مزید مزدور پیدا کرتے رہیں۔ جدلیاتی اعتبار سے تاریخی نشوونما کے وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو سرمایہ داریت فقط ایک واحد مرحلہ ہے۔ مارکس کا خیال تھا کہ آخر کار کارکن ذرائع پیداوار پر قابض ہو جائیں گے اور ''اپنے شعوری اور مقصدی کنٹرول کے تحت پیدا کاروں کی ایک آزاد انجمن بنالیں گے''۔ اس سے کمیونزم ''یعنی ایک غیر طبقاتی اور اجتماعی نظام کی راہ ہموار ہوگی جس میں تبادلہ قدر کے وسیلے کے طور پر دولت (جو کہ چند افراد کے ہاتھوں میں مرتکز ہو سکتی ہے) کی جگہ ضرورت کے مطابق اشیاء کی تقسیم لے سکتی ہے۔

مارکسیت اس اعتبار سے ایک ''سائنسی'' نظریہ ہے کہ انسانی دکھ کی مذہبی، اخلاقی اور مابعد الطبیعیاتی توجیہات کو خاطر میں نہیں لاتا اور صرف معاشی قوتوں کو ہی توجہ کے قابل سمجھتا ہے۔ مارکس اور اینگلز کے نزدیک ہیگل کی جدلیت صرف نظریوں کی ہی نہیں بلکہ معاشی نظاموں کے ارتقاء پر بھی روشنی ڈالتی ہے یعنی متضاد ومتخالف قوتیں ایک نئے ''تالیفی'' نظام میں منتج ہو جاتی ہیں۔ اس تاریخی دھارے میں اپنے مقام کو سمجھنے کی تگ ودو کر کے مارکس نے ناداری ومحرومی کے شکار محنت کشوں کو ترغیب دی کہ وہ اپنی صورتحال سے آگاہی حاصل کریں اور اسے بدلیں تاکہ سماج میں تبدیلی ممکن ہو سکے۔

مارکس کے فلسفے نے بیسویں صدی کی فلسفیانہ اور انقلابی فکر کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے اور اسے پوری دنیا میں کمیونسٹوں اور اشتراکیوں کی تحاریک کے لئے ایک سنگ بنیاد کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

ماؤزے تنگ (1893ء۔1976ء)

عوامی جمہوریہ چین کے بانی۔ ماؤزے نے ہنان صوبے کے ایک خوشحال کسان گھرانے میں آنکھ کھولی۔انہوں نے نوعمری میں معاشرتی علوم میں بہت رغبت اور قابلیت ظاہر کی۔1918ء میں جبکہ ان کی عمر پچیس برس تھی، وہ بیجنگ آ گئے اور یہاں کی نیشنل یونیورسٹی میں اسسٹنٹ لائبریرین کے طور پر کام کرنے لگے۔اس ملازمت کے دوران انہیں بہت سی کتب، جرائد اور رسائل پڑھنے کا موقع ملا اور جلد ہی انہوں نے سیاسی تحاریک میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ وہ 1921ء میں چینی کمیونسٹ پارٹی (سی سی پی) کے پہلے اجلاس میں شریک ہوئے جو شنگھائی میں ایک کشتی پر خفیہ طور پر بلایا گیا تھا۔اس طرح انہیں اس جماعت کے بانی رکن بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔

چھ برس بعد جب گومن تانگ (قوم پرست جماعت) جس کی قیادت چیانگ کائی شیک کر رہے تھے، نے بڑے شہروں میں اشتراکیت پسندوں پر حملہ کیا تو ماؤ اور اس کے ساتھیوں نے ہنان میں شورشوں کا آغاز کر دیا۔اس دور میں وہ دیہی انقلاب کے ایک پکے حامی بن چکے تھے۔انہوں نے ژوتے اور دیگر اشتراکی معززین کے ساتھ مل کر جیانگ شی میں سرخ فوج کی بنیاد رکھی تاہم ان کے خیالات کو سی سی پی کی مرکزی مجلس میں پذیرائی 1935ء میں کہیں اس وقت جا کے ملی جب انہوں نے چھ ہزار میل کے لانگ مارچ میں اشتراکی دستوں کی قیادت کی۔ اشتراکیوں نے یہ سفر گومنتانگ سے بچنے کیلئے اختیار کیا تھا۔ یہ لوگ جب پناہ کی غرض سے زینی کے شہر میں پہنچے تو ماؤ کو پارٹی کا چیئرمین منتخب کر لیا گیا۔ پھر وہ ینان چلے گئے جو کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔

جنگ عظیم دوم کے دوران ماؤ نے جاپانی یلغار کا مقابلہ کرنے کیلئے جیانگ کائی شیک سے مذاکرات کر کے ایک متحدہ محاذ تشکیل دے ڈالا۔ جب 1945ء میں جاپان نے ہتھیار ڈالنے کا اعلان کیا تو اشتراکیوں اور قوم پرستوں کے درمیان اتحاد بھی ختم ہو گیا اور دونوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی جس میں ماؤ اور ان کے ساتھی انتہائی موثر دیہی گوریلا جنگی حکمت عملیوں کو بروئے کار لائے۔ قوم پرستوں کی امریکی پشت پناہی کے باوجود ماؤ کی فوج کو فتح حاصل ہوئی اور انہوں نے چیانگ کائی شیک کو تائیوان میں دھکیل دیا اور 1949ء میں عوامی جمہوریہ چین کے قیام کا اعلان کر دیا۔

ماؤ اگلے ستائیس برس تک چین کے سیاسی افق پر ایک عظیم قائد کی حیثیت سے چھائے رہے۔انہوں نے ملک میں کئی سیاسی و معاشی تحریکیں چلائیں۔ اراضی اور دولت کی از سر نو تقسیم کی اور چینی زندگی اور سماج میں انقلاب برپا کر کے رکھ دیا۔ لیکن ان کی اراضی کی اصلاحات

http://muftbooks.blogspot.com/

(1949-53ء) اور ثقافتی انقلاب (1966-76ء) جیسی بعض پالیسیوں کے نتائج اچھے نہ نکلے۔ اگرچہ ماؤ شروع میں سوویت یونین کو ایک قریبی کمیونسٹ حلیف تصور کرتے رہے لیکن ان کے نظریات سوویت یونین والوں کو اچھے نہ لگے اور دونوں ملکوں میں تین عشروں تک ٹھنی رہی۔ چین نے نئے اتحادی تلاش کرنے شروع کر دیئے اور تیسری دنیا کے ممالک میں ایک بہت با اثر مقام حاصل کر لیا۔ 1972ء میں ماؤ نے بیجنگ میں امریکی صدر رچرڈ نکسن سے ملاقات کر کے مغربی دنیا سے قریبی تعلقات کی بنیاد رکھی۔ 1976ء میں ان کا انتقال ہوا۔

مائیکل اینجلو (1475ء۔1564ء)

اطالوی مجسمہ ساز، شاعر۔ مصور اور ماہر فن تعمیر۔ مائیکل اینجلو بوناروٹی ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئے۔ جسے اپنے خالص فلورنسی اشرافیہ سے حسب نسب پر بہت فخر تھا۔ تاہم مائیکل اینجلو کو اس حسب نسب سے چنداں دلچسپی نہ تھی کیونکہ ان کے والدین کا تفاخر ان کے مصور بننے کی راہ میں حائل ہو رہا تھا۔ انہوں نے اپنی تربیت کا آغاز فلورنس کے ایک مصور کی شاگردی سے کیا۔ تاہم جب ان کی مجسمہ سازی میں صلاحیت ظاہر ہوئی تو وہ میڈیچی اکیڈیمی میں منتقل ہو گئے اور عظیم اطالوی فنکار ڈونا ٹیلو (اندازاً 1386ء۔1466ء) کے ایک سابق شاگرد برٹولڈو جیووانی سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ یہاں رہ کر انہوں نے فلکیات کا مطالعہ بھی شروع کیا جو بعد میں جا کر ان کی مجسمہ سازی کیلئے بہت اہم ثابت ہوا۔ اپنے سرپرست کی وفات اور فلورنس کی سیاسی صورتحال خراب ہونے پر مائیکل اینجلو پہلے بلونیہ آئے اور پھر روم چلے گئے جہاں انہوں نے دو مجسمے باخس (1496ء۔1501ء) اور پائیٹا (1498-99ء) تراشے جس سے ان کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ 1501ء میں وہ فلورنس واپس آئے اور اپنا مشہور مجسمہ داؤد (1501ء۔1504ء) تیار کیا جس نے فلورنسی آرٹ کی علامت کی حیثیت اختیار کر لی۔

1505ء میں پوپ جولیس ثانی نے مائیکل اینجلو سے اپنا مقبرہ بنانے کی فرمائش کی جو 1545ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس مقبرے میں مائیکل اینجلو کا ایک اور معروف مجسمہ موسیٰ (اندازاً 1515ء) بھی نصب کیا گیا۔ تاہم اس اثنا میں مائیکل اینجلو کی تخلیقی قوتوں کا اظہار ایک اور کام یعنی سسٹائن گرجے کے نقش و نگار میں ہوا۔ انہوں نے اس کی چھت کو بائبل کی کتاب آفرینش کے مناظر اور عہد نامہ عتیق میں مذکورہ انبیاء کی تصاویر سے مزین کیا۔ اس چھت کی نقاب کشائی 1512ء میں عمل میں آئی جس کے بعد مائیکل اینجلو کو اپنے وقت یعنی اطالویہ نشاۃ ثانیہ کا عظیم ترین فنکار مانا جانے لگا اور یہ اعزاز پوری عمر ان کے پاس ہی رہا۔

http://muftbooks.blogspot.com/

بعد ازاں مائیکل اینجلو فلورنس واپس آ گئے اور میڈ یچی خاندان کے مقابر کیلئے دن، رات اور شام (1520-24ء) نام کا مجسمہ تیار کیا۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں وہ زیادہ تر روم میں رہے اور انہوں نے اپنی توجہ فن تعمیر پر مرکوز کیے رکھی۔ ان کی عمارتی تخلیقات بھی ان کے مجسموں سے کم نہ تھیں۔ ان کے اس دور کے کارناموں میں سینٹ پیٹر کے گرجے کے گنبد کی تعمیر اور آخری فیصلہ (1536-41ء) نامی وہ تصویر ہے جو انہوں نے سسٹائن گرجے کی دیواروں پر بنائی۔ مائیکل اینجلو نے اپنے پیچھے بہت سے خطوط اور نظمیں بھی چھوڑی ہیں جن میں سے بیشتر ایک کم عمر لڑکے لوماسکو کالوینو کے نام ہیں جس سے انہیں بہت لگاؤ تھا۔ ان کی ادبی نگارشات پہلے مختصر شکل میں ان کے بھائی کے پڑپوتے نے 1623ء میں شائع کیں اور پھر 1863ء میں یہ مکمل طور پر منظر عام پر آئیں جن سے ہمیں ان کے اپنے فن میں استغراق اور ان کی حسن انسانی کے فلاطونی مفہوم اور گناہ و شر کے کیتھولک عقیدے کو ایک دوسرے کی مطابقت میں لانے کی جدوجہد کا پتہ چلتا ہے۔

مایا

وسطی امریکہ کی ایک قدیم انڈین تہذیب۔ مایا سلطنت کا آغاز 1500 ق م میں ہی ہو گیا تھا اور اس کی سرحدیں جنوبی میکسیکو، گوئٹے مالا اور شمالی بیلیز تک پھیلی ہوئی تھیں۔ شروع کی ایک کلاسیکی مایا ثقافت زیپاٹیک کے بارے میں بہت کم معلومات ہم تک پہنچی ہیں تاہم اس کے بارے میں ایک بات عیاں ہے کہ اس کے زرعی دوروں کے تعین کیلئے لازم قدیم کیلنڈر کاہنوں کی حفاظت میں رہتے تھے اور وہی ان کی تعبیر کرتے تھے۔ یہ بھی معروف ہے کہ کیلنڈروں کا یہ علم مذہبی و عقلی سرگرمی کی معراج کے مترادف تھا۔ کوہ البان اور متلا جیسے ان بڑے بڑے مندروں کی تعمیر کا کام بھی اہل زیپوٹیک نے ہی شروع کیا جن میں کاہن لوگ مذہبی رسومات ادا کرتے تھے۔ ایک موخر سا یا زبان یوکاٹیک بھی زیپاٹیک ثقافت سے بھی ماخوز ہے۔

اپنے عروج کے دنوں میں کلاسیکی مایا تہذیب (250ء-900ء) ایک مذہبی اشرافیہ تھی جس پر الوہی نیابت کے تحت حکومت کی جاتی تھی۔ کہانت ورثے میں ملتی تھی اور اس کیلئے بہت زیادہ تعلیم حاصل کرنا پڑتی تھی اور اسے مذہبی و اخلاقی زندگی کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ جاگیرداری نظام کے تحت کسان طبقے کے بنیادی پیشے پارچہ بافی اور کھیتی باڑی تھے۔ مایا سماج مختلف طبقوں میں منقسم تھا۔ سب سے اوپر حکمران خاندان تھا، پھر انتظامیہ، افسر شاہی، دانشور (کاہن، معمار اور کاتب) کاریگر اور سب سے آخر میں عام مزدور اور کسان آتے تھے۔ لوگوں کا

http://muftbooks.blogspot.com/

اعتقاد تھا کہ شاہی خاندان کے افراد کو کوئی اور مٹی لگی ہے اور کسان اور مزدور کسی اور مٹی سے بنے ہیں۔ اشرافیہ گھرانے کاہنوں کے ساتھ شہروں کے وسط میں رہتے تھے۔ وہ ذہانت اور بڑے خاندان کی علامت کے طور پر اپنے نومولود بچوں کی پیشانیاں چپٹی اور دانت ریتی کی مدد سے نوکیلے کر دیتے تھے اور ان پر قیمتی پتھر چڑھا دیتے تھے۔

اس خطے کے لوگ مایہ کھنڈرات کی تعظیم اب بھی مقدس مقامات کے طور پر کرتے ہیں اور وہ ان کی زیارتوں کے لئے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر آج کے دور کے مایا باشندے جنوب وسطی یوکاٹان ریاست کے ایک مقام چچن اتسا کے بڑے مندر کی زیارت کو اس موقع پر جاتے ہیں جب سورج برج میزان کے پہلے خط میں پہنچتا ہے۔ وہ یہاں مندر پر پڑنے والے سانپ کی شکل کے سائے کو دیکھنے جمع ہوتے ہیں جسے بارآوری سے منسوب بارش دیوتا چاک مول کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔ قدیم مایا نسل کے بہت سے لوگ عیسائی مذہب قبول کر چکے ہیں لیکن ان کے بہت سے بھائی بند ایسے بھی ہیں جو کسی نہ کسی صورت میں اب بھی بارش کے دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔

مایا باشندے اپنے فن تعمیر اور نظام تحریر کی وجہ سے مشہور تھے اور فلکیات اور ریاضی کے میدان میں وہ اہل رومہ سے کئی ہاتھ آگے تھے۔ کولمبس سے قبل امریکہ میں پائے جانے والا واحد تحریری نظام انہی کا وضع کردہ تھا۔ تصویری حروف پر مبنی یہ نظام تیسری صدی میں شروع ہوا اور سترھویں صدی کے آخر تک اپنے ارتقاء کو پہنچا۔ اس طرز کے خط کی تحریریں پتھر کی سلوں پر کھدی ملتی ہیں۔ مایا تہذیب پر میکسیکن ثقافت کے اثرات پہلے اہل ٹولٹک اور پھر اہل ایز ٹیک کے توسط سے پہنچے انہیں تلاچتلی رقص گاہوں اور نہوا تیل زبان کی مایا تطبیق میں بخوبی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اکسمل نے اپنا مایا پن برقرار رکھا لیکن چچن اتسا اہل ٹولٹیک اور اہل ایز ٹیک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

مایا باشندوں کے اپنے عظیم شہروں سے بکھراؤ کا عمل آج بھی ایک پراسرار معاملہ ہے تاہم مایا تہذیب (اندازاً 900ء۔1519ء) کے زوال کے مقبول ترین نظریے کے مطابق یہ تہذیب جنگلات جل جانے کے بعد زمین کی زرخیزی کم ہونے اور ہلواہی اور بار برداری کے جانوروں میں کمی کے سبب اجڑی، جب اہل سپین نے سولہویں صدی کے اوائل میں یہ خطہ تسخیر کیا تو مایا باشندے زیادہ تر اپنے پرکھوں کے شہروں کے بیرون میں واقع پہاڑیوں پر آباد تھے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم

http://muftbooks.blogspot.com/

رسول خدا۔ اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ جزیرہ نما عرب کی شہر مکہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حضرت عبداللہ آپ کی ولادت سے قبل ہی دنیا سے جا چکے تھے۔ آپ کا تعلق قبیلہ قریش سے تھا اور آپ کی والدہ حضرت آمنہ کی وفات کے بعد آپ کی پرورش آپ کے دادا حضرت عبد المطلبؓ اور چچا حضرت ابو طالبؓ نے کی۔ آپ جب بلوغت کو پہنچے تو مکہ کی ایک متمول خاتون حضرت خدیجہ کے تجارتی نمائندے کے طور پر کام کرنے لگے۔ بعد ازاں وہ آنحضورؐ کے عقد میں آ گئیں اور ان کے ہاں چار بچوں نے جنم لیا۔

610ء میں حضرت محمدؐ پر جبرئیلؑ کی وساطت سے اللہ کی پہلی وحی نازل ہوئی اور آپ نے اللہ کا پیغام دوسروں تک پہنچانا شروع کیا۔ آپ کی بعثت سے وصال تک آپؐ پر وقفے وقفے سے وحیوں کا نزول ہوتا رہا جنہیں بعد ازاں مدون کر کے قرآن پاک کی شکل دی گئی۔

اسلام سے قبل عرب کے لوگ شرک و کفر میں مبتلا تھے اور وہ بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ آنحضور ﷺ کی تعلیمات نے پرانے نظام کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس دور کے مکہ میں مروج قبائلی اور تجارتی نظام خاص طور پر بہت متاثر ہوا۔ آپ نے جب ایک خالق اور بلا لحاظ رنگ و نسل اور قوم و جنس تمام انسانوں کی برابری کا درس دیا تو بہت سے عرب سرداران کے دشمن بن گئے۔ بعد میں مدینہ کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور آپ کو اپنے پاس آنے کی دعوت دی جس پر آپ نے 622ء میں اپنے ساتھیوں سمیت ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے۔ اسلامی تقویم کا آغاز بھی اسی ہجرت سے ہوا۔ اس لئے اسے ہجری تقویم بھی کہا جاتا ہے۔ مدینہ میں ایک نئی اسلامی سیاسی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ اس سے بعد کے سات برسوں میں مدینہ کے مسلمانوں اور کفار مکہ کے درمیان کئی معاہدے اور جنگیں ہوئیں اور 629ء میں آپ ایک فاتح کی حیثیت سے مکہ واپس آئے اور واپس آنے کے بعد انہوں نے ماضی کے سب دشمنوں کو معاف کر دیا۔

آپؐ کا وصال مدینہ منورہ میں ہوا اور اس کے بعد اسلامی تہذیب و ثقافت دنیا کے کونے کونے میں جا پہنچی۔ اسلامی عقیدے کے مطابق محمدؐ خاتم الانبیاء ہیں اور آپ جناب کی رحلت کے بعد نبوت کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند ہو چکا ہے۔ آپؐ حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح اللہ کے برگزیدہ رسول تھے لیکن مسلمان ان کی پوجا نہیں کرتے بلکہ ان کی تعظیم کرتے ہیں۔ آپ کے اسوہ حسنہ کی پیروی کو اپنے لیے باعث سعادت خیال کرتے ہیں۔ حضرت محمدؐ نے اخوت و مساوات کی تعلیم عام کرنے کے ساتھ لوگوں کو حاجت مندوں اور مظلوموں سے ہمدردی کا درس بھی دیا۔ انہوں نے یتیموں، بیواؤں اور بے سہارا لوگوں کی اعانت اور ان پر

http://muftbooks.blogspot.com/

شفقت پر خصوصاً بہت زور دیا۔ وہ بیواؤں کی نگہداشت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے خدیجہؓ کی وفات کے بعد متعدد خواتین سے نکاح کیا۔ آنحضرتؐ کی پیاری بیٹی حضرت فاطمہؓ کی شادی آپؓ کے چچازاد بھائی حضرت علیؓ سے انجام پائی جنہوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد چوتھے مسلم خلیفہ کا منصب سنبھالا۔ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہ کی شادی سے حضرت امام حسین اور امام حسن پیدا ہوئے۔ حضرت علیؓ اور ان کے کنبے کے بقیہ افراد کو مسلمان اہل بیت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

مرابطین

مسلم مذہبی پیشوا۔ شمالی افریقہ کے لوگوں میں مرابطین کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ آج کل وہ زیادہ تر الجیریا میں پائے جاتے ہیں۔ مرابطین غالباً عربی کے لفظ مرابط سے ہے جس کا مطلب رباط یا ایسی قلعہ بند خانقاہ میں رہنے والا ہے جو مذہبی بھی ہو اور عسکری بھی۔ گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں مرابطین شمال مغربی افریقہ سے نکل کر سپین تک پھیل گئے۔ ان کا احترام خدا کے برگزیدہ ولیوں کی طرح کیا جاتا تھا۔ گیارہویں اور بارہویں صدی میں مراکش اور سپین کے بعض علاقوں کے فرمانروا جنھیں المووادی کہا جاتا تھا انہی کی اولاد تھے۔ انیسوی صدی میں لڑی جانے والی سینی گیمبیا کی جنگوں میں یہ اصطلاح آرتھوڈوکس مسلمانوں کیلئے استعمال کی جاتی رہی۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ لفظ اپنا عسکری مفہوم کھو بیٹھا ہے۔

مرٹن، ٹامس (1915ء۔1968ء)

امریکی رومن کیتھولک راہب، ادیب اور ایک معاشرتی نقاد۔ مرٹن کو ان کی تحریروں اور سماجی کاموں کی وجہ سے ان کی زندگی میں ہی بین الاقوامی شہرت مل گئی تھی۔

ٹامس مرٹن نے جنوبی فرانس کے ایک قصبے پریڈز میں آنکھ کھولی۔ ان کے ابا ایک امریکی اور والدہ نیوزی لینڈ سے تھیں اور دونوں مرٹن کے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ مرٹن نے جوانی کا زمانہ فرانس، برطانیہ اور امریکہ کے مختلف مقامات پر تنہائی کے عالم میں گزارا۔ مرٹن سکاٹ لینڈ کے ایک ہائی سکول اور چند سال تک کیمبرج یونیورسٹی میں پڑھے اور اس کے بعد انہوں نے نیو یارک پہنچ کر 1935ء میں کولمبیا یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ انہوں نے اس ادارے کے مزاحیہ رسالے کیلئے کام کیا، اس کے مجلّے کی ادارت کی، ایک سلسلے کے ساتھ رہے، بانکوں چھبیلوں والے پہناوے پہنے اور خوب عیاشی کی زندگی گزاری جس کی انہوں نے بعد میں خود مذمت بھی کی۔

http://muftbooks.blogspot.com/

مرٹن 1941ء میں کنٹکی کی ایک خانقاہ میں داخل ہو گئے جہاں کی زندگی بہت سخت تھی۔ اس خانقاہ کے ساکنوں کو مسلسل کڑی مشقت میں سے گزرنا پڑتا تھا اور انہیں باہر جانے کی اجازت بھی شاذ و نادر ہی ملتی تھی۔ مرٹن نے یہ پر مشقت زندگی بڑی خندہ پیشانی سے گزاری اور اپنے ستائیس برس اسی خانقاہ میں ہی بتا ڈالے۔ مرٹن نے اپنی مشہور ترین تصنیف ''سات منزلہ پہاڑ'' (1948ء) میں اپنی ابتدائی زندگی اور اس خانقاہ میں آمد کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

بعد میں مرٹن کا دل تنہائی کی اس خانقاہی زندگی سے اوبھ گیا اور وہ ''دنیاوی'' سیاست میں مصروف ہو گئے۔ ان کی مذہبی فکر انجام کار ایک آزاد خیال سیاسی نظریے کی بنیاد بنی۔ جب مرٹن کے لبوں سے یہ الفاظ نکلے کہ ''اے پروردگار'' ہمیں صحیح سوچ والے'' بندے بننے سے بچا۔ یعنی وہ بندے جو اپنی پولیس سے مکمل طور پر متفق ہوتے ہیں''۔ تو وہ ان جذبات کا اظہار کر رہے تھے جو باطناً 1960ء کے عشرے کی تحکم مخالف انقلابی سیاست کے بہت قریب تھے۔

مرٹن نے ویتنام کی جنگ، جوہری اسلحے کی دوڑ اور امریکہ میں جاری نسل پرستی کی کھلم کھلا مخالفت کی۔ وہ 1960ء کے عشرے میں زین بدھ مت میں بھی بہت زیادہ مشغول رہے۔ تصوف کے اس سلسلے میں ان کی دلچسپی اس قدر بڑھی کہ انہیں 1968ء میں ایشیاء کا دورہ کرنا پڑا لیکن وہ اس سفر کے دوران ایک عجیب سے حادثے کے نتیجے میں جاں بحق ہو گئے۔ ہوا کیا کہ انہوں نے بینکاک میں راہبوں کے ایک جلسے کے دوران ایک پنکھے کو مس کیا۔ پنکھا خراب تھا جس سے انہیں شاگ لگا اور وہ موقع پر ہی انتقال کر گئے۔ مرٹن کے تحریری کارناموں میں درج ذیل تصانیف شامل ہیں:

کوئی شخص بھی جزیرہ نہیں (1955ء)

مذہب اور تشدد (1968ء)

زین اور اشتہا کے پنچھی (1968ء)

ٹامس مرٹن کے ایشیائی جرنل (1973ء)

مغل

ہندوستان پر حکمرانی کرنے والے مسلمان بادشاہ۔ مغلیہ خاندان میں کل انیس بادشاہ ہوئے جنہوں نے 1526ء سے 1858ء تک ہندوستان پر حکومت کی۔ مغلیہ سلطنت کی بنیاد ظہیر الدین بابر (اقتدار 30-1526ء) نے رکھی تھی جو ترک النسل فاتح تیمور لنگ (اندازاً 1336ء۔ 1404ء اور منگول جنگجو چنگیز خان (اندازاً 1167ء۔1227ء) کی لڑی سے تھا۔ بابر نے پانی

http://muftbooks.blogspot.com/

پت کی پہلی جنگ (1526ء) میں سلطان ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی اور آگرہ کے علاقوں پر قبضہ کیا لیکن وہ مغلیہ خاندان کی حکومت کے قیام کے چار سال بعد انتقال کر گیا۔ بابر کے بعد ان کا بیٹا ہمایوں (اقتدار 56-1530ء) تخت نشین ہوا جسے سوریوں نے شکست دے کر ایران بھگا دیا۔ سوریوں نے دہلی پر پندرہ برس تک حکومت کی۔ پانی پت کی دوسری جنگ (1556ء) کے بعد مغلیہ حکومت دوبارہ قائم ہوئی اور بابر کے پوتے جلال الدین اکبر (اقتدار 1556ء۔1605ء) کی فتوحات کے نتیجے میں ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی حدیں افغانستان سے لے کر خلیج بنگال اور جنوب میں گجرات اور شمالی دکن تک پھیل گئیں۔ اکبر نے اپنا دارالحکومت فتح پور سیکری منتقل کر لیا۔ مغلیہ دور میں دین اسلام کو ہندوستان میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی لیکن اکبر کا رویہ ہندوؤں کی طرف مصلحت اور مصالحت آمیز رہا اور انہوں نے ہندوستان کے مختلف مذاہب کے عقائد جمع کر کے ایک نیا مذہب دین الٰہی کے نام سے مروج کیا۔ اکبر نے مناصب اور جاگیروں پر مبنی ایک نیا انتظامی ڈھانچہ متعارف کروایا جس سے مغلیہ سلطنت مزید 150 برس تک مستحکم بنیادوں پر رواں دواں رہی۔

اکبر کے بیٹے جہانگیر (اقتدار 1605ء۔ 1627ء) اور پوتے شاہجہان (اقتدار 1627ء۔1658ء) نے مغلیہ سلطنت کی حدود کو مزید توسیع دی۔ آخری عظیم مغلیہ فرمانروا اورنگزیب عالمگیر (اقتدار 1650ء۔1707ء) کے عہد میں یہ سلطنت اپنے عروج پر پہنچی لیکن اس کے ساتھ ہی زوال کے بیج بھی پھوٹنا شروع ہو گئے۔ اورنگزیب نے دکن، گولکنڈہ اور بیجاپور کی مسلم ریاستوں کو فتح کر کے مغلیہ سلطنت کو اور زیادہ وسیع کیا لیکن اس کے بعد کیا ہوا کہ سلطنت کے دور دراز علاقوں میں خلفشار پھوٹ پڑا اور انہوں نے مسلم علماء اور فقہاء کی طاقت بحال کر کے ہندوؤں کو اپنا مخالف بنا لیا اور انھوں نے مغلوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔

اورنگزیب عالمگیر کی 1707ء میں وفات کے بعد 1719ء میں بادشاہ فرخ سیر کو گروہی تنازعات میں قتل کر دیا گیا اور پھر 1720ء اور 1730ء کے عشروں میں ہندو زمینداروں اور مرہٹوں کی بغاوتوں نے سلطنت کو مزید کمزور کر دیا۔ رہی سہی کسر ایرانی فاتح نادر شاہ (اقتدار 47-1736ء) کے حملے نے نکال دیا۔ وہ محمد شاہ (48-1719ء) کے عہد میں ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور اس نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ مغل سلطنت کو پانی پت کی تیسری جنگ (1761ء) میں اس وقت اور بھی نقصان اٹھانا پڑا جب احمد شاہ ابدالی (اقتدار 73-1747ء) نے ہندوستان پر یلغار کر کے مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی (اقتدار 1759ء۔

http://muftbooks.blogspot.com/

1806ء) کوشکست سے دوچار کر دیا تھا۔۔

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور یورپی تجارت کے اثر کے پھیلاؤ سے مغلیہ سلطنت دہلی اور اس کے اڑوس پڑوس کے علاقوں تک سمٹ کر رہ گئی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس بڑھتی ہوئی طاقت کو آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر (اقتدار 57-1837ء) نے چیلنج کیا۔ انہوں نے 1857ء کو جنگ آزادی کی حمایت کا اعلان کیا جس پر انہیں معزول کر دیا گیا اور 1858ء میں رنگون (حال یانگون) جلاوطن کر دیا گیا۔ اس طرح مغلیہ سلطنت کا ٹمٹاتا ہوا چراغ گل ہو گیا اور وہ شاندار دور اختتام کو پہنچا جس کی پہلی اینٹ بابر نے رکھی تھی۔

مغلیہ دور میں آرٹ کے بہت سے یادگار فن پارے اور فن تعمیر کے شاہکار منظر عام پر آئے۔ مغل بادشاہوں کی سرپرستی میں شاہی دربار سے وابستہ فنکاروں نے بہت سے پورٹریٹ تخلیق کئے اور ادبی و تاریخی تصانیف کو تصاویر اور نقش و نگار سے مزین کیا اور اس دور میں گھریلو دھات کاری کنندہ کاری اور نگینہ تراشی نے نمایاں فنون کی حیثیت اختیار کر لی۔ اکبر کے دربار میں بہت سے مقامی ادباء، فضلاء اور فنکار جمع ہو گئے تھے جنہوں نے داستان امیر حمزہ جیسی تخلیقات قلمبند کیں جو کپڑے پر بنی 1400 منی ایچر تصاویر کا ایک سلسلہ تھا۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں مغل سرپرستی میں اسلامی فن تعمیر بھی اپنے عروج پر پہنچا اور لاہور، دہلی، آگرہ اور فتح پور سیکری میں لال پتھر سے عالیشان مساجد تعمیر کی گئیں۔ تاہم اس عہد کی جس عمارت کو دنیا میں سب سے شہرت نصیب ہوئی وہ آگرہ کا تاج محل ہے جو شاہجہان نے اپنی مرحومہ بیگم ممتاز محل کی یاد میں تعمیر کیا تھا۔

منڈیلا، نیلسن (1918ء۔.....)

جنوبی افریقہ کے پہلے سیاہ فام صدر۔ منڈیلا ایک شاہی تمبو گھرانے میں ٹرانسکی کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ان کی پرورش مستقبل کے سردار کے طور پر ہو رہی تھی لیکن جب ان کے ابا فوت ہوئے تو ان کی نگہداشت کی ذمہ داری ان کے ایک کزن پر آ گئی جس نے انہیں ایک اقامتی سکول میں داخل کرا دیا۔ بعد ازاں انہوں نے اور اولیور ٹامبو (ان کے مستقبل کے ایک سیاسی حلیف) نے فورٹ ہیئر یونیورسٹی کالج میں داخلہ لے لیا جہاں سے دونوں کو ایک طلباء ہڑتال میں ملوث ہونے کی بناء پر خارج کر دیا گیا۔

منڈیلا ٹرانسکی چھوڑنے کے بعد جوہانسبرگ چلے گئے جہاں انہوں نے پولیس مین کے طور پر کام شروع کر دیا۔ وہاں انکی ملاقات مستقبل کے ایک اور حلیف والٹر سیلو سے ہوئی۔ انہوں نے اپنا بی اے 1941ء میں خط و کتابت کے ذریعے کیا۔ پھر انہوں نے قانون کی سند لی اور ٹامبو کے

http://muftbooks.blogspot.com/

ساتھ مل کر وکالت کرنے لگے۔ یہ جنوبی افریقہ کی پہلی افریقی قانونی شراکت تھی۔

1944ء میں منڈیلا نے سسولو اور ٹامبو سے مل کر افریقی نیشنل کانگریس (اے این سی) کی یوتھ لیگ کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا اور 1948ء میں اس کے مرکزی سیکرٹری بن گئے۔ اگرچہ منڈیلا شروع میں سفید فام حکومت کی سیاسی و معاشی حاکمیت کی مخالف دیگر نسلی جماعتوں کے ساتھ کام کرنے سے احتراز کرتے رہے، وہ 1952ء کی تحریک مزاحمت میں شامل ہو گئے جس کا مقصد مزاحمتی عناصر کو متحد کرنا تھا۔ انہیں قومی ''رضا کار اعظم'' مقرر کیا گیا۔ اس برس منڈیلا کو سسلو اور دیگر ساتھیوں سمیت قانون انسداد اشتراکیت کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ وہ نو ماہ تک قید میں رہے اور ان پر سیاسی جلسے جلوسوں میں شرکت کرنے پر بھی پابندی عائد کر دی گئی۔ پابندی کے ان احکامات کی نو برس تک بار بار تجدید کی جاتی رہی۔ اور تو اور انہیں اے این سی سے مستعفی ہونے پر بھی مجبور کیا گیا جس کے وہ اس وقت مرکزی نائب صدر تھے اور انہیں جوہانسبرگ سے باہر جانے سے بھی روک دیا گیا۔ ان تمام پابندیوں کے باوجود مینڈیلا نے ایم پلان کی تشکیل میں بہت اہم کردار ادا کیا جس کے تحت اے این سی کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا تا کہ ضرورت پڑنے پر زیر زمین رہ کر کارروائیوں کو جاری رکھا جا سکے۔

1956ء میں منڈیلا اور 150 دیگر سیاسی رہنماؤں کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا لیکن ساڑھے چار سال تک چلنے والے مقدمے میں ان پر جرم ثابت نہ ہو سکا۔ یہ مقدمہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ اے این سی اور پی اے سی (پین افریقی کانگریس) نے مل کر نسلی امتیاز پر مبنی ایک ایسے قانون کے خلاف تحریک کا آغاز کر دیا جس کے تحت یہ پابندی عائد کی گئی تھی کہ سفید فام افراد کے علاوہ باقی تمام شہری ہر وقت اپنے پاس اپنی جیب میں رکھیں۔ اس کے نتیجے میں شارپ ول کے مقام پر 1960ء میں قتل عام دیکھنے میں آیا۔ اس خونیں تصادم کے موقع پر سیکورٹی فورسز نے مظاہرین پر اندھا دھند گولیاں برسائیں اور جنوبی افریقہ پوری دنیا کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس واقعہ کے بعد حکومت نے ملک میں ہنگامی حالات کے نفاذ کا اعلان کر دیا اور اے این سی اور پی اے سی دونوں جماعتوں پر پابندی لگا دی۔ اس کے ساتھ حکام نے مینڈیلا سمیت کوئی 1800 مظاہرین کو بغیر کسی الزام یا فرد جرم کے حراست میں لے لیا تاہم انجام کار انہیں رہا کر دیا گیا۔

1961ء میں جنوبی افریقہ میں سیاسی تناؤ کے پیش نظر ایک آل افریقہ کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس کانفرنس کے موقع پر مینڈیلا کو مجلس عمل کا سیکرٹری بنا دیا گیا اور ایک قومی کنونشن بلانے کی ذمہ داری انہیں سونپ دی گئی۔ اس کے ساتھ ان کے ذمے یہ کام بھی لگایا گیا کہ وہ مئی

http://muftbooks.blogspot.com/

1961ء کی گھر بیٹھ ہڑتال کا بندوبست کریں۔اس دوران اگرچہ وہ زیرزمین رہے، وہ اے این سی کے عسکری بازو، ''نیزہ ملت'' کی تشکیل میں بھی پیش پیش رہے۔

مینڈیلا نے1962ء میں باہر کا رخ کیا اور الجیریا میں ایک گوریلا تربیتی پروگرام اور کل افریقی تحریک آزادی کے اجلاس میں شرکت کی۔ اس کے بعد وہ لندن میں برطانوی حزب اختلاف کے اراکین سے بھی ملے۔ وطن واپسی پران پر گڑبڑ پھیلانے کا الزام عائد کر کے انہیں گرفتار کرلیا گیا۔عدالت نے مینڈیلا اور دس دیگر افراد پر فرد جرم عائد کر کے انہیں عمر قید کی سزا سنا دی۔ان کی حراست کے دوران ان کی اہلیہ ونی، جو کہ خود بھی ایک سیاسی کارکن تھیں، مسلسل حکومتی ہتھکنڈوں کا شکار بنی رہیں اور انہیں ہراساں کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔

منڈیلا کو1990ء میں رہا کر دیا گیا۔ان کی رہائی میں زیادہ ہاتھ نیشنل پارٹی کے صدر فریڈرک ڈبلیو ڈی کلارک کی کوششوں کا تھا جنہیں اس امر کا احساس ہو چکا تھا کہ اب جنوبی افریقہ کی سیاسی فضا بدل چکی ہے۔مینڈیلا نے اے این سی کے صدر کی حیثیت سے نسلی امتیاز کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی اور وہ1992ء کے امن کے نوبل پرائز کے حقدار ٹھہرے۔ اپریل1994ء میں جنوبی افریقہ میں پہلے جمہوری انتخابات کے بعد وہ جنوبی افریقہ کے پہلے سیاہ فام صدر بن گئے۔

منگول

براعظم ایشیا میں آباد ایک نسلی ولسانی گروہ۔منگولوں نے تیرہویں صدی میں چنگیز خان (اندازاً1167ء۔1227ء) کے دور میں عروج حاصل کیا جس نے وسطی ایشیا کی چراگاہوں میں بسنے والے خانہ بدوش چرواہوں کو متحد کر کے ایک عسکری وحدت میں تبدیل کر دیا۔ ایک مرحلے پر منگول تاریخ انسان کی سب سے بڑی سلطنت پر قابض تھے جو آج کے چین، ترکی، ایران اور روس میں پھیلے وسیع علاقہ جات پر مشتمل تھی۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ ان کا اس سلطنت پر قبضہ زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا۔

چنگیز کے پوتے قبلائی خان (1215۔1294ء) نے1260ء میں چینی طرز کے ایک شاہی خاندان یون کی بنیاد رکھی جس کے عہد میں چینی ثقافت خوب پھلی پھولی۔ اس خاندان کو منگول قیادت کے داخلی تفرقات، چینی منگ خاندان کے ساتھ جنگوں نیز قدرتی آفات اور کسان بغاوتوں کے سبب1368ء میں زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم منگولوں نے منگ بادشاہوں کو مسلسل پریشان کیے رکھا اور انہیں مانچو فرمانرواؤں کے ہاتھوں شکست کھانے تک چین میں اثر و

رسوخ حاصل رہا۔ منگول مانچوؤں کے ساتھ امتزاج کر کے ایک ماتحت حیثیت میں آ گئے لیکن پھر بیسویں صدی میں آ کر انہوں نے عوامی جمہوریہ منگولیہ کے نام سے ایک الگ ریاست قائم کر لی۔

منگولوں کی ثقافت چینیوں کی نسبت اہل تبت کی ثقافت سے زیادہ مشابہ ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو خانہ بدوشوں اور زراعت پیشہ لوگوں کے درمیان رہن سہن کا فرق تھا لیکن اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ منگولوں نے کبھی بھی چینی رسم الخط اختیار نہ کیا۔ منگولوں کی اکثریت آج بھی چین کے اندر ایک خود مختار منگول علاقے میں رہتی ہے لیکن بہت سے منگول سابق سوویت یونین کی ریاست بریاتیا میں بھی آباد ہیں۔

موپساں، گی دا (1850ء۔1893ء)

فرانس کے ایک نامور افسانہ نگار اور ناول نویس۔ موپساں نے ایک مالدار گھرانے میں آنکھ کھولی اور ابتدائی زندگی نارمنڈی کے دیہی علاقے میں زیادہ تر اپنی اماں کے ساتھ گزاری۔ فرانسیسی ناول نگار گستاف فلوبیئر (1821ء۔1880ء) کا ان کے گھر بہت آنا جانا تھا لہٰذا موپساں کو ان کی اور ان کے شاعر دوست ''Bouilhet'' کی صحبت میں بہت سا وقت گزارنے کا موقع ملا جس کے دوران فلوبیئر نے ان کے اتالیق کی حیثیت لے لی اور وہ موپساں کی تحریروں کی اصلاح و تدوین بھی کرتے رہے۔

موپساں نے ایک مختصر مدت کیلئے فرانکو۔ پروشین جنگ میں بھی خدمات سرانجام دیں، اور پھر وہ پیرس چلے آئے۔ پیرس میں انہوں نے کئی سرکاری عہدوں پر کام کیا اور ساتھ ساتھ فارغ اوقات میں لکھتے بھی رہے۔ موپساں نے فلوبیئر کی زیر رہنمائی اپنے تحریری اسلوب کو بہتر بنانے کیلئے بڑی جستجو کی اور 1880ء میں ان کی نظموں کا ایک مجموعہ Des Vers کے عنوان سے شائع ہوا۔ اسی اثنا میں انہوں نے معروف ناول نگار ایمیل زولا (1840ء۔1902ء) کے ادبی حلقے میں بیٹھنا اٹھنا شروع کر دیا اور گو انہیں زولا کی فطرت پسندی سے کوئی سروکار نہیں تھا انہیں اس حلقے کے بہترین نوجوان ادیب کے طور پر جانا جانے لگا۔ موپساں نے بہت زیادہ لکھا لیکن درج ذیل تصانیف کا شمار ان کے بہترین ادبی کارناموں میں ہوتا ہے۔

1۔ ایک زندگی (1883ء): اس ناول میں ایک ناآسودہ نارمن گھریلو خاتون کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

2۔ پیارا دوست (1885ء) یہ ناول ایک خود غرض صحافی کی کہانی بیان کرتا ہے۔

3۔ پیئر اور ژاں (1888ء): ناول، دو بھائیوں کے درمیان نفرت کی کہانی اور

http://muftbooks.blogspot.com/

4۔ افسانے مثلاً گالنی (1884ء)، ٹیلو بال (1880ء) اور ملاقات (1889ء) وغیرہ۔

یہ سب تخلیقات حقیقت نگاری، رمز و ایمائیت، طنز اور معروضیت جیسے فنی محاسن پر موپساں کے کامل عبور کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

موپساں آتشک کے موذی مرض کی وجہ سے زیادہ طویل عمر نہ پا سکے۔ یہ عارضہ انہیں چھبیس سال کی عمر میں لاحق ہوا تھا۔ ان کے آخری ایام بہت برے گزرے۔ وہ کئی کئی دن مسلسل بستر پر گزارتے اور آخر میں تو آتشک نے انہیں مکمل دیوانگی میں مبتلا کر دیا تھا۔ انہوں نے 1892ء میں اپنا گلا کاٹنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے آخری چند ماہ پیرس کے ایک کلینک میں گزرے۔ ایک اندازے کے مطابق وہ اپنی ادبی زندگی میں چھ صفحے یومیہ یعنی 1500 صفحات سالانہ لکھتے رہے، شاید یہ لکھنا لکھنا مدام لکھنا ان کے گُرو فلوبیئر کی کسی نصیحت کا اثر تھا۔

مورو

فلپائن میں آباد ایک مسلم گروہ۔ وسیع تناظر میں مورو سے مراد فلپائن کی آبادی کا وہ حصہ ہے جو مسلمانوں پر مشتمل ہے لیکن ایک دوسرے تناظر میں اس سے ان جزائر میں سیاسی طور پر فعال ان مسلمانوں کی طرف اشارہ مقصود ہے جو اپنے حقوق کے لئے جدوجہد میں مصروف ہیں۔ یہ اصطلاح سب سے پہلے ہسپانوی حملہ آوروں نے سولہویں صدی میں استعمال کی جنہوں نے فلپائنی مسلمانوں کو اسلامی شمالی افریقہ کے ان مسلمانوں سے لف کر کے دیکھا جنہوں نے سپین کے ایک حصے اندلسیہ پر آٹھویں تا پندرھویں صدی حکومت کی اور جنہیں وہ ''مور'' کہتے تھے۔ اس دور میں جبکہ اہل سپین مسلم اکثریت کے حامل فلپائن کے جنوبی جزائر پر قبضہ جمانے کی کوشش کر رہے تھے تو وہ ''مورو'' کی اصطلاح کو منفی مفہوم میں فلپائنی مسلمانوں کو گھٹیا اور جاہل جان کر استعمال کرتے تھے۔ تاہم 1960ء کے عشرے کے اوائل میں جب ان فلپائنی مسلمانوں نے مورو نیشنل فرنٹ کی بنیاد رکھی تو انہوں نے یہ اصطلاح اپنے لئے خود اختیار کر لی۔ یہ فرنٹ فلپائنی مسلمانوں کی صدر فرڈیننڈ مارکوس کی حکومت سے آزادی کیلئے قائم کیا گیا تھا۔ جس نے 1966ء میں اقتدار سنبھالا۔ اس تنظیم کے قائدین اس علاقے میں ایک الگ مسلم ریاست کا مطالبہ بھی کرتے ہیں جو ان کے مطابق فلپائنی عیسائیوں نے ان سے جبراً ہتھیا لی تھی۔ جب 1972ء میں صدر مارکوس نے ملک میں مارشل لاء لگانے کا اعلان کیا تو فرنٹ کے عسکری بازو بنگسا مورو نے ایک الگ وطن کے حصول کیلئے مسلح جدوجہد شروع کر دی۔ یہ لڑائی کئی برس چلتی رہی لیکن بعد ازاں فرنٹ اور حکومت فلپائن کے مابین مذاکرات کے نتیجے میں امن قائم ہو گیا۔

http://muftbooks.blogspot.com/

1985ء میں مسلمانوں نے اپنی جدوجہد کا پھر سے آغاز کر دیا۔ اگر تجزیہ کیا جائے تو مارکوس کی حکومت گرانے میں اس مسلم جدوجہد کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔

مونتیسکو، شارل لوئی دوسکوندا (1689ء۔1755ء)

فرانس کا سیاسی فلسفہ دان، مونتیسکو 1689ء میں ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئے اور جب 1696ء میں ان کے والد کا انتقال ہوا تو وہ بیرن بن گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی برس دیہاتیوں کے درمیان بسر کیے جس نے ان کے دل میں زمین سے ایک بہت گہری وابستگی پیدا ہوگئی۔ 1700ء میں وہ جوئلی میں داخل ہوگئے اور پھر قانون کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے بورڈو یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے۔ 1715ء میں انہوں نے ایک خاتون ژاں لاراٹیگ سے شادی کر لی جو جہیز تو لائی ہی تھی، ایک برس بعد اسے اپنے چچا کی طرف سے ایک جاگیر بھی ورثے میں مل گئی جس میں بورڈو پارلیمنٹ کی صدارت بھی شامل تھی۔ لہٰذا مونتیسکو کو بورڈو اکیڈمی میں سائنسی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے سرکاری فرائض بھی انجام دینے پڑے۔ لوگوں پر ماحول کے اثرات میں وہ گہری دلچسپی جو ہمیں ان کی بعد کی تاریخی تصانیف میں نظر آتی ہے اس کی ایک وجہ ان کی وہ حیاتیاتی تحقیقات بھی ہیں جو انہوں نے اکیڈمی کی تعلیم کے دوران سرانجام دیں۔

مونتیسکو نے اپنی پہلی کتاب ''فارسی خطوط'' شائع کی۔ یہ کتاب مشہور عربی داستان الف لیلہ سے متاثر تھی جو یورپی سیاحت میں مصروف تین فارسی افراد کے گھر لکھے جانے والے خطوط پر مشتمل تھی۔ اس کتاب میں اس دور کے یورپی رسوم ورواج کا بڑے طنزیہ اور چبھتے ہوئے تنقیدی انداز میں جائزہ لیا گیا تھا بلکہ اورتو اور مصنف نے لوئی چاردہم اور اور پوپ کو بھی تضحیک کا نشانہ بنانے سے احتراز نہیں کیا۔ مونتیسکو نے اس کتاب پر اپنا نام شائع نہیں کیا تھا لیکن لوگوں کو جلد ہی پتہ چل گیا کہ اصل مصنف کون ہے جس کے بعد انھیں بہت مدح وتوصیف ملی۔

مونتیسکو کو نہ تو مقامی سیاست سے زیادہ دلچسپی تھی اور نہ ہی مال و دولت سے۔ لہٰذا انہوں نے 1726ء میں بورڈو پارلیمنٹ میں اپنا عہدہ فروخت کر دیا۔ 1728ء میں وہ اکیڈمی فرانسے سے منسلک ہوگئے اور پھر یورپ کی سیاحت پر چلے گئے۔ ان کی موخر سیاسی تصانیف پر ان کے سفر انگلستان کا اثر خاص طور پر بہت گہرا ہے جہاں رہ کر انہیں رائل سوسائٹی میں شمولیت اور انگریزی سیاست کو بڑے قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ وہ 1731ء میں فرانس واپس آئے اور انہوں نے 1734ء میں ''تاملات براسباب عروج وزوال رومہ'' شائع کی جس میں انہوں نے

http://muftbooks.blogspot.com/

اس خیال کا اظہار کیا کہ رومن کامیابی کی کلید اس کے شہریوں کے اوصاف اور اس کے اداروں کی حالات کے ساتھ موافقت اختیار کر لینے کی صلاحیت تھی۔ اس کتاب کو ''فارسی خطوط'' ایسی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی تاہم والیٹر نے اسے خوب سراہا۔

چودہ سال بعد مونٹیسکو نے ''روح قوانین'' (1750ء) شائع کی جسے ان کا عظیم ترین کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ کوئی قانونی تحریر نہیں تھی بلکہ یہ ان سماجی، تاریخی اور ماحولیاتی عوامل پر تحقیق تھی جو تہذیبوں میں مروج مختلف اور پیچیدہ قوانین کے پیچھے کارفرما ہوتے ہیں۔ مونٹیسکو کا کہنا تھا کہ قوانین وہ ضروری روابط ہوتے ہیں جو اشیاء کی ماہیت سے نکلتے ہیں۔ مثال کے طور پر آب و ہوا ایک بہت اہم چیز ہے جو کسی معاشرے کی سوچ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ کتاب انسانی تطابق پذیری کا محض ایک قدر پرستانہ بیان ہی نہیں ہے بلکہ اس میں ماحول اور حالات پر بطور ایک سیاسی پالیسی کے توجہ دینے کی سفارش کی گئی ہے۔ مونٹیسکو کے مطابق بڑے قانون ساز وہ ہوتے ہیں جو قوانین کو حالات حاضرہ کے مطابق ڈھالنے اور بعض صورتوں میں ان سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

مونٹیسکو نے مختلف اقسام کی حکومت اور ان کے ''حیات آفریں'' اصولوں کی بھی وضاحت کی ہے: جمہوریہ میں اچھائی، بادشاہت میں آن، یا آمریت میں ڈر انہوں نے انگلستان کو ایک مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے مقنّنہ، انتظامیہ اور عدلیہ کو الگ الگ رکھنے کے حق میں دلائل بھی دیئے ہیں۔ مذہب کے بارے میں مونٹیسکو ایک سیکولر رویے کے حامل ہیں۔ وہ مذہب کو بھی دیگر سماجی مظاہر کی طرح کا ایک مظہر خیال کرتے ہیں جس پر سچ یا صداقت کی بات کو ملحوظ خاطر رکھے بغیر بحث کی جا سکتی ہے۔ اس تصنیف کو فلسفہ دان ڈیوڈ ہیوم جیسی شخصیات سے بہت داد ملی لیکن اس پر لے دے بھی بہت ہوئی اور وٹیکن نے 1751ء میں اسے ممنوعہ کتب کی فہرست میں شامل کر دیا۔

مونٹیسکو آخری عمر میں بینائی کھو بیٹھے تھے اور انہوں نے عزلت نشینی اختیار کر لی تھی۔ ان کا انتقال 1755ء میں پیرس میں ہوا۔

مہابھارت

ایک ہندو رزمیہ۔ مہا بھارت کے کئی مختلف طرح کے نسخے ملتے ہیں اور شاید یہ شمالی ہندوستان میں لکھی گئی تھی۔ مہا بھارت تقریباً اڈھائی لاکھ مصرعوں پر مشتمل ہے جو اٹھارہ کتابوں میں منقسم ہیں اور اس میں مشہور مذہبی نظم بھگوت گیتا اور ہندو دیوتا کرشن کی زندگی اور اس کے حسب

نسب کے بارے میں ایک بہت بعد کا بیان بھی شامل ہے۔ اگر چہ اس رزمیہ کے بعض حصے پانچویں صدی قبل مسیح سے بھی پہلے تحریر کئے گئے، اس میں موجود بہت سی حکایتیں اور لوک کہانیاں بعد میں شامل کی گئی ہیں۔ اس کی بیشتر عبارت ڈرامائی مواد پر مشتمل ہے جو گانے کیلئے موزوں ہے اور ہندوستان کے بہت سے میلوں ٹھیلوں اور تہواروں میں استعمال ہوتا ہے۔

اگر چہ مہابھارت کے مختلف نسخوں میں اختلاف پایا جاتا ہیمگر یہ کروکیشتر کی قدیم ریاست میں رونما ہونے والی خاندانی کشمکش اور خانہ جنگی کی کہانی ہے۔ اس کہانی کے مطابق کوروکیشتر کے تخت پر پہلے راج کمار دھرتراشٹر کو بٹھانے کا فیصلہ کیا جاتا ہے لیکن بعد میں اس کے اندھے پن کے پیش نظر یہ طے پاتا ہے کہ اسے اپنے چھوٹے بھائی پانڈو کے حق میں دستبردار ہو جانا چاہیے جو بالآخر تاج وتخت سب چھوڑ کر ہمالیہ کو جا نکلتا ہے اور ایک تارک الدنیا جوگی کی زندگی بسر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس پر دھرتراشٹر کو ایک دفعہ پھر تخت پر بیٹھنے پر مجبور کیا جاتا ہے لیکن پانڈو کے پانچوں بیٹے جنھیں یہ گلہ ہے کہ تخت کے اصل وارث وہ ہیں اشتعال میں آ کر اپنے تایا کو اقتدار سے محروم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف دھرتراشٹر کے سو بیٹے اس کا دفاع کرتے ہیں اور اپنے چچازادوں کو ریاست سے نکال دیتے ہیں لیکن دھرتراشٹر کو قضیے کا بہترین حل یہ سوجھتا ہے کہ ریاست کو بیٹوں اور بھتیجوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ دھرتراشٹر کے سپوتوں کو یہ بات پسند نہیں آتی اور وہ اپنے چچازاد بھائیوں سے جنگ پر اتر آتے ہیں۔ انجام کار وہ غلط سلط حربے استعمال کر کے جنگ جیت جاتے ہیں اور ان کا ساری ریاست پر قبضہ ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر کیا ہوتا ہے کہ پانڈو کے بیٹے کرشن دیوتا کی مدد حاصل کر کے اپنا حق لینے کیلئے واپس پلٹتے ہیں۔ کرشن کے تعاون کی بدولت اس بار پانڈو کے بیٹوں کو فتح مل جاتی ہے اور سب سے بڑا بھائی یدھشٹر بادشاہ بن جاتا ہے اور وہ ایک طویل عرصے تک امن وامان سے حکومت چلاتا رہتا ہے۔

میگنا کارٹا

آزادیوں کا انگریزی دستور۔ اسے میگنا کارٹا یا دستور اعظم اس کے حجم کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ یہ سات سو سال سے زائد عرصے سے دستوری قانون کے بین الاقوامی ماڈل کا کام دیتا چلا آ رہا ہے۔ میگنا کارٹا ایک انگریز زمیندار کی تحریر کردہ ایک دستاویز سے ارتقاء پا کر اس شکل کو پہنچا جو اس نے اس دور کے بادشاہ جان اول (1167ء-1216ء) کی نافذ کردہ متعدد ناپسندیدہ پالیسیوں کے خلاف احتجاج کے طور پر لکھی تھی جو صلیبی جنگوں اور پھر فرانس کے خلاف فوجی مہمات کی وجہ سے بہت مقروض ہو چکا تھا۔ جاگیرداروں نے غیر معمولی اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہوئے

http://muftbooks.blogspot.com/

بادشاہ کے اختیارات محدود کرنے کیلئے مطالبات کا ایک مجموعہ ترتیب دیا۔ بادشاہ کی رعایا اور کلیسا میں غیر مقبولیت کی وجہ سے حالت کمزور تھی اور انگریز جاگیرداروں نے اس کی طاقت میں کمی کیلئے اس موقع کو غنیمت جانا۔ جاگیرداروں نے کنٹربری کے لاٹ پادری سیٹون لینگٹن کی زیر ہدایت مطالبات واصلاحات کی ایک دستاویز مرتب کی جو ''جاگیرداروں کے آئین'' کے نام سے معروف ہے۔ اسی دستاویز نے بعد میں میگنا کارٹا کی شکل اختیار کی۔ جب یہ دستاویز پہلی مرتبہ بادشاہ سامنے پیش کی گئی تو اس نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا جس پر جاگیرداروں نے مل کر لندن پر قبضہ کر لیا۔ اب بادشاہ کے پاس ان کی شرائط ماننے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ لہٰذا جاگیردار اسے 15 جون 1215ء کو رنی میڈ کے مقام پر ملے۔ میگنا کارٹا پر دستخط ہوئے اور اس نے ایک قانون کی شکل لے لی۔

میگنا کارٹا کے نفاذ سے بادشاہ کے اختیارات کم ہو گئے اور امن وامان کا ایک ایسا منصفانہ نظام قائم ہوا جس سے عام آدمی کے حقوق کو تحفظ حاصل ہو گیا۔ بادشاہ کے اپنی مرضی سے محصولات وصول کرنے کے اختیار اور اس کے قید کرنے کے حق میں بھی کمی آ گئی۔ ملکی قوانین کے مطابق عمائدین کی جیوری کی موجودگی میں مقدمے کا حق اس دستاویز کا ایک اہم حصہ ہے۔ میگنا کارٹا میں ایک شق ایسی بھی تھی جس کی رو سے بادشاہ کی طرف سے اس دستاویز کے کسی حصے کی خلاف ورزی کی صورت میں اس کے خلاف جنگ کی جا سکتی تھی۔ پارلیمان نے اس دستاویز کی منظوری 17-1216ء میں دی اور یہ تیرہویں صدی کے دوران کئی بار دوبارہ جاری کی گئی۔

میمونی (1135ء۔1204ء)

یہودی ربی، طبیب اور فلسفی۔ میمونی مسلم سپین کے شہر غرناطہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا پورا نام موسیٰ بن میمون تھا۔ انہوں نے اپنا سارا کام مسلم معاشرے میں رہ کر کیا جس کا زیادہ حصہ عربی زبان میں ہے۔ انہوں نے ارسطو کے فلسفے کی تعلیم سپین کے عرب اساتذہ سے حاصل کی اور عبرانی روایت کے عظیم ترین عالموں میں شمار ہوئے۔ مشنیٰ (عربی سے عبرانی زبان میں مترجمہ یہودی روایات کا مجموعہ) پر ان کے لکھے ترجمے کو اس کتاب کے بہترین تبصروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ میمونی کا سب سے بڑا کارنامہ مشنیٰ میں شامل دیوہیکل غیر تحریری یہودی شریعت کو جمع کر کے اسے ایک ایسے خلاصے کی شکل دینا تھا جس سے ربیوں اور قاضیوں کے علاوہ عام لوگ بھی استفادہ کر سکیں۔ میمونی نے طب پر بہت سی تصانیف لکھنے کے علاوہ ''رہنمائے مضطرباں'' کے نام سے فلسفے پر بھی ایک عظیم کتاب قلمبند کی جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ارسطو کو کسی قدر گہرائی میں پڑھ

http://muftbooks.blogspot.com/

رکھا تھا۔اس کتاب نے نہ صرف یہ کہ بعد کے یہودی فلسفے کو متاثر کیا بلکہ،اس نے بہت سے عیسائی مفکرین پر بھی اپنے اثرات مرتب کئے ہیں۔میمونی بالآخر کار سلطان مصر صلاح الدین ایوبی کے معالج بن گئے تھے اور ان کا انتقال قاہرہ میں ہوا۔

ن

ناگ ناچ

ہوپی انڈینز کی ایک مذہبی تقریب۔ناگ ناچ کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔اس تقریب کے موقع پر جلوس نکالے جاتے ہیں۔رقص کیا جاتا ہے اور خشوع وخضوع سے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔یہ تقریب اگست کے آخر میں اس وقت منعقد کی جاتی ہے جب شمالی اریزونا میں برسات کا موسم ہوتا ہے۔اس موقع پر زیر زمین حجروں (کِوا) میں آٹھ یوم تک خفیہ رسمیں اور دعائیں ادا کی جاتی ہیں۔نویں دن کی سہ پہر کو یہ تقریب عوامی مظاہرے کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس کے دوران رقاص مختلف قسم کے خطرناک زندہ سانپوں سے کرتب دکھاتے ہیں اور انھیں اپنے منہ میں ڈالتے ہیں۔ہوپیوں کا عقیدہ ہے کہ سانپ ان کے پیامات دیوتاؤں تک پہنچانے کے لیے قاصدوں کا کردار ادا کرتے ہیں۔چنانچہ جب تقریب کا اختتام ہوتا ہے تو سانپوں کو آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ وہ قبیلے کی دعاؤں کو اپنے ساتھ پاتال میں لے جائیں جسے ہوپیوں کے نزدیک بہشت کی حیثیت حاصل ہے۔ہوپی سوچتے ہیں کہ سانپ پاتال میں موجود بڑے دیوتاؤں کو جا کر یہ بتائیں گے کہ قبیلے کے لوگ اب بھی اپنے بزرگوں کے طور طریقوں پر کاربند ہیں،اس پر دیوتا بارش بھیجیں گے اور قبیلے کی فصلیں شاداب رہیں گے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ یہ رسم صدیوں قبل ایک داستان کی بنیاد پر شروع ہوئی جس کے مطابق ایک شخص ''ٹی یو'' نے پاتال میں اتر کر ناگ باشندوں کے رقص اور رسمیں سیکھیں اور پھر واپس آ کر اپنے قبیلے والوں کو ان کی تعلیم دی۔

بظاہر ہوپیوں کے پاس سانپ کے ڈسنے کا کوئی تریاق نہیں ہوتا۔تاہم رقاصوں کو اس امر سے آگاہی ہوتی ہے کہ سانپ صرف اس صورت میں ڈس سکتا ہے کہ وہ اپنے جسم کو بل دے کر بیٹھا ہو چنانچہ وہ بل کھائے سانپ کو چھیڑنے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ ہی اس کے قریب کھڑے ہوتے ہیں۔خطرے کو مزید کم کرنے کے لیے کرتب دکھانے والے حضرات سانپ کو پکڑنے سے

http://muftbooks.blogspot.com/

پہلے اس سیدھا کر لیتے ہیں۔

نپولین بوناپارٹ (1769ء۔1821ء)

فرانسیسی شہنشاہ۔ انہیں نپولین اول بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے 1804ء سے 1815ء تک فرانس پر حکومت کی اور ایک مغرور اور متلون طبع شخص اور ایک عظیم فوجی قائد کے طور پر شہرت پائی۔ انہوں نے جزیرہ کورسیکا میں آنکھ کھولی، فرانس کے عسکری سکولوں سے تعلیم حاصل کی اور 1785ء میں فوجی افسر بن گئے۔ انہوں نے شمالی اٹلی میں آسٹریا کے خلاف بہت سی فیصلہ کن جنگوں میں فتح حاصل کی جس سے انہیں ایک قومی ہیرو کا درجہ حاصل ہو گیا۔

انہیں جب شام و مصر میں انگریزوں سے شکست ہوئی تو انہوں نے پیرس واپس آ کر اس وقت کی زوال پذیر حکومت کا تختہ الٹ دیا اور کونسل اول کا لقب اختیار کر کے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دو سال بعد وہ فرانس کے شہنشاہ بن گئے۔ اپنے عہد حکومت کے ابتدائی چند برسوں کے دوران نپولین نے بہت سی قانونی، تعلیمی اور معاشی اصلاحات نافذ کیں اور ملک کے اندر اور باہر اپنے اقتدار کو استحکام دیا۔ وہ یورپ کے بیشتر حصے کو اپنی ذاتی سلطنت تصور کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کی سب سے زیادہ فیصلہ کن فتح 1805ء میں آسٹرلٹز کے معرکہ میں حاصل کی جس میں انہوں نے روس اور آسٹریا کی متحدہ قوت کو پچھاڑنے کا اعزاز حاصل کیا۔ 1810ء تک نپولین اپنی طاقت کے عروج پر پہنچ چکے تھے اور یورپ کا بیشتر حصہ ان کے قبضے میں آ چکا تھا۔

نپولین کے برے دن اس وقت شروع ہوئے جب انگریزوں نے سر ویلزلی (ڈیوک آف ویلنگٹن) کی قیادت میں 1808ء کی جنگ میں فرانس کے خلاف سپین اور پرتگال کی مدد کی۔ اس کوشش میں ناکامی کے بعد نپولین نے اپنی سلطنت کو مشرق کی طرف بڑھانے کی کوشش شروع کر دی اور اس نیت سے 1812ء میں روس پر حملہ کر دیا لیکن جب نپولین کی فوجیں ماسکو میں داخل ہوئیں تو انہیں ویرانی اور کھنڈرات کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔

اپریل 1814ء میں نپولین نے یورپی اتحادیوں کے ہاتھوں لیپزگ کے مقام پر شکست کا مزہ چکھا جس کے نتیجے میں انہیں مجبوراً تخت سے دستبردار ہونا پڑا اور پھر انہیں جلاوطن کر کے ایک جزیرے ایلبا پر بھیج دیا گیا۔ لیکن انہیں اقتدار کا مزہ پڑ چکا تھا، لہٰذا وہ ایلبا سے فرار ہو کر مارچ 1815ء میں ایک بار پھر واپس فرانس پہنچے لیکن ان کی فاتحانہ واپسی زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ ان کی فوج کو 18 جون 1815ء کو واٹرلو کی جنگ میں زبردست ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اب کے نپولین کو ایک دفعہ پھر حکومت سے دستبردار ہو کر سینٹ ہیلینا نامی جزیرے پر جلاوطنی اختیار

http://muftbooks.blogspot.com/

کرنا پڑی۔

نشاۃ ثانیہ (تحریک احیائے علوم)

یورپی زبانوں میں اس کیلئے Renaissance کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو اصلاً ایک فرانسیسی لفظ ہے۔ اس کا مطلب ''پیدائش نو'' ہے۔ جب ہم نشاۃ ثانیہ کی بات کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد چودھویں صدی کے اواخر سے لے کر سولہویں صدی کے اوائل تک کا وہ زمانہ ہے جس میں اہل یورپ نے علمی، ادبی، سائنسی اور ثقافتی میدانوں میں بہت زیادہ ترقی کی۔ اس دور میں لوگوں نے قدیم یونانی علم میں دوبارہ دلچسپی لینا شروع کی، نئے براعظم دریافت ہوئے، کوپر نکس کے فلکیاتی تصور کو قبولیت ملی اور اہل یورپ کاغذ، چھاپہ خانے، قطب نما اور بارود جیسی اہم اشیاء سے روشناس ہوئے۔ جب ہم نشاۃ ثانیہ کے آرٹ کی طرف رخ کرتے ہیں تو لیونارڈو ڈو اونچی (1452ء۔1519ء) مائیکل اینجلو (1475ء۔1564ء) اور رافیل (1383ء۔1520ء) جیسے گرانڈیل فنکاروں کے چہرے ہماری نظروں کے سامنے لہرانے لگتے ہیں۔

نشاۃ ثانیہ کے ارتقاء کا جائزہ لیں تو اس کی کونپلیں ہمیں بشریتی فکر (Humanism) کے شجر سے پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں۔ ولندیزی دانشور ایراسمس (اندازاً 1466ء۔1536ء) اور فرانسیسی مفکر فرانسوا ریبلے (اندازاً 1488ء۔1553ء) اس تحریک کے بڑے حامیوں میں سے تھے اور اگر ہم ان سے بھی پہلے دیکھیں تو ہمیں اطالوی شاعر دانتے (1265ء۔1321ء) اور پیٹرارک (1304ء۔1374ء) کو بھی اپنے ذہن میں رکھنا ہوگا۔ بشریت نے بطور ایک مکتبہ فکر کے انسان کی اپنے اردگرد کے ماحول کو اپنے تسلط میں لانے کی تخلیقی جدوجہد کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا۔ ازمنہ وسطی کے یورپ میں زیادہ تر مذہبی فکر کا راج رہا لیکن اس بشریتی لہر نے دانشوروں، سائنسدانوں اور فنکاروں کو یہ ترغیب دی کہ وہ اپنے آس پاس پھیلی دنیائے فطری و علمی کا مطالعہ کریں۔ 1453ء میں قسطنطنیہ (استنبول) پر مسلمانوں کے قبضے کے بعد مشرق کے بہت سے دانشور اٹلی میں جمع ہوئے اور انہوں نے وہاں قدیم یونانی حکمت کی روایت کو از سر نو متعارف کرایا۔

اٹلی میں صحیح معنوں میں نشاۃ ثانیہ ہمیں پندرہویں اور سولہویں صدی میں واقع ہوتی نظر آتی ہے۔ فلورنس اور روم اس دور میں فنون لطیفہ کے سب سے اہم مراکز تھے۔ فلورنس میں میڈیچی اور دیگر متمول تاجر خانوادوں نے ڈوناٹیلو (اندازاً 1386ء۔1466ء) اور گیبرٹی (اندازاً 1378ء۔1455ء) جیسے بڑے فنکاروں سے مجسمے بنوائے اور اگر اس دور کے روم کی بات

http://muftbooks.blogspot.com/

کریں تو یہاں لیونارڈو، مائیکل اینجلو اور رافیل جیسے اہل فن چھائے ملتے ہیں۔

اگر دیگر مغربی ممالک کو دیکھیں تو وہاں نشاۃ ثانیہ کی لہریں سولہویں صدی سے کچھ بعد تک بھی رواں دواں رہیں اور ان ممالک میں مختلف ثقافتی تبدیلیوں کا باعث بنتی رہیں۔ مثلاً اگر جرمنی کو لیں تو وہاں سے اٹھنے والی پروٹسٹنٹ اصلاح کے ڈانڈے بھی آپ کو نشاۃ ثانیہ سے ملتے نظر آئیں گے۔ ہالینڈ میں اس تحریک نے آلبریکٹ ڈوُرر (1471ء۔1528ء) جیسا قد آور مصور پیدا کیا اور انگلستان میں شیکسپیئر (1564ء۔1616ء) سر ٹامس مور (1478ء۔1535ء) اور فرانسس بیکن (1561ء۔1626ء) جیسے ادیبوں کے عظیم فن پارے معرض وجود میں آئے۔ ہسپانوی ادیب سرویتیز نے ڈان کیہوٹی جیسا شاہکار ناول لکھا۔ اس کے بعد نشاۃ ثانیہ کی فکری وفنی روایات کی جگہ بتدریج اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے عہد تنویر (Enlightenment) نے لینا شروع کر دی تھی۔

نرودا، پیبلو (1904ء۔1973ء)

چلی کے ایک معروف شاعر، سفارت کار اور سیاستدان۔ انہوں نے اپنی جوانی کا بیشتر حصہ ٹیموکو میں گزارا۔ ان کے والد ایک انجینئر تھے جو اپنے بیٹے کے ادیب یا شاعر بننے کے خلاف تھے لیکن ہمارے اس شاعر نے بغاوت میں آ کر اپنا خاندانی نام ہی ترک کر دیا اور ایک چیک ادیب جان نرودا کا خاندانی نام استعمال کرنے لگے چنانچہ اس کے بعد انہیں پبلو نرودا کہا جانے لگا۔ نرودا نے سانتیاگو کی یونیورسٹی آف چلی سے تعلیم حاصل کی اور پھر اپنی شاعری کا ایک مجموعہ ''بیس منظومات محبت و یک نغمہ یاس'' (1924ء) کے عنوان سے شائع کیا جس سے چلی میں انہیں خوب چرچا ملا۔ اگرچہ ان کی ابتدائی شاعری میں لاطینی امریکہ کی جدیدیت عکس مارتی نظر آتی ہے، رفتہ رفتہ وہ اپنا ایک منفرد اور طبع زاد اسلوب اختیار کرتے چلے گئے جس میں انسانی صورتحال کے بارے میں ایک قنوطی تخیل ٹھاٹھیں مارتا دکھائی پڑتا ہے۔ نرودا ایک سرریالسٹ فنکار تھے اور انہوں نے آزاد نظمیں لکھیں۔ ان کا اسلوب طبع زاد تو ہے لیکن اس کے ساتھ بہت دقیق بھی۔ ان کی ''سپین میرے دل میں'' (جو انہوں نے سپین کی خانہ جنگی میں جمہوریت پسندوں کی ممکنہ شکست دیکھ کر مایوسی کے عالم میں لکھی) جیسی جذبات نظمیں گہرے رنج وغم کا اظہار تشبیہات و استعارات کی ایک عجیب وغریب اور چونکا دینے والی زبان میں کرتی نظر آتی ہیں۔ سپین کی خانہ جنگی کے بعد ان کی شاعری میں چلی کا ڈرامائی لینڈ سکیپ رفتہ رفتہ زیادہ نفوذ کرتا چلا جاتا ہے جسے وہ ان اندرونی جذبات واحساسات کے اظہار کیلئے استعمال میں لاتے ہیں جو وہ مثال کے طور پر

عام لوگوں کیلئے یا انڈین باشندوں کے استحصال کے خلاف محسوس کرتے ہیں۔ کانٹو جنرل (1950ء) میں انہوں نے ایک لاطینی امریکی رزمیہ تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے۔ نرودا کو بطور سفارتکار اور سیاستدان دنیا کا بہت وسیع تجربہ حاصل ہوا۔ وہ 1920ء کے عشرے کے اواخر میں چین، سری لنکا اور برما سفیر میں رہے اور پھر 1930ء کے عشرے وسط میں انہوں نے سپین میں بھی خدمات انجام دیں۔ 1940ء کی دھائی کے اواخر میں انہیں چلی کی کمیونسٹ پارٹی سے روابط کی پاداش میں میکسیکو جلا وطن کر دیا گیا۔ ان کی شاعری (اور ان کی سیاسی وفا) نے انہیں عصر حاضر کے لاطینی امریکہ کے سب سے زیادہ اثر آفریں شاعر کے رتبے پر لا کھڑا کیا ہے۔ انہیں 1971ء میں ادب کا نوبل پرائز دیا گیا۔

نظام الدین اولیاء (1226ء۔1325ء)

چشتیہ سلسلے کے ایک مشہور صوفی۔ حضرت نظام الدین ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں یکساں عزت و احترام سے دیکھے جاتے ہیں۔ اگرچہ آرتھوڈوکس اسلام موسیقی کی زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کرتا، انہوں نے اپنے مرید خاص امیر خسرو (1253ء۔1325ء) سے مل کر اسلامی ثقافت میں ساز و لحن کی گنجائش نکالی اور سالکین کی مجالس میں سماع کی روایت شروع کی۔ ان کی دوسری بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے عربی اور فارسی موسیقی کے مقابلے میں خالص ہندی موسیقی کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ حضرت نظام الدین کی درگاہ دلی میں ہے اور انہیں اس شہر کا پیر خاص تصور کیا جاتا ہے۔ ہر سال دنیا کے کونے کونے سے چل کر لوگ ان کے عرس میں شرکت کیلئے دہلی میں حاضری دیتے ہیں۔

نوروز

ایران اور ایشیا کے بعض دیگر علاقوں میں نئے سال کا پہلا دن اور اس موقع پر منایا جانے والے ایک پر مسرت جشن ہخامنشی سلطنت فارس (550۔330 ق م) کے دنوں میں یہ دن اکیس مارچ یعنی اس وقت منایا جاتا تھا جب سورج میکھ کے پہلے خط میں پہنچتا تھا (اعتدال بہاری) لیکن لگتا ہے کہ اس سے پہلے شاید یہ موسم گرما کے وسط میں بھی منایا جاتا تھا۔ نوروز خوشی و مسرت اور تجدید حیات کی علامت بھی تھا اور اس دن سالانہ محصولات بھی جمع کئے جاتے تھے۔ جب ساتویں صدی میں عربوں نے ایران کو فتح کیا اور ایرانی حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو نوروز یوم محصولات کے طور پر اسلامی تقویم میں شامل ہو گیا اور گیارہویں صدی میں آکر مارچ کو ایک مرتبہ

http://muftbooks.blogspot.com/

پھر آغاز سال نو قرار دے دیا گیا۔

بعد میں آنے والے ادوار میں نوروز کو انا طولیہ، افغانستان ، وسطی ، ایشیا ، شمالی ہند (پاکستان)، عراق اور مصر جیسے اسلامی دنیا کے بہت سے حصوں میں ایک مقبول غیر مذہبی تہوار کی حیثیت حاصل ہوگئی تاہم جس تزک واحتشام سے یہ ایران میں منایا جاتا ہے اور کہیں اور نہیں منایا جاتا۔ ایرانی جشن نوروز کی ایک اہم بات سفرہ ہے۔ لغوی اعتبار سے سفرہ کا مطلب رومال یا دستر خوان ہے جس پر سات خاص چیزیں چن دی جاتی ہیں۔ یہ چیزیں اور ان کی تعداد زرتشتی پس منظر کی حامل لگتی ہیں کیونکہ سات کے عدد کو فارسی علم الاعداد میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس موقع پر گھر کے تمام افراد بلکہ نوکر چاکر بھی سفرہ کے گرد جمع ہو کر بیٹھتے ہیں اور پھر وہ اپنے عزیز واقارب سے ملنے کیلئے نکلتے ہیں۔

نہرو، (پنڈت) جواہر لال (189ء۔1964ء)

انگریز راج کے خاتمے پر بننے والے پہلے بھارتی وزیر اعظم۔ انہوں نے الہ آباد کے ایک کشمیری برہمن گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے پتا موتی لال نہرو ایک ممتاز وکیل تھے اور انہیں ہندوؤں کے مذہبی وسیاسی رہنما موہن داس گاندھی کے دست راست کی حیثیت حاصل ہوئی۔ نہرو نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی لیکن جب وہ سولہ کے سن کو پہنچے تو انہیں انگلستان کے مشہور سکول ہیرو میں داخل کرا دیا گیا۔ دو سال بعد یعنی 1907ء میں انہوں نے کیمبرج کے ٹرنٹی کالج میں داخلہ لے لیا اور وہاں سے علوم طبعی میں ڈگری پاس کر کے نکلے۔ اس کے بعد نہرو نے قانون کی تعلیم حاصل کی اور لندن کے انر ٹیمپل سے بیرسٹری کی سند حاصل کی۔

نہرو 1912ء میں ہندوستان واپس آ گئے جہاں پہلے تو انہوں نے وکالت کا کام شروع کیا لیکن پھر وہ تحریک آزادی کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ 1912ء میں انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس میں بطور مندوب شرکت کی اور گاندھی سے ان کی پہلی ملاقات 1916ء میں ہوئی۔ گاندھی کے نظریات وعقائد نے نہرو کی شخصیت پر بہت گہرے اثرات مرتب کئے۔ نہرو کو گاندھی کا خوف ونفرت اور تشدد سے مبرا لائحہ عمل بہت پسند آیا اور اگرچہ عدم تشدد کے نظریے کے بارے میں دونوں رہنماؤں کا رویہ قدرے مختلف رہا اور نہرو نے اسے کسی عقیدے کی بجائے ایک حکمت عملی کے طور پر اپنایا لیکن دونوں قائدین کے درمیان جلد ہی ایک مکمل ہم آہنگی و یگانگت کا تعلق استوار ہو گیا۔

1919ء میں جلیانوالہ باغ کا دلسوز واقعہ رونما ہو گیا۔ جس میں برطانوی فوجیوں نے نہتے

http://muftbooks.blogspot.com/

مظاہرین پر اندھا دھند فائرنگ کر کے 379 معصوم شہریوں کو گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔ اس واقعے میں 379 تو جان سے گئے اور 1200 سے زائد افراد زخمی بھی ہوئے۔ یہی نہیں اس کے علاوہ بھی ظلم و بربریت کے کئی واقعات منظر عام پر آئے جس کے نتیجے میں ہندوستان سراپا احتجاج بن گیا اور مقامی لوگوں میں قومیت کی لہر زور پکڑ گئی۔ اس ساری صورتحال سے نہرو بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہوں نے بھی اس احتجاجی تحریک میں زور و شور سے حصہ لینا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہرو کو بہت سے دیگر کانگریسوں کے ہمراہ گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا اور نہرو کے آبائی صوبے میں کانگریس پر پابندی لگا دی گئی۔ انہیں اس کے بعد بھی سات بار جیل بھگتنا پڑی اور ان تحریکی سرگرمیوں کی وجہ سے وہ کل نو برس قید میں رہے۔ قید و بند کے ان ایام کے دوران انہیں کارل مارکس کی تحاریر کا بڑی گہرائی سے مطالعے کا موقع ملا اور بعد میں انہوں نے مارکس کے معاشی نظریات میں مقامی تقاضوں کے مطابق کانٹ چھانٹ کر کے انہیں اپنی حکومتی پالیسیوں کا حصہ بنا لیا۔ وہ ہنسی مذاق میں جیل کو سب سے بڑھیا یونیورسٹی قرار دیا کرتے تھے۔

1929ء میں نہرو کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور لاہور کا وہ اجلاس ان کے عہد صدارت میں منعقد ہوا جس میں ہندوستان کا پہلا اعلان آزادی پیش کیا گیا۔ نہرو کو کانگریس کا صدر بنوانے میں گاندھی جی کا بڑا کردار تھا اور وہ نہرو کو ہندوستانی نوجوانوں کی اس سیاست کا نمائندہ تصور کرتے تھے جو دائیں اور بائیں بازو کی دو انتہاؤں کے درمیان مفاہمتی پل کا کردار ادا کر سکتی تھی۔ اگرچہ گاندھی نے اپنے منہ سے نہرو کو اپنا سیاسی جانشین کہیں 1942ء میں جا کر مقرر کیا لیکن بہت سے ہندوستانیوں کو اس سے بہت پہلے 1931ء میں جب نہرو کے والد فوت ہوئے، اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ گاندھی کا اصل سیاسی وارث نہرو ہی ہے۔

گاندھی اور نہرو کی سرکردگی میں ہندوستان کی تحریک آزادی بڑھتے بڑھتے 1930ء کے عشرے میں داخل ہو چکی تھی۔ 1935ء میں لندن میں منعقد ہونے والی گول میز کانفرنس میں ہندوستان میں شامل صوبوں کیلئے محدود خود مختاری کا اعلان کیا گیا لیکن 1939ء میں دوسری عالمی جنگ شروع ہونے کے بعد ہندوستان میں برطانوی سامراج کے خلاف مظاہروں میں شدت پیدا ہو گئی اور گاندھی نے ملک میں عام نافرمانی کی تحریک چلانے کا اعلان کر دیا۔ 1942ء میں کانگریس نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' قرارداد منظور کی جس کے سبب ساری کانگریسی قیادت کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا جس میں نہرو بھی شامل تھے۔ اس آخری بار نہرو صاحب تین برس تک جیل میں رہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

جب انگریز سرکار نے جنگ عظیم دوم کے بعد ہندوستان سے دستبردار ہونے کی تیاریاں شروع کیں تو نہرو کو 1946ء میں بننے والی عبوری حکومت کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔ ہندوستان کو بالآخر 1947ء میں آخری برطانوی وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے طویل مذاکرات کے بعد آزادی کی منزل مل گئی لیکن ہوا کیا کہ اب ہندوستان ہندوستان نہ رہا تھا بلکہ اب یہ دو الگ الگ ریاستوں میں بٹ چکا تھا۔ ایک حصے پر مسلمانوں نے پاکستان بنا لیا اور دوسرے حصے پر ہندو اکثریت کا بھارت معرض وجود میں آ گیا۔ اگرچہ گاندھی جیسے رہنماؤں نے ہندو مسلم اتحاد قائم رکھنے اور بٹوارے کو روکنے کیلئے بڑی سر توڑ کوشش کی تھی مگر نہرو کو بالآخر ہار ماننا پڑی اور 14 اگست 1947ء کو دنیا کے نقشے پر دو الگ اور نئی ریاستیں وجود میں آ گئیں۔ نہرو بھارت کے پہلے وزیر اعظم بنے۔

سیکیولرازم اور جدیدیت کو نہرو حکومت کے نمایاں خدوخال میں شمار کیا جاتا ہے۔ بھارت میں پارلیمانی طرز حکومت متعارف کروانے کے ساتھ نہرو کو ان کی کثرت پسندی، سماجی اصلاح، صنعتی ترقی اور نچلے اور پسے ہوئے طبقوں خصوصاً خواتین کی بہبود کیلئے بھی یاد رکھا جاتا ہے۔ خاص طور پر بھارتی بیواؤں کیلئے تو انہوں نے بہت اچھا کام کیا، جنہیں نہرو کے دور اقتدار میں پہلی بار وراثتی اور ملکیتی حقوق نصیب ہوئے۔ بین الاقوامی منظر نامے پر وہ غیر جانبدار ملکوں کے ایک بڑے ترجمان اور سامراجیت کے کٹر مخالف بن کر ابھرے۔

نہرو نے اپنی خودنوشت سوانح عمری کے علاوہ بھی کئی تحریریں قلمبند کیں جن میں ہندوستان اور دنیا (1962ء)، سوویت یونین (1949ء)، تاریخ عالم پر ایک نظر (1942ء) اور ان کی تقاریر و مضامین کے دو مجموعے اکھنڈ ہندوستان (1941ء) اور آزادی اور مابعد (1949ء) شامل ہیں۔

نہرو کو 1963ء میں دل کا معمولی سا دورہ پڑا لیکن 1964ء میں پڑنے والا دورہ معمولی ثابت نہ ہوا اور وہ اس کے تین ماہ بعد ایک تیسرا دورہ پڑنے پر انتقال کر گئے۔ نہرو تو چلے گئے لیکن وہ اپنے پیچھے اپنی بیٹی اندرا کو چھوڑ گئے جو کافی عرصہ تک بھارت میں برسر اقتدار رہیں۔ اندرا کے قتل کے بعد نہرو کا نواسہ راجیو آیا لیکن وہ بھی ایک خودکش دھماکے میں مارا گیا۔ آج بھارت کے وزیر اعظم تو ایک سکھ رہنما موہن سنگھ جی ہیں لیکن راجیو کی بیوہ جو کانگریس کی صدر ہیں، کو بھارتی حکومت کا اصل کرتا دھرتا خیال کیا جاتا ہے۔

نیشن آف اسلام

http://muftbooks.blogspot.com/

ایک مذہبی وثقافتی تنظیم جس میں غالب اکثریت امریکہ کے سیاہ فام مسلمانوں کی ہے۔ یہ تنظیم لوسٹ، فاؤنڈ نیشن آف اسلام، ورلڈ کمیونٹی آف اسلام ان دا ویسٹ اور امیریکن مسلم مشن کے ناموں سے بھی مرسوم ہے۔ اس تنظیم کی بنیاد 1930ء کے عشرے میں ویلس محمد (جنہیں ولی فرح، پیغمبر، مہدی اعظم یا ناجی بھی کہا گیا ہے) نے رکھی جو ایک معماتی شخصیت کے مالک تھے اور 1930ء میں نقل مکانی کر کے امریکہ آ بسے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ 1877ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ مورش سائنس ٹیمپل نامی تنظیم کے قائد پیغمبر ڈریو علی کے دعوؤں کی طرز پر انہوں نے بھی دعویٰ کیا کہ تمام سیاہ فام لوگ قدیم مسلم قبیلے شباذ کے رکن ہیں۔

فارڈ کا کہنا تھا کہ سیاہ فام لوگ خود آگاہی کے توسط سے کفارہ ادا کر کے خود کو ''سفید شیطانوں'' کے جبر سے نجات دلا سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں۔ فارڈ نے 1931ء میں تعمیر شدہ ڈٹرائٹ کی ایک مسجد سے اپنی تبلیغ شروع کی۔ ان کے ابتدائی پیروکار انہیں اللہ کا اوتار مانتے تھے اور وہ زیادہ تر ان افریقی امریکی باشندوں پر مشتمل تھے جو جنوب کے دیہی علاقوں سے بھاگ کر شمال کے صنعتی شہروں میں آ بسے تھے۔ فارڈ نے ایک شخص ایلیا پول کو اپنا خلیفہ نامزد کیا جس نے بعد ازاں اپنا نام بدل کر ایلیا محمد رکھ لیا۔ 1934ء میں فارڈ کے پراسرار طور پر غائب ہو جانے کے بعد ایلیا محمد روز بروز پھیلتی اس تنظیم کا قائد بن گیا۔

ایلیا محمد نے شکاگو میں ایک اور عبادت گاہ تعمیر کروائی۔ دوسری عالمگیر جنگ کے اختتام تک نیشن آف اسلام کی عبادت گاہیں امریکہ (شمالی یو ایس) کے بیشتر بڑے بڑے شہروں تک پھیل چکی تھیں۔ اگرچہ اس جماعت کے بیشتر عقائد اور عبادات سرزمین عرب کے خالص اسلام کے مطابق تھے، نیشن آف اسلام نے ایلیا محمد کی سرکردگی میں سیاہ فام مسلمانوں کا ایک الگ مسلک بھی تشکیل دینا شروع کیا جس میں تخلیق انواع سے متعلق ''سائنسی'' اور تاریخی نظریات کی بھرمار تھی۔ اس مسلک کے عقائد کے مطابق کالے ہی اس دنیا میں سب سے پہلے آئے جنہیں اللہ کی شبیہہ کے مطابق تخلیق کیا گیا تھا اور اللہ کی زمین کی حکمرانی ان کے سپرد کی گئی تھی۔ سفید فام لوگ انتخاب نسل کے ایک خراب تجربے کا نتیجہ ہیں اور وہ ایک شیطانی قوم ہیں جو سیاہ فام لوگوں کو غلام بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نیشن آف اسلام کا نصب العین سیاہ فام لوگوں کو اس آخری جنگ آخری کیلئے تیار کرنا تھا جس کے نتیجے میں پوری دنیا کا قبضہ ایک بار پھر ان کے ہاتھوں میں آ جائے گا۔ ان نئے عقائد کو بہت زیادہ تنقید کا سامنا کرنا پڑا اور اس تنظیم کے اراکین پر نفرت، انگریزی، علیحدگی پسندی، یہود دشمنی اور نسل پرستی کو ہوا دینے کے الزامات عائد کئے گئے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

اس تنظیم نے زیادہ عملی کام بھی سرانجام دے۔اس سے وابستہ کارکنان نے نشے کی لت میں گرفتار افراد کی بحالی کی مہمیں چلائیں، سیاہ فام سزایافتہ لوگوں کی اصلاح وتربیت کیلئے کام کیا، ثمر اسلام کے نام سے ایک عسکری تنظیم کی بنیاد ڈالی اور سیاہ فام بستیوں میں سماجی خدمت کے کاموں کی پیشوائی کی۔محمد کی آہنی قیادت میں نیشن آف اسلام نے ایک انتہائی منظّم اور منضبط تنظیم کی شکل اختیار کر لی اور تقریباً ہر بڑے شہر کی افریقی بستیوں میں اس کے ذیلی گروپ وجود میں آ گئے۔نیشن آف اسلام نے ایک دس نکاتی پروگرام بھی پیش کیا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ سیاہ فام مجرمین کو رہا کیا جائے، امریکہ میں ایک الگ سیاہ فام ملک کا قیام عمل میں لایا جائے اور سیاہ فام افراد کو وفاق کی طرف سے عائد کردہ ٹیکسوں اور فوجی خدمات سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

1960ء کے عشرے میں میلکم دہم نے محمد کے ترجمان اول کی حیثیت اختیار کر لی جس سے اس تنظیم کو بہت شہرت اور بدنامی ملی۔میلکم کھلم کھلا عسکری خیالات کا حامل اور شعلہ بیان مقرر تھا۔اس کے آگے آنے سے نیشن آف اسلام ٹی وی اور اخبارات کی بہت سی خبروں اور فیچروں کا موضوع بنی۔اس سلسلے میں سب سے یادگار پروگرام ٹیلیویژن پر ''نفرت ثمر نفرت'' کے نام سے پیش کیا گیا۔1961ء میں ایرک لنکن نے ''امریکہ کے سیاہ فام مسلمان'' کے عنوان سے ایک کتاب بھی لکھی جو اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ انہوں نے اس تنظیم کو سیاہ فام نسل کے نوجوانوں میں بہت زیادہ مقبولیت دی لیکن اس کے ساتھ ان کے اقدامات کے نتیجے میں قانون نافذ کرنیوالی وفاقی ایجنسیاں اس کی دشمن بن گئیں۔میلکم دہم اور تنظیم کے دیگر اراکین کے درمیان اختلافات شدت اختیار کر جانے کے بعد انجام کار انہیں تنظیم سے نکال دیا گیا اور 1965ء میں وہ قتل کر دیئے گئے۔

1970ء کے عشرے میں جب نیشن آف اسلام محمد کے بیٹے وارث دین (یا ویلس ڈی) محمد کے ہاتھ میں آئی تو ایک بالکل مختلف رنگ مشاہدے میں آنے لگا۔انہوں نے اپنے ابا کی نسلی تعلیمات سے قطع تعلقی اختیار کر لی اور تنظیم کی رکنیت کیلئے تمام نسلی قدغنیں ختم کر دیں۔اس کے ساتھ انہوں نے لباس، غذا اور ذاتی رہن سہن کی بہت سی بندشیں بھی ختم کر دیں۔انہوں نے ممبران کو سیاسی عمل میں شرکت اور فوجی خدمات میں شمولیت کی بھی اجازت دے دی۔انہوں نے اس تنظیم کا نام بدل کر امیریکن مسلم مشن رکھ دیا لیکن پھر 1985ء میں آ کے یہ موقف اختیار کرتے ہوئے اسے ختم کر دیا گیا کہ اس اقدام سے تنظیم سے وابستہ افراد کو مسلم امہ سے قریب تر لانے میں مدد ملے گی۔

ایلیا محمد کے قریبی ساتھیوں میں شامل ایک صاحب لوئی فرحان جو کہ نیو یارک والی عبادت گاہ کے امام بھی تھے نیشن آف اسلام کا نام استعمال کرتے رہے۔ انھوں نے وارث دین کے ترک کردہ بہت سے عقائد اور پابندیوں کو از سر نو بحال کیا اور انہیں اپنے پیروکاروں میں رائج کیا۔ فرحان نے نیشن آف اسلام کی وہی پہلے والی مجادلانہ روش بھی اختیار کیے رکھی۔ یہود دشمن مواد کی حامل ایک کتاب ''سیاہ فاموں اور یہودیوں کے درمیان خفیہ تعلق کی کہانی''، جس میں یہودیوں کو غلاموں کی تجارت کا مورد الزام ٹھہرایا گیا تھا، کی اشاعت نے فرحان اور اس تنظیم کی شہرت کو بہت نقصان پہنچایا۔ تاہم 1990ء کے عشرے تک فرحان کی نیشن آف اسلام کو شہری حقوق کی تنظیموں کے ایک طاقتور متبادل کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔

اکتوبر 1995ء میں فرحان اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے واشنگٹن میں منعقد کیے جانے والے مارچ میں ایک طرف جہاں نیشن آف اسلام کے کمیونٹی بلڈنگ کے روایتی اہداف سے وابستگی کا اعادہ دیکھنے میں آیا وہاں دوسری طرف اس کے اراکین میں علیحدگی پسندی کے پہلے والے جذبات میں تبدیلی بھی مشاہدے میں آئی جس کا اظہار سیاہ فام علاقوں میں ووٹروں کے ناموں کے اندراج کے لئے چلائی جانے والی مہمات کے حق میں سنائی دیئے گئے بیانات میں ہوا۔

نیطشے، فریدرک ولہیم (1844ء۔1900ء)

جرمن فلسفی اور شاعر۔ نیطشے کے والد پروشیا کے صوبہ سیکسن میں ایک پروٹسٹنٹ پادری تھے۔ نیطشے کا نام شاہ پروشیا فریڈرک ولہیلم کے نام پر رکھا گیا کیونکہ دونوں کی تاریخ پیدائش ایک ہی تھی۔ نیطشے کے والد پاگل ہو کر 1849ء میں اس دنیا سے کوچ کر گئے اور نیطشے اپنے گھر والوں کے ساتھ ہجرت کر کے نورمبرگ چلے گئے۔ انہوں نے پفورٹا کے ایک بورڈنگ سکول اور یونیورسٹی آف بون سے تعلیم حاصل کی لیکن 1865ء میں یونیورسٹی آف لائپ مک جا کر عما نوئیل کانٹ (1724ء۔1804ء)، شوپنہاؤر (1788ء۔1860ء) جیسے بڑے جرمن فلسفیوں اور اس دور کے نامور موسیقار رچرڈ واگنر (1813ء۔1883ء) کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ایک برس فوج میں گزارنے کے بعد نیطشے کو چوبیس سال کی عمر میں یونیورسٹی آف باہنر میں کلاسیکی لسانیات کا ایسوسی ایٹ پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ باہنر یونیورسٹی نے 1869ء میں انہیں بنا کسی مقالے یا امتحان کے ڈاکٹریٹ کی سند عطا کر دی اور وہ جب باہنر واپس آئے تو انہیں پروفیسر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ نیطشے کو انہی ایام میں آتشک کا موذی مرض لاحق ہوا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ آخری عمر

http://muftbooks.blogspot.com/

میں ان پر دیوانگی کا جو دورہ پڑا وہ اسی بیماری کا نتیجہ تھا۔ اس معاملے کے بارے میں بہت سی قیاس آرائیاں سننے میں آتی ہیں کیونکہ نیطشے نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ تجرد میں گزارا۔

نیطشے کی پہلی کتاب ''روح موسیقی سے المیے کی پیدائش'' 1812ء میں شائع ہوئی جس پر ''روح یونان'' کے حوالے سے اور اس تحریر کے علمی طریقے کے حوالے سے بہت بحث مباحثہ ہوئے۔ اس کتاب میں یونانی حوالہ جات اور حواشی مفقود ہیں تاہم اس میں یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ یونانی المیے نے اپالونین فتح کے طور پر ڈائیونس (باخس) کے ماننے والوں کے والہانہ رقص وسرود سے جنم لیا۔ اس کتاب کے آخر میں واگنر کی غنائیہ تمثیل کی خوب مدح وتحسین کی گئی ہے اور اسے المیے کی حیات نو سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کتاب کے اس حصے میں ایک نئی قسم کے فلسفی یعنی ''آرٹسٹک سقراط'' کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا ہے کہ جو عقلی تجزیات کی اہلیت تو رکھتا ہو لیکن ان تجزیات کو آرٹ کا تڑکہ بھی لگا محسوس ہو۔ 1873ء سے 1876ء تک کے عرصے میں نیطشے نے اپنے چار ''بے وقتے افکار'' شائع کیے جن میں انہوں نے معاصر دور کی ثقافتی بے ذوقی کو ہدف تنقید بنایا۔ ان تحاریر میں ان کی مسیحی اخلاقیات پر ابتدائی یلغار اور ان کے فلسفہ خود تولیدی کا ارتقاء بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

نیطشے 1878ء میں اس دور کے نمایاں ترین جرمن فنکار اور اپنے انتہائی قریبی دوست واگنر سے ان بن ہونے پر بحرانی کیفیت کا شکار ہوئے۔ 1876ء سے 1882ء تک کے عرصے میں انہوں نے پانچ کتب شائع کیں جو زیادہ تر مقولوں پر مشتمل تھیں۔ ان میں سے تین کتب ''ہیومن ٹو ہیومن'' (1878)ء کے عنوان سے ایک مجموعے کی شکل میں شائع ہوئی۔ ''حکمت شادان'' 1882ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ کتب تجرباتی نوعیت کی ہیں اور اس میں انسانی کردار کو ایک طرح دینے'' کی کوشش کی گئی ہے۔ ان میں نیطشے کے موخر دور میں نمو پانے والے تصورات مثلاً ''آرزوئے تسخیر (Will to Power) اور اخلاقیات آقا وبندہ کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ ان تصورات اور فوق البشر یعنی خود تخلیقی انسان کے تصور کو اگلی تین کتب میں زیادہ تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتب ''یوں گویا ہوا زرتشترا'' (1885ء) ''خیر وشر سے آگے'' (1886) اور ''اخلاقیات کا سلسلہ نسب'' (1887ء) ہیں اور انہیں نیطشے کی بہترین اور سب سے زیادہ اثر آفرین تصانیف تصور کیا جاتا ہے۔

''یہ رہا وہ آدمی'' میں نیطشے نے اپنی سابقہ تحاریر کا استہزائیہ انداز میں جائزہ لیا ہے۔ تاہم نیطشے کی ہمشیرہ نے 1908ء تک اس کتاب کی اشاعت روکے رکھی۔ نیطشے پر 1908ء میں پاگل

http://muftbooks.blogspot.com/

پن کا دورہ پڑا اور ان کی بقیہ تمام عمر اسی کیفیت میں گزر گئی۔ انہوں نے اپنی آخری کتاب ''قضیہ واگنر'' 1888ء میں سے اپنے اختلافات کی وضاحت کیلئے شائع کی تھی۔ آسٹریا کے عظیم نفسیات دان سگمنڈ فرائیڈ کا کہنا ہے کہ خود کو جس قدر نیطشے اچھی طرح جانتے تھے اتنا تاریخ انسانی کا کوئی اور شخص خود کو نہیں جان سکا اور آئندہ بھی کوئی خود کو اتنا نہیں جان سکے گا۔

و

والکٹ، ڈیرک (آلٹن) (1920ء۔.....)

نوبل انعام یافتہ ویسٹ انڈین شاعر اور ڈرامہ نگار۔ وہ ویسٹ انڈین جزیرے سینٹ لوسیا میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی زندگی نسلی و ثقافتی اعتبار سے ایک رنگارنگ معاشرے میں گزری جس کے اثرات ہمیں ان کی نظموں اور ڈراموں میں بھی نظر آتے ہیں۔ والکٹ والدین کے اعتبار سے آدھے یورپی اور آدھے افریقی ہیں۔ انھوں نے کئی لحاظ سے ایک منقسم شخصیت اور ''ثقافتی شیزوفرینیا'' کے شکار بچے کے طور پر وقت گزارا۔ ''ثقافتی شیزوفرینا'' کی اصطلاح دراصل انہوں اپنے لیے خود ہی اپنے مضمون ''سانجھ کیا کہے؟'' میں استعمال کیا ہے۔ اگرچہ ان کے گھر اور سکول میں انگریزی بولی جاتی تھی، لیکن باہر انہوں نے خود کو ایسی آبادی سے گھرا پایا جس کی زبان فرانسیسی اور کریول کا آمیزہ تھی اور جو ایک محکوم قوم کی حیثیت سے اپنی بقا کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ محکوموں اور سامراجیوں دونوں سے نسبت نے والکٹ کی بحیثیت لکھاری نشوونما میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

والکٹ کی بطور ڈرامہ نگار زندگی کا آغاز ان ایام میں ہوا جب وہ یونیورسٹی آف ویسٹ انڈیز میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ وہ جیکو بین ڈرامے سے متاثر تھے اور ان کا پہلا کھیل ہنری کرسٹوف تھا جو کہ ایک تاریخی ڈرامہ تھا۔ یہ ڈرامہ اشعار میں لکھا گیا اور سینٹ لوسیا (1950ء) اور لندن (1951ء) دونوں جگہوں پر پیش کیا گیا۔ بعد میں انہوں نے تاریخیت کو خیرباد کہہ دیا اور اپنی توجہ لوک ثقافت اور ویسٹ انڈیز کی ثقافتی تالیف پر مرکوز کر لی۔ والکٹ یو ایس میں ایک مختصر عرصے کے لئے تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1959ء میں ٹرینیڈاڈ منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے لٹل کیرب تھیٹر سے وابستگی اختیار کر لی۔ بعدازاں انہوں نے ٹرینیڈاڈ تھیٹر ورکشاپ کی بنیاد رکھی اور لٹل کیرب سے مل کر پانچ مزید کھیل پیش کئے۔ والکٹ نئی ٹرینیڈاڈ/ٹوبیگو قوم سے بھی بہت

http://muftbooks.blogspot.com/

زیادہ وابستہ تھے اور انہوں نے مقامی آرٹ اور سیاسی جرائد دونوں کیلئے لکھنے لکھانے کا کام کیا۔ شاید ''کوہ بندر کا خواب'' کو ان کے اس دور کا معروف ترین کھیل قرار دیا جا سکتا ہے جس کی تیاری پر کئی برس صرف ہوئے اور یہ بالآخر 1967ء میں ٹورنٹو میں سٹیج کیا گیا۔ وہ اس تخلیق میں بھی نو آبادکاروں اور مقامی لوگوں کے درمیان کے تعلقات پر سوچ بچار کرتے نظر آتے ہیں۔

والکٹ 1970ء اور 1980ء کے عشروں میں بھی ڈرامے اور نظمیں لکھتے رہے۔ ان کی تخلیقات نے بتدریج زیادہ دورن بیں لہجہ اختیار کر لیا ہے لیکن وہ اب بھی ویسٹ انڈین زندگی کی زبان اور لے سے ہم آہنگ نظر آتی ہیں اور ان میں استعماریت کے ترمسئلے کی عکاسی کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً اوبیلیون (1976ء) ایک حقیقی رستفاری قوم، اس کی زبان اور مذہبی عقائد پر مبنی ہے۔

والکٹ 1970ء کے عشرے کے وسط سے مختلف امریکی یونیورسٹیوں میں تدریسی فرائض بھی سرانجام دیتے رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے شاعری اور ڈرامہ نگاری کو بھی ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا ہے۔ انہیں 1992ء میں ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔

وٹگنشٹائن، لڈوک (یوزف یوہان) (1889ء۔1951ء)

ایک معروف فلسفی جن کا تعلق آسٹریا سے تھا۔ وٹگنشٹائن نے ایک متمول یہودی النسل گھرانے میں پرورش پائی جس نے کیتھولک مسلک اختیار کر لیا تھا۔ چودہ برس کی عمر تک انہوں نے گھر پر ہی تعلیم حاصل کی۔ چونکہ ان میں ابتدائی عمر سے ہی میکانکی صلاحیتوں کا اظہار ہونے لگا تھا۔ ان کے والدین نے انہیں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے پہلے برلن اور پھر مانچسٹر بھیجا۔ جب ان کی شناسائی انگریز ریاضی دان اور فلسفی برٹرینڈ رسل (1872ء۔1970ء) سے ہوئی تو انہیں علم ریاضیات کی فلسفیانہ بنیادوں میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اس پر انہوں نے رسل کے ساتھ مل کر کام کرنے کیلئے انجینئرنگ ترک کر کے ٹرنٹی کالج کیمبرج میں داخلہ لے لیا۔ پھر کیا ہوا کہ انہوں نے کیمبرج کو بھی خیر باد کہہ دیا اور ناروے میں گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ جب ان سے کیمبرج چھوڑنے کی وجہ دریافت کی گئی تو فرمانے لگے کہ کوئی ایسے لوگوں کے درمیان چین سے کیسے رہ سکتا ہے جن سے اسے گھن آتی ہو۔ جب جنگ شروع ہوئی تو انہوں نے ناروے کو بھی چھوڑ دیا اور آسٹریا کی فوج میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس دوران وہ اٹلی والوں کے ہتھے چڑھ گئے اور انہیں کچھ وقت جنگی قیدی کے طور پر گزارنا پڑا۔ اپنی ملازمت اور قید کے دوران وہ اپنی اس کتاب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں مصروف رہے جو انہوں نے کیمبرج کے دنوں میں شروع کی تھی۔ اس کتاب کا عنوان ''رسالہ منطقی و فلسفی'' تھا اور یہ ان کی واحد تصنیف ہے جو ان کی زندگی میں شائع ہوئی۔

http://muftbooks.blogspot.com/

ونگنشٹائن 1920ء میں اپنے وطن آسٹریا لوٹے جہاں انہوں نے ایک گاؤں کے سکول میں پڑھانا شروع کر دیا۔ چھ برس بعد وہ تدریس سے مستعفی ہو کر ماہر تعمیر بن گئے اور انہوں نے اپنی ہمشیرہ کیلئے ویانا میں ایک حویلی تعمیر کی۔ جب یہ عمارت مکمل ہوئی تو ان کا فلسفے کا شوق پھر عود کر آیا۔ اور وہ 1930ء میں کیمبرج واپس جا کر ریسرچ فیلو کے طور پر کام کرنے لگے۔ ایک مرتبہ پھر جنگ آڑے آئی اور ونگنشٹائن نے ایک فوجی ہسپتال میں نرس کی ملازمت اختیار کر لی۔ 1944ء میں وہ ایک مرتبہ پھر کیمبرج جا کر پڑھانے لگے لیکن جب انہیں اس میں کوئی مزیداری محسوس نہ ہوئی تو انہوں نے 1947ء میں یہ پیشہ ہمیشہ کیلئے ترک کر دیا۔ انہوں نے اگلے چند برس ڈبلن کے مضافات میں واقع ایک گاؤں میں خلوت نشینی میں گزارے۔ لیکن اس دوران انہوں نے امریکہ کا سفر بھی کیا اور اپنی کتاب ''فلسفیانہ تحقیقات'' بھی مکمل کی جسے ان کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔

ان کے فلسفے کی مرکزی بات یہ نظریہ ہے کہ فلسفے کے پیشتر مسئلوں کو فلسفے کے بیرون زبان کے افعال پر توجہ دے کر زیادہ بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ونگنشٹائن نے اپنی پہلی کتاب ''رسالہ منطقی و فلسفی'' میں زبان، فکر اور دنیا کے مابین موجود قریبی تعلق کی وضاحت کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ خیال اور زبان ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کام کرتے ہوئے حقیقت کا پرتو بناتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ کسی بول کو سمجھنے کیلئے یہ جاننا اہم ہے کہ اسکے مختلف اجزاء ایک دوسرے سے اور حقیقی دنیا سے کس تعلق میں ہیں۔ جب ہم ''فلسفیانہ تحقیقات'' کو دیکھتے ہیں تو یہ ہمیں اس فارمولے سے بہت زیادہ انحراف کرتی نظر آتی ہے کیونکہ اس میں زبان کی وضاحت حقیقت کے ردعمل نیز اس کی تصویر کشی کے طور پر کی گئی ہے۔

وکٹورین ازم

انیسویں صدی کے برطانیہ کی سیاسی و سماجی آب و ہوا۔ وکٹورین روایات کی جڑیں اٹھارویں صدی کی ان پروٹسٹنٹ تحریکوں میں ملتی ہیں جن کے روح رواں روسو، شلر اور عمانوئل کانٹ جیسے دانشور تھے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے وکٹورین دور برطانوی تاریخ کا وہ عہد ہے جب ملکہ وکٹوریہ (1839ء۔1901ء) برسر اقتدار تھیں۔ اس وقت یورپ میں نسبتاً زیادہ خوشحالی کا زمانہ تھا۔ صنعت کاری تیزی سے نشوونما پا رہی تھی اور ایک وسیع متوسط طبقہ وجود میں آ رہا تھا۔ بورژوا طبقے کے عروج سے اشرافیہ مخالف احساس بھی در آیا اور عالمیت اور اینٹی پروٹیکشنسٹ جذبے کو تقویت ملی۔ تمام لوگوں کے درمیان برابری نیز اخلاقی ذمہ داری کے ایک

http://muftbooks.blogspot.com/

قومی احساس نے غلامی کی برائیوں کے متعلق مباحث کو جنم دیا جسے بالآخر برطانیہ میں 1833ء میں ایک پارلیمانی قانون کی وساطت سے ختم کر دیا گیا۔

دیکھا جائے تو وکٹورین ازم کے قلب میں انقلاب کے بعد ابھرنے والے معاشرے میں نظم وضبط برقرار رکھنے کی خواہش کارفرما نظر آتی ہے۔ اس عہد میں شہریوں سے تعمیل، محبت، دینداری، شہری فرائض کی بجا آوری، سنجیدگی اور عزت دار رویے کی توقع کی جاتی تھی۔ انفرادیت اور جنسیت کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ ان کا تعلق انقلاب سے ہے لہٰذا انہیں دبانے اور اس کی بجائے مذہبی جذبات راسخ کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ جنسی رویوں کو ''شائستہ'' معاشرے میں تو کامیابی سے دبا دیا گیا لیکن یہ جنسی رویے وکٹورین عہد کی زیرزمین دنیا میں اتنے ہی زور وشور سے ابھرے جہاں رنڈی بازی خوب پھلی پھولی۔

عہد وکٹوریہ میں قانون پسندی کو معاشرے میں بڑی خاص قدر حاصل تھی لہٰذا پولیس کی حمایت میں بھی خوب اضافہ ہوا۔ وکٹورین دور کو نہایت ''شائستہ'' اور ''مہذب'' دور کے طور پر یاد کیا جاتا ہے لیکن جان سٹوارٹ مل اور چارلز ڈکنز جیسے اس دور کے بعض ناقدین ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنے مضامین اور ناولوں میں وکٹورین عہد کی طنزیہ تصویر کشی کر کے اس دور کی ریاکاری اور تقلید کی خوب قلعی کھولی۔

ووڈو

ہیٹی کا ایک لوک مذہب جس میں فرانسیسی نوآبادکاروں کے متعارف کردہ رومن کیتھولک عبادات کی بعض چیزیں اور یوروبا، فان اور کانگو قبائل کے غلاموں کے لائے ہوئے افریقی اور اسلامی الہیاتی وطلسمی عناصر باہم یکجا ہو گئے ہیں۔ ''ووڈو'' کا لفظ ''ووڈن'' سے نکلا ہے فان باشندوں کی زبان کے مطابق جس کا مطلب ''دیوتا'' یا رُوح'' ہے۔ اس روایت کے پیروکاروں کا عقیدہ ہے کہ خدا سب سے بڑا ہے لیکن وہ قادر مطلق نہیں کیونکہ وہ ہر وقت انسانوں کے روزمرہ معاملات دیکھنے میں لگا رہتا ہے۔

اسی مذہب کے ماننے والے لوآ یعنی ارواح سے مدد مانگتے ہیں جو ان کے عقیدے کے مطابق ان کے کاموں کو بنا یا بگاڑ سکتی ہیں۔ صفات کے اعتبار سے یہ ارواح عیسائی اولیاء سے بہت مشابہ ہیں اور انہیں مختلف مقامی یا افریقی دیوتاؤں، اجداد یا کیتھولک پیروں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ووڈو کے پیروکاروں کا کہنا ہے کہ لوآ کبھی جیتے جاگتے افراد تھے جواب بھی کسی ماننے والے کے جسم میں داخل ہو سکتے ہیں اور ایسا شخص لوآ کی سیوا کر کے ان سے بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔

یہ لوگ لوآ کو خوش کرنے کیلئے کسی عبادت گاہ میں جمع ہوتے ہیں اور کسی کاہن یا کاہنہ کی قیادت میں اپنی مذہبی رسمیں ادا کرتے ہیں اور ان رسموں کے دوران ناچتے گاتے ہیں، دعائیں مانگتے ہیں، پکوان بناتے ہیں اور جانور قربان کرتے ہیں۔

ووڈو کاہن ہاؤنگان اور کاہنہ میمبو کہلاتی ہے اور انہیں ہیٹی کی دیہی زندگی میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کاہنوں کے بارے میں مشہور ہے کہ انہیں خوابوں اور مکاشفوں کے وسیلے سے علم حاصل ہوتا ہے۔ وہ اپنے ارادت مندوں کو مشورے دیتے ہیں، ان کا علاج کرتے ہیں اور انہیں سحر، ٹونے اور دیگر سفلی عملیات کے نحس اثرات سے محفوظ رکھتے ہیں۔ یہ باشندے کوئی بھی بڑا کام شروع کرنے سے قبل مشورے کیلئے اپنے کاہنوں کے پاس جاتے ہیں۔ ووڈو انہیں آسمانوں سے منظوری دلاتے ہیں اور پیروں کی ارواح سے رابطے کیلئے وسیلے کا کردار ادا کرتے ہیں، فطری واقعات کی وضاحت کرتے ہیں۔ لوگوں کی ذہنی پریشانی رفع کرتے ہیں اور لوگوں کو رقص و موسیقی اور ڈرامے کی تفریح فراہم کرتے ہیں۔

زومبی ووڈو فرقے کا ایک بہت انوکھا مظہر ہے اور گذشتہ دور میں اس کے بارے میں بہت سنسنی پھیلائی گئی ہے۔ زومبی کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ یا تو کسی مرے ہوئے شخص کی روح ہوتی ہے جسے ساحرانہ مقاصد کیلئے استعمال کیا جاتا ہے اور یا پھر یہ کوئی سچ مچ کی لاش ہوتی ہے جسے جادو کے زور پر قبر سے اٹھا کر ایک غیر ارادی مشین کی طرح کسی کھیت میں کام کرنے کیلئے لگا دیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ زومبی کاہنوں کے کرنے سے حرکت میں آتے ہیں جو اپنے معفول کی جلد پر کوئی ایسا زہر لگاتے ہیں جس سے وہ کئی گھنٹوں کیلئے گہرے جسمانی فالج کی کیفیت میں چلا جاتا ہے۔

ووڈو سے وابستہ افراد کبھی غلامی کے خلاف جدوجہد میں پیش پیش رہے ہیں لہٰذا انہیں اس حوالے سے انقلابی خیال کیا جاتا ہے لیکن اب شہری حکومت کو ان کی طرف سے کوئی خطرہ درپیش نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسانوں کی بنیادی حالت میں بہتری کیلئے کوئی کردار ادا کر رہے ہیں۔ روسی کیتھولک چرچ پہلے کئی عشروں تک ووڈو کی بڑی شدومد سے مذمت کرتا رہا اور اس کے پیروکاروں کو سزا دینے کی حمایت کرتا رہا لیکن بیسویں صدی کے اواخر میں آ کر اس کے رویے میں تبدیلی دیکھنے میں آئی اور اس نے اس مسلک کے وجود کو برداشت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس مذہب کا صفایا کرنے کی کوشش کرنے والوں کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ مذہب بظاہر کسانوں کی ضروریات کو اس طرح سے پورا کرتا ہے جیسے کہ شہروں کا کیتھولک مسلک نہیں کر پاتا۔

ویدیں

http://muftbooks.blogspot.com/

ہندوستان کی مذہبی کتابیں۔ ویدک سنسکرت کے مطابق وید کا لغوی معنی ''علم'' ہے۔ ویدیں بھجنوں، منتروں، شعری تخیلات، دعاؤں اور دیو مالائی کہانیوں کا مجموعہ ہیں جنہیں قدیم دور کے رشیوں نے تالیف کیا۔ ہندو ان رشیوں کو اپنے اولین معلم اور آسمانی علم کے مخزن خیال کرتے ہیں۔ ویدوں کی تعداد چار ہے جن میں رگ وید، یجر وید، مسام وید، اور اتھرا وید شامل ہیں۔ بہت سے ہندو ویدوں کو الہامی کلام تصور کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ جس طرح براہ راست ادراک یا صحیح منطقی نتیجے کو جھٹلایا نہیں جا سکتا، اسی طرح ویدوں میں لکھی بات کی تکذیب بھی نہیں کی جا سکتی۔ بدھ مت کے پیروکاروں کی طرح ہندوؤں کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ کائنات کا نہ کوئی آغاز ہے اور نہ کوئی انجام اور یہ متواتر ادوار میں حرکت کرتی رہتی ہے۔ ویدوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ چاروں ویدیں چار عالمی ادوار (یگوں) کے آغاز پر ایک ایک کر کے اتریں۔ ویدوں میں لکھے لفظوں، شعروں اور سطروں کے معانی کو ثانوی اہمیت کا حامل خیال کیا جاتا ہے۔ اصل قوت ان لفظوں (اور ان کی آواز) کے اندر پوشیدہ تصور کی جاتی ہے۔ وہ برہمن جنہیں یہ علم حاصل ہو جاتا ہے کہ ویدک بھجن پڑھنے کا مناسب طریقہ کیا ہے اور رسوم کس طرح ادا کی جاتی ہیں، انہیں کائنات پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے یہ ہندی تہذیب کے قدیم ترین ایام سے ہی اس خطے کے بادشاہ اور راجے مہاراجے ولائتوں اور ان کے باشندوں کو تسخیر کرنے کیلئے ویدک رسوم ادا کرنے والے برہمنوں کی خدمات حاصل کرتے رہے۔

روایتی ہندوؤں کیلئے ویدوں کے زمانے کی بحث کرنا ایک لایعنی سی بات ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ ویدوں کی اصل ابتداء 1500 ق م اور 700 ق م کے درمیانی عرصے میں ہوئی اور یہ منوں مواد جمع ہونے میں تقریباً ایک ہزار سال صرف ہوئے۔

ویدک بھجنوں کا مواد ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ بعض بھجنوں میں ان مختلف دیوتاؤں کو مخاطب کیا گیا ہے جنہیں کچھ لوگ قوے فطری کی تجسیم خیال کرتے ہیں۔ بعض بھجن بہت نفیس، فلسفیانہ بلکہ متشککانہ بھی ہیں۔ ان میں آفات اور بدروحوں سے بچنے اور لوگوں کی خوشحالی کیلئے بہت سے منتر بھی ہیں۔ ویدوں کے بعض حصے بہت زیادہ مزاحیہ بلکہ پھکڑ پن کا نمونہ ہیں۔ ویدوں کا زیادہ رنگ مذہبی ہے۔ ان میں ہماری ملاقات بہت سے دیوی دیوتاؤں سے ہوتی ہے جو مختلف قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کی الگ الگ پوجا کی جا سکتی ہے۔ ضروری نہیں کہ کوئی ایک ہی دیوتا کی پرستش کرے۔ بعض دیگر افراد ویدوں کو بہت سخت خیال کرتے ہیں۔ مناسب طریقے سے پڑھے ہوئے منتر بہترین ثمر کا موجب بنتے ہیں اور دیوتا وہی کرتے ہیں جس کا ویدی

http://muftbooks.blogspot.com/

الفاظ اور رسوم انہیں حکم دیتے ہیں۔ فلسفیانہ مزاج کے افراد ویدوں کو کائنات کی اصل حقیقت کو سمجھنے اور خود میں اور باقی تمام اشیاء میں رواں دواں روح مطلق کو محسوس کرنے کا ایک وسیلہ خیال کرتے ہیں اور ان میں دکھائی دینے والے بہت سے دیوی دیوتاؤں کو اسی پوشیدہ مطلق کی علامتیں قرار دیتے ہیں۔ جدید ہندوؤں کو ویدوں میں توحید بھی نظر آتی ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ یہ محض اسلام اور عیسائیت سے درآمد شدہ نظریات کی وجہ سے ہو۔

ہ

ہانوکا

ایک یہودی تہوار۔ اس عبرانی لفظ کا مفہوم نذر یا نیاز ہے اور اس کا شمار ہم یہودیوں کے سب سے پرمسرت تہواروں میں کر سکتے ہیں۔ یہ مقابلی فتوحات کی یاد میں منایا جاتا ہے جن کے طفیل یہودی بالآخر مذہبی آزادی اور قومی خود مختاری سے ہمکنار ہوئے۔ ہانوکا کو ''نیاز کی رات'' یا ''روشنیوں کا تہوار'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس تہوار کے موقع پر ہیکل سلیمانی کی 168۔165 ق م میں یونانی عہد کے شامیوں کے ہاتھوں تباہ ہونے کے بعد دوبارہ تعمیر کی خوشی بھی منائی جاتی ہے۔

ہانوکا جو کہ مسلسل آٹھ یوم تک جاری رہتا ہے، کا آغاز یہودی سال کے تیسرے مہینے کی پچیسویں تاریخ کو ہوتا ہے۔ تہوار کا یہ دورانیہ غالباً قدیم عید شامیانہ کے آٹھ ایام کی مطابقت میں رکھا گیا ہے لیکن ایک تالمودی حکایت کے مطابق یہ اس معجزے کی یاد میں منایا جاتا ہے جس سے ایک دن کا مقدس تیل ہیکل کی سپلائی آنے تک آٹھ دن تک چلتا رہا تھا۔

ہل ایل اکبر (اندازاً پہلی صدی قبل مسیح تا پہلی صدی عیسوی) نے یہ رواج ڈالا کہ ہانوکا کی پہلی شب مینورہ (ہشت شاخہ شمع دان) کی واحد موم بتی روشن کی جائے اور اگلی شب دوسری اور پھر تیسری حتیٰ کہ ساری موم بتیاں روشن ہو جائیں۔ جب مینورہ کو جلایا جاتا ہے تو بچے مختلف کھیلیں کھیلتے ہیں اور انہیں بڑوں کی طرف سے تحائف دیئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ روایتی دعائیں (خصوصاً ہل ایل مکمل) پڑھی جاتی ہیں۔ بعض دیگر یہودی تہواروں کے برعکس ہانوکا میں کام یا خوراک کی کوئی بندش نہیں۔

ہالوکاسٹ

انگریزی زبان کے اس لفظ کا لغوی مطلب ''بہت بڑی تباہی'' ہے تاہم آج کل یہودی تاریخ کے تناظر میں اس سے مراد جرمنی کے نازی حکمران ہٹلر کے ہاتھوں یورپی یہودیوں کا وسیع

http://muftbooks.blogspot.com/

پیمانے پر قتل عام لیا جاتا ہے جو 1933ء سے 1945ء تک جاری رہا۔ یہودیوں کو ڈرانے دھمکانے اور ان کی نسل کشی کا سلسلہ تقریباً ایک عشرے تک چلتا رہا اور پھر اس کے جرمنی اور اس کے مقبوضہ علاقوں میں بسنے والے جپسیوں، ہم جنس پرستوں، اشتراکیوں اور فاشزم مخالف جرمنوں کو بھی اپنے حلقے میں لے لیا۔

نازیوں نے اپنی یہود دشمنی کو 1933ء میں ہٹلر کے چانسلر بنتے ہی عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا تھا اور ہٹلر نے اس کا دستاویزی اظہار جیل میں لکھی اپنی کتاب ''میری جدوجہد'' میں اس وقت ہی کر دیا تھا جب وہ ابھی اقتدار میں نہیں آیا تھا۔ 1935ء کے نورمبرگ قوانین کے تحت برسہا برس سے جرمنی میں مقیم یہودیوں سے جرمن شہریت واپس لے لی گئی اور یہودیوں اور دوسرے جرمنوں کے درمیان شادی بیاہ کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ بڑی جنگ سے قبل یہود دشمنی کا بڑا مظاہرہ نو اور دس نومبر کی درمیانی رات جسے ''شب شیشہ شکستگی'' بھی کہا جاتا ہے، کو اس وقت پیش آیا جب نازیوں نے پورے ملک میں یہودیوں کی عبادت گاہوں، دفتروں اور کارخانوں کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا۔ نئے یہودی محلے (گیٹو) اور عقوبت خانے تعمیر کیے گئے اور 1941ء میں چھ برس سے زائد عمر کے تمام یہودیوں پر یہ پابندی عائد کر دی گئی کہ وہ زرد رنگ کا ستارہ داودی لگا کر باہر نکلیں (ہم جنس پرستوں کو پیازی تکونین لگانے کو کہا گیا تھا) اس کے ساتھ تمام یہودیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ پبلک ٹرانسپورٹ اور ٹیلی فون استعمال نہ کریں۔ اس دور میں یہودیوں کے قتل اور ان کی گمشدگیوں میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

جنگ عظیم دوم میں جرمنوں کی تیز رفتار فتوحات (خصوصاً پولینڈ اور فرانس پر) نے یورپی یہودیوں کی ایک بہت بڑی اکثریت کو نازیوں کے رحم و کرم پر لا چھوڑا تھا۔ مشرقی یورپ میں تو جرمن خفیہ کے خاص دستوں نے پورے کے پورے دیہات کو مار ڈالا تھا۔ کئی یہودیوں کو ٹرکوں اور وینوں پر لادا گیا اور انہیں راستے میں اذیت ناک طریقوں سے قتل کرنے کے بعد اجتماعی قبروں میں دفن کر دیا گیا۔ یہ پالیسیاں ان علاقوں میں تعینات جرمن کی باقاعدہ فوج کے بعض سپاہیوں کو ناکام اور غیر اطمینان بخش محسوس ہوئیں اور انہوں نے جنوری 1941ء میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں نازی قیادت کو یہودی مسئلے کے ''حتمی حل'' کیلئے کوئی منصوبہ وضع کرنے پر ابھارا جس کے نتیجے میں آشوونز، مائیدنک، ٹریبلنکا، کھیمنو، سوبیبورہ، بیلزک اور پولینڈ کے دیگر مقامات پر موت کے کیمپ تیار کیے گئے جہاں یہودیوں کو خفیہ طور پر اکٹھے قتل کر کے ان کی لاشوں کو جلا دیا جاتا تھا۔

یہ ڈیتھ کیمپ بیوروکریٹک قابلیت کے ماڈل اور بربریت کی ایک انتہائی بھیانک مثال تھے۔ یہودیوں کو ''انتظامی مقاصد'' کیلئے ایک عدد دیا جاتا تھا جو ان کے بازوؤں پر انمٹ سیاہی

http://muftbooks.blogspot.com/

سے نقش کر دیا جاتا تھا۔ ان کیمپوں میں مقیم بہت سے یہودیوں کو اپنی موت کا پتہ بالکل آخری لمحات میں چلتا تھا۔ نازیوں نے خصوصی گیس چیمبر تیار کروائے جن کے بارے میں لوگوں کو یہ بتایا گیا کہ یہ حمام ہیں۔ لگ بھگ چالیس لاکھ یہودی تو صرف ان کیمپوں میں ہی ہلاک ہوئے اور اندازاً ساٹھ لاکھ جنگ کے دوران مختلف جرمن حملوں میں مارے گئے۔

بعض مقامات پر یہودیوں نے مزاحمت کی کوشش بھی کی۔ پورے پولینڈ کے یہودی محلوں (گھیٹو) خصوصاً وارسا میں بہت کم اسلحے سے لیس یہودیوں نے سفاک جرمن سپاہیوں سے ٹکر لی اور جلاوطنی کے ان احکامات کی مزاحمت کی جو دراصل انہیں کیمپوں میں منتقل کرنے کیلئے جاری کیے جا رہے تھے۔ نوجوان یہودیوں نے پولینڈ، سوویت یونین، اٹلی اور فرانس میں فاشزم مخالف عسکری دستوں میں شمولیت اختیار کی۔ بہت سے یہودیوں نے تہہ خانوں اور پڑوسیوں کے ہاں چھپ کر جان بچانے کی کوشش کی۔ بعض ڈنمارک کے راستے فرار ہو کر سوئٹزرلینڈ پہنچ گئے۔ 1930ء کے عشرے سے بہت سے یہودیوں نے تو یورپ سے ہمیشہ کیلئے بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی ملک بھی ایسا نہ تھا جو کہ ان کے بڑے گروہوں کو پناہ دینے کیلئے ہو۔

نازیوں کے یہودیوں پر کئے گئے ظلم وستم کی صحیح داستان پہلی مرتبہ اس وقت سامنے آئی جب جنگ کے خاتمے پر اتحادی فوجوں نے ڈیتھ کیمپوں کو آزاد کرایا۔ نورمبرگ میں چلائے جانے والے مقدموں کا ایک مقصد ہالوکاسٹ کے ذمہ دار سرکردہ نازیوں پر انسانیت کے خلاف جرائم ثابت کر کے انہیں کیفر کردار تک پہنچانا تھا۔ 1948ء میں اقوام متحدہ نے ''نسل کشی کی تادیب و تدارک'' پر ایک کنونشن تشکیل دینے کی منظوری دی تا کہ جرمن حکومت کی 1933ء سے 1945ء تک کی سرگرمیوں کے متعلق دستاویزات تیار کی جا سکیں۔ ہالوکاسٹ کی یاد نے 1948ء میں اسرائیلی ریاست کے قیام کے فیصلے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

ہٹلر، ایڈولف (1889ء۔1945ء)

جرمنی کا سابق چانسلر اور جنگ عظیم دوم کے دنوں کا ایک مشہور سیاسی رہنما۔ ہٹلر آسٹریا و ہنگری کے ایک مقام برانو میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ آسٹروی کسٹمز میں ملازم تھا۔ وہ ایک نالائق طالب علم تھا اور اسے 1905ء میں بغیر کوئی سند لیے سکول چھوڑنا پڑا۔ پھر وہ ویانا چلا گیا اور وہاں مصور بننے کی کوششیں کرنے لگا۔ وہ فنون لطفیہ کی اکیڈمی کے داخلے کے امتحان میں دو بار فیل ہوا اور پھر اس نے ایک ہاسٹل میں باپ کی طرف سے ملنے والے معمولی سے ترکے، ایک سرکاری وظیفہ یتامت اور نقل شدہ پوسٹ کارڈوں کی فروخت پر گزر اوقات شروع کر دیا۔

http://muftbooks.blogspot.com/

ویانا میں قیام کے دوران ہٹلر کو بہت سی کتب پڑھنے کا موقع ملا جس سے اس کے ذہن میں یہودیوں، آریہ نسل اور بورژوا جمہوریت کے بارے میں تصورات پختہ ہوتے چلے گئے جو ساری عمر اس کے ہمراہ رہے۔ 1913ء میں اس نے میونخ جانے کے بعد خود کو رضا کارانہ طور پر فوجی خدمات کیلئے پیش کر دیا اور جنگ عظیم میں ایک سپاہی کے طور پر حصہ لیتا رہا جس میں جرمنی کو ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ کے کچھ ہی عرصہ بعد اسے معلم مقرر کر کے جرمن فوجیوں کی تعلیم پر لگا دیا گیا۔

1919ء میں جبکہ وہ فوج کے ایک سیاسی ایجنٹ کے طور پر کام کر رہا تھا، اس کے تعلقات ایک چھوٹی سی نسل پرست جماعت جرمن ورکرز پارٹی سے قائم ہو گئے۔ اس نے 1920ء میں فوج کو خیر باد کہہ کر خود کو پارٹی کیلئے وقف کر دیا اور ترقی کرتے کرتے پہلے مجلس ناظمہ میں افسر نشر و اشاعت اور پھر اس کا صدر بنا۔ اس دوران اس پارٹی کے ارکان کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ دیکھنے میں آیا۔ کچھ عرصہ بعد اس جماعت نے اپنا نام بدل کر قومی اشتراکی جرمن ورکرز پارٹی رکھ لیا جو بعد میں NSDAP اور نازی کے نام سے بھی مشہور ہوئی۔ ہٹلر کے قائد بننے کے بعد اس جماعت کے اہداف میں بھی تبدیلی دیکھنے میں آئی اور ان میں برلن کی آزاد حکومت کو ہٹانے کا نصب العین بھی شامل ہو گیا۔

1923ء میں ہٹلر نے ایک شراب خانے میں جرمنی میں انقلاب بپا کرنے کی ایک فضول سی کوشش کی جس پر اس پر مقدمہ چلا اور اسے نو ماہ قید بھگتنا پڑی، اگرچہ فیصلے کے وقت سزا کی مدت پانچ سال سنائی گئی تھی۔ قید کے دوران اس نے اپنی آپ بیتی ''میری جدوجہد'' کا پہلا حصہ تصنیف کیا جس میں نازی پارٹی کے نظریات بڑے واضح انداز میں بیان کئے گئے تھے۔ اس کتاب کے کوئی ایک کروڑ کے قریب نسخے فروخت ہوئے جس سے ہٹلر کو بہت دولت و شہرت ملی۔ 1930ء کے عشرے کے اوائل تک نازی پارٹی جرمنی کی سب سے بڑی سیاسی جماعت بن چکی تھی۔ جب 1932ء میں اس نے صدارت کے عہدے کیلئے الیکشن لڑا تو اسے برسر اقتدار پال فان ہنڈنبرگ کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا لیکن پھر وہ 1933ء میں سابق چانسلر فرانز فان پیپن سے ساز باز کر کے ملک کا چانسلر بن گیا۔ اگلے برس ہنڈ برگ کی وفات پر اس نے صدر اور چانسلر کے عہدوں کو آپس میں ضم کر دیا اور ملک میں ریفرنڈم منعقد کروا کے اپنے اس اقدام کی منظوری حاصل کر لی اور خود کو جرمنی کا فیورر (لیڈر) کہلوانے لگا۔

ہٹلر عالمی معاملات میں جرمن کی قدرتی بالادستی کا قائل تھا لہٰذا اس نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد خود کو اس تصور کے فروغ اور ایک ایسے نئے عالمی نظام کی تشکیل کے وقف کر دیا جو اس تصور

http://muftbooks.blogspot.com/

پر مبنی ہو۔اس نے معاہدہ ورسائی کی توہین آمیز شرائط کی خلاف ورزی شروع کر دی اور جرمنی کو ایک بار پھر مسلح کرنا شروع کر دیا۔اس کے علاوہ اس نے گسٹاپو کے نام سے ایک خفیہ پولیس بنائی، ملک میں جبری فوجی بھرتی کو ایک مرتبہ پھر لاگو کیا، فضائیہ تشکیل دی اور یہودیوں، جپسیوں اور ہم جنس پرستوں کیلئے عقوبت خانے تعمیر کروائے جنہیں وہ حقارت سے ''نیم انسان'' کہا کرتا تھا۔

1933ء میں اس نے جرمنی کو اتحاد اقوام سے بھی الگ کر لیا اور اٹلی کے مسولینی (1883ء ۔1945ء) اور سپین کے فرانسسکو فرانکو (1892ء۔1975ء) جیسے فاشسٹ رہنماؤں کو ساتھ ملا کر توسیعی جنگیں شروع کر دیں۔1934ء میں اس نے آسٹریا کے چانسلر کو قتل کروا کے اسے جرمنی میں ضم کر لیا اور پھر اس نے 1939ء میں پولینڈ اور چیکوسلاواکیہ پر حملہ کر دیا جس سے دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز ہو گیا۔1941ء میں اس نے جنگی فیصلوں کا مکمل اختیار اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور جرمنی و اس کے مقبوضہ علاقوں میں یہودیوں کو مار مکانے کے منصوبے پر عملدرآمد کی ابتدا کر دی۔ اس وقت تک شمالی اور مشرقی یورپ کا بیشتر حصہ جرمنی کے قبضہ میں آ چکا تھا لیکن وہ اپنی بمباریوں کے آگے سپر برطانوی مزاحمت اور امریکی و روسی افواج کی مداخلت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکا۔لہٰذا 1944ء تک یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ہٹلر کو شکست ہو کر رہے گی۔اس دوران اس پر قاتلانہ حملے بھی ہوئے اور وہ ایک بم دھماکے میں مرتے مرتے بچا۔تاہم اس نے شکست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی فوجوں کو حکم دیا کہ وہ تادم مرگ لڑتی رہیں۔اس کا یہ اقدام دونوں طرف لاکھوں ہلاکتوں کا باعث بنا۔اس نے 29 اپریل 1945ء کو اپنی دیرینہ معشوق ایوا براؤن سے شادی رچائی اور اگلے دن جب روسی فوج نے برلن پر حملہ کیا تو دونوں نے مل کر چانسلری کے تہہ خانے میں خودکشی کر لی۔

ہری ہر

ایک گمبھیر دیوتا۔ یہ دیوتا ہندو دیوتاؤں وشنو اور شیو کا مرکب ہے۔اسے وشنو، شیو اور شنکر نارائن بھی کہا جاتا ہے۔ ہری ہر کلاسیکی انگکور کھمیر ثقافت میں خاص طور پر بہت مقبول تھا۔ وشنو (برکت دینے والا) کو عام طور ہری جبکہ شو (لینے والا) کو ہر کہا جاتا ہے۔ ہری ہر دیوتا زندگی و موت اور تخلیق و فنا کے تکمیلی تعامل کی علامت ہے۔ ہری ہر ہندو دیومالا میں پہلی مرتبہ اس وقت ظاہر ہوا جب وشنو اور شیو کو گوہ کو شکست دینے کیلئے ایک قالب میں یکجان ہونا پڑا۔ گوہ کا لغوی مطلب 'چھپانے والا'' ہے اور وہ اس قدر طاقتور تھا کہ وشنو اور شیو میں سے کوئی بھی اکیلے اسے زیر نہیں کر سکتا تھا۔اگر ہری ہر کا بت دیکھیں تو یہ دائیں طرف سے شیو اور بائیں طرف سے وشنو دکھائی دیتا

ہے۔کمبوڈیا کی انگکور تہذیب کے آثار میں ایسی بہت سی مورتیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

ہسکالہ

اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی میں یورپی عہد تنویر کے متوازی چلنے والی ایک یہودی سماجی وثقافتی تحریک، ہسکالہ کے قائدین کا تعلق پڑھے لکھے یہودی اشرافیہ ماسکلم طبقے سے تھے۔ یہ وہ گروہ تھا جس نے یورپی عیسائیت سے تعامل کر کے یہودیوں اور غیر یہودیوں کے درمیان حائل پھاٹک توڑنا شروع کر دیئے تھے۔ ہسکالہ کے پیروؤں نے اس دور میں اتحاد کے پیغمبروں کا کردار سرانجام دیا جب یہودیوں پر زمین تنگ کی جانے لگی تھی۔ وہ اپنے لئے مخصوص کیے گئے محلوں میں رہتے تھے، یدش زبان بولتے تھے اور مذہبی قیادت کی فرمانبرداری کرتے تھے۔

اگرچہ بعض اوقات ماسکلم پر الحاد کی حوصلہ افزائی کا الزام بھی لگا، ان کی اکثریت یہودی عقیدے کے ساتھ اپنی وابستگی بڑی شدومد سے برقرار رکھے ہوئے تھے۔ تاہم انہوں نے یہودیوں کو ghettos سے باہر آنے اور مختلف نئے پیشے اختیار کرنے کو ضرور کہا۔ اس سلسلے میں جسمانی محنت کے کاموں کی خاص طور پر حوصلہ افزائی کی گئی۔ یہ ایک تو رومانوی تحریک کے اثر کی وجہ سے تھا اور اس کا دوسرا مقصد اس تاثر کو زائل کرنا تھا کہ یہودی ''ہڈحرام'' ہوتے ہیں۔ مختلف ممالک میں یہودیوں کی حیثیت کے سبب ہسکالہ کو پیچیدگیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ گھیٹو ختم کرنے کی حکمت عملیاں صرف ان ممالک میں ہی مؤثر ثابت ہوسکتی تھیں جنہوں نے یہودیوں کو مکمل شہریت کے حقوق دے رکھے تھے اور ان میں سے بہت سے ممالک ایسے بھی تھے جن کی پالیسی میں یہ بات واضح نہ تھی کہ یہودیوں سے کس طرح کا برتاؤ کیا جائے۔

ماسکلم یہودی تعلیم میں انقلاب لانے کے بھی ذمہ دار تھے۔ انہوں نے روایتی مذہبی نصاب میں سیکیولر مضامین متعارف کروائے اور یدش کی بجائے عبرانی یا مقامی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کیلئے کام کیا۔ 1778ء میں برلن میں فری سکول کے نام سے ایک مثالی ادارہ قائم کیا گیا۔ یہ ابتداء میں غریب بچوں کے مدرسے کے طور پر شروع کیا گیا تھا لیکن اس نے جلد ہی ایسے صاحب ثروت یہودیوں میں مقبولیت حاصل کر لی جو اپنے بچوں کو دنیاوی علم کے زیور سے آراستہ کرنے کیلئے بے تاب تھے۔ ہسکالہ کے تعلیمی فلسفے کا اندازہ اس مدرسے کے نصاب سے کیا جا سکتا ہے جس میں جرمن، فرانسیسی، حساب، جغرافیہ، تاریخ، علوم طبیعی، آرٹ، عبرانی اور بائبلیات جیسے مضامین شامل تھے۔ رفتہ رفتہ فری سکول کے نمونے کے مدارس پورے یورپ میں قائم کر دیئے گئے۔ خواتین کو بھی مفصل تعلیم دی جاتی تھی۔ متمول جرمن یہودیوں کی بیٹیاں گھر پر رہ کر خصوصی

http://muftbooks.blogspot.com/

اتالیق سے تعلیم حاصل کرتی تھیں جبکہ غریب بچیوں کو بریسلو، کونگس برگ، ڈیسو اور ہمبرگ جیسے شہروں میں قائم کئے گئے مدارس میں پڑھایا جاتا تھا۔ یہودی نوجوانوں کو تعلیم دے کر انہیں سیکولر عیسائی اکثریت کے ہمرکاب کرنے کی تحریک کو آسٹریا کے شہنشاہ جوزف ثانی جیسے مسیحی حکمرانوں سے بھی بہت مدد ملی جنہوں نے سیکولر یہودی مدارس کھولنے میں اعانت کی اور سرکاری سکولوں اور یونیورسٹیوں کے دروازے بھی یہودیوں کیلئے کھول دیئے۔

انیسویں صدی کے آخر تک یہودی قوم پرستی جس کی نمائندگی صہیونی تحریک کر رہی تھی، منظر عام پر آنے لگی اور یورپ کو یہود کشی کی لہر نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ روس میں جہاں کہ ہسکالہ کے اثرات دیر سے پہنچے، یہودی مدارس اور یہودی پریس نے 1860ء کے عشرے میں نشوونما پائی۔ اگرچہ ہسکالہ کے انضمامی حربے ایک مختصر دورانیے کیلئے کامیاب ہوتے دکھائی دیئے۔ گھیٹوؤں سے نکل کر شہری معاشرے میں داخل ہونے کے یہودی عمل نے روسیوں میں بہت زیادہ بغض کے جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ 1881ء میں الیگزینڈر ثانی کے قتل کے بعد منظر عام پر آنے والی قتل و غارت نے نئے یہودی متوسط طبقے کے دعوؤں کو بکھیر کے رکھ دیا تھا۔ فرانس میں رونما ہونیوالے قضیہ ڈریفس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ دولت مند، محبّ وطن اور بہت زیادہ ترقی پسند یہودی بھی نفرت کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ اس قضیے نے یہودی رہنما تھیوڈور ہرزل (جس کا شمار اس سے قبل تک ہسکالہ تحریک کے شارحین میں ہوتا تھا) جیسے صہیونیوں پر یہ ثابت کر دیا کہ یہودیوں کو یورپ میں کبھی بھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جائے گا اور ان کیلئے امید کی واحد کرن فلسطین میں ایک الگ قومی ریاست کا قیام ہے۔ یہودیت، قوم یہود اور جدیدیت کے باہمی تعلق کے تناظر میں ہسکالہ کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

ہندومت

بھارت اور نیپال کی اکثریتی آبادی کا مذہب۔ ہندومت کا شمار دنیا کے قدیم ترین مذہبوں میں ہوتا ہے لیکن ہم اس کی ابتداء کے بارے میں کوئی پکی بات نہیں کر سکتے۔ اس کا کوئی بانی نہیں اور یہ برصغیر کی مذہبی وثقافتی تحاریک کے ساتھ ساتھ ارتقاء پاتا رہا ہے۔ یہ کئی مختلف فرقوں پر مشتمل ہے لیکن ہم اسے عیسائیت یا یہودیت وغیرہ کی مانند منظّم قرار نہیں دے سکتے۔

جب آریا باشندے 1400 اور 500 قبل مسیح کے درمیان ہندوستان میں وارد ہوئے تو انہوں نے یہاں اپنا مذہب ویدمت اور بھجوں کی کتب یعنی ویدیں متعارف کرائیں۔ اگرچہ ہندو مت متعدد مختلف فرقوں میں منقسم ہے، اکثر ہندو ویدوں کو اپنے مقدس ترین صحائف تصور کرتے

http://muftbooks.blogspot.com/

ہیں۔ ویدمت کی بنیادی بات آگ کی قربانی تھی۔ اس مت نے آگے جا کر ہندومت کو جنم دیا جس کا بنیادی تصور حیات درحیات یا آواگون ہے اور اس کا تعلق بھی ہندو عقیدے کے مطابق آگ کی بھینٹ سے ہے۔ یہ قربانی ہندو پروہت یعنی برہمن ادا کرتے ہیں جنہیں آخری وید یعنی اپنشدوں میں تمام اشیاء کی حقیقت کے نمائندے کہا گیا ہے۔ اپنشدوں کے بعد ہندوؤں کی ایک اور اہم مذہبی کتاب بھگوت گیتا (اندازاً 200 ق م۔200) ہے جس نے اسی آریائی مذہب میں کرموں (اعمال) کا تصور شامل کیا۔ اس عقیدے کے مطابق انسان کو اپنے اچھے یا برے اعمال کی جنم در جنم جزا یا سزا ملتی ہے۔ ایک ہندو کی آخری منزل موکشا (نجات) یعنی جذبات سے چھٹکارا اور خدا کا قرب حاصل کر کے بار بار مرن جیون کے چکر سے خلاصی حاصل کرنا ہے۔

جین مت اور بدھ مت کے آنے سے ''ہندومت'' میں بھی تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوئیں اور ویدی قربانی کی جگہ یوگا اور روحانی ریاضت کی دیگر مشقوں نے لینا شروع کر دی۔ اس کے ساتھ اس میں مقبول مذہبی تحریکوں کے دیوتا اور ان کی شبیہوں کی پرستش بھی در آئی۔ پھر اس فکر میں بھی اضافہ ہوا کہ لوگوں کی روزمرہ اور معاشرتی زندگی کو کیسے بہتر بنایا جائے اور انسانی سماج میں نظم ونسق کو کیسے برقرار رکھا جائے۔ اس ضمن میں قوانین منو خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو سنسکرت زبان میں 200 ق م سے 200ء تک کے عرصے میں تحریر کئے گئے۔ مذہبی اور عام زندگی سے متعلق یہ اصول وضوابط ایک ہندی قانون دہندہ منو کے نام سے موسوم ہیں۔ ان قوانین میں دھرم یعنی فرض کے تصورات بھی شامل ہیں جس کا اطلاق ذات پات (ورن) کی بنیاد پر زندگی کے ہر پہلو پر ہوتا ہے۔ ہندو قانون کے مطابق معاشرہ چار طبقات یعنی برہمنوں (پروہتوں) کشتریوں (سپاہیوں) ویشوں (کاروباری لوگوں) اور شودروں (مزدوروں) پر مشتمل ہے۔ ان تحاریر میں جنہیں پران کہا جاتا ہے ہر طبقے کے افراد کے فرائض کا تعین کیا گیا ہے۔ انہی تحاریر میں برہما (خالق)، وشنو (رب) اور شیو (فنا کرنیوالا) پر مشتمل الوہی تثلیث کا تصور بھی پیش کیا گیا ہے۔ شدید مذہبی سرگرمی کے اس دور میں ہندو مذہب میں بہت سے صوفی شاعر، گیت اور رزمیے متعارف ہوئے۔ ہندوؤں کے مقبول دیوتا وشنو کی رام اور کرشن کے روپ میں تجسیم ہوئی اور شیو کالی کے روپ میں ظاہر ہوا۔ دیوتاؤں کے ان تمام اوتاروں کو ذات مطلق ہی کے مختلف روپ خیال کیا جاتا تھا۔ خواہ ان کا فرقہ کوئی بھی ہو ہندو دین میں ایک ایسی ہستی (برہمن) پر اعتقاد پنہاں ضرر ملے گا جو ابدی ہے اور جو نہ مذکر ہے اور نہ مونث اور جسے ان کی سادہ ترین تعریف کی رو سے نفس یا آتما کہا جا سکتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں آپ کو برہمن/آتما کے تصور کے ساتھ مربوط تناسخ

http://muftbooks.blogspot.com/

ارواح کا نظریہ بھی ملے گا۔اس عقیدے کے مطابق روح ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتی رہتی ہے یہاں تک کہ یہ تکمیل کے مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے جس پر یہ عرفان سے ہمکنار ہو کر ذات کبریا سے واصل ہو جاتی ہے۔متعدد طریق اور مسلک ایسے ہیں جن پر چل کر موکشا یا نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔جدید ہندومت کے شارحین نے اس مذہب کا رخ درویشی اور فقیری سے پھیرنے کی بہت کوشش ہے تا کہ ہندی عوام اپنی توجہ بڑھتی ہوئی آبادی کے مسائل اور سیاسی معاملات پر مبذول کر سکیں۔گاندھی (1869ء۔1948ء) جیسے ہندو رہنما مذہبی زندگی اور معاشرتی تقاضوں کو یکجا کرنے کی کوشش کرتے چلے آرہے ہیں۔

ہندو ذات پات کا نظام

سماجی درجہ بندی کا ہندوانہ نظام۔ذات پات کا نظام غالباً ویدک دور میں پروان چڑھا۔ ہر ذات یا جاتی کے افراد کا ایک اپنا جدا دھرم یا فرائض ہوتے ہیں جن پر عمل یا جن سے انحراف ان کے نیک یا گنہگار ہونے کا تعین کرتا ہے۔

سب سے اونچی ذات برہمنوں اور سب سے نچلی اچھوتوں کی تصور کی جاتی ہے۔یہ دونوں جاتیاں بہت حد تک ممیّز ہیں لیکن ان دونوں کے درمیان کی ذاتوں کی حدود بعض اوقات گڈمڈ بھی ہو جاتی ہیں اور وہ اس قدر متعین وممیّز نہیں۔ہندو برہمن جنھوں نے کہ ذات پات کا یہ نظریہ تخلیق کیا، یہ دعوی کرتے ہیں کہ یہ درجہ بندی مذہبی اخلاص پر مبنی ہے۔ویدک دور (1500 ق م۔ 600ء) میں معاشرہ ورنوں (رنگوں) میں منقسم تھا۔پہلے نمبر پر پروہت یا برہمن تھے۔پھر سپہ گر یا کشتری اور پھر کھیتی باڑی کرنے والے اور سوداگر جو ویش کہلاتے تھے۔دیکھتے دیکھتے ایک چوتھا طبقہ بھی رونما ہو گیا جس کے افراد کو شودر یعنی نوکر چاکر کہا جانے لگا۔یہ طبقہ بہت سے غیر آریائی لوگوں کو ویدک سماج میں جذب کرنے کی ضرورت کے تحت تخلیق کیا گیا۔یہ جاتیاں مختلف نسلی اور پیشہ ورانہ گروہوں کے درمیان امتیاز اور موروثی کسبوں کی حوصلہ افزائی کا کام دیتی تھیں۔ تاہم اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ ذات اور معاشی حیثیت کے درمیان کوئی تطابق تھا۔اسلام مساوات کا درس دیتا ہے لیکن جب برصغیر میں مسلم اور ہندو معاشروں کا اختلاط عمل میں آیا تو ذات پات کا یہ رنگ مسلمانوں میں بھی سرایت کر گیا۔اس کی وجہ وہ نومسلم تھے جنھوں نے اسلام تو قبول کیا لیکن اپنی پرانی سماجی روایات پر بھی چلتے رہے۔

ذات پات کا نظام ہندو معاشرے میں آج بھی بہت اہمیت کا حامل ہے جہاں کسی جاتی کی رکنیت کا فیصلہ پیدائش سے ہوتا ہے۔اگر کسی شخص کو کسی بڑے جرم کے نتیجے میں کسی جاتی سے نکال

http://muftbooks.blogspot.com/

دیا جاتا ہے تو وہ کسی دوسری نچلی جاتی میں نہیں آجاتا۔ اس طرح کوئی شخص بہت زیادہ دولت جمع کر کے کسی اوپر والے طبقے میں بھی شامل نہیں ہوسکتا۔ تاہم ایسی چھوٹی جاتیاں جنھیں پلید یا اچھوت تصور نہیں کیا جاتا اجتماعی طور پر ماس سے اجتناب، جہیز اور برہمنوں کی رسومات جیسی پاک اور اعلیٰ عادات کو اپنا کر اوپر جاسکتی ہیں۔ ہندو اپنی ذات کو خالص رکھنے کے لیے شادیاں بھی عموماً اپنی ذات برادری میں ہی کرتے ہیں۔

شروع میں ذاتوں کا تعلق مذہب اور سماجی حیثیت سے تھا لیکن جدید دور میں یہ تصور زیادہ قوی نہیں رہا۔ اب ذاتیں زیادہ تر مختلف نسلی گروہوں سے وابستگی کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کی جاتیں ہیں۔ نتیجے کے طور پر اب تعلیم یا ملازمت کے سلسلے میں ذات کوئی قانونی رکاوٹ حائل نہیں کرسکتی۔ تاہم ذات اب بھی سماجی تنظیم کے لیے ایک اہم بنیاد مہیا کرتی ہے اور بہت سی سیاسی تحریکیں ذات برادری کی بنیاد پر ہی چلائی جاتی ہیں۔ ذات پات پر مبنی امتیاز آج بھی ہندوستانی معاشرے میں بہت سے مسائل کا باعث بنتا ہے۔

ہنومان

ہندو دیومالا میں بندر کی شکل کا ایک سپہ سالار۔ لغوی طور پر ''ہنومان'' کا مطلب ''تین جبڑوں والا'' ہے اور وہ ہندو رزمیہ ''رامائن'' کے مرکزی کرداروں میں شامل ہے۔ ہنومان نے ایک بندریا اجنا اور ہوا کے دیوتا وایو سے جنم لیا جس نے اسے بعض مافوق الفطرت طاقتیں عطا کیں جن میں اڑنے اور اپنی شکل تبدیل کرنے کی طاقت بھی شامل تھی۔ رامائن کے مطابق ہنومان رام کا بہت وفادار خدمت گزار تھا اور اس نے رام کی اپنی بیوی سیتا کو ایک بدکار بادشاہ راون سے بچانے میں بہت مدد کی۔ ہنومان کو لنکا میں راون کی جاسوسی کرنے کیلئے بھیجا گیا تھا لیکن وہ وہاں پکڑا گیا اور اس کی دم کو آگ لگا دی گئی تاہم اس نے لنکا میں بھاگا دوڑی کر کے سارے شہر کو جلا دیا۔ اس کے بعد اڑ کر ہمالیہ پہنچا تاکہ اپنی زخمی دم اور رام کی بیمار فوج کیلئے جڑی بوٹیاں حاصل کر سکے۔ رام نے اس کے کارناموں کے صلے میں اسے حیات ابدی اور مستقل شباب کے تحفے عطا کیے۔ مختلف حکایات میں ہنومان کو ایک مسخرے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن ادب میں اس کی تصویر کشی اپنے مالک کے ایک بہترین نوکر اور ویدی بھجنوں کے ایک ماہر کے طور پر بھی کی گئی ہے۔

ہنومان نسل کا بندر ہندوستان میں بہت عام پایا جاتا ہے اور بہت سے ہندو اسے مقدس خیال کرتے ہیں۔ ہندی فلموں، تصویروں اور مورتیوں میں ہنومان کا چہرہ عموماً سرخ دکھایا جاتا ہے اور وہ اپنی دم پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ہنومان دیوتا کی پوجا جاپان میں بھی کی جاتی ہے جہاں بہت سے

http://muftbooks.blogspot.com/

مقامات کا نام اس کے نام پر رکھا گیا ہے اور اس کے نام پر بہت سے مندر تعمیر کئے گئے ہیں۔

ہوسا

نائجیر یا میں آباد وہ لوگ جو خود کو ہوسا کہتے ہیں۔ ان کا شمار نائیجیریا کے تین بڑے نسلی گروہوں یعنی یوروبا، اگبو اور ہوسا میں ہوتا ہے۔ ہوسا قوم شمال مغربی نائیجیریا اور جنوبی نائیجر میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہوسا آبادی ستر لاکھ نسلی ہوسا اور چالیس لاکھ فلانی (نائیجیریا، مالی، گنی اور کیمرون میں آباد ایک قوم) افراد پر مشتمل ہے۔ اس فلانی قوم نے رفتہ رفتہ ہوسا ثقافت کو اپنے اندر جذب کر لیا اور انیسویں صدی میں حکمران طبقے کی حیثیت حاصل کر گئی۔ باہمی شادیوں نے ان دونوں قوموں کے امتیاز کو بہت حد تک کم کر دیا ہے اور اب ان کیلئے صرف ہوسا کا نام استعمال کیا جاتا ہے۔ قرون وسطیٰ میں سات ہوسا ریاستیں وجود میں آئیں۔

کانو (ایک صدر مقام) کا پہلا بادشاہ 999ء میں برسر اقتدار تھا۔ ہوسا سماج سرکاری عہدوں اور طبقات کی بنیاد پر مختلف پرتوں میں منقسم ہے۔ زیادہ اہم سرکاری اسامیاں شرفاء کیلئے مختص ہیں۔ اس وقت کئی ہوسا ریاستیں موجود ہیں۔ ریاست کا نظام امیر چلاتا ہے اور سیاسی ڈھانچہ جاگیردارانہ نظام پر مبنی ہے۔ برطانوی سامراج نے دنیا میں کئی جگہوں پر روایتی سیاسی نظام کو توڑ پھوڑ کے رکھ دیا تھا لیکن ہوسا ریاستوں کا یہ نظام ان دنوں میں بھی جوں کا توں برقرار رہا۔ ہوسا قوم کی سست رفتار سماجی تبدیلی ان کے اور نسبتاً زیادہ کامیاب اگبو اور یوروبا قوم کے درمیان عداوت کا باعث بنی۔ 1967ء میں بیافرا کی علیحدگی کے پیچھے کارفرما عوامل میں ان دونوں گروہوں کے آپس کے اختلافات بھی شامل تھے۔

اگرچہ بہت سے ہوسا اب کانو، سوکوتو، زاری اور کاتسینا جیسے بڑے قصبوں اور شہروں کی طرف ہجرت کر گئے ہیں، اس قوم کی اکثریت اب بھی دیہی ہے جو بڑے بڑے مشترکہ کھیتوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ فلانیوں کے مویشیوں سے حاصل ہونے والی قدرتی کھاد استعمال کرتے ہیں اور ان کی گزر اوقات مکئی اور باجرے کی فصلوں پر ہے۔ ہوسا کاریگر کھالیں صاف کرنے، کپڑا بننے اور چاندی کی چیزیں تیار کرنے کا کام بھی کرتے ہیں۔ تجارت، خصوصاً بڑے قصبوں اور شہروں میں، ہوسا ثقافت کا ایک اہم پہلو ہے۔

ہوسا قوم نے اشاعت اسلام سے بہت اثر قبول کیا۔ ان تک یہ دین یاجی کے عہد اقتدار میں (1349ء۔1385ء) مالی سے سفر کرتا ہوا پہنچا۔ ہوسا قوم کی اکثریت مسلمان ہے جبکہ کچھ ہوسا جن میں ماگوزاوا (یابن جاوا) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اب بھی اپنے پرانے عقائد کے

http://muftbooks.blogspot.com/

پیرو ہیں۔ بہت سے ہوسا الفاظ عربی سے آئے ہیں بلکہ ہوسا زبان لکھی ہی عربی رسم الخط میں جاتی ہے۔ ہوسا باشندوں کا حسب نسب باپ کی طرف سے شمار ہوتا ہے اور دوسرے خاندانوں میں شادی بیاہ کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے اور اس رجحان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ہوسا زبان

ایک افریقی زبان۔ ہوسا عوامی جمہوریہ نائجر اور نائیجیریا کے شمالی علاقہ جات کی بڑی زبان ہے۔ یہ مغربی افریقہ کے ان دیگر خطوں میں بھی عام بولی جاتی ہے جہاں ہوسا قوم کے لوگ تجارت کی غرض سے سفر کرتے رہتے ہیں۔ آپ اسے مرقومہ بالا علاقوں کی لنگوا فرینکا یا رابطے کی زبان کہہ سکتے ہیں۔ سواحلی کی طرح اس زبان میں بھی غیر زبانوں کے بہت سے الفاظ شامل ہیں۔ اسلامی فتوحات کے بعد اس نے بہت سے عربی الفاظ مستعار لیے اور اب بہت سے انگریزی لفظ بھی اس کا حصہ بن چکے ہیں۔

ہوسا جانوروں کی کہانیوں، تمثیلی حکایات، ضرب الامثال اور دیومالائی تشریحات سے لبریز ایک گراں مایہ تقریری روایت کی حامل زبان ہے۔ اس کے تحریری ادب کا آغاز کوئی دوسو برس بعد ہوا جس کے لیے عربی رسم الخط (عجمی) کو استعمال میں لایا گیا، خصوصاً مذہبی عبارات کیلئے۔ الحاج ابوبکر امام کے ناولوں اور تاریخی وسیاسی تحاریر کے بشمول جدید دور میں ہوسا زبان میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ایسی بہت سی تصانیف میں رومن ابجد استعمال کی گئی ہے جسے ہوسا میں بوکو رسم الخط کہا جاتا ہے لیکن مذہبی تحریریں اب بھی عجمی میں لکھی جاتی ہیں۔ اگرچہ ہوسا شاعری پر عرب روایات کا بہت زیادہ اثر ہے لیکن بوکو میں لکھی بہت سی جدید شاعری ایسی بھی ہے جو کلاسیکی اور مذہبی اسالیب سے دور ہٹتی محسوس ہوتی ہے۔

ہوسا قوم میں زبانی شاعری جسے واکا کہا جاتا ہے، کا رواج بہت قدیم زمانے سے ہے۔ اسے گویے (مواکا) موسیقی کے ساتھ گاتے ہیں۔ یہ شاعری ان بادشاہوں اور بڑے لوگوں پر بھی ہوسکتی ہے جو ان شاعروں اور فنکاروں کی سرپرستی کرتے ہیں لیکن شاعر کھیتی باڑی، شکار، سیاست اور کشتی کو بھی موضوع بنا سکتے ہیں۔ یہ شاعری بعض اوقات خاص مواقع اور مذہبی تہواروں کیلئے خصوصی طور پر بھی تیار کی جاتی ہے۔ اس شاعری کے ساتھ ایک ایسا ڈھول بھی بجایا جاتا ہے جسے کلنگو کہا جاتا ہے اور جو انسانی آواز کے زیر و بم اور مختلف لہجوں کی نقل اتار سکتا ہے۔ اس کیلئے موبو اور گارایہ جیسے تاردار آلات موسیقی بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔

http://muftbooks.blogspot.com/

ہومر (اندازاً 700 ق م)

یونان کا مشہور رزمیہ شاعر۔ اسے قدیم یونانی دنیا کا عظیم ترین شاعر تصور کیا جاتا ہے اور شہرہ آفاق رزمیہ نظمیں ''الیاڈ'' اور ''اوڈِسی'' اسی سے منسوب کی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ نابینا تھا اور اس نے یہ منظومات جنگ لڑنے کے کچھ عرصہ بعد رقم کیں۔ تاہم ان کے خالق یا ان کے زمانہ تصنیف کے بارے میں تاحال کوئی پکے ثبوت فراہم نہیں کئے جا سکے۔ ہومر کی پر سرار بلکہ یوں کہیے کہ غیر مرئی پس منظر اور الیاڈ اور اوڈسی کے ماخذ تک پہنچنے کی جستجو نے ادبی حلقوں میں زمانوں سے بحثیں چھیڑ رکھی ہیں۔ بہر کیف ان تخلیقات نے یونان کی تعلیم وثقافت پر زبردست اثرات مرتب کئے ہیں۔ یونانی طلبا ءان کے بڑے بڑے اقتباسات زبانی حفظ کیا کرتے تھے اور اس روایت نے ان نظموں کو آنے والی نسلوں تک محفوظ رکھنے میں بہت مدد دی۔ ان کی سادگی سے ان کی ڈرامائی کیفیت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے اور یہی وصف ہے جس کی وجہ سے ان میں پنہاں پیام نے ہر طبقے کے دل میں گھر کر لیا۔

ہومر کے وقتوں میں لوک شاعری کتابوں میں پڑھا نہیں بلکہ اسے شاعروں سے سنا کرتے تھے۔ ہیروؤانہ روایت کے بیشتر شاعر جو نظمیں پڑھتے تھے وہ ایک یا دو راتوں میں ختم ہو جاتی تھیں لیکن ہومر کے رزمیے غیر معمولی طور پر طویل تھے۔ اس کی واحد نظم الیاڈ 16000 سے زائد اشعار پر مشتمل ہے۔ ایسی نظمیں پڑھنے میں کئی راتیں لگتی ہوں گی۔

بہت سے ناقدین اس شبے کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ ایک اکیلا شاعر ایسی بڑی دو رزمیہ داستانیں تخلیق نہیں کر سکتا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ نگارشات کسی ایک شاعر کی بجائے شعراء کی کسی جماعت نے مل کر وضع کیں۔ ایسے نقاد اپنی دلیل کو ثابت کرنے کیلئے مختلف عبارتی الجھنوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ وہ حضرات جو ہومر کو ہی اس تمام کام کا خالق مانتے ہیں وہ تیسری صدی عیسوی کے ادبی نقاد لانجائنس کا حوالہ دیتے ہیں جس کا خیال تھا کہ الیاڈ میں ہومر کی جوانی کا اسلوب جھلکتا ہے جبکہ اوڈسی اس نے پکی عمر میں جا کر لکھی۔

ان منظومات کے زمانہ تخلیق کے تعین کیلئے محققین ان میں شامل مختلف اشیاء کے بیان اور اہم لسانی سانچوں سے اندازے لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہ اعتبار اسلوب ان کا تعلق 700 ق م کی ہسیادی روایت سے بنتا ہے۔ تاہم انہیں اگر دوسرے زاویے سے آنکیں تو ان میں نویں، آٹھویں اور ساتویں صدیوں سے متعلق اشیاء کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ ہومر نے جس خاص بحر کا استعمال کیا ہے وہ چھٹی صدی کے اوائل کی کئی دیگر منظومات میں بھی دیکھی جا سکتی ہے اور چھٹی صدی کی شعری تخلیقات میں اس کے رزمیے جھلکتے نظر آتے ہیں۔ ہومر کی

http://muftbooks.blogspot.com/

سوانح عمریاں پانچویں صدی قبل مسیح میں کسی وقت لکھی جانے لگیں۔ وہ واحد بات جو ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں یہ ہے کہ یہ نظمیں ٹرائے کی جنگ جو کہ تیرھویں صدی قبل مسیح میں لڑی گئی تھی، کے بعد لکھی گئیں کیونکہ الیاڈ میں اس لڑائی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ وہ شواہد ہیں جن کی بنا پر مورخین الیاڈ کو ساتویں صدی سے منسوب کرتے ہیں۔ ان نگارشات میں بعض متروک عناصر بھی نظر آتے ہیں جس سے یہ شک پڑتا ہے کہ شاید ان نظموں کا تعلق ساتویں صدی قبل مسیح سے قبل کے زمانے سے ہے۔ لیکن ایسی بات نہیں ہے۔ ماہرین اس امر کو ہومر کی شاعرانہ مہارت پر ہی قیاس کرتے ہیں۔ ان دونوں نظموں کو تحریری شکل غالباً نویں یا آٹھویں صدی میں اس وقت دی گئی جب لکھنے کا ابجدی نظام یونان میں پہلی بار منظر عام پر آیا۔ ان کی مکمل تحریری شکل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ چھٹی صدی قبل مسیح میں بین الاتھینائی کھیلوں کے موقع پر وجود میں آئی۔ بہت سے محققین اس بات پر بھی اتفاق کرتے ہیں کہ اس قدر زیادہ شعروں کو یاد رکھنے کیلئے ہومر ضرور نوٹس استعمال کرتا رہا ہوگا۔

ہیمنگوے، ارنسٹ (ملر) (1899ء۔1961ء)

ایک بلند پایہ امریکی ناول نگار۔ انہیں 1954ء کا ادب کا نوبل پرائز دیا گیا۔ وہ اپنے زمانے میں بہت زیادہ مشہور تھے اور انہوں نے بہت زیادہ مہماتی زندگی بسر کی۔ ان کے ناولوں اور افسانوں میں مردانہ رنگ کی چھاپ نمایاں ہے۔ ہیمنگوے نے اپنی قلمی زندگی کا آغاز نوجوانی میں ہی کر دیا تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے اٹھارہ انیس کے سن میں ''کنساس سٹی سٹار'' اور ''ٹورنٹو سٹار'' کے ساتھ رپورٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ پہلی عالمی جنگ کے موقع پر انہوں نے فوج میں شامل ہونے کیلئے درخواست دی جسے ان کی آنکھ کے زخم کی وجہ سے مسترد کر دیا گیا جس پر وہ امریکی ریڈ کراس کے ایمبولینس ڈرائیور کے طور پر کام کرنے لگے۔ جنگ کے بعد انہوں نے پیرس میں سکونت اختیار کر لی۔ اس وقت کے پیرس میں مقیم ایذرا پاؤنڈ اور گرٹروڈ سٹین جیسے امریکی ادیبوں کی حوصلہ افزائی پر انہوں نے چھوٹی چھوٹی افسانوی تحریریں لکھنا اور چھپوانا شروع کیں اور 1925ء میں ''ہمارے وقتوں میں'' کے عنوان سے اپنی پہلی غیر صحافتی تحریر شائع کی۔ اس کے ایک برس بعد ''سورج بھی نکلتا ہے'' بھی بازار میں آ گیا۔

ہیمنگوے نے دونوں بڑی جنگوں کے درمیانی دور میں اپنی شکار، بل فائیٹ اور سکی انگ کی پیاس بجھانے کیلئے بہت زیادہ سفر اختیار کیے۔ ان موضوعات کی جھلک آپ کو ان کی تصانیف پڑھتے ہوئے بھی ملے گی۔ 1927ء میں انہوں نے ''مرد بلاخواتین'' شائع کی۔ بعد میں وداع

http://muftbooks.blogspot.com/

جنگ (1929ء) مرگ سہ پہر (1932ء) جیتنے والے کیلئے ٹھینگا (1933ء)، افریقہ کی سبز پہاڑیاں (1935ء)، پانچواں کالم (1938ء) جرس باجے کس کیلئے (1940ء)، دریا پار پیڑوں کے تلے (1950ء) اور بابا اور سمندر (1952ء) شائع ہوا جس پر انہیں پلزر پرائز ملا۔ وہ اپنے جنگ اور جسمانی تگاپو سے عشق کے طفیل کئی مرتبہ مشکلات میں بھی پھنسے۔ انہوں نے دوسری عالمی جنگ میں براہ راست اور سپین کی خانہ جنگی اور کیوبا کے انقلاب میں بالواسطہ حصہ لیا اور پھر کیوبا میں ہی رہنے لگے۔ اپنی شہرت و مقبولیت اور مہم جویانہ طرز زندگی کے باوجود ہیمنگوے کے آخری ایام اچھے نہ گزرے۔ کیوبا سے وہ ادا ہو آئے جہاں نفسیاتی بیماریوں نے ان کی زندگی عذاب بنائے رکھی۔ اس عہد میں انہیں اعصابی کمزوری نے بھی آن لیا اور ڈاکٹروں نے ان کا برقی جھٹکوں سے علاج کرنے کی کوشش کی لیکن اس مایہ ناز ادیب کیساتھ آخر میں ہوا کیا کہ انھوں نے اپنی کنپٹی پر گولی چلا کر خود اپنی جان لے لی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی یادداشتیں اور مختصر ناولوں کا ایک سلسلہ گشتی ضیافت (1964ء) اور ندی کے جزیرے (1970ء) میں شائع ہوا۔

ی

یدش

مشرقی اور وسطی یورپ میں آباد یہودیوں کی روایتی زبان جو عبرانی حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اس زبان کی جڑیں دیکھنے کیلئے ہمیں مشرق وسطیٰ (یورپ میں اصل سامی آبادکاروں کی عبرانی اور آرامی) اور وسطی یورپ (ان کے غیر یہودی پڑوسیوں کی جرمن بولیاں) کو دیکھنا ہوگا۔ جب یہودیوں نے ازمنہ وسطیٰ میں مشرق کی طرف مزید سرکنا شروع کیا تو یدش پر سلاوی زبانوں نے بھی اثرات مرتب کئے۔ تحریری یدش جس نے طباعت شروع ہونے کے بعد نمو پائی مغربی یورپ کی بولی سے ماخوذ تھی۔ تاہم ہسکالہ (یہودیوں کی اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں پروان چڑھنے والی ایک سماجی و ثقافتی تحریک) کے بعد جرمن نے پورے وسطی یورپ میں یدش کی جگہ لے لی اور وہاں تقریری یدش زبان تقریباً ناپید ہو کر رہ گئی۔ اس وقت جبکہ مغربی یورپ کے یہودی یدش کو حقیر اور گنوار زبان قرار دے کر مسترد کر دیتے تھے، یہ مشرق میں ایک نئی زندگی سے ہمکنار ہونا شروع ہوئی۔ اس کا ادبی احیا انیسویں صدی کے اواخر میں شروع ہوا۔ جب مشرقی یورپ کے یہودیوں نے نقل مکانی شروع کی تو اس تحریک نے ترقی کر کے ایک بین الاقوامی حیثیت حاصل کر لی۔ اس صدی کے آخر میں یدش

http://muftbooks.blogspot.com/

ڈرامے پر جس کا مرکز نیویارک تھا، بھی بہار کے آثار دیکھنے کو ملے۔

دورِ حاضر میں یدش ناپیدگی کے خطرے سے دوچار ہے۔ ایک تو نازیوں نے یدش بولنے والے لاکھوں یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور دوسرا امریکہ اور بعض دیگر خطوں میں آباد یہودی امریکی اپنے بڑوں کی نشانی یعنی یدش سے منہ موڑتے چلے جا رہے ہیں۔ سوویت یونین اور اس کے بعد کے روس میں یہودیوں کو سرکاری سطح پر دبانے کی کوشش کی گئی اور یدش زبان کے استعمال پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ اس پر طرہ یہ کہ اسرائیلی اربابِ اختیار کا سارا زور بھی عبرانی پر محسوس ہوتا ہے اور اس طرح یدش کو یہودیوں کے اپنے وطن میں سوتیلوں کا سا سلوک برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔

یدش اب اگر کہیں استعمال ہوتی دکھائی دیتی ہے تو قدامت پسند ہاسیدیوں میں اور یا پھر یونیورسٹیوں کے مصنوعی ماحول میں۔ تاہم امید کی جاتی ہے کہ بعض حلقوں کی جانب سے بین الاقوامی سطح پر ایسے پروگرام شروع کیے گئے ہیں جن سے اس زبان کے بچنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ یوتھ فار یدش کو ایسے ہی پروگراموں کی ایک مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

یوریپیڈیز

یونانی ڈرامہ نگار۔ المیہ کے صنف میں ایتھینیا کے تین ڈرامہ نویسوں کو سب سے عظیم مانا جاتا ہے: پہلا ایسکائلس (525۔456 ق م)، دوسرا سوفوکلیز (496۔406 ق م) اور تیسرا یوریپیڈیز (اندازاً 485۔406 ق م) معروف یونانی فلسفی ارسطو (384۔322 ق م) نے اسے ''شاعروں میں سب سے زیادہ المیاتی'' قرار دیا ہے۔ یوریپیڈیز اخلاقی معنویت سے تہی ژولیدگی اور غیر منطقی قوتوں سے برسرِ پیکار اور اس ان کے سامنے بے بس افراد کی تصویر کشی کے لیے مشہور ہے۔ اس نے اپنے زیادہ تر کھیل جنگ پیلوپونیز (431۔404 ق م) کے نازک دور میں تحریر کیے۔ ہم اس زمانے کے احوال کی عکاسی اس کے داستانوی ہیروز کے کرداروں کی ہارڈ بوائلڈ حقیقت پسندی اور (غیر مشروط نیکی اور شاہی طبقے کی تعریف کے بشمول) اس معاشرے کے روایتی رویوں اور رویتروں پر تنقید میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

لگتا ہے کہ یوریپیڈیز اپنے حریف سوفوکلیز کے برعکس عوام میں زیادہ مقبول نہیں تھا اور تنہائی کی زندگی اور تنہارہ کر لکھنے کو ترجیح دیتا تھا۔ تاہم سوفوکلیز کی طرح وہ بھی ایک بڑے گھرانے میں پیدا ہوا اور اس نے ممتاز علماء سے تعلیم حاصل کی۔ وہ اپنی حجت پسندی کے لیے مشہور تھا جس کی ایک وجہ اس کا بلاغت پر اصرار اور اس کے دیوتاؤں اور سُورماؤں کے پورٹریٹوں کی مخفی تشکیک ہے۔ سقراط اسے رند کہا کرتا تھا۔ یوریپیڈیز نے مخاصمت اور ڈراموں کے مقابلوں میں اپنی اوسط

درجے کی کامیابی کو دیکھ کر 408 ق م میں ایتھنز چھوڑ کر مقدونیہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

کہا جاتا ہے کہ یوریپیڈیز نے بانوے کھیل تحریر کیے۔ ان میں سے اب ہمیں اس کے نام سے منسوب جو کھیل ملتے ہیں ان کی تعداد انیس ہے جن میں ''رحم کی طالب عورتیں (اندازاً 421 ق م)، ہرکولیس دیوانہ (اندازاً 420 ق م) ٹرائے کی عورتیں (415 ق م)۔ الیکٹرا (413 ق م) اور اورسٹیز (408 ق م) شامل ہیں۔ اگرچہ اس کی بیشتر تخلیق کو میلوڈرامائی خیال کیا جاتا ہے۔ اس کا واقعات کا انتخاب اور ان واقعات کی ڈرامائی تشکیل نیز اس کی واضح اور فطری لفاظی ان میں حقیقت پسندی کا رنگ پیدا کر دیتی ہے۔ اس حقیقت پسندی کی بات کرتے ہوئے سوفوکلیز کہا کرتا تھا کہ وہ اپنے ڈراموں میں لوگوں کو ایسے پیش کرتا ہے جیسا کہ انھیں ہونا چاہیے جبکہ یوریپیڈیز انھیں ایسے دکھاتا ہے جیسے کہ وہ ہیں۔ یوریپیڈیز عموماً پیراڈوکس (استعبادات) کے استعمال اور اپنی کردار نگاری میں الہام کے وسیلے سے اپنے تماشائیوں میں ہمدردی کے ٹکراؤ پیدا کرتا ہے۔

یہودیت

دنیا کا قدیم ترین بڑا توحیدی مذہب یہودی عقیدے سے کا مرکزی ستون ایک خدا اور اس کے اور بنی اسرائیل کے درمیان خصوصی تعلق پر ایمان ہے۔ یہودی روایت کے مطابق بیسویں صدی قبل مسیح کے وسط میں خدا اور جدالانبیاء حضرت ابراہیمؑ کے درمیان ایک مقدس معاہدہ عمل میں آیا جس کو تیرہویں صدی قبل مسیح میں اس وقت توسیع ملی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم یہود کو مصر کی غلامی سے نجات دلا کر انہیں ارض موعود یعنی کنعان کی سرزمین پر لے کر آئے۔

غلامی کے اس دور میں یہودی علماء نے پہلے سے چلی آتی تحریروں اور زبانی روایتوں کو جمع کر کے انہیں باقاعدہ مذہبی صحائف کی شکل دی جو بعد میں ''موسیٰ کی پانچ کتب'' یا توریت کے نام سے معروف ہوئے۔ بعد ازاں ان میں انیس کتابوں کا مزید اضافہ ہوا اور یہ سارا مجموعہ ''عبرانی صحائف'' یا عہد نامہ عتیق کے طور پر جانا جانے لگا۔ اس عہد نامے کی خاص بات ایک ایسے مسیحا کی آمد کی بشارت ہے کہ جو وہ دنیا میں امن و انصاف قائم کرے گا۔ موسیٰؑ سے منسوب توریت اور موخر کتب اجتماعی طور پر انجام کار یہودی مذہب کی بنیاد بنیں جو صدیوں کے عمل سے گزر کر تین شاخوں یعنی تقلیدی، قدامت پسند اور اصلاحی یہودیت میں تقسیم ہو گیا۔

تقلیدی یہودی روایتی عقائد و عبارت کی سب سے زیادہ سختی سے پیروی کرتے ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ دوسرے دو مسالک کے یہودیوں کو بھی اپنا ہم مذہب تسلیم کرتے ہیں، وہ رہن سہن اور

http://muftbooks.blogspot.com/

عبادات میں ان دونوں گروہوں کی طرف سے کی گئی تبدیلیوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔ مثال کے طور پر جہاں اصلاح پسند یہودی غذائی حد بندیوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ تقلیدی مسلک کے مقلدین غذائی قوانین کے اتباع کو اپنا فرض عین تصور کرتے ہیں۔ تقلیدی عبادت گاہوں میں عورتوں اور مردوں کو الگ الگ بٹھایا جاتا ہے لیکن اصلاح پسندوں اور قدامت پسندوں کے ہاں ایسا نہیں کیا جاتا۔

تقلیدی مسلک جدیدیت کی مزاحمت کے ضمن میں کوئی ایسا بے لچک بھی نہیں۔ نویں صدی کے وسط کی اصلاحی تحریک نے رجعتی سے رجعتی یہودی علماء کو بھی اپنے خیالات پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ فرینکفرٹ کے ربی سمیسن رافیل ہرش کو تقلیدی فرقے کا امام کہا جا سکتا ہے۔ اس نے گو تحریک اصلاح دین کی مخالفت بھی کی لیکن اس نے اس کے تمام اہداف کو یکسر مسترد بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے اس بات کی ضرورت تسلیم کی تھی کہ اگر یہودی اپنے اردگرد کے معاشروں کے ساتھ گھل مل کر رہنے کی کوشش کریں تو اس میں کوئی مضائقے والی بات نہیں۔ اس نے مغربی لباس، زبان اور ثقافت اختیار کرنے کی حمایت کی لیکن ساتھ اس نے یہ زور بھی دیا کہ مذہبی روایات تبدیل نہیں ہوا کرتیں۔ یہ ہرش کی کامیاب قیادت کا ہی ثمر تھا کہ وسطی اور مغربی یورپ کے بیشتر یہودیوں کی تقلیدی مسلک سے وابستگی برقرار رہی۔ اسرائیل میں سرکاری طور پر آج کل یہی مسلک رائج ہے اور وہاں اسے ربیوں کے توسط سے اچھی خاصی طاقت بھی حاصل ہے۔ امریکہ میں بھی تقلیدی یہودیوں کی ایک منظم یونین ہے جن کا فکری مرکز نیویارک کی یشوا یونیورسٹی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

قدامت پسند تحریک انیسویں صدی کے تاریخی مکتب یہودیت کی تحریروں کے زیر اثر پروان چڑھی۔ زیکریئس فرینکل جس کا شمار اس مسلک کے سب سے قد آور اراکین میں ہوتا ہے، کو یہ خوف تھا کہ یہودی دوسری ثقافتوں میں جذب ہو کر اپنا قومی و مذہبی تشخص کھو بیٹھیں گے۔ قدامت پسند مسلک کے ارتقاء کی ایک اور اہم بات انیسویں صدی کے اواخر میں دیکھی جانے والی صہیونیت کی نشوونما ہے جس نے روحانی و سیاسی لحاظ سے قدامت پسند یہودی رہنماؤں کے نظریات کو تقویت دی۔ تاہم اس کے قائدین کے درمیان اس مسئلے پر اختلافات بھی دیکھنے میں آتے رہے کہ مذہبی اور سیاسی معاملات میں سے زیادہ اہمیت کسے دی جانی چاہیے۔ سیاسی صہیونیت کا بانی تھیوڈور ہرزل یہودیوں کیلئے ایک بین الاقوامی سطح پر مسلمہ قومی ریاست کی اہمیت پر زور دیتا رہا جبکہ اہاد آم اور اس کے مقلدین یہودیت کے مذہبی و فکری احیاء کو اسرائیل کا اصل مقصد سمجھتے تھے۔ قدامت پسند تحریک نے اہاد گروپ کا پورا پورا ساتھ دیا لیکن انہوں نے ہرزل صہیونیت کو بھی کبھی مسترد نہیں کیا۔ تاہم آج کل قدامت پسند یہودیوں کی اکثریت (نیز تقلیدی اور

http://muftbooks.blogspot.com/

اصلاح پسند) اسرائیل کی بطور یہودی ریاست مکمل حمایت کرتے ہیں۔

اصلاحی مسلک یہودیت کی ایک آزاد خیال شکل ہے جس کی ابتداء جرمنی سے ہوئی اور اٹھارہویں صدی کے فلسفی موسیٰ مینڈل سون کو اس کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ وہ مذہبی اصلاح کے توسط سے یہودیت کو وسیع تنویری نظریات کے شانہ بشانہ لاکر کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اگرچہ اس تحریک کا آغاز یورپ سے ہوا، اسے وہاں زیادہ حمایت حاصل نہ ہوسکی۔ اسے صحیح مقبولیت اس وقت حاصل ہوئی جب یہودی ایک بڑی تعداد میں جرمنی سے ہجرت کر کے امریکہ پہنچے۔ اس مسلک کے نظریات کی صحیح شکل وصورت 1885ء میں آ کے اصلاحی ربیوں کے اس مشہور اجتماع میں متعین ہوئی جسے پیٹرز برگ پلیٹ فارم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کانفرنس میں اصلاحی یہودیت کے بنیادی اصولوں کا تعین کیا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ یہودیوں کا تاریخی تشخص برقرار رکھنا ضروری ہے لیکن ایسا کرنے کیلئے یہودی روایت کوئی ایسی لازم ملزوم چیز نہیں۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی کہی گئی کہ تالمودی ادب کی بڑی اہمیت ہے لیکن اسے مطلق قانون قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس اجتماع میں طے پانے والی پالیسیوں کو 1937ء میں منعقد ہونے والی نئی کانفرنس کولمبس پلیٹ فارم تک اصلاحی فکر کے قلب کی حیثیت حاصل رہی۔ اس کانفرنس میں نئی پود کے اصلاح پسندوں نے ایک بار پھر سر جوڑ کر یہ سوچنا شروع کیا کہ ان کی قوم کی بڑھتی اور بدلتی ہوئی ضروریات کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے کیا کیا جانا چاہیے۔